تاریخِ شاہ جہاں

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

تاریخ شاہجہاں

تالیف

ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ

مترجم

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

تاریخ شاہجہاں

تالیف

ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ

مترجم

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

نیشنل بک ہاؤس ۰ لاہور

حقوق اشاعت محفوظ

۱۹۸۷ء
باردوم ۱۹۹۵ء

تاریخِ شاہجہاں

بنارسی پرشاد سکسینہ

مترجم: ڈاکٹر اعجاز حسین

ناشر : الطاف حسین
طابع : گنج شکر پریس لاہور
قیمت
-/۳۰۰

یکے از مطبوعات
نیشنل بک ہاؤس، ایبک روڈ، لاہور

چند باتیں

کسی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اور یہ اُمید کرنا کہ اصل زبان و بیان کا پورا لطف ترجمہ میں بھی باقی رہ جائے اگر خام خیالی نہیں تو صحیح بھی نہیں۔ جن اہلِ قلم کو اس وادیٔ دشوار سے گزرنا پڑا ہوگا ان کی مشکلات کا اندازہ بھی کرنا آسان نہیں۔ عملی کارگزاری کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ کا کام تصنیف کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اپنے خیالات کو اپنی زبان میں بیان کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا دوسری زبان کی جملہ خصوصیات اپنے الفاظ میں منتقل کرنا۔ انگریزی زبان کی وسعت و معنوی پختگی و زور، اس کے لفظیات کی ہمہ گیری، اظہارِ مفہوم کی صلاحیت اُردو غریب کو کہاں نصیب۔ ان باتوں کے پیشِ نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود اپنی پوری توجہ کے تاریخ نویسی کی پوری فضا میں نہیں پیدا کر سکا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ ابلاغ و ترسیل کے مرحلے کو ہمواری سے طے کرنے کی بلیغ کوشش کی ہے۔ ہر قدم پر یہ فکر دامن گیر کہ مفہوم کہیں مجروح نہ ہونے پائے۔ اس نظریہ کے تحت ممکن ہے آپ کو زبان و بیان میں کہیں کہیں لغزش نظر آئے۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں مگر ایسی حرف گیری کے وقت یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ انگریزی میں طویل جملے کا استعمال مستحسن سمجھا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اُردو میں فعل، فاعل، مبتدا و خبر کا قریب ہونا دلکشی کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے طویل جملوں کو اپنے طور پر بالاختصار انداز میں پیش کرنے میں پسینہ آجاتا ہے۔ اس ضمن میں کبھی کبھی مجھے ایک جملہ کو اردو میں حسن و اثر کے ساتھ ترجمہ کرنے میں گھنٹوں صرف کرنا پڑا ہے اور شاید حسبِ خواہش بات قلم بند نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ اُردو کی لفظیات کا ذخیرہ بھی اتنا وافر نہیں جتنا انگریزی کا۔

ہر موقع کے تاثرات کی تصویرکشی کے لیے الفاظ کی کمی نے کبھی کبھی حُسن بیان کو اُبھرنے نہیں دیا۔

یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا اگر مصنّف میری مدد نہ کرتے حسنِ اتفاق سے وہ میرے کرم فرما استاد بھی ہیں۔ اگلے زمانے کے استاد و شاگرد میں جو روحانی ارتباط پیدا ہوجاتا ہے وہ خوش قسمتی سے ہم دونوں میں ابھی تک باقی ہے۔ چنانچہ جب کبھی میں نے ان سے اس سلسلے میں مدد چاہی تو موصوف نے بڑی خندہ پیشانی سے میری مشکل حل کرنے میں زحمت گوارا کی۔ منجملہ ان کے دیگر احسانات کے میں اس کرم فرمائی کو بھی دل میں محفوظ کر لینا الفاظ میں اظہار شکر گزاری سے بہتر سمجھ کر خاموش ہوں۔

شکر گزاری کے سلسلے میں ڈاکٹر سید حسن احمد صاحب (لکچرر شعبۂ پولٹیکل سائنس، مسلم یونیورسٹی) کا احسان نہ ماننا میرا اخلاقی جرم ہوگا۔ موصوف نے جس محنت و نظر سے مسودہ پر نظرثانی کی ہے وہ میرے لیے بڑی گراں بہا ہے۔ اگر ان کی توجہ شامل نہ ہوتی تو ترجمہ میں بعض ایسی فروگزاشتیں رہ جاتیں جو کتاب چھپنے پر خود میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتیں۔

اس سلسلے میں پروفیسر اقتدار عالم صاحب کا بھی ممنونِ کرم ہوں موصوف کی ہمت افزائی محنت طلبی میرے لیے بانگ درا سے کم نہ تھی ان ہی کی آواز پر لبیک کہتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ منزل بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔

اعجاز حسین

اختصاریہ

۱۔ آئین	آئینِ اکبری
۲۔ ا ،ن	اکبر نامہ
۳۔ عرضداشت	خطوط سید مظفر بار بہ خان جہان
۴۔ بساطین	بساطین السلطان
۵۔ ب ،م	برٹش میوزیم کیٹلاگ، مخطوطات فارسی
۶۔ فتوحات	فتوحاتِ عادل شاہی
۷۔ حدیقات	حدیقۃ السلاطین
۸۔ آئی ،او ،ال	انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ مخطوطات فارسی
۹۔ اقبال نامہ	اقبال نامہ جہانگیری
۱۰۔ ج ،ا ،س ،ب	جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی - بنگال
۱۱۔ ج ،ر ،ا ،س	جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی
۱۲۔ لاہوری	پادشاہ نامہ
۱۳۔ قزوینی	پادشاہ نامہ
۱۴۔ قصاص	قصاص الخاقانی
۱۵۔ ر ،ب	راجرس اور بیورج - توزک جہانگیری

۱۶. ریو	برٹش میوزیم کٹلاگ، فارسی مخطوطات
۱۷. رد	ایسے آف سرنامس رد
۱۸. صالح	عمل صالح
۱۹. طباطبائی	پادشاہ نامہ طباطبائی
۲۰. طبقات	طبقات شاہ جہاں
۲۱. وارث	پادشاہ نامہ

نوٹ: مجموعۂ مراسلات کے لیے دیکھیے جامع مراسلات فی الالباب

فہرست

دیباچہ ۲
حرف آغاز ۳
چند باتیں ۵
اختصاریہ ۷

تعارف

۱۱
باب ۱ .... بچپن اور جوانی ۲۱
باب ۲ .... شہرت کا ارتقا ۵۲
باب ۳ .... گہن اور طلوع ۶۳
باب ۴ .... بغاوتیں ۸۶
باب ۵ .... معمولی فتوحات اور انتشارات ۱۱۲
باب ۶ .... احمد نگر کا اختتام ۱۲۸
باب ۷ .... بیجاپور اور گولکنڈہ ۱۴۵
باب ۸ .... ماوراالنہر ۱۶۸
باب ۹ .... ایران سے تعلقات ۱۸۹
باب ۱۰ .... ثقافت اور وزارت ۲۱۰
باب ۱۱ .... انتظامیہ کے بعض پہلو ۲۳۴
باب ۱۲ .... آخری منزل ۲۶۲

تتمہ ۔ حاشیے ۲۹۱

تعارف

ایسے دور میں جب شخصیت کے بجائے واقعات کا مطالعہ تاریخ کے سنجیدہ طالب علم کی توجہ کا مرکز ہو رہا ہے تو یہ بات ذرا نامناسب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی صلاحیت ایسے کام میں صرف کرے جو صرف ایک منفرد شہنشاہ کے عہد کے تشریحی[1] بیان تک محدود ہو لیکن شاہجہاں کے دورِ حکومت کی خصوصیات اس سے مختلف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا عہدِ حکومت اس کے دادا اکبر کی حکومت کی طرح بجائے خود ایک دور ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ کام ابھی حسبِ امکان تک کیا بھی نہیں گیا۔

مقالہ کے حدود

اس مقالہ کا مقصد اس خلا کو پُر کرنا ہے جو چغتائی خاندان کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ مقالہ کی وسعت ۱۵۹۲ء سے ۱۶۵۷ء تک محدود ہے۔ شاہجہاں کی شدید علالت کے بعد جو جنگ وراثت کا سلسلہ شروع ہوا وہ اس موضوع کے باہر ہے کیونکہ سر جادوناتھ سرکار نے اپنی گرانبہا تصنیف "اورنگ زیب" میں اس کا تذکرہ بڑی شرح و بسط سے کر دیا ہے۔ اس لئے شاہجہاں کی زندگی کے آخری دور کا بھی بیان اس مقالہ کے حدود سے باہر رکھا گیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہے معروف واقعات کی تکرار سے بھی گریز کیا گیا ہے، لیکن جہاں کہیں بیان میں ربط قائم رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں نہایت اختصار کے ساتھ ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔

میرے مطالعہ کا انحصار زیادہ تر ایرانی عصری ذرائع ہیں۔ جہاں کہیں، کافی مواد

میسر نہیں ہو سکا تو اس عہد کے بعد کے مواد سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ میں نے مغربی سیاحوں کے ان مواد سے بھی استفادہ کیا ہے جو انگریزی زبان میں یا بذریعہ ترجمہ انگریزی میں آتے ہیں۔ ذخیرہ کے اس خام مواد کی پوری طرح چھان بین کر کے مفید مطلب جو نتائج اس مقالہ میں شامل کئے گئے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں (۱) ابتدائی تصنیفیں (۲) عصری تاریخی روزنامچے (۳) مغربی سیاحوں کے بیانات۔

ابتدائی تصانیف: اکبرنامہ و آئین

اکبرنامہ: ابوالفضل کی یادگاری جلد سوئم میں ہم کو شہزادے خرم کی ولادت و تعلیم کے بارے میں جابجا حوالے ملتے ہیں، لیکن اس کی دوسری تصنیف آئین، مغل بادشاہوں کے انتظامی ادارت کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی کتاب کی بہترین تنقید ڈبلو۔ ایچ مورلینڈ کی تصنیف "اسلامی ہندوستان کی زراعتی تنظیم" میں ملتی ہے۔

توزک جہانگیری: لیکن اکبرنامہ سے زیادہ دلچسپ اور موضوع سے متعلق توزک جہانگیری ہے۔ اس کی حیثیت جتنی ادبی اعتبار سے قابلِ قدر ہے، اتنا ہی تاریخی اعتبار سے بھی۔ جہانگیر اپنے قلم سے روزانہ یہ حالات قلمبند کرتا تھا۔ یہ سلسلہ اس کی حکومت کے تقریباً ۱۷ ویں سال کے اواخر تک قائم رہا۔ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں سال کے حالات معتمد خان نے لکھے ہیں۔ اس لئے کہ شہنشاہ کی روز افزوں کمزوری سدِ راہ تھی۔ توزک میں جہانگیری عہدِ حکومت میں شاہجہاں کے عروج کا ذکر مسلسل آتا ہے۔ لیکن جب شہزادے نے بغاوت کی تو جہانگیر کا رویہ بدل گیا اور اب بجائے پُرشوکت لقب۔ شاہجہاں کے اس کو 'بے دولت' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

مخزن افغانیہ

مخزن افغانیہ کا مصنف نعمت اللہ تیس سال تک اکبر کے زمانہ میں حکمۂ خالصہ سے وابستہ تھا اور جہانگیر کے زمانہ میں ۱۱ سال تک وقائع نویس کے عہدہ پر فائز رہا۔ اس کے علاوہ وہ بتاتا ہے کہ ۱۵۹۵ء میں خانخاناں کے یہاں داروغہ کتب خانہ کی حیثیت سے اس نے کام کیا۔ ۱۶۰۸ء میں وہ سرکاری ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ اس کے بعد اس کو خان جہاں لودی کی سرپرستی حاصل ہوئی
۱۲ رفروری ۱۶۱۲ء میں اس نے یہ کتاب ملکاپور (برار) میں لکھنی شروع کی۔ اس نے صاف صاف اعتراف کر لیا ہے کہ اس کا مقصد اپنے سرپرست کی مدح سرائی ہے۔ پہلے چار ابواب میں اس نے لودی اور سوری خاندان کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ پانچویں باب میں خان جہاں

کے آباؤ اجداد کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کتاب میں آخری واقعہ خان جہاں کی اس سبک دوشی سے متعلق ہے جو مئی ۱۶۱۲ء میں ایلیچ پور میں ہوئی۔

معاصر جہانگیری اور اقبال نامہ

شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد دو ایسی کتابیں ملتی ہیں جو تفصیل کے لحاظ سے قریب قریب یکساں ہیں۔ یہ ان لوگوں کے کارنامے ہیں جو دربار سے بہت قریب تھے۔ مرزا کامگار حسینی نے ۱۶۳۰ء میں معاصر جہانگیری تصنیف کی اور معتمد خان نے ۱۶۳۲ء کے کچھ بعد اقبال نامہ ختم کیا۔ ان دونوں کارناموں کے تقابل سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں مصنفوں کا واقعاتی ذریعہ معلومات ایک ہی تھا لیکن کامگار سے زیادہ سرقہ کا مجرم معتمد خان ہے کیونکہ اس نے توزک کی عبارت کا چربہ اپنی زبان میں اتار لیا ہے۔ خافی خان کی رائے کے لحاظ سے بھی معتمد خان سے زیادہ راست گو و قابل استناد کامگار ہے۔ لیکن کامگار، عبداللہ خان فیروز جنگ کا طرف دار ہے کیونکہ اس کا قریبی رشتہ دار ہے۔ دو موقعوں پر اس نے فیروز جنگ کے عیارانہ کردار کی صفائی میں بڑے زور شور سے وکالت کی ہے۔ پہلا موقع تو وہ ہے جب اس نے بلوچ پور کی لڑائی کی ابتدا سے کچھ پہلے ہی اپنا پہلو بدل دیا اور دوسرا موقع وہ ہے جب اس نے شاہجہاں کا ساتھ اس وقت چھوڑا جب آخر الذکر بنگال سے واپس آیا تھا۔ باوجود دونوں کتابوں کی خامیوں کے ہم کو ان سے ایسے زمانے کی قیمتی اطلاعات مل جاتی ہیں کہ جن کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مثلاً شاہجہان کی بغاوت اور وہ حالات جو اس کی تخت نشینی کے پہلے رونما ہوئے۔

عصری تحریروں کی تعداد اور ضخامت حیرت انگیز ہے۔ ان کی قدر قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے نوعیت کے لحاظ سے ان کو حسب ذیل چار حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔

(۱) سرکاری تاریخ اور وہ تحریریں جو مغل دربار سے قربت رکھنے والوں نے لکھیں۔

(۲) بیجاپور اور گولکنڈہ کی تاریخیں۔

(۳) ایران کی تاریخیں۔

(۴) عصری مراسلات جن میں ڈائری اور اخبارات بھی شامل ہیں اور وہ مختصر بیانات بھی جو کسی ایک جنگ یا حادثہ سے متعلق ہیں۔

گمشدہ تحریرات

شاہجہاں چونکہ فطرتاً خود پسند تھا اس لئے اس کو بڑی فکر تھی کہ اس کے زمانے کے تاریخی واقعات پرشکوہ الفاظ میں آئندہ

نسلوں تک پہنچیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے متعدد آدمی اس کام کے لیے مقرر کیے۔ محمد صالح کمبوہ نے لکھا ہے کہ حکیم حاذق اور ملا عبداللطیف گجراتی ان عہدوں سے اس لئے برطرف کیے گئے کہ ان کے رفیق کار اُن سے جلتے تھے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کے کام کا نام ونشان باقی نہیں۔ اس لئے ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ انھوں نے کیسے اور کیا لکھا۔

قزوینی کا بادشاہ نامہ

شاہجہاں کے سرکاری مورخوں میں جن کا کارنامہ اب تک محفوظ ہے سب سے پہلے مرزا امینائی قزوینی کا نام ملتا ہے قزوینی افضل خان کا پروردہ تھا۔ وہ ہندوستان کب آیا اس کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں لیکن خود اس کا بیان ہے کہ ۱۶۳۰ء میں وہ دکن میں موجود تھا جب یہاں شدید قحط سالی کا دورہ تھا۔ شاہجہاں کی حکومت کے پانچویں سال وہ شاہی ملازمت میں داخل ہوا اور جب شہنشاہ ۳۴-۱۶۳۳ء میں کشمیر گئے تو قزوینی، افضل خان کے ہمراہیوں میں تھا۔ اس کی پہلی تحریر اس معرکہ کا بیان ہے جس میں اورنگ زیب سدھاکر ہاتھی سے لڑا تھا۔ شہنشاہ نے اس بیان کو بہت پسند کیا۔ اس کے بعد اس نے بندیلہ کی لڑائی قلم بند کی۔ شاہجہاں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس کو درباری مورخ کی جگہ دے دی۔ اس عہدہ پر وہ اس زمانہ تک کام کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے شاہجہاں کے پہلے دس سال حکومت کا ذکر مکمل کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کی حسد کی وجہ سے برطرف کیا گیا۔

قزوینی کے بادشاہ نامہ کی زبان سادہ اور دلکش ہے۔ اس زمانے کے خالص فارسی اسلوب بیان کا مثالی نمونہ ہے۔ فطرتاً مصنف اپنے سرپرست شہنشاہ کا جانب دار ہے چنانچہ شہنشاہ کی ابتدائی زندگی اور خاص کر اس کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوتے وہ سارا الزام نورجہاں پر رکھ دیتا ہے۔ نورجہاں کو بُرے الفاظ میں یاد کرتا ہے۔ دراصل بغاوت کا بیان بہت مختصر ہے۔ مصنف کوشش کرتا ہے کہ اس عہد کے کشمکش کی بنیاد وہم کی باتوں پر رکھ دے۔ باوجود ان باتوں کے اس کا کارنامہ اس لئے قیمتی ہے کہ شاہجہاں کی ابتدائی تعلیم اور اس کی حکومت کے ابتدائی دس سال کے واقعات کا اندازہ ہوتا ہے۔

طباطبائی کا بادشاہ نامہ

قزوینی کی طرح ایک دوسرا بادشاہ نامہ جلال الدین طباطبائی کا لکھا ہوا ہے۔ جو حصہ محفوظ ہے اس میں شاہجہاں کے عہدِ حکومت کے صرف چار سال کا ذکر ہے۔ یعنی ۵ویں سے ۸ویں سال تک کا، لیکن اس کتاب

میں مختصر حوالے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ طباطبائی نے اس سے پہلے کے زمانہ کا بھی حال لکھا ہے۔اس کی زبان بڑی خوبصورت اور مرصع ہے طرز بیان دیسی فارسی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس کام کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔کیونکہ یہ صرف اس کے پیش رَو اور ہم وطن قزوینی کے بیان کا چربہ ہے۔بعض مقامات پر خاص کر کشمیر کے بیان میں محسوس ہوتا ہے کہ طباطبائی نے بلا تکلف قزوینی کی نقل کی ہے۔ طباطبائی نے اپنی کتاب ۱۶۴۰ء میں مکمل کی۔

لاہوری کا پادشاہ نامہ

تیسرا سرکاری مورخ جو شاہجہاں کے معیار پر پورا اترا وہ عبدالحمید لاہوری تھا۔محمد صالح کے خیال میں وہ ابوالفضل اسکول کا مقلد تھا دربار کا مورخ ہونے سے پہلے ہی وہ عمر کی زوال پذیر منزل میں تھا۔جب کہ اس کے کام کی ابتدا حقیقتاً شاہجہاں کے عہد حکومت کے بارویں سال سے پہلے کی نہیں۔خیال یہ ہے کہ تخمیناً سولھواں سال شاہجہاں کے عہد کا تھا جب اس نے یہ کام شروع کیا۔محمد وارث کا کہنا ہے کہ عبدالحمید نے اپنا کام ۹ رنومبر ۱۶۴۸ء میں مکمل کیا۔اس کا انتقال ۳۰ راگست ۱۶۵۴ء میں ہوا۔

لاہوری کا پادشاہ نامہ شاہجہاں کے حکومت کے پہلے ۲۰ سال پر مشتمل ہے مصنف نے ابتدا میں ابوالفضل کا اسلوب بیان اختیار کیا لیکن بعد میں ترک کر دیا۔پہلے دس سال کا ذکر قزوینی کے بیان کی تکرار ہے۔البتہ جا بجا تفصیل میں کچھ اضافہ ہے۔نورجہاں کے متعلق فیصلہ کرنے میں لاہوری اتنا ہی سخت ہے جتنا اس کا پیش رَو تھا۔کشمیر کا بیان بعینہٖ مشابہ ہے۔اس کے کام کی اصل قیمت دوسرے حصہ میں ہے جس میں دوسرے دور کے واقعات کا بیان ہے۔تاریخی نقطہ نظر سے یہ مکمل ہے لیکن اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی ادب کے طالب علم کی توجہ یا تعریف کا مرکز بنے۔

وارث کا پادشاہ نامہ

لاہوری اپنے کام کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔پیرانہ سالی نے اس کو معذور رکھا۔لہٰذا یہ کام اس کے ایک شاگرد محمد وارث کے سپرد کیا گیا۔جس نے شاہجہانی عہد کے تیسرے دور کا ذکر کیا ہے۔شاہجہاں آباد کی عمارتوں کا ذکر بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ بڑے دل کش انداز میں ہے۔

محمد وارث کا شاہجہاں نامہ

محمد وارث کے بعد اطلاعات کے لیے ہم کو بعض ایسے افسروں کی تحریر پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو دربار سے بہت زیادہ قریب تھے۔ اس سلسلہ میں اوّل و اہم ترین کام محمد صادق کا شاہ نامہ ہے۔ باوجود متعدد خود نوشت سوانحی

حوالہ جات کے مصنف کی شناخت مشکل ہے۔ بہر حال اگر شاہجہاں نامہ، غیر معمولی اہمیت کا کارنامہ نہیں تو کم از کم اس میں شک نہیں کہ یہ اسی زمانہ کی معتبر تاریخی اسناد میں سے ہے۔ یہی نہیں کہ مصنف ایک مخصوص عہدہ پر مامور تھا۔ (ایک زمانہ میں وہ داروغہ غسل خانہ تھا) جس سے اس کو موقع ملتا تھا کہ اپنے پیش کردہ حالات کو دیکھ کر، سمجھ کر ایک سوچے سمجھے تجزیہ کی صورت میں قلم بند کرے بلکہ جہاں کہیں بیانات کو ذاتی علم کا سہارا نہیں مل سکا وہاں بھی اس کے اطلاعی ذرائع مشکوک نہیں۔ اس نے اپنے چار چچاؤں کے نام بتاتے ہیں جن میں سے تین سرکاری ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے۔ اسحاق بیگ یزدی، ممتاز محل کا میر ساماں تھا۔ امیر خاں، امیر توزک تھا اور باقی خاں عرصہ دراز تک اکبرآباد (آگرہ) کا ناظم تھا۔ اس کا چوتھا چچا محمد یار عرف احدی یار رسالے میں سوار تھا۔ محمد صادق کو اپنا کوئی مطلب نکالنا نہیں تھا۔ نہ وہ درباری مورخ تھا نہ کسی سرپرست کے خوش کرنے کے لئے لکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شاہجہاں کا جانب دار ہے۔ ورنہ وہ منصف مزاج ہے۔ وہ ضروری تنقید سے کبھی باز نہیں آتا نہ ناخوشگوار حقائق لکھنے میں تکلف کرتا ہے، وہ جہانگیر کی موت سے کام شروع کرتا ہے اور شاہجہاں کی نظر بندی تک حالات رقم کرتا ہے۔

اس کی غیر جانب داری کی یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً خان جہاں لودی کے ساتھیوں کی جد وجہد کی تعریف، حالانکہ آخری معرکہ میں یہ لوگ بلحاظ تعداد سادات بارہہ سے کم تھے، دکنی تیغ زنی کا کمال، مراری پنڈت کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے اس کو صاحب سیف و قلم کہنا، نورجہاں کی مرحوم شوہر کے ساتھ وفاشعاری، بعض ہندو افسروں بالخصوص آصف خاں کے دیوان مکندرائے کی تعریف، بالآخر اس کا یہ اعتراف کہ قندھار میں مغل اس لئے ناکامیاب رہے کہ ان کے آتش بار اسلحے گھٹیا قسم کے تھے۔ دارا کی شکست کے بعد اس نے شاہجہاں اور اورنگ زیب کی گفت و شنید میں براہ راست حصہ لیا تھا۔ اس لئے اس کا بیان نہایت مستند ہے۔

ملا طاہر کی ملخص: محمد طاہر آشنا کی تصنیف ملخص شاہجہانی دور کے ۳۰ سال کی مکمل تاریخ ہے، شاہ نواز خاں اس کے صاف ستھرے طرز بیان کی تعریف کرتا ہے لیکن بہ حیثیت مورخ اس کا شمار نقل نویسوں میں ہو سکتا ہے۔ اہل تحقیق میں نہیں، اگر چہ شاہی ملازمت میں اسے بلند مرتبہ نصیب تھا اور اپنے عہدے کے لحاظ سے

بے لوث اطلاعات فراہم کرسکتا تھا۔ (وہ کشمیر کے ناظم ظفر خان کا بیٹا تھا) لیکن اس نے کمتر درجہ کا رویہ اختیار کیا۔ محمد امین قزوینی و عبدالحمید لاہوری وغیرہ کی تاریخوں سے حرف بحرف نقل کر دیا۔ وہ اتنا آرام طلب تھا کہ تبت کی فتح کو بھی اپنی معلومات سے جاندار بنانے کی زحمت نہ کی حالانکہ یہ یہ مہم اس کے باپ نے سر کی تھی۔ وہ شاہ جہاں کا طرفدار ہے اس لیے خسرو کے قتل کا ذکر نہیں کرتا نہ اس کا ذکر کرتا ہے کہ شاہجہاں نے بغاوت سے پہلے اپنے باپ سے کیا مطالبات کئے تھے۔ اس کا یہ بیان دلچسپ ہے کہ بلخ کی مہم کی نوعیت انتقامی جذبہ تھی۔ کیونکہ نذر محمد خان نے کابل فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔

عمل صالح مصنفہ محمد شاہ کمبوہ

محمد شاہ کمبوہ نے شاہ جہاں کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ۱۶۵۹ء میں مکمل کی۔ بعض حوالوں سے خیال ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتاب جنگ وراثت سے پہلے شروع کی تھی۔ مثلاً شاہ جہاں کی ممتاز محل سے شادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس ازدواجی رشتہ سے چار لڑکے ہیں جو چار دانگ عالم پر قبضہ کئے ہیں" لیکن جب وہ ملکہ کی وفات کا ذکر کرتا ہے تو شہزادہ اورنگ زیب کی تعریف کی لمبی فہرست پیش کرتا ہے۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ تعریف کے پل باندھنے کی نہ تھی۔ شاہ جہاں کے المیہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے کا سلسلہ ۱۶۵۹ء کے بعد بھی قائم تھا۔ اس کے علاوہ شجاع کے بارے میں مصنف کا یہ کہنا کہ اب تک (۱۶۶۹ء) اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا" ظاہر کرتا ہے کہ اعمال صالح اس سال تک ختم نہیں ہوئی۔

غلام یزدانی اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ مصنف شاہی محکمۂ اندراجات میں ملازم تھا اس لئے اس کو براہ راست معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ لیکن اس کی تصنیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز آخری جز کے محمد صالح نے شاہجہاں کی حکومت کے عصری حالات رنگین زبان میں بیان کر دیا ہے، دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شاہجہاں کا جانب دار اور نور جہاں کا مخالف تھا۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ شاہجہاں خسرو کے قتل میں شریک تھا، ایک بڑا ثبوت اس کی آزادرائے کا ہے۔

ظفر نامۂ عالمگیری

بے جا نہ ہوگا اگر یہاں چند کتابوں کا ذکر کیا جائے جو اگرچہ قطعی طور پر عصری نہ تھیں مگر اس عہد کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ظفر نامہ بادشاہ عالمگیر" پہلے نمبر پر آتا ہے ریو (۱۱، ۲۶۸) اس تصنیف کو میر خان، صوبہ دار قابل سے منسوب کرتا ہے یہ مصنف اس عہد کے واقعات انگیز کی دستاویز ہے۔ جس میں اورنگ زیب اپنے باپ کو تخت سے اتارنے اور دوسرے حریفوں کو محروم کرنے میں کامیاب ہوا۔ پر مصنف نے اپنی ذاتی معلومات سے جہاں آرا کے اورنگ زیب کے پاس جانے سے متعلق جو کچھ لکھا ہے بہت دلچسپ ہے۔ محمد صادق کی طرح وہ بھی خلیل اللہ خان کی اس غداری کا ذکر کرتا ہے جس نے اورنگ زیب کو اپنے باپ سے بالکل بیگانہ کر دیا۔

فتوحات عالمگیری

فتوحات عالمگیری اورنگ زیب کی حکومت کا تاریخی دستاویز ہے جس کا مصنف ایسر داس ناگر ساکن شہر پٹن (گجرات) ہے۔ یہ کتاب اورنگ زیب کے عہد حکومت کی تاریخ ہے جس میں عروج اقتدار سے چونتیس ۳۴ سال تک کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ اس میں سات باب ہیں جن کے صرف دو باب ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ پہلے باب کی ابتدا شاہجہاں کی علالت اور دارا کے حصول سلطنت کی جدوجہد پر مشتمل ہے اس میں اختصار کے ساتھ شجاع کی اس شکست کا بھی ذکر ہے جو جے سنگھ اور سلیمان شکوہ کے ہاتھوں اسے اٹھانی پڑی اس کے بعد مصنف، مراد کے ہاتھوں علی نقی کے قتل کا جواز پیش کرتا ہے اس جواز کی بنا اس امر پر ہے کہ علی نقی دارا سے ساز باز رکھتا تھا۔

دوسرے باب میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ اس وعدہ کا ذکر ہے جو اورنگ زیب نے مراد سے کیا تھا کہ وہ اس کو تخت پر بٹھا کر خود دنیا ترک کر دے گا۔ اس سے آگے چل کر وہ خلیل اللہ خان کی اس دغا بازی کا ذکر کرتا ہے جو اس نے دارا کو ہاتھی سے اتر جانے کی رائے دی تھی۔ مجموعی حیثیت سے وہ مراد کا طرفدار ہے اور اس کا بیان اس لئے بھی قابل اعتماد نہیں کہ اس کی بنیاد مستند ثبوت پر نہیں۔

نسخہ دل کشا

اس طرح کی دوسری تاریخی تصنیف نسخہ دل کشا ہے۔ اس کا مصنف بھیم سین ولد رگھوناتھ داس ایک کایستھ ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ سرکاری ملازمت ترک کرنے پر وہ ترک دنیا بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عزیزوں کی محبت نے اس کو یہ راستہ نہ اختیار کرنے دیا۔ اس نے راؤ دل پت سے دوستی کر لی۔ راؤ دل پت، ایرسنگھ دیو بندیلا کی اولاد میں تھا، بھیم سین اس کی خدمت میں داخل ہو گیا۔

ایک مختصر تعارف کے بعد بھیم سین، راؤ دل پت کے بزرگوں کے ذکر سے اپنی کتاب

شروع کرتا ہے اس کے بعد وہ شہر برہان پور کا ذکر کرتا ہے۔ اتفاقیہ طور پر ملک عنبر کی ولادت و وفات کا مادہ تاریخ بیان کرتا ہے۔ وہ کھڑکی کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اس شہر کو ملک عنبر نے آباد کیا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے بہ نام بدل کر اورنگ آباد کر دیا۔ واقعات کا وہ بیان جو شاہجہاں کی علالت کے بعد ہی رونما ہوتے اور خاص کر دکن میں ہوتے وہ بالکل ہی قابلِ استناد ہے۔ شاہجہاں کے عہدِ حکومت کی تاریخ کے لئے اس کتاب کے ابتدائی ۱۰ صفحات اہم ہیں۔ اس نے لفظ بھونسلا کی جو تشریح کی ہے وہ دلچسپ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس خاندان کا بانی راجہ اُرسین تھا جو چتوڑ سے دکن چلا گیا تھا۔ وہاں پرندا کے ایک گاؤں بھونسا میں آباد ہو گیا۔ اس گاؤں کی نسبت سے اس کی اولاد بھونسلا کہلائی۔

مراۃ العالم

اس عہد کی غیر مخصوص کتب تواریخ میں تین قابلِ ذکر ہیں :۔

(۱) مراۃ العالم۔ ریو اس تصنیف کو بختاور خان سے منسوب کرتا ہے۔ بختاور خان عہدِ قدیم کے تاریخی قصوں کا ماہر تھا۔ لیکن ایتھے اس بیان کی تردید کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ شیخ محمد بقا کی تصنیف ہے اس نے اپنے اصل کام میں اضافہ کر کے اس کا نام "مراۃ جہاں نما" رکھا۔ مصنف نے شاہ جہاں کی تاریخ باب ششم میں سرسری طور پر پیش کی ہے۔

خلاصۃ التواریخ

(۲) خلاصۃ التواریخ ۔ اس کا مصنف سجان رائے کھتری، پٹیالہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی جوانی اور اس کے بعد سے بلند پایہ سرکاری افسروں کا منشی رہا ہے۔ اسناد کی ایک طولانی فہرست راماتن سے لے کر "تاریخ بہادر شاہی" سے اخذ کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے ان ہی بنیادوں پر اپنا کارنامہ تیار کیا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ چونکہ اس کتاب میں اورنگ زیب تک متعدد بادشاہوں کا تذکرہ ہے اس لئے اس نے اس کتاب کا نام 'خلاصات' رکھا ہے۔ کتاب کے نصف حصہ میں صوبجات اور ان ہندو اور مسلمان بادشاہوں کا ذکر ہے جو چغتائی سے پہلے حکمراں تھے۔ ہندوؤں کے سلسلہ میں وہ کمبھ میلہ کا بھی ذکر کرتا ہے جو ہر بارہویں سال ہردوار میں ہوا کرتا ہے۔ خسرو کے قتل میں شاہ جہاں کا ملوث ہونا اس کے نزدیک مشتبہ ہے۔ جہانگیر کی حکومت کا حال بھی مختصر ہے۔ شاہ جہاں کی حکومت کی تفصیل کے لئے وہ محمد وارث کے شاہجہاں نامہ کا حوالہ دیتا ہے۔ جنگ وراثت کے سلسلے میں جسونت سنگھ کا میدان چھوڑ کر بھاگنا اس کے نزدیک جسونت سنگھ

(1) Rieu

(2) Ethe (I.O.C. Cat. p. 47)

کے ساتھیوں بالخصوص راجہ رائے سنگھ سیسودیا اور راجہ سبحان سنگھ چندراوت کی وجہ سے ہوا۔ وہ یہ بھی کہتا کہ خلیل اللہ خان کی رائے سے دارا ہاتھی سے اترا۔ دارا کا سندھ سے گجرات فرار ہونے پر یہ کتاب ختم ہوجاتی ہے۔ مصنف بے ربطی سے بیان کرتا ہے کہ اورنگ زیب ۹۲ سال کی عمر ۱۷۰۷ء میں دکن میں مرا۔

منتخب اللباب

(۳) منتخب اللباب۔ اس ضخیم تاریخی کتاب کا مصنف خافی خان ہے۔ بلاشبہ وہ بڑا سمجھدار مصنف ہے۔ لیکن جہاں تک شاہ جہاں کے دور کا سوال ہے وہ ہماری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتا۔ جب وہ دکن کا بیان کرتا ہے تو صاف صاف کہتا ہے کہ اس نے سارے واقعات بادشاہ نامہ سے لئے ہیں۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی وہ اسی کتاب کا حوالہ دیتا ہے۔

دکن کی تواریخ

تذکرۃ الملوک ـــ اس کتاب کا مصنف رفیع الدین شیرازی ۱۵۵۹ء میں ہندوستان آیا۔ گجرات، دلی اور ساگر کی سیاحت کے بعد وہ بیجاپور چلا گیا۔ یہاں وہ اپنے چچازاد بھائی افضل خان کے ساتھ رہنے لگا۔ افضل خان شاہی مراعات کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ علی عادل شاہ نے اس کو خوان سالار کے عہدہ پر مامور کیا اور وہ اپنے آقا کے ساتھ تالی کوٹ کے میدان بھی گیا۔ بعدازاں ترقی کر کے خرانچی اور شاہ بُرج کے نگران کے عہدے تک پہنچا۔ عادل شاہ کے انتقال کے بعد افضل خان اور رفیع الدین دونوں گرفتار کر لئے گئے۔ یہ صرف قسمت کی یاوری تھی کہ رفیع رہا کر دیا گیا، اس کو ابراہیم عادل شاہ کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ اس کی سرپرستی میں جمعدار، مصاحب، محل کا نگراں اور بالآخر بیجاپور کا ناظم مقرر ہوا۔

اس کا کارنامہ دکن کی عام تاریخ ہے اگرچہ اس نے اپنی توجہ بیجاپور پر مرکوز کی۔ لیکن ہندوستان کے مغلوں اور ایران کے صفویوں کے متعلق بھی اس کتاب میں ذکر ہے۔ وجے نگر، گولکنڈہ، احمد نگر اور گجرات کے متعلق بھی تاریخی تحریریں اس میں مل جاتی ہیں۔ ملک عنبر کی زندگی کے کچھ حالات بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر نہ فرشتہ میں ملتا ہے نہ کسی دوسری عصری تاریخ میں۔ مجموعی حیثیت سے اس کارنامہ کی امتیازی خصوصیت سادہ دپُرزور تحریر ہے۔ اس میں نہ تو ثقیل الفاظ ہیں نہ مبالغہ آمیز بیانات، نہ استعارہ سے بوجھل زبان ہے اگرچہ اس کا موضوع سخن ایک وسیع عہد سے متعلق ہے لیکن کسی لحاظ سے تھکا دینے والا نہیں۔ بعد

میں آنے والوں مورخوں نے اس سے بہت فائدے حاصل کئے۔ چنانچہ فرزدنی استرآبادی نے بے شمار حوالے اس کتاب سے دیئے ہیں۔ بساط السلاطین کا کہنا ہے کہ یہ کتاب محمد عادل شاہ کو اس موقعہ پر نذر کی گئی جب وہ مصطفیٰ خان کے گھر گیا تھا۔ اس کتاب میں صرف ایک خرابی ہے کہ مصنف نے یوسف عادل شاہ کی اصلیت بیان میں کرنے میں قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔

فتوحات عادل شاہی

فتوحاتِ عادل شاہی۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ اس کتاب کے مصنف فزیونی استرآبادی کو دربار عادل شاہ جانا پڑا۔ ہوا یہ کہ وہ اپنے وطن استرآباد سے حج کرکے مکہ گیا لیکن راستہ کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے واپس اپنے گھر نہ جاسکا بلکہ ہندوستان چلا آیا۔ اثنائے سفر مالابار کے راہزنوں نے اسے لوٹ لیا۔ ناچار مصطفیٰ باد (دہبل) کی بندرگاہ پر خستہ حالی و کس پرسی کے عالم میں اتر پڑا ——— بندرگاہ ناظم نے مدد کی، اس کو بیجاپور پہنچا دیا۔ یہاں مصطفیٰ خاں نے اس کو عادل شاہ کی حضوری میں پیش کر دیا۔ یہ تصنیف اس نے اپنے سرپرست کی فرمائش پر قلم بند کی۔

فتوحات میں ابراہیم عادل شاہ کے عہدِ حکومت اور محمد عادل شاہ کی ابتدائی حکمرانی کا کافی ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح فزیونی وہ خلا پُر کرتا ہے جو فرشتہ اور خافی خان کے درمیان ملتا ہے۔ محمد عادل شاہ کی حکومت کے متعلق اس کے بیانات اس لئے قابلِ اعتماد ہیں کہ اس نے اپنی رائے مستند ذرائع پر قائم کی اور اس لئے بھی کہ غالباً سرکاری دستاویزات تک اس کی پہنچ تھی۔ اس نے مغل بادشاہوں کی دکنی جدوجہد کا تذکرہ بالتفصیل کیا ہے۔ شافعیہ میں ملک عنبر کے متعلق جو حالات ملتے ہیں ان میں فزیونی نے اضافہ بھی کیا ہے ان تعلقات پر بھی بحث ہے جو بیجاپور اور مغلوں کے درمیان ۱۶۴۱ء تک رہے۔ آخری واقعہ جس کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے وہ سلطان محمد کا ۱۶۴۴ء میں گیسو دراز کے مزار پر جانا ہے۔

بساطین السلاطین

بساطین السلاطین۔ یہ کتاب بیجاپور کی تاریخ کا مکمل خلاصہ ہے۔ بنیاد سے زوال تک کی روداد اس میں ملتی ہے۔ اس کے مصنف غلام مرتضیٰ نے ان اسناد کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جن سے اس نے استفادہ کیا۔ اس فہرست کی بعض کتابیں نایاب ہو گئی ہیں۔ دوسرے عصری مواد کی عدم موجودگی میں

تاریخ بیجاپور از سر نو مرتب کرنے کے لیے بساطین کی موجودگی زبردست سہارا ہے۔

تاریخ محمد قطب شاہی

اگر چہ کسی لحاظ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گولکنڈہ کے قطب شاہان، فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں بخیل تھے لیکن بدقسمتی سے ان کو غیر معمولی صلاحیت کا کوئی مورخ دستیاب نہ ہو سکا۔ سب سے قدیم نسخہ جو ہنوز باقی ہے اس کا نام ہے "تاریخ محمد قطب شاہی" یہ کسی گمنام مؤلف کا کارنامہ ہے جس میں ان کے مفصل بیانات کا خلاصہ کر دیا ہے۔ جو فرشتہ نے شاہ خرشان سے منسوب کر دیا ہے۔ مؤلف نے یہ کام محمد قطب شاہ کے حکم سے شروع کیا تھا۔ اس نے اس خاندان کی تاریخ ۱۶۱۶ء تک پیش کی ہے۔ حکمران وقت کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔ ابعد ازاں خافی خان کو باوجود کافی محنت و تلاش کے کوئی ایسی اطلاع نہ مل سکی جو تاریخ محمد قطب شاہی میں اضافہ بھی جاتی۔ اس لیے گیارہ سال کا افسوس ناک خلا اس خاندان کی تاریخ میں رہ جاتا ہے۔

حدیقۃ السلاطین

حدیقۃ السلاطین میں اگرچہ ۱۶۱۴ء سے تذکرہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے لیکن بجز عبداللہ قطب شاہ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کے کسی واقعہ کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ اس کا مصنف نظام الدین احمد بن عبداللہ شیرازی، وزیر اعظم شیخ محمد کا منظور نظر تھا۔ اسی کے حکم پر اس نے یہ کام شروع کیا، اس نے بھی ایسے درباری مورخوں کے طرز پر لکھا جو ہمیشہ بدی کو نیکی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس کا بیان مغلق اور پُر پیچ ہے۔ جیسے لفظ "مشعل اور ڈیوٹ" ایک ساتھ استعمال ہوا ہے۔ لیکن بہ حیثیت عصری تاریخی دستاویز کے حدیقہ بہت کارآمد ہے۔ ان روداد کا بھی بیان ہے جو مغل اور قطب شاہی درباروں میں سرانجام پاتی رہیں۔ اگرچہ ہر موقعہ پر مصنف عبداللہ کی بیچارگی و نرمی کا جواز پیش کرتا ہے، تاریخی واقعات کے علاوہ مصنف بعض بڑی دلچسپ باتیں لکھ جاتا ہے۔ مثلاً وہ بیان کرتا ہے کہ نمک کیسے تیار کیا جاتا تھا اور عبداللہ نے اس پر سے چنگی ہٹانے کے لیے کیا کیا، اس نے گولکنڈہ میں مینا بازار کے وجود کا بھی ذکر کیا ہے اس میں مغربی عورتیں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ حدیقہ ۱۶۴۰ء میں ختم ہوئی یعنی عبداللہ کی حکومت کے ۱۶ ویں سال میں۔

حدیقۃ العالم

حدیقۃ العالم۔ ابوالقاسم بن رضی الدین موسوی، عرف میر عالم کی تصنیف ایک جامع و مانع قطب شاہی خاندان کی تاریخ ہے۔ مصنف نظام علی آصفی کا وزیر اور معتمد ملازم تھا۔ وہ مشہور و معروف شوشتر خاندان کا ایک

فردستھا۔ اس نے آصفی سلطنت کے آغاز کی تشریح کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ یوں تو اس نے تاریخ محمد قطب شاہی، فرشتہ اور خافی خان کی تواریخ پر اپنے بیانات کی بنیاد رکھی ہے۔ لیکن وہ اپنی تنقیدی ذکاوت سے مختلف فیہ، بیانات میں معقول دلائل بھی پیش کرتا ہے۔ مگر بہت کم وہ نئی معلومات پیش کرتا ہے۔ چنانچہ محمد قطب شاہ کی حکومت کا بیان بھی اتنا ہی نامکمل ہے جتنا ان مورخوں کے بیان جن سے اس نے کتاب لکھنے میں مدد حاصل کی، وہ اپنی کتاب کا خاتمہ اورنگ زیب کی اس حکومت پر اعتراض کے ساتھ کرتا ہے۔ جو گول کنڈہ سے متعلق ہے، مصنف کے نزدیک مغل سلطنت کو اس تسخیر سے بہت کم فائدہ ہوا بلکہ برخلاف اس کے کمزوری کا سبب بن گئی کیونکہ اسی اقدام نے مرہٹہ سلطنت کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا۔

تواریخ ایران؛ تاریخ جدید

تاریخ جدید —— اس کا مصنف مرزا طاہر وحید، وزیر اعظم مرزا تقی الدین محمد، کا آوردہ تھا۔ شاہ عباس ثانی کی حکومت میں وہ مجلس نویس، کے عہدہ پر مامور تھا۔ ۱۶۸۹ء میں وزیر ہوگیا۔ اسی عہدہ پر اٹھارہ سال تک کام کرتا رہا۔

ولی قلی شاملو، طاہر وحید کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے اسلوب بیان کا پہلا استاد تھا۔ خود مصنف کا کہنا ہے کہ تاریخ جدید شاہ عباس ثانی کی فرمائش پر لکھی گئی، اس لئے یہ کتاب اس کے عہد کی سرکاری دستاویز ہے۔ تحریر کا سلسلہ ۱۶۵۶ء کی ابتدا تک جاتا ہے۔ آخری واقعہ جو اس کتاب میں بیان ہوا ہے اس زلزلے کا ذکر ہے جو اس وقت قزوین میں رونما ہوا۔

ایران کی عصری تاریخ کے لحاظ سے یہ کارنامہ بالکل قابلِ اعتماد ہے کیونکہ ان سے واقعات کے ہجوم میں جو مصنف نے بیان کئے ہیں زیادہ تر ایسے ہیں جن کا یا تو اس نے خود مشاہدہ کیا ہے یا تحریر کی بنیاد ان اطلاعات پر ہے جو دربار میں پیش ہوتیں۔ اس کے بعد کے جملہ مورخین نے ایران کی تاریخ لکھتے وقت اس کتاب سے استفادہ کیا۔ دو خاص عیب اس کتاب میں ہیں۔ ایک تو وہ عام عیب ہے جو اس نمونہ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے یعنی حکمران وقت کی جانب داری اور دوسرا عیب سال وماہ لکھنے کی کمی ہے۔ جس سے بیان کردہ واقعات غیر متعین ہو جاتے ہیں۔

چغتائی یا ہندوستانی مغلوں کی طرف مصنف کی توجہ قندہار کے معاملات سے شروع ہوتی ہے ان واقعات کے اندراج میں مصنف بڑی جانب داری سے کام لیتا ہے۔ علاوہ بریں اکثر وہ اس سلوک کا ذکر کرتا ہے جو شاہ نے نام نہاد شاہزادہ بلاقی اور اس کے چچازاد بھائی باسنقر کے ساتھ کیا تھا۔ یہ دونوں ہندوستان سے بھاگ کر وہاں پناہ گزین تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلاقی، شاہ ایران کو بہت عزیز تھا۔ کیونکہ وہ اکثر اس کو محفل جام و مینا میں شرکت کے لیے قزوین سے بلاتا تھا۔

قصاص الخاقانی

قصاص الخاقانی —— یہ تصنیف صفوی خاندان کی تاریخ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن اس میں شاہ صفی اور شاہ عباس ثانی کے دورِ حکومت کا بیان ہے۔ اس کا نام قصاص الخاقانی اس لیے پڑا کہ اس میں حضرت صاحبقراں شاہ عباس ثانی کے جنگی کارناموں کا ذکر ہے۔ یہ ان چند عصری دستاویزات میں سے ہے جو شاہ عباس ثانی کے دورِ حکومت کا مکمل بیان پیش کرتی ہے۔ کتاب کا وہ حصہ جو ہندوستان سے متعلق ہے اس کے لیے مصنف یعنی ولی قلی شاملو، مرزا طاہر وحید کا ممنون معلوم ہوتا ہے۔ جس کے اقتباسات اس نے آزادی سے پیش کیے ہیں۔ لیکن واقعات کو حتی الامکان مکمل بنانے کے لیے وہ اپنے ذاتی معلومات سے بھی کام لیتا ہے۔

جانب داری کی جڑیں اس کے دماغ میں بُری طرح پیوست تھیں، اس امر واقعہ کو وہ چھپاتا بھی نہیں اور اسی نظریے کے تحت وہ ان واقعات پر ملمع کر دیتا ہے جن سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ اس کے سرپرست پر کوئی آنچ جائے گی۔ بلکہ کبھی کبھی ایسے واقعات ضبط تحریر میں لاتا ہی نہیں۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے وہ موقع بے موقع خطابت و شاعری رنگینی سے کام لیتا ہے۔ قندہار کے واقعاتی بیان کے سلسلہ میں مصنف صاف صاف تسلیم کرتا ہے کہ وہ ہندوستانی مورخوں کی مبالغہ پسندی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ قصص لکھنے میں غالباً لطائف الاخبار نے اس کو قلم اٹھانے کا جذبہ دیا۔ شاہجہاں کی علالت کے بعد ہندوستان کے وہ واقعات بھی اس نے قلم بند کیے جو اس کے سننے میں آئے لیکن مرادسے اس کی جانب داری واضح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہزادے نے شاہ عباس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس نے اپنے شیعہ ہونے کا بھی اقرار کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کو مصنف نے ایک بے ایمان سیاست داں کی صورت میں پیش کیا ہے کیونکہ اورنگ زیب نے

مراد کو راہ راست سے منحرف کر دیا تھا۔ اور اس لئے سمی کہ سا موگڑھ کی جنگ کے بعد بقول مصنف مراد آگرہ کا محاصرہ کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ اس نے اپنے بھائی کو رائے دی تھی کہ ہم دونوں باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کی معافی مانگ لیں۔ ولی قلی خاں کی رائے میں اورنگ زیب کی دو عملی پالیسی میں اس کے حامل میر شیخ کا ہاتھ تھا۔

خلد بریں

خلد بریں —— یہ ایک مکمل تاریخ ہے صفوی خاندان کی۔ اس کا مصنف طاہر وحید کا چھوٹا بھائی ہے۔ اُس کا نام لئے نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ گم ہے اور اسی میں شاہ عباس اول اور اس کے پیش رو حکمرانوں کا کارنامہ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ شاہ صفی کی حکومت کا آخری دور تھا جب بہ حیثیت منشی مال گذاری کے محکمہ میں وہ ملازم ہوا۔ بعد ازاں جب محکمہ توپخانہ علیحدہ صورت میں قائم ہوا تو وہ اس کا وزیر بنا دیا گیا۔ اس نے یہ کتاب ۱۰۷۱ء میں مکمل کی۔

وہ ایسے اعلیٰ مرتبہ پر مامور تھا جس نے اس کو بہترین موقع دیا ہوگا کہ اپنی معلومات کے لئے اصل ذرائع سے فائدہ اٹھا سکے بلکہ پیش کردہ واقعات کا مشاہدہ بذات خود کر سکے۔ لیکن اس عہد کے دوسرے مصنفوں کی طرح غیر جانب داری کی نعمت سے وہ بھی محروم تھا۔ غالبًا اس زمانے میں یہ خصوصیت قابلِ قدر نہ سمجھی جاتی تھی۔ شاہ صفی کے مفصل حالات کے سلسلہ میں غالبًا یہ واحد عصری تاریخ ہے جو اس وقت مرتب ہوئی جب خون ریزی پر کوئی پشیمان نہ ہوتا تھا، قتل کرنا زمانہ کا عام دستور ہو گیا تھا۔ چنانچہ رائج الوقت بھیانک المیہ پر بجائے خوف و ہراس کے اظہار کرنے کے مصنف اس کو جواز عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ ترکوں کی لڑائیوں کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کی جانب داری قریب قریب مجرمانہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایرانیوں کی شکست بھی وہ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ان پر فتح کا گمان ہونے لگتا ہے۔ شاہ عباس ثانی کے سلسلہ میں مصنف کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ وہ تاریخ کو ۱۶۶۰ء تک لایا ہے۔

خلد بریں میں ہم کو طاہر وحید کے یہاں سے زیادہ تفصیلی اطلاعات ملتی ہیں۔ مثلاً اُن شکوک کے وجوہات مصنف پوری طرح بیان کرتا ہے جو علی مردان خان کو شاہ صفی کے متعلق تھے۔ اور پوری تفصیل سے اس ترغیب کا بھی ذکر کرتا ہے جو شاہ صفی نے قندھار کے ناظم کو ہموار

کرنے کے لیے دی گئی تھی تاکہ وہی خونیں انجام اس کا بھی ہو جو اور بہت سے افسروں کا ہوا ہے۔ پھر مصنف بلاقی کی اس دعوت کا بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے جو دربار ایران میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اس پناہ گزین کی صحیح شناخت پر شک کرتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی جنگ وراثت کا بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اورنگ زیب کی عیاری پر زور دیتا ہے اور مراد کے ایلچی کا ایرانی دربار میں آنا بھی بیان کرتا ہے۔ اس تیاری کا بھی مذکور ہے جو شاہ نے اس کی اور بعد دارا کی امداد کے لیے کی تھی۔ دوسری غیر معروف مگر دلچسپ حقیقت جس کا ذکر آیا ہے وہ بلاقی کی مجوزہ اسکیم، ہندوستان کے تخت حاصل کرنے کی ہے وہ قزوین سے اصفہان اس لئے آیا کہ شاہ سے امداد کی درخواست کرے لیکن جب اس نے دارا کی قید کا واقعہ سنا تو خاموشی سے اپنی قیام گاہ واپس چلا گیا۔ باوجود سنگین معائب کے خلد بریں تاریخ ایران اور بالخصوص شاہ صفی اور عباس ثانی کے دور کے مطالعہ کے لئے بڑی کارآمد سند ہے۔ ابھی تک یہ مطالعہ موجودہ اہلِ قلم کی توجہ سے بہت کم سیراب ہوا ہے۔ اگرچہ تاریخ وار اندراج بعض مقامات پر بڑا مبہم ہے پھر بھی بہت کارآمد ہے کیونکہ طاہر وحید کی تصنیف سے مل کر یہ شک وشبہہ دور جاتا ہے بلکہ بیانات قطعی اور واضح ہو جاتے ہیں۔

زبدۃ التواریخ یہ ایک ایسی عام تاریخ ہے جو حضرت نوح کے زمانے سے شروع ہو کر شاہ عباس ثانی کے عہد تک پہنچتی ہے۔ جو جسے برٹش میوزیم کے مجموعہ نمبر ۲۰۶۰ میں محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی ایسا عام اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے اس کتاب کی افادیت یا نقص کا اندازہ ہو سکے۔ اس کا مؤلف کمال خان بن جلال اپنے کو ایرانی دربار کا خانہ زاد کہتا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے سپہ سالار رستم خان کے ساتھ جارجیہ کی مہم (۱۶۳۱-۳۲) میں گیا تھا۔ اس کے بعد جب قندھار میں بھیجے گئے افسروں نے ایک جوتشی کی خدمات کا مطالبہ کیا (۱۶۴۸-۴۹ء) تو بادشاہ کی نظر انتخاب مصنف ہی پر پڑی، اس طرح وہ دربار سے پوری طرح قریب ہوتا گیا۔ چنانچہ عصری واقعات کا علم اسے ذاتی طور پر ہوتا رہا۔ اس کی کتاب میں صفی کے عہد حکومت کے عام نظم ونسق کا بیان صفائی اور سادگی سے ادا ہوا ہے۔ لیکن قندھار کے محاصرہ کا ذکر بہت مختصر ہے۔ دربار ایران میں بلاقی کی آمد واستقبال کا ذکر بھی اس نے کیا ہے۔

روزنامچے اور عصری مراسلات چار کتابیں جن کو ڈائری کہا جا سکتا ہے۔ قابل

ذکر ہیں۔ (۱) صبح صادق مصنفہ صادق بن محمد صالح میں اُن فقرا، علما، شعرا اور فلسفیوں کا ذکر ہے جن سے مصنف کی ملاقات گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال، بہار۔ اور دکن کے دوران قیام میں ہوئیں۔

(۲) طبقات شاہ جہانی مصنفہ صادق خان یہ ایک قسم کی بیاض ہے کیونکہ اس میں تیمور کے زمانے سے شاہجہاں کے ابتدائی عہد حکومت تک کے شعرا اور فلسفیوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ آخری حصہ میں مصنف نے اپنے ذاتی علم سے بہت واضح طور پر اپنے زمانے کے ان مشاہیر کا ذکر کیا ہے جن سے اس کو ملنے کا اتفاق ہوا۔ طبقات کے منتشر اندراجات سے ہندوستان کی ۱۷ ویں صدی کے طریق تعلیم سے ہم کو واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) عرضداشت یہ کارنامہ مجموعہ ہے ان خطوط کا جو سید خان جہاں نے دربار کو لکھے۔ اس کے آخر میں تین مختصر خاکے شیخ جلال الدین حصاری نے شامل کر دیئے ہیں۔ آخر الذکر سید کا اخبار نویس تھا۔ ان میں سے ایک خاکہ گوالیار کی ایک ایسی تاریخ ہے جو ایک ہندی کتاب کی بنیاد پر ہے۔ یہ کتاب ایک برہمن مسمّٰی شیام کے قبضے میں پائی گئی۔ شیام کے بزرگ اس جگہ کے پرانے باشندے تھے۔ دوسرا خاکہ جھجار سنگھ کی بغاوت کا ہے جس کے فرو کرنے میں خان جہاں نے نمایاں حصہ لیا۔ شیخ جلال بندیلوں کی ابتدا بیان کرنے میں خیال آرائی سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ان کے آباو اجداد بوندی سے ترک وطن کر کے آتے تھے۔ اس خاندان نے جو بستی بسائی وہ اپنے پرانے وطن کے نام پر تھی۔ تیسرا خاکہ سید خان جہاں کے نورپور کی مہم کا بیان ہے۔ شیخ جلال کے ایک شاگرد بال کرشن نے جو خطوط فراہم کئے وہ بیر سنگھ دیو کے خاندان کے زوال سے متعلق ہیں۔ بعض اہم اطلاعات فراہم کرتے ہیں جن کا تعلق چمپت رائے کی تگ و دو سے ہے۔

(۴) لطائف الاخبار، مصنفہ بدیع الزماں رشید خان شہزادہ داراشکوہ کی قندھار کی مہم کا یہ ایک جریدہ ہے۔ دیباچہ میں مصنف ایک مختصر بیان اورنگ زیب کی دو سابقہ مہمات رقم کرتا ہے۔ یہ تحریر قندھار کے روزمرہ واقعات کا سیدھا سادا بیان ہے۔ مصنف نے اپنے دوستوں کے لئے یہ حالات قلم بند کئے تھے، کسی سرپرست کو خوش کرنے کے خیال سے نہیں۔ اسی لئے وہ

صاف گو اور قابلِ استاد ہے۔ بدیع الزماں کو دارا کا طرفدار سمجھنا غلط ہے بلکہ برخلاف اس کے وہ آزادی سے اس کی ضعیف الاعتقادی توہم پرستی کا ذکر کرتا ہے کیونکہ دارا نے زرِ کثیر صرف کرکے ایسے فقراسے دعا کرنے کی درخواست کی جو زیادہ تر فریبی و عیار تھے۔ بدیع الزماں کے نزدیک دارا کی شکست کی ایک خاص وجہ یہ کہ اس نے اپنے میر آتش جعفر خان پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرلیا۔ اور خود معروف کار نہیں رہا۔ اس رویّے نے تجربہ کار افسروں مثلاً جے سنگھ اور قلیچ خان کو شہزادہ سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے علاوہ مصنف ان شاہی افسروں کی اس شیخی بازی کا بھی ذکر کرتا ہے جو قندہار کی جنگ سے پہلے وہ کیا کرتے تھے۔ دارا کے نابالغ لڑکے سلیمان شکوہ نے قندہار کا فرضی قلعہ بنایا اس کا محاصرہ بھی کیا اور فتح بھی کرلیا۔ جعفر خان نے کہا کہ صاحبزادے کی نظر قندہار فتح کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن چترسال نے طنزیہ جواب دیا" اگر تم کوتاہ ہو جاؤ اور اس کی طرح پرواز کی کوشش کرو تو اندیشہ یہ ہے کہ قبل اس کے قلعہ پر نظر ڈالو تم کو مار کر گرادیا جائے"۔

عصری مراسلات کے حسب ذیل ۸ مجموعے بڑی کارآمد کتاب بن جاتے ہیں۔ اس وقت کی تاریخ پر قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے۔

۱- عنایت نامہ - مصنفہ عنایت خان راسخ ولد شمس الدین لطف اللہ خان جس نے یہ مجموعہ ۴۹ سال کے سن میں مرتب کیا۔ وہ شاکر خان کا بھائی تھا۔ شاکر خان محمد شاہ اور اس کے جانشینوں کی تاریخ کا مصنف ہے۔

۲- جامع الانشاء

۳- جامع المراسلات فی الالباب

۴- مراسلا قطب شاہی :- خطوط نظام الملک حاجی عبداللہ بجانب عبداللہ قطب شاہ و ابوالحسن بنام شاہ جہاں و اورنگ زیب شجاع اور عادل شاہ بیجاپوری۔

۵- منشآت طاہر وحید۔

۶- بہارِ سخن :- اس کے مصنف محمد صالح کمبوہ نے ان خطوط کو جمع کرنا شروع کیا جو شاہ جہاں نے اورنگ زیب اور حکمران ایران و ماوراء النہر کو لکھے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خطوط بھی ہیں جو دربار کے

دوسرے افسروں نے لکھے۔ یہ سلسلہ مولانا ابوالبرکات منیر کے انتقال کی وجہ سے منقطع ہو گیا کیونکہ انھوں اس مجموعہ کا دیباچہ لکھنے کہا تھا۔ اس کام کو مکمل کرنے کے بعد محمد صالح نے نظر ثانی کے لیے مولانا ابوالفتح ملتانی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کتاب میں چار چمن ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے زیادہ اہم اورنگ زیب کا وہ خط ہے جو اس نے عبدالعزیز خان ماوراالنہری کو لکھا تھا۔ اس میں اس نے اپنی فتح کی خبر آخرالذکر کو دی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دارا کے قتل کو جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک دارا ملحد تھا۔ دوسرا چمن ذاتی خطوط پر مشتمل ہے، تیسرے میں مصنف کی وہ تصنیف ہے جس میں شاہ جہاں آباد (دہلی) لاہور، اکبر آباد (آگرہ) کشمیر اور درباری تقریبات قلعہ آگرہ کی آرائش۔ شاہ جہاں کے سیم و زر میں تولے جانے کی رسم قلم بند کی گئی ہے۔ چوتھا چمن ان مختلف خطوط کا مجموعہ ہے جو سرکاری عہدہ داروں کو لکھے گئے تھے۔

۷۔ **چار چمن۔** یہ کارنامہ منشی الزماں چندر بھان کا ہے جس کا ذکر ۱۰ ویں باب میں آیا ہے۔

۸۔ **آداب عالمگیری** یہ مجموعہ ہے ان خطوط کا جو قابل خان نے اورنگ زیب کی طرف سے لکھے تھے۔ ان خطوط سے شہزادے کے کردار کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے حوصلے اور جذبات کا صحیح انکشاف ہوتا ہے۔ ہوتا ہے۔

جب اورنگ زیب دکن میں نائب سلطان تھا تو اپنے باپ کو برابر خط لکھا کرتا تھا اور ہر خط میں درازیٔ عمر اور خوشحالی کی دعا کرتا تھا۔ خدا نے درازی عمر سے تو شاہجہاں کو سرفراز کیا لیکن اس کی خوشحالی اس کی معزولی کے بعد ختم ہو گئی۔ ان مراسلات سے ایک دلچسپ بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاہجہاں کو دکنی آموں سے بڑی رغبت تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب کو لکھا کرتا تھا کہ آم بھیجنے کی ایک مسلسل رسد قائم رکھی جائے۔

مغربی سیاح ۱۷ ویں صدی کے نصف اول میں کافی بڑی تعداد میں مغربی سیاح ہندوستان آتے اور اس ملک میں جو کچھ ان کے علم و مشاہدہ میں آیا قلم بند کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے بیانات پر اس بات کا اثر ہے کہ وہ اپنے قارئین کی قیاس

آرائی کو آسودہ کرنے کی فکر میں رہتے۔ علاوہ بریں ان میں سے اکثر سیاحوں کو اپنی قومی برتری کا وہم تھا اس لیئے وہ اس قابل نہ تھے کہ جن اداروں کا ذکر کرتے ان کا مناسب جائزہ لے سکتے۔ ہندوستانیوں کے لیئے 'وحشی' کا عام لقب ان کی زبان زد تھا۔ یہی ایک بات ان کے زبان زد تھی۔ یہی ایک بات ان کی تنگ خیالی کی واضح دلیل ہے۔ ان سیاحوں میں بعض نیم تعلیم یافتہ اور نااہل تھے۔ وہ نہ صحیح زاویہ نظر سے کام لے سکتے تھے نہ اپنے بیانات صحیح طور سے قلمبند کر سکتے تھے، نہ اختصار سے کام لے سکتے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کو مستند سیاسی اطلاعات کی آگاہی نہ تھی اس لیئے انھوں نے افواہ اور بازاری خبروں کا قلمبند کرنا کافی سمجھا۔ ان میں سے جو سیاح اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور بلند خاندانوں سے وابستہ تھے ان میں ایک دوسرے قسم کا سخت عیب نظر آتا ہے۔ یہ لوگ مغل حکومت اور ہندوستانی اداروں کو ان مثالی نظام سلطنت کی کسوٹی پر پرکھتے جو ان کے ذہن میں پہلے سے تھی۔ اور جب نتیجہ ان کی امیدوں سے کم نظر آتا تو معائب کو زیادہ اہمیت دیتے اور محاسن کو نظر انداز کر دیتے۔ ان باتوں نے میرے ذہن کو میرے ذہن کو مشکوک کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان سیاحوں کا بیان صداقت سے دور ہے۔ اس لیئے عہدِ متوسط کے سیاسی یا سماجی اداروں پر ان کی تنقید میرے لیئے قابلِ قبول نہیں۔ علاوہ بریں دورِ متوسط کے اداروں کا موجودہ اداروں سے مقابلہ کرنا اور یہ نتیجہ نکالنا کہ آخر الذکر ادارے اوّل الذکر سے برتر ہیں۔ حالانکہ یہ رویّہ عہدِ حاضر کے اُن بہت سے اہلِ قلم کا ہے جو مغربی سیاحوں کے اشاروں کنایوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ نہ صرف غلط ہے بلکہ اصول ارتقاء کے اعتقاد میں ضعف کا بھی ثبوت ہے۔

قبل اس کے کہ فرداً فرداً سیاح کے ان کارناموں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شائع شدہ دستاویزات کا ذکر کر دیا جائے جو اطلاعات کا مخزن ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات کو مرتب کرکے ولیم فاسٹر نے ہندوستان کی تاریخ نویسی کی بڑی خدمت کی ہے۔ دو سلسلے مطبوعات ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات (۱۶۰۲-۱۷) اور "ہندوستان میں انگریزی کارخانے" (۱۶۱۸ء-۵۶) علاوہ ہندوستان میں انگریزی تجارت کی نشوونما پر روشنی ڈالنے کے اکثر اپنے زمانے کے سیاسی واقعات کی بھی کارآمد اطلاعات پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سورت کے کارخانے کے نگراں نے جو روزمرہ کے خطوط انگلستان بھیجے بڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن ان کے مندرجات

کو احتیاط سے قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ بعض اوقات گپ اور افواہ کو بھی ان میں جگہ دی گئی ہے۔ گو اس کے پس پشت شر انگیز ارادہ نہیں معلوم ہوتا۔

سَر ٹامس رو

دربار جہانگیر میں ابتدائی سیاحوں کی فہرست میں سر ٹامس رو کا نام بہت نمایاں ہے۔ اپنی ڈائری میں وہ شہزادے خرم کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے کردار، شکل و شباہت کی مرقع کشی کرتا ہے۔ چونکہ گجرات شہزادہ خرم کی جاگیر تھا اس لئے قدرتی طور پر سر ٹامس رو کو اس سے رابطہ قائم کرنے کا بہت موقع ملا۔ لیکن یہ انگریزی سفیر ہر موقع و محل پر اپنی من مانی بات پوری نہ کر سکتا، اس لئے کہ وہ ترش رو بھی ہو جاتا اور مغل حکومت کی نامناسب تصویر پیش کرتا ہے۔ بایں ہمہ مغل دربار کی آئینہ بندی کا بیان بہت دلچسپ ہے۔

پلسارٹ

فرانسس پلسارٹ دسمبر ۱۶۲۰ء میں ہندوستان بحیثیت گماشتہ ڈچ فیکٹری آیا۔ دوران قیام وہ زیادہ تر آگرہ میں رہا۔ یہاں سے وہ ۱۶۲۷ء کے اواخر میں ہالینڈ واپس گیا۔ اس کی کتاب "ری مانسٹران ٹی" اس کے سات سالہ تجربات کا دفتر ہے۔ اس نے آگرہ، لاہور، کشمیر، برہان پور کا ذکر کیا ہے شاید ان شہروں میں خود گیا تھا۔ وہ خسرو کے قتل کا ذمہ دار شہزادہ خرم کو ٹھہراتا ہے۔ نور جہاں کی بالادستی کی سخت مذمت کرتا ہے۔ ضلع کی عدالتوں اور گاؤکشی بند کرنے کے بیانات بھی دلچسپ ہیں۔ سرکاری طور پر اس گاؤکشی کی بندش کو وہ گورنمنٹ کے اس احترام سے منسوب کرتا ہے جو ہندوؤں کے جذبات سے وابستہ تھا اور اس میں یہ اقتصادی پہلو بھی تھا کہ بیلوں سے یہاں وہ ہر کام لیا جاتا ہے جو ہالینڈ میں گھوڑوں سے لیا جاتا ہے۔

ڈی لائیٹ

سچ پوچھیے تو ڈی لائیٹ یورپ سے آنے والے سیاحوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ ہندوستان کبھی نہیں آیا اس کا کام صرف کاغذات کا مرتب کر دینا تھا۔ اس کے اس کام کا ترجمہ Banerji اور Hoyland نے کیا ہے۔ اس کے آخر میں شہزادہ شاہ جہاں کی بغاوت، جہانگیر کی موت اور شاہ جہاں کی تخت نشینی کا بیان اچھا ہوا ہے۔

---

(1) Pelsaert

(2) Remonstrantie.

(3) De laet.

پیسٹرو ڈیلاویل

اٹلی کا ایک اچھا تعلیم یافتہ باشندہ تھا۔ یہ ۱۰ر فروری ۱۶۲۳ء میں شہر سورت آیا۔ اپنے چار سالہ قیام میں اس نے دکن کے خاص خاص شہروں کی سیر کی۔ اس نے دیانت داری سے وہ واقعات رقم کئے جو اس کے دیکھنے میں آئے۔ اس نے صدق دل سے ایمان دار رہنے کی کوشش کی۔ اس کا تاریخی بیان بڑی حد تک صحیح ہے البتہ بابر کی مہمات کا بیان خیالی ہے۔ بابر کا نام اس نے نہیں لیا۔ یہی حال خرم کی بغاوت کے اسباب کا ہے۔ اس بیان میں بھی اس نے قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ علاوہ بریں اس کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ قطب شاہ نے باغی شہزادے کی مدد اس لئے نہیں کی کہ اس پر جہانگیر کا خوف طاری تھا۔ خرم سے آصف خان کی جانب داری کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ پلسارٹ کی طرح وہ بھی خسرو کے قتل کا ذمہ دار خرم کو قرار دیتا ہے۔ مغل حکومت میں آزادیٔ خیال کا بھی ذکر اس نے کیا ہے اور ہندوؤں کے جذبات کے احترام میں کا بے کی گاؤکشی بند کرنے کا بھی بیان ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے دور کے انتظامات کا ذکر زیادہ نہیں کیا لیکن ان شہروں اور قصبات کے چشم دید بیانات بہت واضح ہیں۔

سرٹامس ہربرٹ

مغلیہ سلطنت کی تاریخ نویسی کا حق سرٹامس ہربرٹ کو صرف اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ ایک قلیل وقفہ کے لئے سرزمین ہند پر وہ قیام پذیر تھا۔ وہ اپنی تاریخی تحریر کی ابتدا عہد تیمور سے کرتا ہے۔ تیمور کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ سلطان بایزید کے قید خانہ کا داروغہ تھا۔ بیانات کا سلسلہ شاہجہاں کی تخت نشینی تک چلتا ہے۔ اکبر و جہانگیر کی حکومت کا بیان کتاب کے بہت بڑے حصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی اہم واقعہ نظر انداز نہیں ہوا لیکن مصنف نہ تو تاریخی سلسلہ کا خیال کرتا ہے نہ واقعات کی علت و معلول کا۔ ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات وہ زبردست جغرافیائی غلطی کا مرتکب نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں غلطیوں کو چھپانے کے لئے وہ اپنے طرز بیان کی دلکشی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھی خسرو کے قتل کا مجرم شہزادہ خرم کو قرار دیتا ہے اور باپ سے بغاوت کرنے کے سلسلے میں شاہ جہاں پر غلط الزامات کا اضافہ کرتا ہے۔ اس نے بہت صحیح عبداللہ خان فیروز جنگ کو ہندوستان کا بادشاہ لکھا ہے۔ لیکن بنگال میں شاہ جہاں کی کارگزاری کا بیان بہت الجھا ہوا ہے۔

---

(1) Pietrodellavalle.

مینڈلسلو

جان البرٹ وان مینڈلسلو ایک نوجوان جرمن تھا جو اپنے دوستوں سے الگ ہو کر اپریل ۱۶۳۸ء میں سورت آیا۔ اس کے دوست ڈیوک آف ہوسٹین سفیر برائے ایران تھے۔ سال کے اواخر میں اس نے شمالی ملک کا دورہ شروع کیا۔ احمد آباد، کیمبے، آگرہ، اور لاہور کی سیر کی۔ اس نے جنوری ۱۶۳۹ء میں سورت کو خیرباد کہا۔ اپنے سفر کی ابتدا سے بارہ مہینے کے اندر ڈوور واپس گیا۔ اَیریئس نے مینڈلسلو کے سارے اندراجات ۱۶۵۸ء میں شائع کئے۔ چار سال بعد اس کا فرانسیسی ترجمہ ابراہم ڈی وکفوٹ نے شائع کیا۔ ولیم فارسٹر کی رائے میں آخر الذکر نے اصل مسودہ میں کافی رد و بدل کیا۔ اسی مسخ شدہ نسخے کا ترجمہ جان ڈیئے وس نے انگریزی میں کیا۔ اس سے بہتر اور زیادہ صحیح نسخہ کی عدم موجودگی میں مجبوراً اسی انگریزی ترجمہ کو غنیمت سمجھ کر میں نے مطالعہ کیا۔

مینڈلسلو نے مغلیہ نظم و نسق کا تفصیلی بیان سپرد قلم کیا ہے اس کے بعض بیانات قیاس آرائی کے نتیجے ہیں اور بعض میں حقیقت کی جھلک ہے۔ اس نے شہر آگرہ اور قلعہ کا ذکر کیا ہے۔ جشن نوروز اور تولے جانے کی رسم کے بھی حوالے دیئے ہیں۔ تعزیہ کی ابتدا اس نے غلط بیان کی ہے۔ (امام حسن اور امام حسین کی قبروں کی نقلی صورت۔ امام حسین کی شہادت کربلا کی لڑائی میں ہوئی) اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ جلوس نکلنے پر کسی ہندو کو گلی کوچے میں آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ اس کے آگے لکھتا ہے کہ شاہ جہاں نے بلاقی سے تخت چھین لیا تھا۔ بلاقی کو مینڈلسلو نے قزوین میں دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی اپنے بیان میں کہا ہے کہ شاہ جہاں کو برہنہ رقص بہت پسند تھا۔

پیٹر منڈی

پیٹر منڈی ۱۶۲۸ء میں سورت پہنچا اور ۱۶۳۰ء میں آگرہ فیکٹری میں ملازم ہوا۔ ہندوستان کے ہشت سالہ قیام میں اس نے مالوہ، موجودہ اتر پردیش اور بہار کے متعدد شہر دیکھے۔ اس کے بیان میں ایسے حوالے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے صحیح نظریہ سے ہندوستان کے بعض ایسے خاص سماجی اور ایسے عجیب و غریب ہندو سماجی و مذہبی مراسم دیکھنے کی کوشش کی جو دوسرے سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکے۔

---

(1) Mandelslo.
(2) Dover.
(3) Olearius.
(4) John Davis.

منجملہ عام دلچسپ موضوعات کے جو اس کے بیان میں آئے ہیں ان میں حسب ذیل کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ گوالیار محل، فاصلہ کی پیمائش کا طریقہ ہندوستانی حجاموں کی مالش میں ہنرمندی، پان، بہنگی، بھاری چیزیں اٹھا کر لے جانے کے واسطے لمبا بانس اور اسی سے ملتی جلتی دوسری باتیں۔ آگرہ، اس کے بازار اور مکانات کا بیان واضح اور دلچسپ ہے۔

اس نے بادشاہ اور دربار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ہاتھیوں کی لڑائی چیتا کا شکار، جنگلی ہاتھیوں کا پکڑنا، بقر عید میں بادشاہ کا جلوس، دارا اور شجاع کی شادیاں نوروز اور مینا بازار سب کا بیان اس کے یہاں ملتا ہے۔ وہ فتح پور سیکری کا تقابل مغربی شہروں سے عمارت کی مناسبت کے لحاظ سے کرتا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ مغلیہ بادشاہ بجز دریائے گنگا کے پانی کے اور کہیں کا پانی نہ پیتے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ شاہی دربار میں برہمن اور مسلمان جوتشی جمع ہیں کیونکہ بادشاہ کی توہم پرستی شگون نیک و بد سے ہمکنار تھی۔

عصری سیاسی واقعات میں بلخ میں نذر بی بانسنر کا تعہ شاہجہاں کے حکم سے بنارس کے مندروں کا گرانا، آصف خان اور مہابت خان کا معزز مرتبہ عبداللہ خان فیروز جنگ کی ہوس ناکی اور ظلم پرستی، شاہ جہاں کی دکنی مہمات، مہابت خان کا تقرر، دولت آباد فتح کرنے کے لئے ان سب کا بیان مصنف کے یہاں ملتا ہے۔ مصنف پھر ایسے واقعات بھی بیان کرتا ہے جو شاہجہاں کی تخت نشینی سے پہلے ہوتے تھے مثلاً خسرو کا قتل، نورجہاں کا اپنے داماد کے لئے تخت و تاج حاصل کرنے کی کوشش اور اس کے محرکات میں آصف خان کی خلل اندازی لیکن سلیم شاہ اور شیر شاہ کی حکومت کے بیانات مایوس کن ہیں۔ اس کا یہ بیان بھی مہمل ہے کہ نورجہاں شاہجہاں کی ماں تھی۔ اس طرح اس کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ جہانگیر نے اپنا جانشین بلاقی کو بنایا تھا۔ یہ قیاس آرائی بازاری خبروں کا نتیجہ ہے۔ مغل طرز حکومت پر اس کا بیان غلط بحث کا نمونہ ہے لیکن ۱۶۳۰ء کے قحط کی تصویر کشی اور لوگوں کی پریشانی کا ذکر بہت پُر اثر ہے۔

مانریکو

اُپُرٹو کا ایک پرتگالی باشندہ مانریکو ۱۶۲۹ء میں بنگال مشن سے وابستہ ہوا۔ بعد میں چھ سال وہ ارکان میں رہا۔ اس نے تین سال

---

(1) Manrique .

(2) Oporto .

(۱۶۳۷-۴۰ء) فلپائن و چین کی طولانی سیاحت میں صرف کئے۔ ۴۱-۱۶۴۰ء میں یورپ جاتے ہوئے شمالی ہندوستان پہنچ کر اس نے ڈھاکہ سے قندھار کا سفر کیا۔ ۱۶۴۳ء میں وہ روم پہنچا اور اپنی تصنیف آئی نے ٹی رے ریو (Itinerario) ۱۶۴۹ء میں شائع کی۔ ۱۶۶۹ء میں وہ قتل ہوا۔

اس کی تصنیف کا بڑا حصہ ارکان سے متعلق ہے۔ صحت کے ساتھ عصری معاشی زندگی کی تصویر کشی نے اس کے بیان کو بے حد قیمتی بنا دیا ہے، باوجود ایک مشنری اور رومن کیتھولک ہونے کے وہ بے لوث ہو کر مشرقی تہذیب کے اچھے عناصر کی تعریف کرتا ہے۔ دوسرے متعدد عصری سیاحوں کی طرح وہ مغربی تعصب کا ثبوت نہیں دیتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ہماری معلومات میں زیادہ اضافہ نہیں کرتا لیکن اس کے ذاتی تجربات جو اس کی پوری کتاب میں رواں دواں ہیں کتاب کی اہمیت بڑھا دیتے ہیں۔

شمالی ہند میں لوگوں کی خوش حالی، زمین کی زرخیزی، سامان خورونوش کی ارزانی، اس کے لئے باعث حیرت ہے۔ وہ ہندوستانیوں کے شطرنج کھیلنے کی دانائی اور آم کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ مغل فوج کی تنظیم و ترتیب کی بڑی داد دیتا ہے۔ ارکان کی عوامی تعلیم جو عبادت گاہوں اور خانقاہوں تک مرکوز تھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ مغلوں کی عیش پرستی کا بیان بالکل صحیح ہے۔ جس شہر میں اس نے قدم رکھے اس کا بیان تفصیل سے لکھا۔ مصنف کے مغلیہ شہنشاہ کے سیم وزر میں تولے جانے کی رسم، مغل دربار اور تاج محل کی بنتی ہوئی عمارت کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ تاج محل کی نقشہ سازی اس نے جرینو ویرونیو[1] سے منسوب کی ہے۔

عصری سیاسی واقعات کا ذکر مان ریکو نے بہت کم کیا ہے۔ قندھار کی سپردگی اور ناظم فرح کی قندھار واپس لینے کی انواہی کوشش کا بھی بیان ہے۔ اس نے آصف خان کے بے پناہ اثر کا بھی ذکر کیا ہے، اس کو Secundus De Rege کہتا ہے۔ مرزا رستم صفوی کی لڑکی سے شجاع کی شادی کا بھی تذکرہ اس نے کیا ہے۔

مان ریکو جب ان تاریخی واقعات کا بیان کرتا ہے جس سے اس کو ذاتی واقفیت نہیں تو اوروں کی طرح وہ بھی حقیقت و افسانہ کا مخلوط نمونہ پیش کرتا ہے۔ ان باتوں کا مثالی نمونہ شاہجہاں کی بغاوت کا بیان ہے

(1) Germino Veroneo.

اس کے یہاں ہگلی کی تسخیر کا ذکر صرف اتنا ہی ملتا ہے جو اس نے فادر ڈی کرسٹو کے تذکرے میں بیان کیا ہے۔ یہ شخص ۹ سال تک آگرہ کے قید خانہ میں تھا، لیکن مان ریکو جب اس کا ان کا بیان کرتا ہے تو کچھ ہلکی روشنی ان پرتگالی حرکات پر پڑتی ہے جو مغل بادشاہ کے حملہ کرنے کا سبب بن گئیں۔ مغل سرکار کا بیان اس نے ڈی لیٹ کے یہاں سے نقل کیا ہے۔

رچرڈ بل اور جان کمپ بل

رچرڈ بل اور جان کمپ بل کے سفرناموں کو دوبارہ سر رچرڈ ٹمپل نے برٹش میوزیم کے سلوان مجموعہ نمبر ۸۱۱، ہندوستانی انٹی کیوری (۱۹۰۶-۸) میں شائع کیا۔ مدبر کا کہنا ہے کہ Bell کو زبانی بول کر لکھایا گیا تھا۔ جان بل کے لکھے ہوئے واقعات کو زبانی کہے جانے والی داستان کی صورت میں لانے کے لئے حیرت انگیز طریقہ پر توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ جن واقعات کو جان کمپ بل نے چشم دید بتایا ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے مضحک ہو گئے ہیں۔ مثلاً مراد کو شاہ جہاں کا سب سے بڑا لڑکا بتایا گیا ہے اور اورنگ زیب کو سب سے چھوٹا۔ جنگ وراثت کا سارا بیان مخلوط و نا قابلِ فہم ہے۔ کچھ ایسے دعوے بھی ہیں جو صریحاً غلط ہیں۔ مثلاً مراد کو اورنگ زیب کے حکم سے کچل کر مار ڈالا گیا اور شاہ جہاں معزولی کے وقت ۱۳۰ سال کا تھا، حالانکہ کمپ بل جب دارا کا ہاتھی سے جنگ میں اتر آنے کا قصہ دہراتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ کسی معزز شخص کے کہنے سے ہاتھی سے اتر پڑا تھا اور یہی حادثہ اس کی موت کا باعث ہوا۔ اسی طرح سے وہ اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے جب اورنگ زیب کے سفیر سے شاہ ایران نے بہ نظر حقارت پوچھا تھا کہ اورنگ زیب اپنے آپ کو عالم گیر کیوں کہتا ہے۔ نہ اس نے ترکوں کو فتح کیا نہ عیسائیوں کو، اس نے صرف اپنے باپ کو قید کیا اور خاندان کو برباد کیا۔ قندہار کا بیان دلچسپ ہے۔

برنیئر

مغربی سیاحوں میں جنہوں نے مشرق کے متعلق کچھ لکھا ہے اس میں برنیر کا بیان سب سے زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ فلسطین، شام اور مصر بھی

(1) De Laet. (2) Richard Bell.
(3) John Campbell. (4) Sloane Collection.
(5) Bernier.

گیا تھا۔ یہاں آنے کے لئے قاہرہ سے بحری سفر کرتا ہوا ۱۶۵۸ء کے اواخر میں روانہ ہوا۔ ابھی وہ آگرہ نہ پہنچا تھا کہ احمد آباد کے قریب دارا سے ملاقات ہو گئی۔ دارا کو دیورائے (متصل اجمیر) میں شکست ہوئی تھی۔ پسپا ہو کر وہ گجرات چلا گیا تھا۔ ہندوستان میں اپنے قیام کی مدت برنیر نے ۱۲ سال بتائی ہے۔ اس زمانہ میں اس نے لاہور، کشمیر، تاج محل، تاہم بازار، سوئی ہیم اور گول کنڈہ کی سیر کی۔ یہیں اس نے شاہ جہاں کے انتقال کی خبر سنی۔ ایران سے سفر کرتا ہوا ۱۶۶۹ء میں وہ مارسیلز پہنچا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے اپنی کتاب شائع کی، اور ۱۶۸۸ء میں مر گیا۔

دہلی میں دانشمند خان نے اس کی سرپرستی کی۔ دانشمند خان دربار کا سربرآوردہ منصب دار تھا۔ برنیر نے کبھی کبھی اپنی معلومات کے ذرائع کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً، دھرمات کی لڑائی کا حال اورنگ زیب کے ایک ایسے فرانسیسی توپچی سے اس نے سنا، جو اس کی ملازمت میں تھا۔ شجاع کی قسمت کے آخری فیصلہ کا حال اس نے پرتگالیوں، مسلمانوں اور ڈچ کے باشندوں سے سنا جو بنگال میں موجود تھے۔ مغل حرم سرا کا تذکرہ خواجہ سراؤں کے بیانات پر مبنی ہے۔ اس نے اُن مغربی تجار سے بھی مشورے کئے جو عرصہ دراز سے یہاں تھے۔ ان کے علاوہ سفیروں، اہل کاروں اور ترجمانوں سے بھی اس نے حالات معلوم کئے۔

اس کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس نے مغل دربار، اس کی رُوداد، و زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے بہت سے ذرائع استعمال کئے مگر پھر بھی اس کی بیان کردہ معلومات سب کی سب ذاتی نہ تھیں۔ علاوہ بریں چونکہ وہ نہایت مہذب آدمی تھا۔ اس کے لئے بعض اوقات یہ ممکن نہ ہوا کہ مثالیت اور حقیقت کو علیحدہ علیحدہ رکھ سکتا۔ مغلیہ گورنروں کے مظالم اور شخصی سلطنت کے معائب کا دلچسپی سے بیان کرنا اس قسم کی مثالیں ہیں۔ نتیجتاً وہ ایسے نتیجے بھی نکالتا ہے جن کی تائید اس کے دوسرے ہمعصروں کے بیان سے نہیں ہوتی۔ اس کو فرانسیسی اداروں کی برتری کا وہم بھی تھا۔

بااینہمہ جنگ وراثت کا بیان نہایت واضح ہے۔ حالانکہ اس کی جہاں آرا کی کردار نگاری بعید از قیاس ہے۔ اس نے دہلی میں دارا کی تشہیر بچشم خود دیکھی تھی۔ سلیمان شکوہ کا دربار میں پہنچنا بھی اس نے بیان کیا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اورنگ زیب

نے اپنے قیدی باپ کو قلعہ کے اندر پوری آزادی دے رکھی تھی، اگرچہ یہ بیان منوچی کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ وہ دور شاہجہاں کے سیاسی واقعات کے سلسلہ میں ہگلی اور تبت کوچک کی فتح، مندروں کے گرائے جانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کی فوجی تنظیم کی خامیوں پر اس کی رائے صحیح ہے لیکن فوج کی تعداد کا بیان قابل اعتماد نہیں۔ دہلی، آگرہ، کشمیر کا بیان دلچسپ ہے۔ تاج محل کو جو اس نے خراج عقیدت پیش کیا ہے، تاج محل اس تعریف کا مستحق بھی ہے۔

ٹیورنیئر

ٹیورنیئر کو جہاں گرد لوگوں کا شہزادہ کہہ سکتے ہیں۔ ۲۱ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے فرانس، انگلستان، ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، ہنگری اور اطالیہ کے بہترین حصے دیکھ لئے تھے۔ یوروپ کی زبانوں کا اسے اچھا خاصا علم تھا۔ مشرق کے سفروں نے اسے تاریخ میں مشہور کر دیا، پہلی بار ۱۶۴۰ء میں ہندوستان آیا اور بعد کے متعدد سفروں میں اس ملک کا کافی بڑا حصہ دیکھ لیا۔ برنیر سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے بنگال کا سفر بھی کیا۔ اپنے سفرنامہ کے لئے وہ اس رفیق کار، اور ہم وطن کا ممنون ہے۔

ٹیورنیئر کا سفرنامچہ اس وقت کی تجارتی تاریخ کے لئے اہم ہے۔ سڑکوں اور شاہراہوں کا بیان بھی معاشرتی زندگی کے اتفاقیہ بیانات کی طرح بڑا دلچسپ ہے۔ سیاسی تاریخ کا باب، افسانہ و حقیقت کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ شاہ جہاں نے عیاری سے تخت حاصل کیا، جن امراء اور شہزادوں سے وہ بدگمان تھا ان لوگوں کو گوالیار میں قید رکھا لیکن ان کو اپنی جائداد سے روپیہ حاصل کرنے کی اجازت تھی، دولت آباد کی تسخیر خیالی ہے۔ جنگ وراثت کا بیان شاید برنیر کی نقالی ہے۔ لیکن میر جملہ کے معاملات اور قطب شاہ کی لڑکی سے سلطان محمد کی شادی کا بیان اس نے کافی صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ شاہجہاں کی بغاوت کا بیان قطعاً غیر معتبر ہے، اس کی وجہ غالباً اس کی لاعلمی ہے۔ لیکن شہنشاہ کے بیش قیمت جواہرات کا بیان بالکل قابل اعتماد ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ ذخیرہ اس کو اورنگ زیب نے دکھایا۔ شائستہ خان اور میر جملہ سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ اس کا خیال ہے کہ شاہجہاں جواہرات کا بڑا نقاد تھا۔ اس کا یہ قول کہ جہاں بنیے سودا کرنے پر تیار نہیں ہوتے وہاں اہل مغرب کو نفع کی کیا امید ہو سکتی ہے، ہندوستانی تجار کی

(1) Jean-Baptiste Tavernier.

ہوشیاری کا اعتراف ہے۔

منوچی ۱۷ویں صدی کے نصف اوّل کے مغربی سیاحوں میں سب سے زیادہ لکھنے والوں میں منوچی[1] ہے۔ ابھی وہ ۱۴ سال کا لڑکا تھا کہ وینس کو اس نے خیرباد کہہ کر بقیہ زندگی اور خاص کر ہندوستان میں گزاری۔ اس کو فارسی و ترکی زبانوں سے بھی کام چلانے بھر کی واقفیت تھی۔ جس کی وجہ سے دارا کی ملازمت حاصل ہوئی، دارا کی خدمت اس نے خلوص اور وفاداری سے کی۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ شریک تھا۔ وہاں سے بچ بچا کر اپنے سرپرست کے شریک غم ہونے کے لئے لاہور پہنچا، ملتان اور بھکر بھی اس کے ہمراہ گیا۔ یہاں خواجہ سرا بسنت کے ساتھ وہ قلعہ کا محافظ مقرر ہوا۔ بھکر فتح ہوجانے پر وہ لاہور چلا گیا اور وہاں سے دلّی واپس آیا۔ اعتبار خان نے زور دیا کہ وہ اورنگ زیب کی ملازمت میں آجائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اورنگ زیب کے کشمیر جانے کے بعد اس نے بنگال کا طولانی سفر اختیار کیا۔ وہاں سے واپس آکر راجہ جے سنگھ کی ملازمت میں آگیا۔ اسی کے ساتھ دکن گیا۔ ۱۶۶۶ء میں وہاں بھی استعفیٰ دے دیا اور ایک خطر پسند زندگی بسر کرنے کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ وہ ۷، ۸ سال طبیب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۶۷۸ء میں شاہ عالم کی ملازمت میں داخل ہوا۔ جس کے ساتھ وہ اورنگ زیب کی راجپوتانہ اور دکن کی لڑائی میں رہا تھا۔ اس کا انتقال ۱۷۱۷ء میں ہوا۔ جو کتاب اس نے فرانکوس مارٹن[2] اور بیوریو ڈس لینڈ[3] کی فرمائش پر لکھی تھی اس کے متن میں اس نے اپنے اسناد و مخزن کا پتہ برابر دیا ہے۔ حسب مذکورہ بالا وہ راجہ جے سنگھ کی ملازمت میں تھا۔ راجہ کے لڑکے کیرت سنگھ سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ امانت خان، مرزا لہراسپ ولد مہابت خان اور فدائی خان کو وہ اپنے بے تکلف دوستوں میں شمار کرتا ہے۔ منطقی طور پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ دارا اور بیگم صاحبہ کا منظور نظر تھا اس لئے اور بہت سے افسروں سے بھی اس کی ملاقات رہی ہوگی۔

اس نے دھرمات کی جنگ کی خبر ایسے بلند پایہ اشخاص سے پائی جو خود جنگ میں شریک تھے۔ اورنگ زیب کے مغربی توپچیوں سے بھی اس لڑائی کی خبر ملی۔ ساموگڑھ

---

(1) Niccolao Manucci. (2) francios Martin

(3) Boureau Deslands.

کی لڑائی میں وہ خود بھی شریک تھا۔ سلیمان شکوہ کی تگ و دو کا حال جے سنگھ نے اسے بتایا۔ کھجوا کی لڑائی کی تفصیلات راج محل کے ناظم مرزا جانی اور ہگلی کے ناظم محمد مغل سے معلوم ہوئیں۔ دیورائے کی لڑائی کے حالات میر تقی کے ایک مصاحب نے بیان کئے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی جنگ وراثت کے متعلق اس کے بیانات صحیح ہیں۔ لیکن شاہ جہاں کی حکومت سے پہلے کے حوالہ جات مہملات کا مجموعہ ہیں۔

ولیم اروِن نے صحیح کہا ہے کہ بجز برنیئر کے جزوی نقالی کے منوچی نے کسی دوسرے کی نقل نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ منوچی، برنیئر سے زیادہ باخبر و تجربہ کار آدمی تھا۔ آخر الذکر کی وہ پُر زور تردید کرتا ہے اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ دوسرے لوگ جو اس کی حقارت کے مرکز ہیں، ان میں پرتگالی، یسوعی اور اورنگ زیب تھے۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی ہندوستانی کردار کو بڑی نیچی سطح پر پاتا ہے۔ اس ضمن میں ہندو، مسلمان دونوں شامل ہیں۔ منوچی کارآمد تو ہے لیکن بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔

خاتمہ

مذکورہ بالا اسناد کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاہ جہاں کا عہدِ حکومت صحیفہ دورِ متوسط کا سب سے زیادہ شاندار باب تھا۔ اس عہد میں امن چین، خوش حالی تھی، ہر طرف علم و ہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں بہترین، شاندار عمارتیں ظہور میں آئیں۔ بڑے بڑے پُر حوصلہ جنگی معرکے ہوئے لیکن اسی جاہ و جلال، شان و شوکت کی تہ میں زوال کے ایسے آثار بھی جھلک رہے ہیں اور ایسے خطرناک رجحانات کے سامان بھی نظر آتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے آگے چل کر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ایک دھماکہ بن کر حکومت کے خاتمہ کا پیام بن گئے۔
از روئے انصاف یہ سب تباہ کن عناصر شاہ جہاں کی حکومت سے وابستہ ہیں۔

باب ۱

بچپن اور نوجوانی

شہزادہ خرم جو تاریخ میں عموماً شاہجہاں، شہنشاہ والا شان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۵ جنوری ۱۵۹۲ء کو بوقت شب بروز جمعرات لاہور میں پیدا ہوا۔ یہ اس کے دادا کے عہد حکومت کا چھتیسواں سال تھا۔ اس کی ماں راجپوت شہزادی مان متی یا جگت گسائیں تھیں، جس کے ساتھ جہانگیر نے ۱۵۸۶ء میں شادی کی تھی۔ وہ موٹا راجہ اودے سنگھ کی لڑکی تھی۔

اس کا مستقبل بچے نے زہرہ و مشتری کی یکجائی روشنی میں آنکھیں کھولیں۔ مجموعہ نجوم نے عظیم خوش قسمتی و طوفانی کردار کی نشان دہی کی۔ درباری جوتشیوں نے اس کی جنم کنڈلی دیکھی اور متفقہ رائے بچے کی غیر معمولی خوش قسمتی کی پیشین گوئی کی۔ شعرا بھی فنکاری مدح سرائی میں پیچھے نہ رہے۔ اپنی نظموں کا سہارا لے کر آگے بڑھے ان میں مادہ سے دو تاریخ خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

۱۔ لمعۂ آفتاب عالمگیر

۲۔ شاہ روے زمین و شاہ جہاں۔

اگر شعرا کے اس بظاہر الہامی بیان کو اہمیت دی جائے تو دوسرا مادۂ تاریخ واقعی شہزادے کی زندگی کے مستقبل کا مظہر معلوم ہوگا۔

اکبر کے لیے اس پوتے کی پیدائش معمولی دلچسپیوں سے زیادہ اہم تھی۔ دو طرح سے یہ قابل خیر مقدم تھی، اس کی حسب معمول مسرت کا باعث ہوئی لیکن اس سے بھی زیادہ اس کی لاولد ملکہ سلطان بیگم کی زندگی کے لیے تازگی بخش ثابت ہوئی۔ ملکہ کے جوتشی ہرگوبند نے اس مژدہ کی خبر پہلے ہی دے دی تھی اور کہا تھا کہ بچہ کو اپنا متبنیٰ کرلے۔

حسب دستور شاہی خاندان، پیدائش کے چھٹے دن سلیم نے اکبر کو مدعو کیا کہ نوزائیدہ کو نام عطا کرے۔ اکبر نے اس کا نام خرم رکھا اور واقعی شاہی خاندان میں اس بچے کی آمد سے بڑی خوشی منائی گئی۔ اسی دن بچہ رقیہ بیگم کے حوالے کیا گیا اور اس نے اسے گود لے لیا۔ یہ بچہ ہوش سنبھالنے کے تین سال بعد تک اسی ملکہ کے زیر سایہ پروان چڑھتا رہا۔

تعلیم

مغلوں میں دستور تھا کہ بچہ کی تعلیم ختنہ کے فوراً بعد شروع ہو اس لیے جب شہزادہ چار سال چار ماہ چار یوم کا ہوا تو مکتب کی رسم ادا کی گئی غالباً اس موقعہ پر مروجہ شان و شوکت سے جشن منایا گیا۔ خرم کے پہلے استاد ملا قاسم بیگ تبریزی مشہور مرزا جان تبریزی کے شاگرد تھے۔ علاوہ ممتاز عالم اور علوم عقلی کے ماہر ہونے کے وہ ایک صوفی بھی تھے۔ مجمع البلدان ایسی ضخیم جغرافیہ کی کتاب کا مترجم بھی تھے۔ ان کے بعد شہزادے کے اتالیق شہرۂ آفاق حکیم علی گیلانی ہوئے جو مشہور طبیب اور قابل قدر خوبیوں کے مالک تھے۔ حکیم گیلانی طبابت میں اپنے ماموں حکیم الملک شیرازی اور ان کے بعد شاہ فتح اللہ گیلانی کے شاگرد تھے۔ دینیات میں انھوں نے شیخ عبد النبی سے کسب فیض کیا تھا۔ سارے استادوں سے زیادہ شہزادہ کو حکیم گیلانی سے سروکار رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد کو استاد سے بڑا لگاؤ تھا بعد میں شہزادہ مسرت و احسان مندی کے ساتھ ان کو اکثر یاد کرتا تھا۔ اس یاد میں اس علم کا اظہار تشکر بھی تھا جو عہد تربیت کے سب سے زیادہ اثر پذیر زمانے میں اس نے اپنے استاد سے حاصل کیا تھا۔ ان کے علاوہ جن لوگوں کو شہزادے کی ذہنی نشو و نما کی رہنمائی و تشکیل کی خدمت سپرد ہوئی تھی ان میں شیخ صوفی کا ذکر ضروری ہے۔ یہ میاں وجیہ الدین گجراتی کے شاگرد، خوش مذاق شاعر اور شگفتہ مزاج و آزاد خیال آدمی تھے۔ دوسرے اتالیق شیخ ابو الخیر برادر شیخ ابو الفضل باخبر و متوازن مزاج آدمی تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مشہور علماء کی صحبت نے نوخیز طالب علم کے ذہن کو تیز تر کر دیا ہوگا لیکن اپنے باپ کے برخلاف اس کا ذہن عملی زیادہ تھا مفکرانہ کم تھا۔ اس نے بہت جلد فارسی زبان سیکھ لی بلکہ اظہار بیان پر بھی قدرت حاصل کر لی لیکن ترکی زبان سے اسے انس نہ پیدا ہو سکا۔ آبائی زبان سے اس کی بیگانگی کی شکایت ایک مرتبہ جہانگیر نے رقیہ بیگم سے کی اور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی سنہ ۱۶۰۰ء میں اس نے شہزادہ کو ترکی زبان سکھانے کے لیے تاتار خان کو مقرر کیا۔ یہ صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ نئے استاد نے اس نوجوان شاگرد میں کس قدر جذبۂ شوق پیدا کیا۔ لیکن خرم کند ذہن لڑکا نہ تھا۔ اس کا ذہن تیز اور حافظہ غیر معمولی تھا۔ تفصیل پسندی اور اس پر عبور حاصل کرنے کی اس میں خاص صلاحیت تھی۔

جسمانی تعلیم و تربیت

لیکن ایک مغلیہ شہزادے سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس کو صرف کتب بینی کا شوق ہوگا۔ اس کی تعلیم اس نہج کی ہوئی کہ دماغ اور جسم دونوں توانا ہو سکیں۔ اکبر نے حسب ضرورت شہزادے خرم کی جسمانی تربیت کا بھی خیال رکھا۔ جب سنہ ۱۵۹۷ء میں وہ آخری بار کشمیر جا رہا تھا تو اس نے اپنے پوتے کو لاہور میں زیر نگرانی میر مراد جوائینی[12] چھوڑ دیا۔ شہزادے کو تیر اندازی سکھانا اور تعلیم قور کی روزانہ تعلیم دینا تیر کا فرض منصبی ہوگیا۔

بعدازاں جب خرم اپنے دادا کے ساتھ دکن گیا تو بندوق چلانا سکھانے کے لیے راجہ سلیوان[13] کو تعینات کیا گیا سواری و تیغ زنی کی مشق اس کی روزانہ ورزش کا ایک جزو ہوگئی۔ فن عروض و خطابت جیسے خشک موضوعات کے مقابلہ میں شہزادے کو ان فنون سے زیادہ دلچسپی ہوئی باپ کی طرح وہ بھی تیر کمان و بندوق کے استعمال کا ماہر ہوگیا۔

کشمیر سے واپسی پر اکبر لاہور میں بہت کم ٹھہرا فوراً آگرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اب اُس نے فیصلہ کیا کہ جہانگیر کو رانا کے مقابلے میں روانہ کرے۔ ان کی آمد پر آگرہ کے قریب ولی عہد نے ان کا استقبال کیا۔ میواڑ روانہ ہونے سے قبل جہانگیر نے باپ سے درخواست کی کہ اس کا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ کر دیا جائے۔ خرم کو اکبر جدا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خسرو کو بھی اس کے ساتھ بھیجنا مناسب نہ سمجھتا تھا پرویز کو اس کے باپ کے ساتھ بھیجنے میں اس کو عذر نہ تھا[15]۔

خرم کی علالت

ایسا ہوا کہ جیسے ہی سلیم آگرہ سے روانہ ہوا خرم چیچک کی بیماری میں مبتلا ہوگیا اس کی حالت نازک ہوگئی دادا کو گھبراہٹ ہوئی اس نے فوراً ہوشیار طبیبوں کو شہزادے کے علاج کے لیے بلایا۔ اور صدق دل سے اس کے جلد اچھا ہونے کی دعا مانگی۔ دعا با اثر ثابت ہوئی شہزادہ جلد ہی اچھا ہوگیا ـــــ حسب دستور شہزادے کا غسل صحت ہوا اس دن اکبر نے بے دریغ فیاضی سے کام لیا خیرات تقسیم کی اور بہت سے قیدیوں کو رہا کیا۔ اس کے بعد خرم اپنے دادا کے ساتھ دکن[16] روانہ ہوا۔

خرم آگرہ کے لیے روانہ کیا گیا

سلیم کی بغاوت نے اکبر کو مجبور کیا کہ وہ شمال کی طرف فوراً چلا جائے۔ جب خود سر شہزادہ کو راہ راست پر لانے کے لیے پُرامن ذرائع ناکامیاب ہوگئے تو اکبر نے اسے سخت گیری کے ساتھ قابو میں لانے کا ارادہ کیا۔ اگست سنہ ۱۶۰۳ء[19] میں ایک زبردست فوج کے ساتھ وہ آگرہ سے چل پڑا لیکن آگے نہ بڑھ سکا۔ ماں کی اچانک علالت کی خبر نے اسے معذور رکھا پہلے تو اس نے یقین نہیں کیا کہ اس کے ساتھ سختی کے برتاؤ کیے

جائیں ۔ بہرحال خبر کی صداقت کے لیے اس نے خرم اور حکیم علی کو آگرہ بھیجا تاکہ معلوم ہو کہ علالت کوئی حیلہ تو نہیں ۔ خرم سیدھے اپنی پردادی کے کمرے میں گیا ۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی حالت نازک ہے وہ فوراً اپنے دادا کے پاس یہ کہنے چلا آیا کہ اگر وہ اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو فوراً آگرے واپس آنا چاہیے ۔ اکبر ماں کے پاس بروقت پہنچا ۔ وہ موت کے پنجے میں تھی چنانچہ چند گھنٹوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا ۔

اکبر کی علالت دادی کے انتقال کے بعد سلیم نے اپنے آپ کو باپ کے سپرد کر دیا ۔ اکبر کی صحت اب تیزی سے خراب ہونے لگی ۔ دل بہلانے کے لیے اس نے ایک دن خسرو اور سلیم کے ہاتھیوں میں لڑائی کا انتظام کیا ۔ اکبر اور خرم جھروکے سے دیکھ رہے تھے ۔ سلیم کے ہاتھی کا پلہ بھاری ہونے لگا ۔ سلیم کے ملازموں نے خسرو کے آدمیوں کی مذمت کی ۔ خسرو اپنے دادا کے پاس شکایت لے کر گیا ۔ بادشاہ نے خرم کو سلیم کے پاس اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ ہنگامہ ختم کر دیا جائے [۲۲] ۔ اکبر اس تفریح سے واپس ہوا تو بہت تھکا ہوا تھا اس کی رات بےچینی میں گزری صبح کے وقت اس پر بخار کا حملہ ہوا اور ساتھ ہی اسہال نے بیماری کو اور پیچیدہ بنا دیا [۲۳] ۔

سازش دربار کے غیر مطمئن لوگوں کو سازشی منصوبے تیار کرنے کا موقع مل گیا ۔ انھوں نے جانشینی کا طریقہ بدلنے اور خسرو کو تخت پر لانے کی کوشش کی ۔ حصول کامیابی کے لیے ان لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ سلیم جب باپ کی عیادت کو آئے تو اسے روکا جائے لیکن بروقت اطلاع نے اس کو دشمنوں سے بچا لیا ۔ مگر وہ اپنے لڑکے خرم کی خیریت کے لیے بہت فکرمند تھا ۔ خرم اکبر سے جاں نثارانہ طور سے [۲۴] وابستہ تھا ۔ وہ اس کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا ۔ جب اس کی ماں نے کوشش کی کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے تو خرم نے سختی سے جواب دیا ۔ "نہیں جب تک شاہ بابا کی ایک سانس بھی باقی ہے مجھے کوئی طاقت ان سے جدا نہیں کر سکتی" اچھا ہی ہوا کہ وہ ماں کے ساتھ نہیں آیا کیونکہ سازش کرنے والوں نے کچھ لوگوں کو اس پر لگا دیا کہ جب وہ ایوان شاہی سے نکلے تو اسے گرفتار کر لیا جائے [۲۵] ۔

اکبر کا انتقال دشمنوں کی کوشش جب کامیاب نہ ہوئی تو سلیم باپ کی آخری عیادت کے لیے گیا ۔ اکبر نے اپنے مصاحبوں کو اشارہ کیا کہ شہزادے کو میری تلوار دیدی جائے اور میری پگڑی اس کے سر پر رکھ دی جائے جب یہ ہو چکا تو اکبر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں ۔ اب آخر کار جہانگیر خرم کو اپنے ساتھ چلنے پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔

سلیم کی تخت نشینی باپ کے انتقال کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد بتاریخ ۲۴ راکتوبر ۱۶۰۵ء بروز جمعرات جہانگیر تخت پر جلوہ گر ہوا ۔ اس کے بعد ہی خسرو کی بغاوت سے

حکومت میں ہلچل پیدا ہوئی۔ خسرو ۶ر اپریل ۱۶۰۶ء کی شام کو آگرہ سے بہانہ کرکے نکلا کہ وہ اکبر کی قبر پر جارہا ہے لیکن وہ پنجاب کی طرف چلا۔ راستہ میں اس کو حسین بیگ بدخشی اور عبدالرحمان مل گئے۔ خسرو کے بچ کر نکل جانے کی خبر سے جہانگیر پریشان ہوگیا۔ شیخ فرید بخاری کو حکم دیا کہ باغی کا پیچھا کرے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود بھی اس مہم کے لیے فوراً روانہ ہوجائے۔ چونکہ دارالسلطنت کے تحفظ کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا اس لیے ایک مجلس نیابت بنادی گئی۔ اس میں شیخ علاء الدین نبیرۂ شیخ سلیم جو بعد میں معروف بہ اسلام خاں اور بنگال کے گورنر ہوئے، مرزا غیاث بیگ تہرانی، دوست محمد خواجہ جہاں اور راجہ راؤ سنگھ بھرتیا شامل تھے۔ شہزادہ خرم صدر انجمن بنایا گیا۔ خرم کے لیے سرکاری طور پر عوامی رابطہ کا یہ پہلا موقع تھا۔[23]

خرم اپنے باپ کے ساتھ کابل جارہا ہے

ایک مہینہ سے بھی کم عرصہ میں خسرو کی بغاوت ختم ہوگئی اور ۹ر مئی ۱۶۰۶ء کو جہانگیر لاہور پہنچا اس کے بعض وفادار مشیر کاروں نے اس کو صلاح دی کہ وہ فوراً[24] آگرہ واپس جائے۔ گجرات، دکن اور بنگال میں فضا بہت ناہموار ہے لیکن ایران کے خطرناک رویہ کے پیش نظر جہانگیر نے اس تجویز کو رد کردیا۔ وہ ۱۱ مہینے تک لاہور میں ٹھہرا رہا۔ سرحد کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ چونکہ اس کا ارادہ تھا کہ حالات اعتدال پر آجائیں تب وہ کابل کا سفر کرے، اس لیے اس نے خرم کو حکم دیا کہ مریم زمانی اور دوسری بیگمات کو لے کر وہ لاہور آجائے۔ جب خرم لاہور کے قریب پہنچا تو جہانگیر دھارا تک اپنی ماں کے استقبال کے لیے گیا۔[25] شہزادہ پرویز اس سے پہلے دربار میں آگیا تھا اس طرح ایک شادکام خاندان کا اجتماع ہوا۔

خرم کی نسبت ارجمند بانو سے

جہانگیر کے قیام لاہور میں ۲۱ر مارچ ۱۶۰۷ء کو خرم کو پہلا فوجی منصب ہشت ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار مع طومان تُغ و طبل و علم کے عطا ہوئے۔[26] تقریباً ایک ہفتہ بعد وہ ارجمند بانو بیگم بنت اعتقاد خاں سے منسوب کیا گیا یہی اعتقاد خاں آگے چل کر آصف خاں کے لقب سے مشہور رہا۔ جہانگیر نے اپنے دست مبارک سے ہونے والی بہو کو انگوٹھی پہنائی بہت کچھ خوشی و مسرت کا اظہار[27] ہوا۔ اسی سال کے ماہ نومبر میں کابل سے واپسی پر جہانگیر نے خرم کو اجین کی جاگیر اور حصار، فیروزہ کی سرکار عطا کی۔ اس کے علاوہ اجازت دی کہ وہ سرخ خیمہ نصب کرسکتا ہے یہ عنایت خاص سب سے بڑے شہزادے کو دی جاتی تھی۔ ان اعزازات کو اور معزز بنانے کے لیے ایک مہر ازک کے سپرد کی گئی۔ حکم دیا گیا کہ جملہ فرامین و پروانہ جات پر اس کی مہر ثبت ہونی چاہیے۔[28]

خرم کابل کی چند تعمیرات درست کراتا ہے

ایران کا خطرہ اب ختم ہو چکا تھا۔ ۲۶ مارچ ۱۶۰۷ء کو جہانگیر لاہور سے روانہ ہوا۔ دس ہفتہ کے سفر کے بعد چاندی، سونا بکھیرتا ہوا ۱۳ جون کو کابل میں داخل ہوا۔ اُرتاباغ شہزادہ خرم کو قیام کے لیے دیا گیا۔ وہاں کی عمارتیں شہزادے کو پسند نہ آئیں۔ اس نے فوراً مناسب ترمیمات کر دیں اور اس کے بعد باپ کو باغ کی سیر کے لیے مدعو کیا۔ جہانگیر بدلی ہوئی صورت اور نئی عمارتوں کی خوشنمائی اور تناسب سے بہت خوش ہوا۔ بیٹے کے گھر میں پورا دن آرام و آسایش کے ساتھ اس نے گزارا۔ اس موقع پر مروّجہ دستور کے مطابق منجمان درباری کی رائے کے پیش نظر ستاروں کی نحوست دور کرنے کے لیے شہنشاہ نے شہزادے کی قمری سال گرہ منائی۔ وہ سونا چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں میں تولا گیا جو غریبوں اور حاجت مندوں میں بانٹ دی گئیں[۳۲]۔

خسرو کی سازش

خسرو شاہی جلوس کے ساتھ کابل گیا تھا۔ اس کی نگرانی کچھ کم ہونے لگی۔ وہ پھر بے قرار ہوا اس نے جلد ہی اپنا ہمخیال دوسرے غیر ذمہ دار نوجوانوں کو بنا لیا۔ مثلاً شریف ابن اعتماد الدولہ، نورالدین برادرزادہ، آصف خاں اور اعتبار خاں۔ ان لوگوں نے ۵۰۰ آدمیوں کو اپنا شریک کار بنایا۔ منصوبہ یہ بنایا کہ شہنشاہ کو کسی ایسے وقت قتل کیا جائے جب اس کا کوئی محافظ نہ ہو اور شہزادے کو رہا کر دیا جائے۔ بہت ممکن تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جاتی، لیکن اس جتھے کے ایک شخص کے احساس ندامت نے اعتراف جرم کرا دیا۔ اس شخص نے شہزادے خرم کے دیوان خواجہ واعظا سے صاف صاف اقبال جرم کر لیا، اس سازش کی خفیف سی خبر آصف خان کو کسی دوسرے ذریعے سے پہلے پہنچ چکی تھی لیکن سب سے پہلے یہ اہم خبر بادشاہ کو نوجوان خرم نے دی۔ وہ دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا۔ اور سازش کرنے والوں کے منصوبے سے باخبر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سازش کے سرغنہ پکڑ لیے گئے، ان کو سزا دی گئی اور تحریک ختم ہو گئی۔ حکم ہوا کہ خسرو کو اندھا کر دیا جائے۔ مگر یہ اہم انکشاف جس کی وجہ سے بادشاہ کی جان بچی تھی۔ وہ خرم کے ایک عہدہ دار نے کیا تھا۔ یہ بات خرم کے اعزاز میں مزید اضافہ کا باعث ہوئی۔ باپ کی نظر میں شہزادہ خرم کا وقار ہمیشہ سے زیادہ ہو گیا[۳۳]۔

دوبارہ آگرہ واپس آتا ہے

اس سازش سے پہلے ہی جہانگیر کابل سے روانہ ہو چکا تھا۔ سازش دبانے کے بعد اس نے اپنا سفر پھر شروع کیا راستہ میں کئی مقامات پر اس نے تفریح کے لیے اپنا دل پسند مشغلہ قمرغہ[۳۴] کا لطف اٹھایا۔ حسن ابدال پہنچ کر خرم اور پرویز دونوں کو اس شکار[۳۵] میں حصہ لینے کی اجازت ملی۔ شاہی قافلہ ۲۲ نومبر ۱۶۰۷ء کو لاہور پہنچا۔ یہاں

۲ مہینے سے کچھ زیادہ قیام کے بعد آگرہ کا سفر اختیار کیا گیا۔ شہنشاہ ۲۲ رمارچ ۱۶۰۸ء کو دارالسلطنت میں داخل ہوا۔ شہزادہ خرم اب ۱۶ برس کا نوجوان تھا۔ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کو ایک علٰحدہ مکان اور سازوسامان دیا جائے۔ جہانگیر اس کو اپنے سے الگ بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے اس کو محمد مقیم عرف وزیر خان کا مکان دے دیا۔ یہ مکان قلعہ میں ایوان شاہی کے قریب تھا۔ کابل کی طرح یہاں بھی شہزادے نے اپنے تعمیری ذوق کا ثبوت دیا۔ اپنے مذاق کے مطابق گھر میں ترمیم کی اس کے بعد باپ کو مکان میں مدعو کیا۔ حسب دستور شہزادہ نے قیمتی تحفے نذر کیے۔ جنھیں جہانگیر نے خوشی بہ خوشی قبول کیے[۲۶]۔

خرم کی نسبت صفوی شہزادی سے کیوں؟

۷ رستمبر ۱۶۰۹ء کو شہزادے خرم کو باپ نے ایک لعل اور دو دانہ دریتیم قیمتی چالیس ہزار روپیہ عنایت کیے[۲۷]

۴ ماہ بعد اس کی نسبت مرزا مظفر حسین صفوی خانوادۂ اسمٰعیل شاہ ایران کی لڑکی سے ہوئی۔ جہانگیر اس رشتۂ اتحاد کے لیے اصول سے الگ کیوں ہوا؟ ۔ خاص کر جب نسبت اس سے پہلے ہی ارجمند بانو سے ہو چکی تھی۔ پہلی نگاہ میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا مغل خاندان میں عام بات تھی لیکن یہاں صورت حال دوسری تھی۔ شہزادہ خرم کی شادی اس کی پہلی منگیتر سے نہ ہوئی تھی تو پھر دوسری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی عمر اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ کیونکہ صفوی شہزادی سے اس کی شادی فوراً نہیں ہوئی، بلکہ برخلاف اس کے اصل رسوم کو ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اس زمانے کی تحریروں میں کوئی اشارہ نہیں کہ خرم کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اور نہ اس کی بعد کی زندگی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے بالآخر کوئی سیاسی وجہ بھی پس پشت نظر نہیں آتی۔

کوئی نہ کوئی ایسی خاص بات ضرور نہ ہو گی جس نے شہنشاہ کا دماغ بدل دیا۔ کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں ضروری ہو جاتا ہے کہ بین السطور کا مطالعہ کیا جائے اور حالات کا جائزہ بعض واقعات کی روشنی میں لیا جائے۔ ۳۰ رمارچ ۱۶۰۷ء کو شیر افگن بنگال میں مارا گیا۔ اس کی بیوی مہرالنسا قصر شاہی میں بلائی گئی۔ یہاں آنے پر اس کو ملکہ سلیمہ بیگم کی خدمت میں جگہ دی گئی گمان غالب ہے کہ اس کے کچھ ہی دن بعد جہانگیر نے اسے دیکھا۔ اس پر عاشق ہو گیا اور اپنی تمنا کی درخواست مستقل مزاجی سے پیش کرنے لگا۔ جب وہ اس غیر معمولی طور سے اس جذباتی خاتون کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام ہوا تو فطرتاً اس کو دوسری تدبیریں کام میں لانی پڑیں۔ جہانگیر اس کو دھمکی دے سکتا تھا، کہ

اس کو برطرف کر کے اس کی بیبیتی کو صدمہ پہنچا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی سنجیدگی کا بھی اظہار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے لڑکے کی نسبت ایرانی شہزادی سے کر دی۔ لیکن جب یہ تدبیر بھی راس نہ آئی تو اس نے شاہزادے کی شادی ۲۹ر اکتوبر سنہ ۱۶۱۰ء کو رچائی۔ وہ خود شہزادے کے گھر گیا رات بھر وہاں رہا۔ اکثر امراء کو اعزازی خلعت دیے اور گوالیار کے قید خانہ سے بہت سے قیدی رہا کر دیے گئے۔[۲۹]

اس واقعہ کے کوئی پندرہ روز بعد شام کو جہانگیر چیتا کے شکار میں مصروف تھا۔ انوپ رائے شکاریوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے اتفاق سے ایک بڑے درخت کے قریب ایک نیم خوردہ بیل دیکھا اس کے بعد ہی ایک زبردست شیر جھاڑیوں سے نکل پڑا اور تیزی سے گزر گیا۔ انوپ رائے نے فوراً آدمی دوڑائے کہ جہانگیر کو خبر کر دیں۔ جہانگیر گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی تیزی اور جوش میں اس مقام پر آگیا۔ شہزادہ خرم۔ اعتماد رائے اور حیات خاں اس کے ساتھ تھے۔ جہانگیر کا گھوڑا شیر دیکھ کر بھڑکا۔ شیر ایک درخت کے نیچے پناہ لیے ہوئے تھا جہانگیر گھوڑے سے اتر پڑا۔ شہزادہ خرم تھوڑے فاصلہ پر بائیں جانب کھڑا تھا دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ جہانگیر کا پہلا نشانہ خطا ہو گیا لیکن دوسرے نشانہ سے زخمی ہو کر شیر بھاگا۔ میر شکار پر حملہ کیا، اس کو زخمی کر کے اپنی پہلی جگہ چلا گیا۔ مشکل سے ابھی جہانگیر نے نشانہ باندھ کر تیسری بار گولی چلائی ہو گی کہ جنگلی جانور نے ایک خوفناک حملہ کیا شکاری گھبرا گئے ایک دوسرے پر گرنے لگے اور دو تین تو جہانگیر پر سے گزر گئے۔ جہانگیر کو اعتماد رائے اور کمال نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس اثنا میں شیر بائیں طرف مڑا اور اس نے دہشت ناک انداز میں انوپ رائے پر حملہ کر دیا۔ انوپ رائے نے اپنی چھڑی سے اسے مارا لیکن شیر کے بھاری وزن سے مغلوب ہو گیا۔ شیر نے اپنا جبڑا کھولا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اپنے تیز دانت ان میں چبھو دیے انوپ رائے گر پڑا اس کی جان خطرہ میں آگئی مگر آنکھ جھپکانے کی دیر تھی کہ شہزادہ خرم نے تلوار کھینچ کر کمر پر ماری اپنی تیغ خونچکاں نیام میں رکھ لی۔ وہ جانور شدت تکلیف سے گر پڑا کسی اور نے تو نہیں صرف حیات خاں نے شہزادے کے ہاتھ کی صفائی دیکھی۔ جب اس نے جہانگیر سے اس بات کا تذکرہ کیا تو جہانگیر نے اپنے بیٹے کے انکسار کی بڑی داد دی۔ بایں ہمہ شیر نے مزید انوپ رائے کے بھائی کو زخمی کیا اور ایک مشعل بردار کی جان لی۔ اس کے بعد اسے مار گیا۔[۳۰]

سالِ نو کے جشن پر شہزادہ خرم کو دس ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔[۳۱]

ارجمند بانو کے ساتھ خرم کی شادی بالآخر جہانگیر اپنی محبت میں کامیاب ہوا پچیس مئی سنہ ۱۶۱۱ء کو اسکی

شادی مہرالنساء سے ہوگئی اس نے بیوی کو نور محل کا خطاب دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شہنشاہ کی آنکھ کا نور ثابت ہوئی۔ حرم میں اس کا داخل ہونا دربار کی زندگی میں ایک نئی طاقت کا اضافہ تھا۔ آہستہ مگر مستقل طور پر اس نے اپنا اثر گوشہ گوشہ پر قائم کر دیا۔ ابتدا ہی سے اس کی نظر شہزادہ خرم پر تھی لیکن اپنی بھتیجی کی خوشی وہ خرم کے ہاتھوں میں اس وقت سونپنا چاہتی تھی جب وہ یہ سمجھ لے کہ اس کا عروج ملکہ کی امداد پر منحصر ہے۔ اس لیے اس نے ۲۷ مارچ ۱۶۱۲ء کو خرم کو بارہ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار رکھنے کا منصب عطا کیا[۴۲]۔ تخمیناً چار ہفتہ بعد طویل مدت کی نسبت شادی میں تبدیل ہو گئی۔

جشن شادی

دولھا اور دلھن کے دونوں والدین کے لیے واقعی بڑی خوشی کا دن تھا۔ چنانچہ یہ جشن بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ ماحول کو روشن اور خوشنما بنانے میں ذرا بھی اخراجات میں تکلف نہ کیا گیا۔ دن کو شاہانہ جلوس اور شب کو قیمتی آتشبازی نے جشن کی دلکشی بے پناہ بڑھا دی۔ آگرہ کا پورا شہر جشن میں شامل تھا۔ یہ جشن شادی قریب ایک مہینہ تک منایا گیا۔ ایک مہینے کے بعد جہانگیر اپنے لڑکے کے گھر شادی میں حصہ لینے کے لیے گیا۔ شہزادہ نے باپ کو نذریں گذاریں۔ بیگمات کو جواہرات دیے اور امراء[۴۳] کو خلعت اعزاز عطا کیا۔

اس کی دوسری بیویاں

شہزادہ خرم کی تیسری بیوی شاہنواز خان ابن عبدالرحیم خان خاناں کی لڑکی تھی۔ جب وہ دکن[۴۴] میں تھا تو یہ شادی ۲۳ اگست ۱۶۱۷ء کو ہوئی۔ یہ اتحاد بلاشبہ سیاسی نظریہ سے ہوا۔ شہزادہ میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کے مستقبل کی حرکات و سکنات کا مرکز دکن ہوگا۔ وہاں کے معاملات سے بے اصول خان خاناں سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا۔ اس کی بے دریغ امداد حاصل کرنے کے لیے ازدواجی رشتہ بہترین طریقہ معلوم ہوا۔ علاوہ بریں اس کا لڑکا شاہ نواز خاں غیر معمولی ذہن کا نوجوان تھا۔ خرم چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ذاتی مصاحبوں کی تعداد سمجھ بوجھ کر وہ بڑھا رہا تھا۔

اولاد

پہلی بیوی سے شہزادہ خرم کے ایک لڑکی ۱۲ اگست ۱۶۱۱ء میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام پرہیز بانو رکھا گیا اس کی پرورش رقیہ بیگم[۴۵] نے کی اس کی دوسری بیوی سے چودہ اولادیں تھیں جن میں سے سات بچپن ہی میں مرگئیں، جو سات بچیں وہ حسب ذیل ہیں۔

جہاں آرا بیگم	ولادت	۲۳ مارچ ۱۶۱۴ء بمقام اجمیر
دارا شکوہ	ولادت	۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء بمقام اجمیر
شاہ شجاع	ولادت	۲۳ جون ۱۶۱۶ء بمقام اجمیر

روشن آرا بیگم	ولادت	۲۴ ر اگست ۱۶۱۷ء بمقام برہان پور
اورنگ زیب	ولادت	۲۴ ر اکتوبر ۱۶۱۸ء بمقام دوحات
مراد بخش	ولادت	۲۹ ر اگست ۱۶۲۴ء بمقام روہتاس
گوہر آرا بیگم	ولادت	۷ رجون ۱۶۳۱ء بمقام برہان پور

خرم کا کردار

جہانگیری حکومت کی تاریخ زیادہ تر شہزادے خرم کی درخشاں فتوحات کا ایک دفتر ہے دنیائے شہرت و عروج میں اس کے شہابی عروج نے ہمعصروں کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس کی عوامی زندگی کی ابتدا باپ کی نوازش اور سوتیلی ماں کی امداد سے شروع ہوئی۔ اگرچہ جوان سال تھا لیکن اس نے پختہ کاروں کی ذہانت کا ثبوت دیا اس کے دلکش طور طریقے، مضبوط چال چلن، اس کی فرض شناسی اور دلیرانہ ہمت کا امتزاج اس کے کامیاب کردار کے ضامن تھے۔ اس کے بھائیوں اور حریفوں کے کردار کے تقابل نے اس کو برتری عطا کی۔ اور ان کی ناکامیوں نے ایک سے زیادہ بار اس شہرت میں اضافہ کیا۔ اس کو موقعہ کا انتظار نہیں کرنا پڑا، وہ خود بخود اسے ملتے رہے اس کے جوہر کی پہلی آزمائش میواڑ کے تاریخی میدان میں ہوئی۔

خرم کی میواڑ کی جنگ

راجپوتانہ کی تمام حکومتوں میں میواڑ ایک ایسی حکومت تھی جس نے سب سے زیادہ دیر تک مغل سلطنت کی بے پناہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اکبر کی کوششوں نے اس کے وجود کو مجروح ضرور کیا لیکن ختم نہیں کر سکیں۔ جہانگیر نے باپ کی تقلید میں اپنی حکومت کے اولین عہد میں شہزادہ پرویز کو رانا کے خلاف میدان جنگ میں بھیجا لیکن خسرو کی بغاوت نے جہانگیر کو مجبور کیا کہ وہ اس کے لڑکے کو واپس بلالے۔ بعد ازاں مہابت خان، عبداللہ خان، فیروز جنگ اور راجہ باسو، یکے بعد دیگرے میواڑ بھیجے گئے لیکن ان کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ بعد ازاں ۱۶۱۳ء میں خان اعظم عزیز کوکہ یہاں کی جنگی کارروائیوں کا سرغنہ بنایا گیا لیکن وہ بھی اوروں کی طرح بہت کم کامیاب ہوا۔ اس کی تجویز سے جہانگیر خود اجمیر گیا اور وہاں ۱۶۱۳ء کی خزاں میں مقیم ہوا۔ ۱۶۱۴ء کی ابتدا میں اس نے شادمانی و کامیابی کے ساتھ شہزادہ خرم کو خان اعظم کو سہارا دینے کے لیے بھیجا۔ بارہ ہزار فوجی اس کے زیر حکم تھے۔ اور فدائی خان اس فوج کا افسر خزانہ مقرر ہوا۔ محاذ جنگ پر پہنچ کر شہزادے نے محسوس کیا کہ عزیز کوکہ کے ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہے۔ نوجوان جرنل کو اپنے بزرگ سپہ سالار کی تاخیری کارروائیوں نے برانگیختہ کر دیا۔ اس نے فوراً اپنے باپ سے شکایت کی، جہانگیر نے ابراہیم حسین کو بھیجا کہ خان اعظم کو وفاشعاری کی ضرورت سے متاثر کرے لیکن اس نے اپنا راستہ نہ بدلا۔ شہزادے خرم نے اس کو نظربند کر دیا اور اپنی کارروائی کی اطلاع باپ کو دی۔ جہانگیر نے مہابت خاں کو بھیجا کہ قیدی کو اجمیر لائے۔

اُس کا حوصلہ

یہ پہلا موقعہ تھا جہاں خرم کے جارحانہ حوصلہ کا اظہار ہوا۔ وہ اپنی شان و شوکت میں کسی اور کو حصّہ دینا نہیں چاہتا تھا اس کی خواہش تھی کہ اپنے ذرائع اور طریقے سے کامیابی حاصل کرے۔ اس لیے بلا کسی پس و پیش کے وہ لڑائی میں منہمک ہوگیا۔ دشمن پر دائیں بائیں سے حملہ کرنے لگا۔ اپنی سرگرمی اور دماغی یکسوئی سے اس نے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کیا۔ ساتھیوں نے بڑے صدق دل سے اس کا ساتھ دیا وہ پہاڑی علاقہ میں داخل ہوا۔ باوجود اپنے چچا کی مخالفت کے راجہ سورج سنگھ آگ اور تلوار لے کر سہودیاس کے علاقے میں اتر پڑا اور دشمنوں کو اتنا زیر کیا کہ قریب قریب لوگوں کو فاقہ کی نوبت آگئی۔ جگہ بہ جگہ تھانوں کے قیام نے غنیم کے فوری حملوں کو بند کیا اُس نے جنگ جاری رکھی۔ مخالف فوجیوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اور بھوک نے ان کی ہمت توڑ دی۔ آخر کار جب زیادہ لوگ ساتھ چھوڑ کر فرار ہوگئے تو رانا امر سنگھ نے اپنے ان دوستوں کے ذریعہ صلح کی بات چیت شروع کی جو خرم کی فوج مخالف میں تھے۔

رانا کا اطاعت قبول کرنا

قاصدوں کے آنے جانے کے بعد شرائط صلح جلد ہی طے ہوگئیں۔ رانا اپنی آزادی سے دستبردار ہونے پر رضامند ہوگیا جو ایک مدت سے اس کی تمنا کا مرکز تھی ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی راضی ہوگیا کہ وہ بذات خود شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہو۔ لیکن دربار کی حاضری سے اس کو معاف کر دیا گیا۔ دربار میں اس کا لڑکا کرن سنگھ اس کا نمائندہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ چتوڑ کو کبھی مستحکم قلعہ نہ بنائے گا۔ اس صلح نامہ کی توثیق جہانگیر نے کی اور ایک فرمان بھی جاری ہوا جس پر اس کی مبارک ہتھیلی کا نشان ثبت تھا۔ اپنے بہت سے حامیوں کے ساتھ شہزادہ خرم کے حضور میں امر سنگھ حاضر ہوا۔ اس کی واپسی پر اس کے لڑکے نے بھی یہی کیا۔ شہزادہ خرم نے کرن سنگھ کا شاندار استقبال کیا۔ اس کو ایک غیر معمولی خلعت اعزاز، جواہرات سے مرصع ایک تلوار، ایک خنجر ایک گھوڑا معہ طلائی زین اور ایک خاص ہاتھی سے سرفراز فرمایا۔ خرم کے اس فیاضانہ سلوک سے کرن سنگھ اس کا زندگی بھر دوست رہا۔[27]

خرم کا عروج بخت

میواڑ کی تسخیر سے مغل سلطنت کی شان و عظمت میں اضافہ ہوا۔ جہانگیر سے زیادہ کوئی مفتخر اور شہزادہ خرم سے زیادہ مسرور نہ تھا بحیثیت سپہ سالار اس کے باکمال اور اس کی صلاحیت کے مکمل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہ گیا۔ اس کو ایک ابھرتا ہوا ستارہ سمجھا جانے لگا۔ جب وہ اجمیر کے قریب پہنچا جملہ درباری امراء کو حکم ہوا کہ جا کر اس کا استقبال کریں قیمتی تحائف نذر کریں۔ جب شہزادہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تو آخر الذکر مسرت و محبت کے جذبات سے مغلوب ہوگیا، بغلگیر ہوا اس کے رخسار

بوسے لیے اور مخصوص نوازشش و تبریک سے اس کو سرفراز فرمایا۔ لیکن باپ کی تمام عزت افزائی اور درباریوں کی جملہ مدح سرائی سے بھی زیادہ خرم نے جو نعمت اس جنگ میں پائی وہ اس منتخب جماعت کی رفاقت تھی۔ جو اندھیرے اجالے ہر حال میں اس سے منسلک رہی۔ ایسے لوگوں میں سندر داس، ملا شکر اللہ، سیف خاں بارہہ، دلاور خاں، کشن سنگھ اور میر حسام الدین شامل ہیں۔ شہزادہ اب اپنی عظیم قسمت کی دہلیز پر کھڑا تھا جو پہلے ہی سے مقدر ہو چکی تھی۔

باب ۲

شہرت کا ارتقاء

خرم کے منصب میں اضافہ میواڑ کی غیر مہماں نواز پہاڑیوں میں کافی سخت ایام گزارنے کے بعد ان خوشگوار سیرو شکار میں خرم کو آرام ملا جو اس کے باپ نے اجمیر کے ارد گرد خوبصورت علاقے میں فراہم کر دیا تھا۔ اپنی خدمات کے صلہ میں اس کے منصب میں اضافہ ہوا اب وہ پندرہ ہزار ذات اور آٹھ ہزار سوار کا منصب دار ہو گیا۔ اس کا وہی مرتبہ ہو گیا جو اس کے بڑے بھائی پرویز کا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ پُر اثر رتبہ پر پہنچ گیا۔ اس کو فتح نے عظمت دلائی اور نور جہاں کی قائم کردہ جماعت کی کوشش نے صف اول میں کر دیا۔ اب وہ اپنے ہمعصروں اور حریفوں میں نمایاں حیثیت کا مالک ہو گیا۔

خرم شراب سے لب تر کرتا ہے یکم فروری بروز جمعہ ۱۶۱۶ء کو اس کی شمسی سالگرہ اجمیر میں منائی گئی۔ اب وہ چوبیس سال کا ہو گیا تھا لیکن کبھی اس نے شراب سے لب تر نہ کیا تھا۔ اس موقعہ پر اس کے باپ نے مے نوشی پر زور دیا۔ کہا "بابا اب تو صاحب اولاد ہو گیا اور بادشاہ اور بادشاہ کے لڑکے مے نوشی کرتے ہیں۔ آج سونے چاندی میں تیرے تولے جانے کا دن ہے۔ میں تجھ کو شراب دیتا ہوں اور ایسے موقعوں پر مثلاً سال نو اور دوسرے خاص اوقات پر پینے کی اجازت بھی دیتا ہوں لیکن تجھ کو راہِ اعتدال پر رہنا ہے کیونکہ عقلمند لوگ اس حد تک مے نوشی کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ عقل سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ ضروری ہے کہ شراب پینے پلانے سے صرف فائدہ اٹھایا جائے۔ شہزادہ کو مجبوراً باپ کا کہنا ماننا پڑا۔ اگرچہ بعد ازاں ایک موقع پر اس نے توبہ کی اب کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ مگر یہ توبہ صرف توڑے جانے کے لیے تھی۔

دکن میں صورتِ حال اگرچہ جہانگیر اجمیر میں مزے سے وقت گزار رہا تھا لیکن سلطنت کے جاگی

حالات سے بے خبر نہیں رہا۔ وہ دکن کے حالات کا غور سے مطالعہ کر رہا تھا اور اپنے افسروں کی ناکامی پر مایوس تھا۔ اس نے خود وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اسی خیال سے عبدالکریم معموری کو مانڈو روانہ کیا تاکہ وہ اس کے لیے ایک نیا مکان تعمیر کرے اور پرانے حکمرانوں کی تعمیرات کی مرمت کرا دے۔ لیکن کچھ دنوں کے لیے اس نے اپنا جانا اس لیے ملتوی کیا کہ خانخاناں کی ان جدید کارگزاریوں کا نتیجہ دیکھ لے جو کھوئی ہوئی مغلیہ عظمت کے دوبارہ برقرار کرنے کے لیے وہ کر رہا ہے۔ خانخاناں کو حصول مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی لیکن افسروں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے اس کی ترقی کی رفتار سست ہو گئی۔ علاوہ بریں اس کی رشوت ستانی کی اطلاعات اب تک دربار میں پہنچ رہی تھیں اس لیے جہانگیر کو یقین آ گیا کہ اس منصوبہ کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے جو اس نے پہلے سوچا تھا۔

خرم کا تقرر دکن کے لیے

منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے خرم کا منصب بڑھا دیا گیا اب وہ بیس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کا منصب دار بنا دیا گیا۔ پرویز کو دکن سے ہٹا کر الہ آباد بھیج دیا گیا اور اس کی جگہ شہزادہ خرم کو نامزد کیا گیا اس لیے کہ اس کی اصابت رائے اور حالات سمجھنے کی صلاحیت مسلّم تھی اولاد اکبر کے لیے جہانگیر کا یہ بڑا نامنصفانہ فیصلہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عمل اقدام میں اور ماتحتوں کو کام پر لگانے کی صلاحیت اس میں کم تھی لیکن یہ بڑی زیادتی تھی کہ دکن میں ناکامیابی کا سارا الزام اسی کے سر تھوپا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرویز کی مناسب امداد کبھی نہ کی گئی۔ وہ برائے نام سپہ سالار تھا۔ اصل اختیارات اس کے ماتحتوں کے ہاتھ میں تھے وہ اس کو خاطر میں نہ لاتے تھے جہانگیر کو چاہیے تھا کہ از روئے انصاف اس کو بھی وہی موقعہ دیتا جو اس نے اپنے چہیتے بیٹے کو دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرویز کی ترقی کے امکانات کی قربانی چھوٹے بھائی کو عروج دینے کے لیے کی گئی۔

خرم عبداللہ خاں کی وکالت کرتا ہے

شہزادہ خرم کو موقعہ دیا گیا کہ وہ دکن کے حالات کی تہ تک پہنچ سکے۔ جہانگیر نے وہاں کے سارے اختیارات اسی کو دیدیے۔ یہ وہ وقت تھا جب عبداللہ خان فیروز جنگ پر بے اعتدالی کے الزامات لگائے گئے۔ وہ گجرات بلا لیا گیا۔ پراگندہ خاطر ہونے کی وجہ سے وہ اجمیر کے لیے پیدل چل پڑا۔ یہاں پہنچ کر اس نے خرم کی ہمدردی حاصل کی خرم نے باپ سے اس کی سفارش کی۔ اس کے قصور معاف ہوئے۔ حکم ہوا کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ دکن جائے۔ وہ ایک تجربہ کار افسر تھا اور خرم کی خوش قسمتی تھی کہ اس موقعہ پر اس کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ وہ ایسے علاقے میں جا رہا تھا جس سے اُسے واقفیت نہ

تھی۔ وہاں کے افسر اس کے دشمن تو نہ تھے مگر بے گانگی ضرور تھی۔ سوال یہ ہے کہ عبداللہ خاں جیسے آدمی کی امداد ایسے حالات میں کارآمد نہ ہوتی؟

خرم کو شاہ کا خطاب ملا

روانہ ہونے سے پہلے شہزادہ نے اپنے چیدہ فوجیوں کی پریڈ شہنشاہ کے سامنے ایوان عام میں دکھائی۔ جہانگیر اتنا مطمئن ہوا کہ اس نے خرم کو شاہ کا خطاب دیا یہ ایک نادر اعزاز تھا۔ اس سے پہلے کبھی کوئی شہزادہ حکمراں بادشاہ کی زندگی میں شاہ نہیں کہا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس اقدام میں جہانگیر کا جذبۂ فرد کار فرما ہوا ہو۔ ایرانی سفیر[۹] دربار میں موجود تھا۔ شاید اسی کو یہ دکھانا تھا کہ جہانگیر اس ایرانی سفیر کے آقا سے عظیم تھا کیونکہ اس نے وہی خطاب اپنے ایک لڑکے کو دیا جو ایران کے بادشاہ کا ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ نفسیاتی عمل اس کے اس خطاب کا نتیجہ ہو جو الہ آباد[۱] میں بحیثیت شہزادہ اس کے دماغ میں آیا تھا۔ بہر حال یہ خطاب دینے والے اور پانے والے دونوں کے لیے باعث افتخار تھا۔

دکن جاتا ہے

فتح و شہرت کے لیے باپ کی پُرجوش دعاؤں[۱] کے ساتھ ۱۴ر اکتوبر ۱۶۱۶ء کو شاہ خرم اجمیر سے روانہ ہوا۔ علاوہ دلیر فرد زجنگ کے اور بہت سے افسر ہمرکاب تھے ان میں سب سے زیادہ اہم راجہ سورج سنگھ اور ... نت خاں تھے۔ معتمد خاں فوج کا افسر خزانہ[۱۲] تھا۔ راستہ میں بمقام دودگپور[۱۳] رانا امر سنگھ سے ملاقات ہوئی جس نے پندرہ سو گھوڑوں کا رسالہ کرن سنگھ کی ماتحتی میں ساتھ کر دیا۔ چل کر وہ دریائے نربدا تک پہنچا۔ یہاں دکن کے افسروں بشمول خان خاناں خان جہاں اور مہابت خاں نے اس کا استقبال کیا۔ سرحد پر بغیر زیادہ قیام کیے وہ سیدھے برہان پور[۱۴] کوچ کر گیا اس مقام پر وہ ۶ر مارچ ۱۶۱۷ء کو پہنچا۔

دکن میں امن

اس کی آمد سے دکن کے سیاسی ماحول میں حسب خواہش تبدیلی ہوئی۔ عادل شاہ اور ملک عنبر نے دیکھا کہ ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک رہی ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے شہزادۂ خرم کے اشارۂ صلح کو لبیک کہا۔ اور پندرہ لاکھ روپیہ مالیت کے تحفے نذر کیے۔

ملک عنبر نے بالاگھاٹ واپس کیا اور احمد نگر اور دوسرے قلعے سپرد کر دینے پر رضامند ہو گیا۔ اس طرح صلح و آشتی کے ساتھ فتح حاصل ہو گئی۔ اسلحہ سے جو کچھ اب تک حاصل نہ ہو سکا تھا وہ تھوڑے وقفہ میں صرف حکمت عملی سے مل گیا۔ اس کامیابی کا سہرا شاہ خرم کے سر رہا۔ ہیو اڑ میں وہ دانشمند سپہ سالار نمایاں ہوا اور دکن میں ہوشیار سیاست داں ثابت ہوا۔ نئے علاقوں کے نظم و نسق کا معقول انتظام کرنے کے بعد خانخاناں اور شاہ نواز خاں کو ذمہ دار بنا کر وہ شمال کی طرف باپ سے ملنے چلا گیا۔

جہانگیر کی مسرت

مانڈو میں جہانگیر اپنے لڑکے کی کارگزاری کے نتائج کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سید عبداللہ بارہہ انتظامات کی خبر لایا۔ فتح کا جشن منانے کے لیے نقارے بجائے گئے۔ اس کے بعد شہزادے کا ایک خط ملا جس میں یہ خبر تھی کہ افضل خاں اور راجہ راماں، عادل شاہ کے سفیروں کے ساتھ حاضر خدمت ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ جواہرات ہاتھی اور گھوڑے اتنے لائے تھے کہ ایسے نذرانے کسی وقت کسی حکومت کو نہیں ملے تھے۔ شہزادہ خود ۱۲ر اکتوبر ۱۶۱۷ء کو پہنچا۔ دربار عام میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس نے مناسب طور سے سلامی اور زمین بوسی کی رسوم ادا کیں۔ جہانگیر نے اسے جھروکہ میں بلایا بے پناہ عنایت و مسرت سے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ محبت کے ساتھ بغلگیر ہوا۔

شاہ خرم کا نیا خطاب

شاہ خرم کو تخت کے قریب جگہ ملی۔ تیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کا عدیم المثال منصب ملا۔ اور ساتھ ہی ساتھ شاہ جہاں کا خطاب بھی عطا ہوا۔ اس پر باپ نے بے دریغ زر و جواہر نثار کیے۔ نورجہاں نے اس موقعہ پر شاندار دعوت کی۔[۱]

شہزادہ کے بعد ایسے افسروں کی باری آئی جو دکن سے اس کے ساتھ اس لیے تھے کہ شہنشاہ کو نذریں گزاریں۔ سب سے پہلے خان جہاں لودی نے ایک ہزار روپیہ اور ایک ٹوکری بھر کے جواہرات بطور پیشکش نذر دی۔ اس کے بعد مہابت خان راجہ بھاؤ سنگھ داراب خاں ولد خان خاناں سردار خان برادر عبداللہ خاں دیانت خان شہباز معتمد خان بخشی اور راودے رام دکنی نے نذریں پیش کیں۔ تحفے قبول کیے گئے اور ان کی خدمات کی تعریف ہوئی۔

شاہ جہاں کے تحفے باپ کے لیے

ڈیڑھ ماہ کے بعد شاہ جہاں نے باپ کو وہ بیش بہا جواہرات اور قیمتی اشیاء دکھائیں جو وہ دکن سے بادشاہ کے لیے لایا تھا۔ ۲۰ر نومبر ۱۶۱۷ء یہ سب سامان ایوان خاص میں جھروکہ کے سامنے ترتیب سے آراستہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ طلائی و نقرئی ساز و زین کے ساتھ گھوڑے اور ہاتھی بھی کھڑے کیے گئے۔ بیٹے کی خوشنودی کے لیے جہانگیر نیچے آیا تاکہ چیزوں کو قریب سے بالتفصیل دیکھ سکے۔ قیمتی موتی آبدار ہیرے خوشنما لعل اور خوش رنگ و نازک زمرد سب ہی کچھ اس سامان میں نظر آیا لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ پانچ کوہ پیکر اور متناسب اعضاء کے ہاتھی تھے۔ مجموعی حیثیت سے سارے سامان کی مالیت بائیس لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ تھی۔ اس میں سے دو لاکھ روپے شہزادے نے اپنی سوتیلی ماں نورجہاں کو نذر کیے۔

گجرات کا سفر

دکن کے مسائل فی الحال حل ہو گئے تھے۔ جہانگیر کو ہاتھی کے شکار کے شوق نے گجرات

کے سفر پر آمادہ کیا۔ مریم زمانی اور دوسری بیگمات اور حرم کے دوسرے اشخاص و سامان کو آگرہ روانہ کر دیا خود احمد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ نورجہاں اور شاہجہاں ساتھ تھے۔ سفر تفریحی مشغلہ تھا راستہ میں دھار اور کھمبے کی سیر کی گئی۔ بالآخر بادشاہ منزل مقصود پر[20] ۵ جنوری ۱۶۱۸ء کو پہنچا۔

جام پر فتح

دکن کی کامیابی کے صلہ میں گجرات کا صوبہ شاہجہاں[21] کو دیا گیا۔ اس کے جزیرے نما حصہ کے ایک طرف ایک جزیرہ ہے جس کو کچھ کہتے ہیں۔ اس کے حکمراں کو بہارا کہتے تھے اس خاندان کا ایک دوسرا شخص ہے وہ جام کہلاتا تھا وہ کاٹھیاوار کے شمالی کنارے پر قابض تھا۔ ان دونوں نے عارضی طور پر اکبر کے دور میں اطاعت قبول کر لی تھی، لیکن بعد میں آزاد ہو گئے۔ شاہجہان نے راجہ بکرماجیت کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ جام پہلے زیر ہوا۔ مارچ ۱۶۱۸ء کو جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور چار ماہ بعد دوسرا حاکم بھی حاضر ہوا[22]۔

شاہجہاں کی علالت

گجرات کا چند روزہ قیام جہانگیر کو پسند نہ آیا۔ وہاں کی حبس اور گرد سے وہ پریشان ہو گیا۔ شاہجہاں اور وہ دونوں مئی ۱۶۱۸ء میں بیمار ہو گئے۔ شاہجہاں اتنا کمزور ہو گیا کہ دس دن تک وہ اپنے باپ کو سلام کرنے کے لیے نہ حاضر ہو سکا[23]۔ برسات کے زمانہ میں وہاں سے سفر کرنا ممکن نہ تھا۔ برسات کے بعد جہانگیر ۲ ستمبر ۱۶۱۸ء کو آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ مالوہ ہوتے ہوئے وہ ۱۶۱۹ء جنوری کی ابتدا میں دارالسلطنت کے قریب پہنچا۔ شہر میں طاعون تھا جہانگیر نے فتح پور میں رک جانے کا فیصلہ کیا۔ ۷ جنوری کو وہ فتح پور پہنچا اسی دن شاہجہاں کی اٹھائیسویں شمسی سالگرہ منائی گئی۔ ۹ دن بعد جہانگیر نے اسے اُسے محل کی سیر کرائی اور اکبر کی بنوائی ہوئی ساری عمارتوں کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

شاہجہاں کی ماں کا انتقال

آٹھ اپریل بروز جمعہ جب دربار کا قیام نورمنزل میں تھا شاہجہاں کی ماں کا انتقال ہوا۔ دوسرے دن جہانگیر، شاہجہاں کے گھر ماتم پرسی کے لیے گیا اور اسے اپنے ساتھ اپنے محل لے گیا۔ دوسرے دن شہنشاہ سرکاری طور پر دارالسلطنت میں داخل ہوا۔ یہاں چھ مہینہ قیام کیا۔ اکتوبر میں آگرہ سے کشمیر روانہ ہوا۔ حسب معمول سفر سست رفتار اور آسان تھا راستہ میں شکاری تفریح کا انتظام ہوا، دعوتیں ہوئیں۔ پالم پر جہانگیر نے دو ہرن اپنی بندوق سے مارے اس طرح تفریحی رفتار سے یہ لوگ ۱۰ مارچ ۱۶۲۰ء کو سری نگر پہنچے۔ جہانگیر نے ہندوستانی بہشت کا پورا لطف اٹھایا۔ اگرچہ کبھی کبھی دکن کی خبروں سے پراگندہ خاطر ہوا۔ دکن کے حالات کی وجہ سے اکتوبر میں کشمیر بالآخر چھوڑنا پڑا۔

کانگڑا کی فتح

اس اثنا میں ایک خبر نے اس کو حقیقی اطمینان دلایا ۱۶۱۵ء سے مسلسل حملے کانگڑا کے مشہور قلعہ پر ہوتے رہے۔ کوئی نہ کوئی وجہ ایسی ہو جاتی تھی کہ شاہی فوجوں کا حملہ ناکامیاب ہو جاتا۔ اگست ۱۶۲۰ء میں شاہجہاں نے اس مہم کو ختم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس نے راجہ بکرماجیت کو قلعہ مسمار کرنے کے لیے بھیجا۔ آخر الذکر نے پہلے قلعہ کے راستے بند کیے اس کے بعد محاصرہ سخت تر کر دیا۔ یہاں تک کہ فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

دوبارہ دکن

لیکن سلطنت کے دوسرے حصہ میں حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ شاہجہاں کی دکن کی فتح جولاف وگزاف کا بھی سبب تھی۔ ایک کھوکھلی صلح معلوم ہوئی، جو معاہدے نظام شاہ اور عادل شاہ نے کیے تھے ان میں رتی بھر ثبات نہ تھا۔ وہ حسب موقع و ضرورت توڑ دینے کے لیے گئے تھے اور اب وہ وقت آ پہنچا تھا۔ شہنشاہ بہت دور کشمیر میں تھا اور اس کا بہادر لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ درجہ اول کے افسروں، سالاروں کی اچھی خاصی تعداد کانگڑا میں مصروف تھی۔ دکن میں مغل لوگوں کے سپہ سالار کو کمک پہنچنے کے بہت کم امکانات تھے۔ اس لیے احمد نگر کی کھوئی ہوئی حکومت و عظمت واپس لینے کے لیے ملک عنبر نے اپنی جدوجہد شروع کی۔

ایک مشترک دشمن کے خلاف ملک عنبر کو دو اور سلطنتوں کی امداد حاصل ہو سکی۔ قطب شاہ نے روپیہ اور عادل شاہ نے اپنے آدمی کمک کے لیے دیے۔ ملک عنبر نے ۵۰ ہزار کی فوج سے مغلوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ اس نے حال ہی میں ایک زبردست رسالہ کو منظم کیا تھا۔ اس رسالے نے گوریلا طریقہ جنگ سے دشمن کو پریشان کر دیا۔ آمد و رفت کے ذرائع کٹ گئے۔ سامان خورد و نوش آنا بند ہو گیا۔ مغلوں کو بالاگھاٹ کے باہر کر دیا گیا۔ شاہی فوج مہکر تک پسپا ہو گئی اور وہاں تین مہینے تک دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ لیکن غلہ کی کمی سے مجبور ہو کر وہ اور پیچھے ہٹی۔ اس پسپائی نے دکنی فوجوں کو ہمت دلائی انھوں نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ لیکن غلہ کی کمی سے مجبور ہو کر برہان پور آ گئی بالاگھاٹ اور بیسن گھاٹ ملک عنبر کے قبضے میں آ گئے۔ اب صرف برہان پور اور احمد نگر باقی رہ گئے۔ دکنی فوجیں ان پر بھی چڑھائی کیے ہوئے تھیں۔

برہان پور میں خانخاناں بے حد خستہ حال تھا۔ وہ بادشاہ کو درخواست پر مدد کے لیے بھیج رہا تھا اپنے آخری مراسلہ میں اس نے لکھا کہ اب مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس نے اپنے   کی مثال عزیز کوکہ سے دی جو اکبر کے عہد میں گجرات میں گھر گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بڑے دردناک انداز میں جہانگیر سے درخواست کی کہ آپ مجھے اسی طرح بچائیے جس طرح آپ کے باپ نے دودھ شریک

بھائی کو بچایا تھا ورنہ اپنے لشکر کو قربان کرنے کے بعد میں بھی جوہر کی رسم ادا کروں گا۔ جب یہ درخواست جہانگیر کے سامنے پیش ہوئی۔ اس کا دل تڑپ اٹھا اس کو اپنے اتالیق کا بڑا احترام تھا؛ یاد آیا کہ اس کے باپ نے بڑی نازبرداری سے اس کو پروان چڑھایا تھا۔ اب تک تو کنگڑا کے جھگڑے نے اُسے معذور رکھا تھا وہ کوئی موثر مدد دکن نہیں بھیج سکا۔ لیکن اب وہ جھگڑے ختم ہو گئے تھے اور افسروں کو موقعہ تھا کہ وہ دکن جاسکیں۔

شاہجہاں دوبارہ بھیجا گیا

سوال یہ تھا کہ اس مہم کا رہنما کون ہو۔ جہانگیر کی نظر انتخاب میں بجز شاہجہاں کے کوئی اور نہ تھا وہ قابل اور محنتی تھا اور ضروری تجربات بھی رکھتا تھا۔ جب شہنشاہ نے اس کو خان خاناں کے مراسلات دکھائے تو وہ فوراً تیار ہو گیا لیکن اس بار دربار میں اپنا مرتبہ بہت محفوظ نہ پاتا تھا۔ نورجہاں کے برتاؤ میں رشک کی لہر نظر آرہی تھی۔ باپ بھی تلوّن مزاج محسوس ہو رہا تھا وہ جماعت جس نے اب تک اس کی تائید کی تھی اس میں بھی خلل اندازی کے آثار نظر آئے حالانکہ وہ لوگ اب بھی اس کا پہلے کی طرح احترام کرتے تھے۔ خسرو کی طرف ازسرنو نرم روّیہ اور یہ افواہ کہ وہ نورجہاں سے قریب تر ہو رہا تھا اور اس کے باپ کی گرتی ہوئی صحت، یہ سارے خیالات شاہجہاں کو محتاط بنانے کے لیے کافی تھے۔ اسی لیے اس نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ خسرو کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کی درخواست منظور ہو گئی۔

مے نوشی ترک کرتا ہے

شاہجہاں کے ذہن میں یہ مہم عدیم المثال اہمیت کی حامل اور دشوار طلب تھی۔ اس کی طبیعت میں خودنمائی کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ اس اہم صورت حال کو نمایاں کرنے اور عوامی ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی عمل کرنا ضروری نظر آیا۔ شاہجہاں نے ہمیشہ بابر اور تیمور کو اپنے لیے مثالی نمونہ بنایا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے ان ہی بزرگوں کی طرح توبہ کی کہ وہ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا شراب کا سارا ذخیرہ دریائے چنبل میں پھنکوا دیا اور طلائی و نقرئی قیمتی جام توڑوا کر غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دیا۔

اجین پہنچتا ہے

مانڈو کے سپہ سالار محمد تقی نے اجین میں شاہجہاں کو خبر بھیجی کہ منصور کی قیادت میں آٹھ ہزار دکنی فوج نے نربدا پار کر لیا ہے۔ آس پاس کے اضلاع کو لوٹ کر اب قلعہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور قلعہ محفوظ نہیں ہے شاہجہاں نے محمد تقی کی امداد کے لیے ابوالحسن اور بیرم بیگ کو بھیجا۔ محمد تقی نے جب یہ سنا کہ کمک راستہ میں ہے تو قلعہ

باہر نکل پڑا، دشمن پر حملہ کر دیا۔ مار کر بھگا دیا۔ امدادی فوج کے آجانے پر محمد تقی نے جارحانہ حملے شروع کر دیے اور چار کروہ تک اس کا پیچھا کیا۔ شہنشاہیت کے حامی واپس آئے اور اکبرپور میں خیمہ زن ہوئے۔[29]

مانڈو میں شاہجہاں کو خانخاناں کا ایک مراسلہ ملا جس میں یہ رائے دی گئی تھی کہ وہ جہاں ہے وہیں ٹھہر جائے، کیونکہ وہ خود برہان پور میں اس طرح گھر گیا ہے کہ آدمیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا اور دشمن کی تعداد ساٹھ ہزار ہے۔ شاہ جہاں نے یہ تجویز نہ مانی۔ اس کی فتح کا راز تیزی اور اچانک حملے میں تھا۔ اس کے خلاف وہ غنیم کی کثرتِ تعداد کی مخالفت بھی خاطر میں نہ لاتا۔ خوش قسمتی سے ٹھیک موقعہ پر عبداللہ خاں فیروز جنگ دو ہزار آدمیوں کا امدادی دستہ کالپی سے لے کر آ گیا۔ شاہجہاں کے پاس اب کل ملا کر اٹھارہ ہزار آدمی تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۶۲۱ء کو وہ جنگی تیاریوں کے ساتھ مانڈو سے برہان پور کے محاذِ جنگ کی طرف چل پڑا۔ عبداللہ خاں ہراول فوج کا سرغنہ تھا۔ راجہ وکرم جیت دست راست پر تھا اور ابوالحسن دستِ چپ پر شہزادہ خود قلبِ لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس طرح مجتمع و منظم طریقہ پر دریائے نربدا سے بغیر کسی حادثہ کے ساری فوج پار اتر گئی۔ جب شاہجہاں برہان پور کے قریب پہنچا تو خانخاناں تن تنہا اس سے ملنے آیا کیونکہ باقی لوگوں کو قلعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ آدمیوں کی قلت کی خبر پا کر دشمن قلعہ فتح کرنے کی کوشش کرے۔[30]

برہان پور میں داخل ہوتا ہے

شہزادہ ۴ اپریل ۱۶۲۱ء کو برہان پور میں داخل ہوا۔ لیکن دکن کی سپاہ نے اس کی آمد کا کوئی خیال نہ کیا۔ شہر کے اردگرد اپنی جگہ پر قدم جمائے رہی۔ یہاں مشورتی کونسل میں خانخاناں نے ایک بار پھر تاخیری رویہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس نے سمجھایا کہ فی الحال دشمن کو بھگا کر دریا پار کر دینا چاہیے اور بالاگھاٹ واپس لینے کے لیے برسات ختم ہونے تک مزید حملے ملتوی رکھے جائیں۔ اس تجویز کی عبداللہ خاں اور داراب خاں نے مزید تائید کی لیکن شہزادے نے یہ تجویز رد کر دی بلکہ حکم دیا کہ دکن کی متحدہ حکومتوں کی فوجوں پر فوری اور مؤثر حملہ کرنے کی تیاری کی جائے۔[31]

دکن میں جنگ

شاہجہاں کے لیے اب فوجوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا سوال ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کے حل کرنے کے لیے اس نے بخشیوں کو حکم دیا کہ ان جاگیرداروں کو طلب کیا جائے جن کی زمینیں دشمن نے چھین لی ہیں۔ ان کو زرِ کثیر عطا کیا گیا۔ تاکہ جتنی جلد ممکن

جو اپنا حصہ پورا کریں۔ اس طرح کوئی تیس ہزار آدمی، تھوڑے وقفہ میں بھرتی کر لیے گئے۔ یہ لوگ پانچ رجمنٹ میں تقسیم کر دیے گئے ان میں دو دستے ایسے تھے جو خاص شہزادے کے آدمیوں پر مشتمل تھے۔ اور راجہ بھیم اور راجہ وکرم جیت ان میں سے ہر ایک کے کمانڈر تھے۔ بقیہ تین رجمنٹ میں سے ایک داراب خان کے اور ایک عبداللہ خاں کے اور تیسری ابوالحسن کے سپرد ہوئی۔ نام کے لیے سپہ سالار داراب خاں تھا۔ مگر حقیقتاً اصل اختیارات راجہ وکرماجیت کے ہاتھ میں تھے۔ افسروں کو مشورہ کرنا ہوتا، تو داراب خاں کے خیمہ میں باتیں کرتے۔

چھاپہ ماروں کی حرکات وسکنات کے پیش نظر ضروری تھا کہ ہر ممکن احتیاط برتی جائے۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ ہر رجمنٹ چار ٹکڑوں میں تقسیم کی جائے اور باری باری ہر دستہ فوج کے سامنے اور عقب کے حصوں کی حفاظت کرے۔ جس وقت مغلوں کی فوج آہستہ آہستہ دریا کی طرف بڑھ رہی تھی اسی وقت دکن سیاہ نے یاقوت خاں کی قیادت میں اس دستہ کی پشت پر حملہ کر دیا جس کا محافظ ابوالحسن تھا۔ ایک مختصر مگر ابھی خاص جھڑپ کے بعد دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔ دریا پار ملکا پور میں شاہی سپاہ پر پھر حملہ ہوا مگر پھر پسپا کر دیا گیا۔

ایسے دائیں بائیں آگے پیچھے حملے ہوتے رہے۔ مغلیہ فوج بدقت تمام بالاگھاٹ میں داخل ہوئی۔ پار اُترنے میں گاہے گاہے دونوں فوجوں میں جھڑپ ہوتی رہی۔ بالآخر شاہی فوج بمقام کھرکی پہنچ گئی یہاں غارتگری کے جذبہ سے متاثر ہو کر انھوں نے وہ تمام عمارتیں مسمار کر دیں جو گزشتہ پندرہ سال میں تعمیر ہوئی تھی۔ ۵ رمئی ۱۶۲۱ء میں شاہی فوج دولت آباد کی طرف اس مقصد کے لیے روانہ ہوئی کہ ملک عنبر پر دباؤ ڈال کر اس کو اطاعت پر مجبور کر دے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کا راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ دکن والوں نے ہر طرف سے اچانک حملہ کرنا شروع کر دیا۔ مغلوں کو انھوں نے سنگین سبق سکھایا اور دکھایا کہ انھوں نے جس مقصد کے پیش نظر قدم اٹھائے ہیں اس کا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ دولت آباد لینے کا ارادہ مغلوں کو ترک کرنا پڑا

شاہی فوج نے اب منصوبہ تیار کیا کہ احمد نگر کی امداد کے لیے روانہ ہو۔ شہر کو دکن والوں نے ہر طرف سے گھیر کر مشکل میں ڈال دیا تھا۔ مگر دکنی شاہی فوج کا راستہ روکتے تھے اور اس پر بار بار حملہ کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ راجہ وکرماجیت نے کوشش کی کہ کھلے میدان میں آکر وہ لڑیں لیکن حسب دستور سابق کچھ دیر تک وہ لڑ کر پھر اندر چلے گئے۔ شاہی فوج کے سامنے بڑی دشوار صورت تھی۔ وہ بہت دور تک دشمن کے ملک میں آگئی تھی۔ اس کے واپس جانے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ برسات قریب آچکی

تھی۔ گرمی شدت کی تھی۔

ان تفصیلات پر نظر رکھتے ہوئے شاہ جہاں نے دوسری فوج محمد تقی کی قیادت میں برار اور خاندیش واپس لینے کے لیے اس موقعہ پر بھیجی جب دشمن بالاگھاٹ میں مصروف بیکار تھے۔ محمد تقی نے تیزی سے دکن والوں کو مار بھگایا اور دونوں صوبے اپنے قبضہ میں کر لیے۔ اس اثنا میں دشمن بالاگھاٹ میں پھر دکھائی پڑا۔ شاہجہاں نے محمد تقی کو بالاگھاٹ میں داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ اہم جنگی مقامات پر قبضہ کرے اور ساتھ ہی ساتھ شاہی فوج تک پہنچنے کے راستے پھر سے قائم کرلے اس مقصد کو رد کرنے کے لیے ملک عنبر نے آٹھ ہزار آدمیوں کو آتش خان کی قیادت میں مقابلہ کے لیے بھیجا شاہجہاں نے راجہ بھیم کو حکم دیا کہ محمد تقی کی امداد کو جائے ان دونوں نے مل کر "باسم" پر قبضہ کیا اور دشمن کو وہاں سے بھگا دیا۔ ان سب باتوں کے باوجود احمد نگر پر دباؤ کم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے شہزادے نے سوچا کہ ناسک اور سنگم نیر کو فوج روانہ کی جائے اس منصوبہ پر عمل درآمد ہونا آسان نہ تھا لیکن ملک عنبر گھبرا گیا۔ اس نے صلح کی گفت وشنید شروع کر دی۔

عنبر کی اطاعت

عنبر کے نمائندہ نے پٹن میں راجہ وکرماجیت سے ملاقات کی۔ یہاں راجہ ایک بڑی فوج کے ساتھ مقیم تھا۔ ملک عنبر کی پیشکش یہ تھی کہ جو علاقہ کبھی مغلوں کے قبضہ میں تھا اس سے ہم لوگ دستبردار ہو جائیں اور دونوں حکومتیں تاوان جنگ ادا کریں راجہ نے کہا جب تک ملک عنبر احمد نگر سے چلا نہ جائے اور سامان رسد ہمارے سپاہیوں کو بلا مزاحمت نہ مل جائے ہم کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔

دکن میں امن

ملک عنبر کے وعدے کی صداقت پر بھروسہ کر کے راجہ وکرماجیت نے پھر صلح کی بات چیت کی اور صلح ہو بھی گئی۔ اس طرح ایک بار پھر طاقت اور شاہجہاں کی حکمت عملی سے امن قائم ہو گیا۔ دکن میں۔ ہمیشہ کی طرح یہ فتح بھی دیرپا نہ تھی۔ دکن مغل سلطنت کے لیے سرطان ہو گیا اور اس کی طاقت کو اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ لیکن شاہجہاں کو دکن میں دوبارہ شان وشوکت نصیب ہوئی۔ اس کی دولت اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ حسب معمول اس نے اپنی فتح کی خبر باپ کو دھوم دھام کے ساتھ بھیجی۔ اس نے اپنی اس کامیابی کو اکبر کی گجرات کی فتح سے تشبیہ دی بلکہ جہانگیر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی کارگزاری اکبر کی فتح سے برتر ہے۔ طفلانہ دلائل جو اس نے اپنے دعووں کے ثبوت میں پیش کیے پڑھنے میں پرلطف ہیں۔ کچھ بھی ہو وہ اپنے اقتدار کے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔[۳۳]

باب ۳

گہن اور طلوع

شاہجہاں کا مرتبہ اب شاہجہاں ۳۰ سال کا ہو گیا تھا۔ بچپن سے اس کی پرورش حوصلہ مند خیالات میں ہوئی تھی۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ میرے تمام پوتوں میں خرم میرے مشابہ ہے۔ جہانگیر بھی اس پر ایسی جان چھڑکتا تھا۔ اس کو خوش کرنے کے وہ کوئی بات بھی کر سکتا تھا۔ جب وہ صرف ۱۶ سال کا تھا تو حصار فیروزہ کی جاگیر جو بطور گزارہ معاش ولی عہد کو دی جاتی تھی۔ وہ اس کو عطا کی گئی۔ یہ اس کی زندگی میں ایک موڑ تھا۔ اس کے بعد ہی سے اس کے ہر منصوبے اور اس کی زیر قیادت ہر جنگ میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اس تیزی و آسانی سے اس کو عظمت حاصل ہو گئی کہ وہ کسی قدر مغرور و ضدی بھی ہو گیا۔ لیکن بایں ہمہ اس کے دائرہ اثر میں کمی نہ آئی۔ بلکہ اس کے خلاف یہی خصوصیات اس کے ساتھیوں کو اس کے وقار کے لیے مناسب معلوم ہوئیں۔ وہ سلطنت کا اعلیٰ ترین منصب دار تھا، سب سے زیادہ زرخیز جاگیر کا مالک اور حکومت مغلیہ کی بہترین فوج کا سپہ سالار۔ اس کی نظریں تخت شاہی پر تھیں۔

اس کے حوصلے مرجھا گئے کچھ سال پہلے کوئی رکاوٹ اس کے اور حصول مقصد کے درمیان حائل نہ تھی لیکن بہت تھوڑے عرصہ میں صورت حال بدل گئی۔ اس کی امیدوں پر سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ وہی قوتیں جنھوں نے اب تک اس کی مدد کی تھی اب اس کے خلاف ہو گئیں۔ اس کے سرگرم دوست اس کے جانی دشمن ہو گئے وہ اس صورت حال کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے ان محرکات سے بچنے کی کوشش کی یا کم از کم خوفناک مصیبت کو بدلنے کی کوشش کی لیکن اس وقت بیدار ہوا پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس نے مخالف حالات کا سامنا زورول سے کیا۔

مگر جو تصادم پیدا ہوا وہ سخت بھیانک تھا۔ اس کی بغاوت دو زبردست حوصلہ والوں کی جنگ تھی۔ جن میں سے ہر ایک اپنے مخالف کو دبانے کی فکر میں تھا۔

خطرے کے آثار

دکن میں دوسری فتح کے بعد شاہ جہاں نے کچھ ناموافق دیکھے۔ نور جہاں سے وہ پہلے ہی مشتبہ تھا لیکن اب یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کا باپ پہلے کی طرح اس پر مہربان نہ تھا۔ چنانچہ جب افضل خاں نے جہانگیر کو اس بار فتح کا مژدہ سنایا تو جہانگیر کے اظہار مسرت میں یک گونہ سرد مہری محسوس ہوئی۔ اپنے توزک میں تو اس نے واقعات دکن کو رقم کرتے ہوئے اظہار اطمینان کیا لیکن پہلے کی طرح تعریف و توصیف کا جوش مفقود ہے۔ نہ تو فاتح پر اس بار تازہ اعزاز کی بارش ہوئی، نہ نقارے بجائے گئے نہ جشن فتح پر شاہانہ دعوت ہوئی یہ باتیں خطرے کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ شاہجہاں کو اپنے حریفوں کے بارے میں سوچنا پڑا اور وہ کون تھے؟

شہریار

افق سیاست پر شہریار نمایاں ہو رہا تھا، اس کو آٹھ ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب دیا جا چکا تھا اس کی شادی ملکہ کی لڑکی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسی علامت نظر نہ آتی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ جہانگیر اس کو اپنا جانشین نامزد کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے جب شجاع بیمار پڑا تو اس پر ایک خاص تردد طاری تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ اب کبھی بندوق سے شکار نہ کروں گا اس کے علاوہ اس کی شفایابی کی دعائیں بھی مانگی۔ جب شاہجہاں نے گھوڑوں کی رسد مانگی تو اس نے حکم دیا کہ فوراً ایک ہزار گھوڑے شاہی اصطبل سے بھیج دیے جائیں۔ بایں ہمہ معاملہ فہمی کے لیے صرف شہنشاہ کے ارادوں پر نظر نہ رکھنی چاہیے وہاں ایک ملکہ کا بھی غلبہ تھا۔ ملکہ کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے اعتماد الدولہ کا سارا جما جمایا کارخانہ اس کو دے دیا تھا اور یہ بھی حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے نقارے کے بعد اس کے نقارے و ساز بجائے جائیں۔ وہ اس فکر میں تھی کہ دوسرے امراء بھی اس کے قابو میں آجائیں۔ چنانچہ شہنشاہ کی قمری سالگرہ کے موقع پر اس نے چوالیس امراء کو خلعت سے سرفراز فرمایا۔

پرویز

شاہ جہاں کا دوسرا حریف پرویز تھا، جو سردست باپ کی خاص مراعات سے نوازا جا رہا تھا۔ چند مہینوں میں دو نامہ برپے درپے اس کے پاس بھیجے گئے۔ پہلے اعتماد الدولہ اس کے پاس ایک خلعت خاص اعزاز لے کر گئے۔ اس کے بعد راجا سارنگ دیو دوسرا خلعت، ایک کمربند مرصع جس میں ایک نیلم اور کئی ایک لعل تھے۔ اس کے لیے لے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے بہار کے تبادلے کا حکم لے کر گئے۔ پرویز الہ آباد میں تھا اب اس کا تبادلہ زیادہ زرخیز اور وسیع تر صوبہ میں کیا گیا۔ پرویز اس محبت

اور شفقت کی تازہ عنایات کے اظہار تشکر میں آگرہ گیا اور اپنے بیمار باپ کے بستر کے ارد گرد اس نے اصرار کرکے طواف کیا۔[13]

خسرو

تیسرا حریف خسرو تھا جس کی قسمت میں طوفانی کردار اور خونین قبر تھی اس وقت وہ قیدی کی حیثیت سے شاہجہاں کے قبضہ میں تھا۔ اپنے راستہ سے ہٹانے کے لیے شاہجہاں نے اس کو عمداً قتل کر دیا۔ الفنسٹن اور بیورج نے شاہجہاں کے اس جرم میں ملوث ہونے کے بارے میں[14] شبہ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن عہد جہانگیری کا مورخ بیشمار شہادت اس جرم کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ یہ شہادتیں اگرچہ ضخامت کے لحاظ سے کافی ہیں لیکن نوعیت کے لحاظ سے براہ راست نہیں ہیں۔ کیونکہ ولایتی سیاحوں کے بیانات پر مبنی ہیں۔ بدقسمتی سے ایک عصری ذریعہ کو نظر انداز کیا گیا۔ محمد صالح کمبوہ نے شاہجہاں کی زندگی میں لکھا اور وہ شہنشاہ کی مدح میں خست سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس صورت میں اس کا ثبوت بالکل قابل اعتماد ہے۔ اور اس کا بیان اس واقعہ کے سلسلے میں ایک تفصیلی اقتباس کا مستحق ہے۔

قتل کی شہادت

"اس فانی دنیا میں بالکل جائز ہے کہ عظیم حکمراں اپنے ان بھائیوں اور رشتہ داروں کے وجود سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اُن کو ختم کر دے جن کا ختم کرنا عوام کے لیے مفید ہو۔ دین اور دنیا کدہ ناجائز سمجھتے ہیں کہ تخت مبارک کے مخالف حریفوں کو نیست و نابود کر دیا جائے بشرطیکہ یہ اقدام عوام کی فلاح و بہبود پر مبنی ہو اور ایسے ہی دانشمند مشیر کاروں کی رائے پر شہنشاہ جہانگیر نے مے نوشی کی حالت میں ۲۲ فروری ۱۶۲۲ء بروز دوشنبہ شاہ بلند اقبال (شاہجہاں) کے سپرد خسرو کو کیا تھا جسے دوشنبہ کے دن ۲۲ فروری ۱۶۲۲ء کو زندان کے گڑھے سے نکال کر نیستی کے میدان میں پہنچا دیا گیا۔ شک و شبہ دور کرنے کے لیے مرحوم شہزادہ کا جنازہ مناسب اعزاز و احترام کے ساتھ برہان پور میں گشت کرایا گیا۔ سربرآوردہ اشخاص اور افسران جنازے میں شامل تھے اور دعائیں مانگتے جاتے تھے۔ سہ شنبہ کی رات کو عالم گنج میں دفن کیا گیا۔[15]"

اس اقتباس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ واقعات مسلم الثبوت ہیں۔ ان سے قتل کی نیت اور ساتھ ہی ساتھ قتل کا جواز بھی ملتا ہے۔ یہ تحریر اس شخص کی ہے جو دربار شاہی سے قریب تھا۔ اس کی رسائی سرکاری کاغذات تک تھی۔ علاوہ بریں وہ کسی طرح بغیر پر اثر ثبوت کے شاہجہاں کو اس بھیانک جرم کا مرتکب نہیں قرار دینا چاہتا۔ تعجب ہے کہ یہ خبر خسرو درد قولنج سے مرا کوئی وسوسہ جہانگیر کے ذہن میں پیدا نہ کرسکی۔[16] اس نے اس واقعہ کو خاموشی اور غیر جذباتی انداز کے ساتھ اپنے توزک میں لکھا ہے۔

شاہجہاں کی غلطی عصری مؤرخ اس پر خاموش ہیں کہ دکن میں اس بے رحمانہ قتل کا اثر ایوان شاہی پر کیا پڑا لیکن یقین ہے کہ اس سفاکانہ جرم کرنے والے کے خلاف جذبات سخت ہوئے ہوں گے۔ شاہجہاں کے بعض ہمدرد امرا جو خسرو کے طرف دار تھے اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے لیکن شاہجہاں نے ایسے جذبات کی پروا نہ کی وہ خاموشی سے صورت حال کو دیکھتا رہا۔ واقعات تیزی سے حرکت میں آرہے تھے. شاہجہاں نے ضروری سمجھا کہ جلد کوئی فیصلہ کرے پھر بھی یہ کہنا غلط ہے کہ اپنے دشمنوں کی کارروائی کی وجہ سے وہ جلد ہی باغی ہوگیا۔ بلکہ جہانگیر کو ابھی اس پر شک بھی نہیں ہوا تھا نہ نور جہاں نے کوئی شکایت کا موقعہ دیا تھا. کہنا پڑتا ہے کہ جد وجہد کی ابتدا شاہجہاں کی طرف سے ہوئی۔

شاہ عباس اور قندھار کچھ عرصہ سے یہ اطلاعات مغل دربار میں آرہی تھیں کہ عباس شاہ قندھار واپس لینا چاہتا ہے، لیکن جہانگیر کو انھیں باور کرنے میں تکلف تھا۔ وہ شاہ ایران کے ظاہری اخلاق اور خیر سگالی پر اعتماد کرتا تھا۔ سفیروں کے تبادلہ کا سلسلہ برابر قائم تھا اس وقت بھی زنبل بیگ دربار میں مقیم تھا۔ اگر شاہ ایران کو رشتہ منقطع کرنا تھا تو اس نے اپنے سفیر کو ہندستان میں کیوں رہنے دیا؟ جہانگیر دل میں اسی طرح سوچتا تھا۔ چنانچہ بغیر وسوسہ کے وہ کشمیر کی سیر کے لیے روانہ ہوگیا۔ راول پنڈی پہنچ کر اس نے رائے بدلی۔ اس نے زین العابدین بخشی الحدیث کو شاہجہاں کے بلانے کے لیے بھیجا کہ وہ تیز رفتاری سے آئے اور اپنے ساتھ فاتح فوج لائے۔ یہ بھی حکم تھا کہ وہ کوہ پیکر ہاتھی اور متعدد توپیں جو صوبہ (دکن) کے لیے اسے دی گئیں تھیں اسے لیتا آئے۔[12]

شاہجہاں کو موقع قبل اس کے کہ شاہی پیامبر شاہجہاں تک پہنچیں. شاہجہاں کو یہ خبر مل گئی تھی، کہ شاہ ایران قندھار کو محاصرہ میں لے چکے ہیں۔ زین العابدین کے پہنچنے پر شاہجہاں نے محسوس کیا کہ اس کی خدمات طلب کی گئی ہیں۔ یہ موقعہ بہت مناسب ہے کہ وہ فائدہ اٹھائے اور اپنے دشمنوں کو شکست دے لیکن اپنی نافرمانی پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ برہان پور چلا گیا "تاکہ اپنے باپ سے یہ کہہ سکے کہ وہ شاہی احکام سے بے خبر تھا۔ راہ میں افضل خان راجہ بکرماجیت اور راجہ بھیم ملے۔ ان لوگوں کے پاس وہ زر کثیر تھا جو دکن کے حکمرانوں اور گونڈوانہ کے زمینداروں سے حاصل ہوا تھا اس موقعہ پر یہ دولت بڑی خوش آیند معلوم ہوئی۔ اس کے شکوک مستقبل کا حشر معلوم نہ تھا۔

برہان پور اور مانڈو کے درمیان کسی مقام پر شاہجہاں نے زین العابدین کو دربار واپس جانے کی پروانگی عطا کی۔ جو خط شہزادہ نے پیامبر کو دیا اس میں بڑی صفائی سے ان شرائط کا ذکر کیا جن کا پورا کرنا اس

ہم پر روانہ ہونے سے پہلے ضروری تھا۔ اس نے درخواست کی تھی کہ مانڈو میں اسے برسات تک رہنے دیا جائے اس کو اپنے افسروں کی ترقی و تنزلی کا اختیار دیا جائے اس کو صوبۂ پنجاب سپرد کیا جائے، کافی روپیہ دیا جائے، اور آخر میں یہ کہ رن تھمبور کا قلعہ اس کو اپنے خاندان کے قیام اور حفاظت کے لیے عطا کیا جائے۔ ان مطالبات کی جارحانہ نوعیت کم کرنے کے لیے شاہجہاں نے ہر مطالبہ کی بظاہر خوشنما تشریح کر دی۔ اس کی فوج کی وہ خستگی جو دکن کی مہم میں پیدا ہوئی تھی پہلے مطالبہ کی تائید کرتی تھی۔ اپنے ماتحتوں پر پورا قابو رکھنے کا خیال دوسرے مطالبہ کا جواز تھا۔ رسد کی بہتات و فراہمی اس متوقع طولانی جنگ میں جو شاہ عباس جیسے حکمراں سے پیش آنے والی تھی۔ تیسری اور چوتھی درخواست کی تائید کرتی تھی۔ اپنی عدم موجودگی میں تحفظ کا خیال جب وہ ایسے دور دراز ملک میں ہو گا آخری مطالبہ کا جواز تھا لیکن یہ پردہ سنگین حقیقت چھپانے کے لیے بہت باریک تھا۔ شہزادے نے اپنا پردہ اتار پھینکا تھا۔[18]

جہانگیر کو دھکا لگا

جب زین العابدین نے جسارت کی یہ تحریر جہانگیر کے سامنے پیش کی اس کے جذبات کو بری طرح دھکا لگا قندھار کے محصور ہونے کی خبر ہی اس کی پریشانی کے لیے کافی تھی لیکن اپنے ایسے لڑکے کی نافرمانی پر جو کبھی سزا یا حکم بردار تھا اس کو زیادہ صدمہ ہوا۔ اس نے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا صرف یہ حکم دیا کہ سرادل دکن بھیجے جائیں تاکہ سادات بارہہ اور بخارا شیخ زادے، افغانی اور راجپوت جلد سے جلد آسکیں اس سے پہلے اس کا منصوبہ تھا کہ پرویز اور شاہجہاں کو شمال مغربی محاذ پر بھیجے اسی لیے اس کے پاس پیامبروں کو بھیجا تھا لیکن جب آخر الذکر نے فولادی پنجہ دکھایا تو پرویز کو بلانے کی عجلت اور زیادہ ہو گئی۔ جہانگیر نے مرزا رستم اور اعتقاد خاں کو لاہور جانے کا حکم دیا تاکہ لڑائی کی ابتدائی تیاریاں کریں۔[19]

شاہجہاں کی پہلی ضرب

اس اثناء میں شاہجہاں نے پہلی ضرب لگائی۔ نورجہاں کی درخواست پر دھولپور کی جاگیر شہریار کو دی گئی تھی لیکن شاہجہاں نے بھی اس کے لیے درخواست کی تھی اور اس اعتماد پر کہ درخواست منظور ہو گی، اس نے اپنے آدمی قبضے کے لیے بھیج دیے تھے۔ جب شاہجہاں کے آدمی وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہریار کے افسروں کا اس پر قبضہ ہے۔ شاہجہاں کے آدمی بھی اپنے آقا کی طرح مغرور و ضدی تھے وہ شہریار کے آدمیوں سے لڑ گئے اور زبردستی ان کو اس مقبوضہ سے بے دخل کر دیا۔ جب اس کی خبر جہانگیر کو پہنچی تو وہ بہت برہم ہوا شاہجہاں کو وہ جملہ مراعات و شفقت کا نااہل سمجھا۔ چونکہ وہ اس منحرف شہزادے کے خلاف ابھی تک ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے صرف یہ حکم دیا کہ وہ معقولیت اور اخلاق کی شاہراہ سے قدم باہر نہ رکھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ جہاں ہے وہیں ٹھہرے جن افسروں کی خدمات

قندھار کے سلسلے میں ضروری سمجھی گئی ہے ان کو روانہ کردے۔ حقیقتاً نافرمانی کی صورت میں اس کو سزا کی دھمکی دی گئی تھی۔[۲۰]

شاہجہاں کی جگہ پر شہریار

گمان غالب ہے کہ شاہ جہاں نے اپنے روّیہ کا قابل اطمینان جواب بھیجنے میں تاخیر کی جس سے وہ دشمنوں کے ہاتھ میں جا پڑا۔ نورجہاں ایک مدت سے اپنے داماد شہریار کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی یہ موقعہ اس سے کار برآری کا اچھا ذریعہ مل گیا۔ اپنے شوہر پر اس کا بڑا اثر تھا اب شاہجہاں کو نقصان پہنچانے کے لیے اس نے موقعہ کو اپنی سیاسیات کا حربہ بنالیا جہانگیر سے شاہجہاں کے بارے میں اس نے بڑی غلط بیانی سے کام لیا۔ جہانگیر نورجہاں کی صحیح و نیم صحیح بات کو سُن لیتا تھا۔ چنانچہ وہ شہریار کو قندھار کی سرداری دلانے میں کامیاب ہوگئی۔ شہریار کا مرتبہ بڑھا دیا گیا۔ ۱۲ ہزار ذات اور آٹھ ہزار سوار کا اُسے منصب دیا گیا۔ عین اسی دن جب اس کے داماد کا تقرر ہوا تو شہریار کو خوش کرنے کے لیے اس نے دو قیمتی ترکی موتی نذر کیے۔ ان کی قیمت ساٹھ ہزار روپے تھی اس کا غلبہ اب مکمل ہوگیا تھا اسی کے اشارے پر جہانگیر نے شاہجہاں کے درباری نمائندہ کو حاضری سے محروم کردیا اس طرح نورجہاں کی فتح مکمل ہوئی۔[۲۱]

افضل خاں کا مقصد

برخلاف اس کے شاہجہاں کے ہاتھ سے بازی نکلی جارہی تھی۔ دوآبہ کی جاگیر اور حصار فیروزہ کی جاگیریں ضبط ہوگئیں۔ یقیناً اس کا نشانہ خطا ہوگیا ایک آخری تدبیر اس نے یہ کی کہ اپنے دیوان افضل خاں کو باپ کے پاس اس لیے بھیجا کہ اس کے امن پسند ارادوں کا یقین دلا کر آمادہ کرے کہ عورت کے مشورے پر عمل نہ کرے۔ قاصد کو جہانگیر نے بلایا لیکن اس کی باتوں کا اثر نہ لیا۔ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ شاہ جہان اپنی بے اعتدال حرکات پر عفو تقصیر کا پردہ ڈالنا چاہتا ہے اس لیے افضل خاں کا مقصد ناکامیاب رہا۔ ایک اعزازی خلعت دے کر اس کو رخصت کردیا گیا اس کے فوراً بعد ہی احکام جاری ہوئے کہ صوبہ جات، گجرات، مالوہ، دکن اور خاندیش شاہجہاں کو عطا کیے گئے اور فرمائش کی گئی تھی کہ وہ انہیں مقامات میں کسی جگہ جہاں چاہے مستقل سکونت اختیار کرلے۔[۲۲]

شاہجہاں بغاوت کرتا ہے

افضل خاں کی واپسی اور اس کے حریفوں کی دربار میں کارگزاری نے شاہجہاں کو یقین دلا دیا کہ بات دور تک پہنچ گئی۔ اب وقت پیچھے ہٹنے کا نہیں ہے۔ اس طرح کسی اور کی وجہ سے نہیں خود اپنے غلط اقدام سے اس کو ایسا راستہ اختیار کرنا پڑا جو سلطنت اور اس کے دونوں کے لیے تباہ کن تھا۔ ایک طرف عزت شہرت کو زوال اور اس کے اُن حوصلوں کی پامالی جو عرصہ دراز سے اس کے ذہن میں تھے اور دوسری طرف علانیہ بغاوت تھی۔ اس نے بغاوت پسند کی،

تاکہ اس کے سہارے اپنے پہلے وقار کو پھر سے قائم کرے۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ دشمن کو ملک کے اہم حصّوں میں بہ یک وقت گھیرے اس منصوبہ کے لحاظ سے اس نے جگت سنگھ ولد راجہ باسو کو اپنے ہی علاقہ میں بھیجا کہ پنجاب کے پہاڑوں میں انتشار پیدا کرے اور خود آگرہ چلا گیا۔[۲۱]

ایک عجیب اتفاق

یہ ایک عجیب اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ جب سلیم نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی تو اس کی بھی کوشش آگرہ فتح کرنے کی تھی اور اب جب شہزادہ شاہجہاں نے بغاوت کی تو اس کو بھی یہی کوشش کرنی پڑی۔ وجہ تلاش کرنے میں دور نہیں جانا پڑتا۔ آگرہ شاہی حکومت کا دارالسلطنت تھا اور مغلوں کا خزانہ بھی وہیں تھا۔ اس لیے جو آدمی اس پر قبضہ کرے اس کا پلّہ بھاری ہو جائے۔ لیکن دونوں موقعوں پر کوششیں ناکامیاب رہیں۔ پہلے موقع پر قلیج خان ناظم باغی شہزادے کے لیے بھاری پتھر ثابت ہوا اور موجودہ حال میں خواجہ سرا اعتبار خاں مدمقابل ثابت ہوا۔ اس نے باغیوں کے ہاتھ سے دارالسلطنت بچا لیا[۲۲] جب شاہجہاں اپنی فوج کے ساتھ فتحپور سیکری کے قریب آیا اور اس نے آگرہ کی طرف قدم اٹھائے تو معلوم ہوا کہ دروازے اس کے لیے بند ہیں اس پر اس نے دکرماجیت کو بھیجا کہ شہر لوٹ لے وہ کامیاب ہوا۔ بہت سے امرا کو ان کی دولت سے محروم کر دیا۔[۲۳]

جہانگیر کی قلبی تکلیف

شاہجہاں کا شمال کی طرف آنا جہانگیر کی دل آزادی کا باعث تھا عنایات، مراعات، خطابات و مراتب، جو شاہجہاں کو اس نے دیئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ناامیدی کا یہ جھٹکا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا بڑے درد سے اپنے دماغی انتشار کا بیان کرتا ہے: "درد و ضعف کے عالم میں اور گرمی کے موسم میں جو میری صحت کے لیے نہایت نامناسب ہے، مجھ کو سواری کرنی پڑتی ہے سرگرم رہنا اور ایک نافرمان لڑکے کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور بھی ہونا پڑتا ہے۔ بہت سے ملازمین جن کو عرصہ دراز تک میں نے پروان چڑھایا اور امرا کے درجہ تک پہنچایا جن کو بس آج ازبک اور ایرانیوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا انھیں کو آج اپنے ہاتھوں سے بدمعاشی کی سزا دے کر تباہ کر دینا ہے۔

موسوی خان کا مقصد

اس اہم موقع پر اس کو غم و غصّہ کا اظہار کرنا نامناسب تھا۔ شاہجہاں نے حکومت کو للکارا تھا۔ اس کو سزا ملنی چاہیے تھی۔ جب اس کو یہ خبر ملی کہ شاہجہاں آگرہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے موسوی خاں کو بھیجا کہ اسے اس حماقت سے باز رکھے۔ یہ قاصد شہزادہ کو فتحپور میں ملا۔ آخرالذکر نے عبدالعزیز کو اپنی تجویزات لکھ کر روانہ کیا۔ لیکن جہانگیر اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ حکم دیا کہ اس کو گرفتار کر لیا جائے۔[۲۴] موسوی خان کے بھیجے جانے کا مقصد وقت گزاری تھا۔ شہنشاہ کو شہزادہ پرویز کا انتظار تھا جس کے بلانے کے لیے تیز رفتار قاصد بھیجے

گئے تھے۔ تاکہ جلد سے جلد وہ آجائے۔

مہابت خاں کی آمد

اس اثنا میں مہابت خاں بھی دربار میں آگیا جس کو فوری طلب پر بلایا گیا تھا۔ فطرتاً شاہی معاملات کی نگرانی اس کے سپرد ہو گئی۔ اس نے فوراً شہنشاہ کو اطلاع دی کہ یہاں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو مفسدانہ انداز میں باغی شہزادے سے خط و کتابت کر رہا ہے۔ اس گروہ کے سرغنہ محترم خان خلیل بیگ ذوالقدر اور فدائی خان ہیں ان سب کو گرفتار کرنے کا حکم ہو گیا ان کی حرکات کی تحقیق ہونے لگی۔ مرزا رستم نے خلیل بیگ کی بیوفائی کا حلف اٹھایا اس کے بیان کی تائید نورالدین قلی نے کی۔ اسی طرح ابوسعید نے محترم خان کی دغابازی کا حلف اٹھایا۔ جہانگیر نے مہابت خان کو حکم دیا کہ دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ فدائی خان کے خلاف الزامات ثابت نہ ہو سکے۔ اس کو آزاد اور بحال کر دیا گیا۔

شاہ جہاں کا ہمدرد آصف خاں

اس میں شک نہیں کہ دربار میں کچھ لوگوں کی ایک ایسی جماعت تھی جن کو شاہجہاں سے ہمدردی تھی اس فہرست میں شہزادہ کا خسر آصف خاں سب سے زیادہ[۲۳] اہم تھا اپنی دانشمندی اور چالاکی سے اس نے اپنے جذبات کو ایسا دبائے رکھا کہ جہانگیر کو آخر وقت تک اس کی وفاداری میں شک نہ ہوا اگرچہ وہ خاموش اور بظاہر غیر متعلق تھا لیکن شاہ جہاں کی قوت کا وہ ایک بڑا مخزن تھا۔ بغاوت میں اس کی اصل سرگرمی درباری مؤرخوں نے قلمبند نہیں کی لیکن وہ ضرور کارفرما رہی ہوگی یہ سوچنا حقیقتاً بیجا نہ ہوگا کہ جب وہ آگرہ سے خزانہ لینے بھیجا گیا تو اس نے اس کا اشلہ اپنے داماد کو کر دیا تھا اور ہمت دلائی تھی کہ وہ فوجی دستہ پر حملہ کر دے اس لیے شاہجہاں شمال کی طرف بڑھتا رہا۔ لیکن سپہ سالار اعتبار خاں بڑا ہوشیار تھا اس نے اس سازباز کی تہ تک نظر کی اور آصف خاں کو روک دیا کہ شہزادے کی خطرناک حرکات کے پیش نظر وہ خزانہ یہاں سے لے جائے[۲۴]۔

معتمد خاں

اس مخالف طبقہ میں شاہجہاں کا ایک دوسرا باثر حلیف معتمد خاں تھا وہ شہنشاہ کا مشیر خاص تھا۔ ایسی بلند و مخصوص جگہ پر رہ کر اس کو دربار کی دم بدم کی خبریں ملتی تھیں اور وہ خفیہ طور پر شاہ جہاں کو پہنچا دیتا تھا یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے اس نے محترم خاں اور خلیل بیگ کو اس کام کے لیے مامور کیا ہو لیکن کسی معمولی فائدے کے لیے بھی جان کا خطرہ تھا۔ معتمد خاں نے لکھا ہے کہ مہابت خاں نے اس کی بھی شکایت بادشاہ سے کی اور یہ بھی تجویز کیا تھا کہ اس کو کابل بھیج دیا جائے لیکن شہنشاہ نے منظور نہیں کی[۲۵]۔

شاہجہاں دہلی کی طرف آرہا ہے

شاہ جہاں کا خزانہ جب اچھی طرح بھر گیا تو اس نے کوچ کیا۔ معہ

فوج کے جمنا کے کنارے کنارے چلا۔ اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے جا رہا ہے۔ لیکن یہ بہانہ اتنا سطحی تھا جتنا جہانگیر کا وہ بہانہ جب اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی جیسے ہی خبر پہنچی کہ شاہجہاں دلی کی طرف تیزی سے آرہا ہے۔ جہانگیر نے فوراً اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ شاہجہاں کا مقابلہ کرے اب اتنا وقت نہ تھا کہ وہ شہزادہ پرویز کا انتظار کرتا اس لیے فوج کی سرکردگی مہابت خاں اور عبداللہ خاں کو دی گئی۔ فیروز جنگ کو ہراول دستہ کی ذمہ داری دی گئی۔ تاکہ وہ راستوں کی اور خبر رسانی کے محکمہ کو قابو میں رکھے۔ شاہجہاں نے داراب خاں کو اپنا سپہ سالار بنایا اور راجہ بھیم، رستم خاں اور بیرم خاں کو اس کی کمک پر متعین کیا۔

بلوچ پور کی جنگ

قبول پور اور بلوچ پور متصل دلی کے درمیان مخالف فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی دونوں طرف سے آتشبازی ہونے لگی، لڑائی تیز ہوتی گئی پہلے ہی سے جو منصوبہ بن چکا تھا اس کے مطابق عبداللہ خاں مع اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوج مخالف میں چلا گیا۔ لیکن شاہجہاں کے طرف آنے سے بڑی گڑبڑ ہوئی بجز راجہ بکرماجیت کے اس ارادہ سے کوئی اور آگاہ نہ تھا، جب وہ داراب خاں کو باخبر کرنے کے لیے جا رہا تھا تو اتفاق سے راستہ میں مارا گیا۔ اس سے صورت حال بدتر ہو گئی شاہی فوجوں نے بہادرانہ انداز میں بے ترتیب فوج مخالف پر حملہ کر دیا۔ ان کو بھگا دیا راجہ بکرماجیت کی لاش میدان جنگ میں چھوڑ دی گئی۔ گاؤں کے مقدم نے اس کا سر کاٹ کے خان اعظم کے پاس بھیجا جس نے دربار میں بھجوا دیا۔

جہانگیر کی تگ و دو

جہانگیر آگرہ کی طرف بڑھتا رہا ۱۰ راپریل ۱۶۲۳ء کو فتحپور پہنچا۔ دارالسلطنت میں گئے بغیر وہ اجمیر چل پڑا کیونکہ شاہجہاں اسی راستہ سے دکن کے لیے چلا تھا۔ شہزادہ پرویز کی آمد کی خبر شہنشاہ کو ہنڈوان میں ملی۔ اس نے حکم دیا کہ صاحب اقتدار شہزادے اور بلند پایہ امراء اس کے استقبال کے لیے جائیں، بعد ازاں اس کا باقاعدہ استقبال دربار میں ہوا اس کو چالیس ہزار ذات اور تیس ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا۔ حکم ہوا کہ وہ مہابت خاں اور دوسرے افسروں کے ساتھ باغی شہزادے کا پیچھا کرے۔ صادق خاں بخشی خاص پنجاب کا گورنر مقرر ہوا۔ حکم دیا گیا کہ وہ جگت سنگھ کا فتنہ فرد کرے۔

شاہجہاں کی پسپائی

بلوچ پور کی ہمت شکن شکست پر شاہجہاں راجپوتانہ چلا گیا۔ وہاں کا راجہ بھیم سنگھ[۲۳] دربار میں طلب کیا گیا تھا اس کی عدم موجودگی میں امیر لوٹ لیا گیا۔ شاہجہاں ۱۰ راگست ۱۶۲۳ء کو مانڈو پہنچا لیکن یہ سن کر کہ شہزادہ پرویز اور مہابت خاں بڑی سرگرمی سے اس کا پیچھا کر رہے ہیں اس نے دوسرے ہی دن یہاں سے برہانپور کوچ کر دیا۔ سوچا تھا کہ یہاں بھی

اس کو آرام ملے گا لیکن شاہی فوج نے راستہ ہی میں اس کو روک لیا۔ جھڑپ شروع ہونے سے پہلے ہی مہابت خاں نے شاہجہاں کے بہت سے ساتھیوں کو ترغیب دے کر اپنا لیا۔ برق انداز خاں نے پورے توپ خانے کے ساتھ شاہ جہاں سے علیحدگی اختیار کی اس کی تقلید محمد مراد بدخشانی، رستم خاں اور دوسرے بہت سے لوگوں نے کی۔ یہ واقعہ شاہ جہاں کی ہمت شکنی کے لیے کافی تھا۔ وہ نربدا پار چلا گیا۔

خانخاناں کی دغابازی

اس کو آخری تدبیر یہ سوجھی کہ نربدا کا راستہ محفوظ کر لے۔ دوسری طرف سے ساری کشتیاں ہٹا دے۔ بیرم بیگ کو مقرر کیا کہ گھاٹ اور کنارے کی سختی سے نگرانی کرے اس موقعہ پر اس کو خان خاناں کی فریب کاری کا علم ہوا۔ مہابت خاں کے پاس محمد تقی کو شاہ جہاں نے قاصد بنا کر بھیجا تھا۔ محمد تقی نے وہ خطوط دیے جو اس کے نام تھے۔ ان میں ایک شعر لکھا تھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"سیکڑوں آدمی میری تاک میں ہیں ورنہ میں اڑ کر چھٹکارا حاصل کرتا۔" جب شاہ جہاں نے یہ خط خانخاناں اور داراب خاں کو دکھایا تو انھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن ثبوت پورا تھا دونوں کو معہ اپنے اہل و عیال کے گرفتار کر لیا۔

شاہ جہاں اسیر گڑھ کی طرف بڑھا حسام الدین ابن رشید جمال الدین حسین انجو نے شہر دروازہ کھولا اور باغیوں کو داخل کر لیا۔ بعض مستورات اور بھاری سامان چھوڑ کر شہزادہ برہان پور چلا خانخاناں کو ساتھ ہی لے چلا۔ راستہ میں اس نے راؤ رتن ہاڑا کو مہابت خان کے پاس صلح کی بات چیت کے لیے بھیجا۔ مہابت خاں نے گفت و شنید سے پہلے خانخاناں کی رہائی لازمی کر دی۔ زبردست مایوسی اور بے کسی میں شاہجہاں نے گھٹنے ٹیک کر بوڑھے آدمی سے درخواست کی کہ وہ شہنشاہ پرستوں سے معافی دلا دے۔ اگرچہ خانخاناں کسی کی دلیل نہ سننے والا احتیاط پسند تھا۔ اس نے سائل سے وعدہ کر لیا لیکن اس کے پہلے کہ وہ نربدا کے جنوبی ساحل تک پہنچے شاہی فوجوں نے دریا پار کر لیا تھا اس لیے باغیوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ فائدہ تھا۔ خانخاناں کشمکش و پیچ میں پڑ گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے جائے یا پیچھے ہٹے۔ بالآخر اس نے طے کیا کہ وہ شہزادہ پرویز کے پاس جائے وہ گیا اور اپنی اطاعت پذیری کا اسے یقین دلایا۔

شاہجہاں نرغہ میں

عبور دریا اور خانخاناں کی بے وفائی نے شاہجہاں کے رہے سہے حواس کھو دیے۔ ۱۰ ستمبر ۱۶۲۴ء کو اس نے انتہائی انتشار میں دریائے تاپتی پار کیا۔ ملک عنبر اور عادل شاہ سے اس کی بات چیت پہلے ہی ناکامیاب ہو چکی تھی اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ گولکنڈہ کے راستہ سے وہ اڑیسہ جائے اور بنگال میں قسمت آزمائی کرے۔ شاہی فوجوں نے چالیس

کردہ تک پیچھا کیا پھر برہان پور واپس[49] آگئی۔ یہاں پہنچ کر شہزادہ پرویز نے وہ آرام پایا جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن شاہجہاں کو ایک لمحہ آرام نہ ملا۔ اس کے ستارہ پر پورا گہن چھایا تھا۔ دوستوں سے جدائی ہمراہیوں کی غداری عہد گزشتہ کی شان و شوکت سے محرومی، دربدری، غرضکہ اس کی زندگی بڑی کشمکش میں گزر رہی تھی۔ باین ہمہ اس کے سینے میں کامیابی کی جو امیدیں لہرا رہی تھیں اُن کے زیر اثر اس نے نئے محاذ کے لیے قدم اٹھایا۔

قطب شاہ نے اُس کا استقبال کیا

جب وہ گولکنڈہ کی سرحد کے قریب پہنچا تو اس نے میر عبد السّلام کو محمد قطب شاہ کے پاس بھیجا کہ حالات کی ابتری بیان کر کے اس کی امداد حاصل کرے۔ آخر الذکر نے قاصد کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اس کے آقا کی امداد کا وعدہ کیا۔ قطب شاہ نے اجازت دی کہ وہ اس کے علاقہ سے گزر سکتا ہے بشرطیکہ کسی ایک جگہ زیادہ قیام نہ کرے۔ اس کے علاوہ قطب شاہ نے اپنی سرحد کے افسروں کو کہلا بھیجا کہ شہزادے کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آئیں۔ اس نے کچھ روپیہ بھی بھیجا یہ فراخ دلی کا نمونہ تھا جس کا صلہ شاہجہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد اچھا دیا[50]۔

اڑیسہ پر قبضہ

تلنگانہ پار کر کے شاہجہاں سولی پٹم کی بندرگاہ پر پہنچا یہاں سے اڑیسہ کی طرف بڑھا سرحد پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہی فوجیں بالکل تیار نہیں۔ اگرچہ گورنر احمد بیگ خاں کو اس کے چچا ابراہیم خاں گورنر بنگال نے شہزادے کی تگ و دو سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن اُسے اندیشہ نہ تھا کہ اتنی سرعت سے وہ نقل و حرکت کرے گا اس لیے کسی حفظ ماتقدم یا سرحد کی حفاظت کے بغیر وہ ایک مقامی سردار سے لڑنے چلا گیا تھا۔ جب اس نے شاہجہاں کی آمد کی خبر سنی تو لڑائی چھوڑ کر پپلی واپس آیا اس کی ہمت نے جواب دے دیا اور وہ انتشار کے عالم میں کٹک واپس ہوا، وہاں سے بردوان آیا جہاں وہ جعفر بیگ کے بھتیجے صالح سے ملا۔ شاہجہاں کو راستہ صاف ملا۔ اڑیسہ میں کوئی مزاحمت نہ ہوئی وہاں سے بنگال روانہ ہو گیا۔ بردوان میں محمد صالح کو ملانے کی کوشش کی گئی لیکن باغیوں سے ملنے پر وہ مائل نہ ہوا اُن کا راستہ روک دیا۔ لیکن ایک مختصر لڑائی کے بعد اس کو شکست ہوئی اور فاتح نے اپنا راستہ اختیار کیا۔

بنگال

صالح پر فتح حاصل کر کے شاہجہاں نے ابراہیم خاں گورنر بنگال کو ایک خط بھیجا کہ وہ دربار واپس چلا جائے تو اس کی کوئی مزاحمت نہ ہو گی یا اپنے کو سپرد کر دے[51]۔ لیکن آخر الذکر نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ وہ اپنی آخری سانس تک جنگ کرے گا یہ کہہ کر وہ ڈھاکہ سے راج محل چلا گیا۔ قلعہ کو مستحکم کیا۔ شاہجہاں بھی یہاں پہنچ گیا۔ وہ خود تو شہر میں رک گیا۔ سید جعفر، شجاعت خاں، سید قاسم کو قلعہ کا

محاصرہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابراہیم خاں نے بڑی دانشمندی و دلیری سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب باغیوں نے بعض ایسے اہلِ شہر کے خاندانوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی جو اندرون قلعہ تھے وہ اپنا لشکر لے کر باہر آگیا۔ مقابلہ کی جنگ کی اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے بعد قلعہ کی محافظ فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ قلعہ پر شاہ جہاں کا قبضہ ہو گیا یہاں سے وہ ڈھاکہ کی طرف بڑھا۔ یہاں احمد بیگ خاں نے اطاعت کی اور چالیس لاکھ روپیہ بھی نذر کیا۔ پورا بنگال شہزادے کے زیر قدم تھا مال غنیمت کے تیس لاکھ روپیہ نے اس خزانہ میں پھر سے جان ڈال دی۔ پانچ سو ہاتھی اور کشتیوں کے ایک بیڑے نے اس کے وسائل میں بہت اضافے کر دیے۔ اس کی مردہ دل میں روح پھر سے ڈال کر دی۔ اس نے آگے بڑھ کر جدوجہد کے لیے اپنے کو مائل کیا۔

بہار کی طرف کوچ

بنگال کو داراب خاں کے زیر نگرانی چھوڑ کر شاہ جہاں پورب کی طرف چلا گیا۔ راجہ بھیم نے پٹنہ پر قبضہ کر لیا اب سارا بہار آسانی سے باغیوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ روہتاس کا ناقابل فتح قلعہ سید[59] مبارک نے اس کے سپرد کر دیا۔ یہاں سے عبداللہ خاں الہ آباد بھیجا گیا اور دریا خاں اودھ، اول الذکر جھونسی پہنچا۔ گنگا پار کیا شہر میں خیمہ زن ہوا۔ الہ آباد کا قلعہ محاصرہ میں لے لیا اور اس کی امداد کے لیے کشتیوں کا ایک بیڑا لے کر شاہ جہاں جون پور آگیا۔

مہابت خاں نے بھگا دیا

اس اثناء میں مہابت خاں اور شہزادہ پرویز[60] دربار کے فوری حکم کی تعمیل میں دکن سے کوچ کرتے ہوئے باغیوں کی سرکوبی کے لیے الہ آباد آئے۔ عبداللہ خاں وغیرہ جو قلعہ کا محاصرہ کیے تھے اُن کو ڈھکیل کر جون پور بھگا دیا۔ شاہجہاں کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ تین طرف سے شاہی فوج نے گھیر لیا۔ غلّہ اور جانوروں کے چارہ آنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے بنگال کے حلیف یعنی کشتی بان بھی کھسک گئے۔ ناامیدی کے عالم میں اس نے ایک لڑائی کی ٹھانی اُسے شکست ہوئی اس کے بہت سے سپاہی قتل ہوئے یا منتشر ہو گئے وہ روہتاس چلا گیا جہاں شہزادہ مراد پیدا ہوا۔

دکن کی واپسی

پورب میں اس کی فتح چند روزہ تھی شاہی فوجوں نے بہار پر قبضہ کر لیا۔ شاہجہاں کے لیے روہتاس تین دن سے زیادہ ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ اس کی مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لیے داراب اسے[61] چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ مجبور ہو کر پسپا ہو کر اکبر نگر جائے یہاں سے اس نے دکن کا رستہ لیا۔ شہزادہ دارا اور اورنگ زیب کے علاوہ کچھ وفادار ہمراہی اس کی ناامیدی کا غم دور کرنے کے لیے ہم سفر تھے وہ اڑیسہ اور تلنگانہ سے ہو کر گذرا نظام الملک کے علاقہ میں داخل ہوا ملک عنبر نے اس کا استقبال اس بار خوش دلی سے کیا اور ایک باہمی اتحاد دونوں میں ہو گیا۔ رشتہ اتحاد شاہی حکومت سے دشمنی تھا۔

برہان پور کا محاصرہ

نئے حلیف کی مدد سے شاہجہاں مغلیہ دکن میں داخل ہوا اور برہان پور کا محاصرہ کر لیا لیکن راؤ رتن کی قیادت میں شاہی فوج نے زبردست مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں نے متعدد حملے کیے لیکن ناکامیاب رہے جب یہ واقعات ہو رہے تھے اسی وقت مہابت خاں اور شہزادہ پرویز دوسری بار دکن آئے اب شاہجہاں محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوا۔ پسپا ہو کر روہان کھید چلا گیا۔[42] راستے میں بہت بیمار ہو گیا اور اس کی آزردگی میں اضافہ کرنے کے لیے عبداللہ خان نے بھی ایسے نازک وقت پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔[43]

سپردگی

اس کا حوصلہ بالکل ٹوٹ گیا غرور ختم ہو گیا اب وہ اس لائق نہ رہ گیا کہ اپنی جدوجہد اور قائم رکھ سکے اس کی امداد کے لیے نہ آدمی تھے نہ روپیہ اس نے شہنشاہ سے معافی کی درخواست کی۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ وہ اپنے افسروں کو اسیر گڑھ اور روہتاس سے دستبردار کرا دے اور شہزادے دارا اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال اپنی نیک چلنی کی ضمانت میں پیش کرے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور نذر میں تین لاکھ روپیہ بھی بھیجے باوجود اس کے وہ شاہی علاقہ میں داخل ہونے سے ڈرتا تھا۔ اس نے ناسک میں سکونت اختیار کی۔

ناکامی کے اسباب

اس طرح وہ بغاوت ختم ہوئی جس نے سلطنت کو تین سال سے زیادہ عالم انتشار میں رکھا اس کی وجہ سے آدمی اور روپیہ کی بڑی قربانی ہوئی اور شاہجہاں کے تخت پانے کے امکانات میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ پہلی غلطی محاذ کا انتخاب تھا۔ شمال ہند کا کوچ اس کو سمندر تک لے گیا جس کی وجہ سے وہ کہیں جم کر اپنی پسپائی کے زمانہ میں مقابلہ نہ کر سکا۔ دوسری وجہ اس کی یہ تھی کہ اس کے افسر نیم دلی سے ساتھ دے رہے تھے۔ خانخاناں اور دارابخاں صرف موقعہ پرست تھے انھوں نے اس کا ساتھ اس لیے دیا کہ اس عمل کے لیے مجبور تھے۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ تھے جن کا لڑنے کو جی نہ چاہتا تھا اس لیے مہابت خان کو موقعہ ملا کہ اس کے بہت سے آدمیوں کو اپنی طرف توڑے۔ تیسری وجہ وفادار سربرآوردہ افسروں کا مرنا تھا۔ راجہ وکرم جیت لڑائی کی ابتدا میں مارا گیا۔ راجہ بھیم جونپور کے قریب مارا گیا۔ چوتھی وجہ اس کے محدود ذرائع تھے۔ شاہجہاں کی فتح مندی کی بنیاد صرف شاہی سرکاری امداد پر تھی اور اب جب اس نے اپنے کو اس کے خلاف کر لیا، تو اس کی ہمت شکن شکست طے شدہ تھی لیکن اس کی ابتدائی کامیابی نے اپنے محدود ذرائع پر نظر نہ جانے دی۔

نورجہاں کے منصوبے

شاہ جہاں کی ذلت اور زوال نورجہاں کو اس کے مقصد میں قریب تر پہنچا گئے۔ ایک حریف کے زیر کرنے کے بعد دوسرا میدان میں آگیا۔ مہابت خان اور شہزادہ

پرویز کے قریبی اتحاد میں اس کو ایک دوسرے خطرے کی جھلک نظر آئی اوّل الذکر اس سے بہتر کوئی اور شخص نہ تھا۔ اب بغاوت ختم ہو چکی تھی اس کی ضرورت نہ رہ گئی تھی کہ اس کو اس مرتبہ پر برقرار رکھا جائے علاوہ اس کے پرویز سے اس کی علیحدگی خود بخود اس کی بنیادی طاقت کو ہلا دے گی یہ سب سوچ کر مہابت خان کو بنگال کے دور دراز صوبہ میں بھیج دیا گیا۔ جہانگیر کا ایک دوسرا جان نثار ساتھی خان جہاں لودی تھا مہابت خان کی جگہ شہزادہ پرویز کی اتالیقی[۹۵] اس کے سپرد کی گئی۔

نورجہاں کی مہابت خان کو تباہ کرنے کی کوشش

نورجہاں نے اتنے ہی پر قناعت نہ کی وہ اس تجربہ کار سپہ سالار کو بالکل تباہ کرنا چاہتی تھی۔ حوصلہ مند منصوبہ کو پورا کرنے کے لیے اُسے ایک ہوشیار آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بیک وقت اس کا بھائی آصف خاں اور وہ ایک ہی ذہن کے ہو گئے دونوں نے مل کر مہابت خان کے خلاف سازش کی۔ اس پر غبن و نافرمانبرداری کا الزام لگایا گیا۔ اس سے جواب طلب کیا گیا لیکن اس نے اپنے مخالفوں کے ارادوں کو تہ تک جھانک لیا تھا۔ لہذا اپنے جان نثار راجپوت ہمراہیوں کے ساتھ دشمنوں کو سبق دینے کے لیے بنگال سے روانہ ہوا۔ جب شاہی دستہ جہلم پار کر رہا تھا یہ موقعہ پر پہنچا اور شہنشاہ و نورجہاں دونوں کو حراست میں لے لیا۔ آصف خاں بچ کر اٹک چلا گیا لیکن وہ بھی سر تسلیم خم کرنے پر جلدی ہی مجبور ہوا[۹۶]۔ دشمنوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے کر وہ شہنشاہ کے ساتھ کابل گیا جہاں چند روز قیام میں اس کے خلاف منصوبے نے اس کی طاقت کو کمزور کر دیا واپس ہوتے ہوئے راستہ ہی میں نورجہاں اپنے شوہر کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ مہابت خان آمر کے مرتبہ سے گر کر باغی سمجھا گیا۔ ایک شاہی فوج نے بڑی سرگرمی سے اس کا پیچھا کیا اس نے بھاگ کر میواڑ کے جنگلوں میں پناہ لی۔

شاہ جہان کا کوچ سندھ کو

حکومت کے خلاف ناگہانی بغاوت پر شاہ جہاں کو سوچنا پڑا۔ شہنشاہ کابل میں تھا۔ پرویز اور خان جہان کو دکن میں کافی مصروفیت تھی۔ وہ دکنی حکمرانوں[۹۷] کا عرصہ تک مہمان رہا۔ ملک عنبر کا انتقال ہو گیا تھا۔ نظام شاہی دربار کی صورت حال غیر اطمینانی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ کیوں نہ وہ دکن چھوڑ دے اور شاہ ایران کی مدد سے سندھ پر قبضہ کرے علاوہ بریں ناسک کی آب ہوا بھی اس کو موافق نہ آئی۔ دکنیوں اور خاص کر حبشیوں کی دغابازی نے اسے پریشان کر دیا[۹۸] تھا۔ اس لیے ۸ رجون ۱۶۲۶ء کو اس نے اپنی پناہ گاہ چھوڑی، ایک مہینہ بعد اجمیر پہنچا۔ یہاں شیخ معین الدین چشتی کے مزار پر گیا اس کے بعد ناگور اور جیسلمیر کے راستے سے ٹھٹھہ کی طرف گیا اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو اُس کے جد امجد ہمایوں نے اپنے سفر

ایران میں راجپوتانہ پار کرتے ہوئے کیا تھا۔ اکتوبر کے اوائل میں وہ ٹھٹھہ پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

اس کی پسپائی کے اسباب

لیکن مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ سندھ سے پسپا ہو کر دکن واپس آنے پر مجبور ہوا۔ اس فیصلہ کے کئی اسباب تھے۔ پہلا قلعہ میں اس کی ناکامی اور اس کے دو جاں نثار افسر راجہ گوپال گوڑ اور علی خان ترین کی موت تھی۔ دوسرے پرویز کی سخت علالت کی خبر۔ تیسرے مہابت خاں کے اقتدار کا خاتمہ اور آخری وجہ شاہ ایران کا مایوس کن رویہ۔

شاہ جہاں کے تعلقات شاہ ایران سے

کئی سال سے شاہجہاں اور شاہ ایران میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ شاہ کی خدمت میں اس کا پہلا قاصد[99] زاہد بیگ تھا یہ قاصد ایران اس وقت پہنچا جب شاہ عباس قندھار کا محاصرہ کر رہا تھا اس لیے اس کو شرف حضوری اس وقت تک نہیں ملا جب تک کہ آخر الذکر جنگ سے واپس نہیں آیا۔ واپسی پر زاہد بیگ اپنے آقا سے فتح پور میں ملا۔ دوسرا قاصد خواجہ حاجی تھا جس کو شاہجہاں نے اس وقت ایران بھیجا تھا جب خود اس کو پسپا ہو کر دکن جانا پڑا تھا۔ شاہ ایران کے خط میں شہزادے نے ان حالات کا ذکر کیا تھا جن سے مجبور ہو کر اس کو شمال جانا پڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس لڑائی کا بھی گول مول الفاظ میں ذکر ہے جو دہلی کے نزدیک اس کو شاہی فوج سے لڑنی پڑی تھی۔ خط کا خاتمہ ان الفاظ پر ہے "اپنے بزرگوں کی طرح میں نے بھی امداد کے لیے آپ کی طرف رخ کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے بر وقت و بر محل رائے سے مستفیض فرمائینگے۔ لیکن اس درخواست پر ایک رسمی جواب ملا۔ شاہ ایران نے شہزادہ کو باپ کی وفاداری اور اطاعت گزاری کے لیے نصیحت کی جواب میں یہ بھی لکھا کہ وہ جہانگیر کے پاس ایک سفیر بھیج رہا ہے کہ وہ اس سے شاہ جہاں کی سفارش کرے۔ شاہ جہاں کا تیسرا خط شاہ ایران کو اس وقت گیا جب اس نے باپ کی اطاعت قبول کر لی اس میں ان شرائط کا ذکر تھا جن کی رو سے اس نے شاہی حکومت سے مصالحت کی شاید اپنے قاصد اسحاق بیگ سے اس نے زبانی کہا کہ وہ شاہ ایران کو میری مدد پر مائل کرے۔ شاہجہاں کے سندھ جانے کی سب سے بڑی وجہ اسی امداد کی امید تھی۔ اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ ایران جائے اور ہمایوں کی طرح واپسی پر تخت حاصل کرے لیکن بادشاہ نے بجز خیر سگالی کے اور کچھ نہ کیا البتہ شہزادے سے امور متعلق پر خیر اندیشی کا اظہار کیا اور اپنے خط میں پھر اسی نصیحت کو دہرایا جو پہلے موقعہ پر کر چکا تھا۔

پرویز کا انتقال

اس طرح اس کے مانے ہوئے دوستوں کی سرد مہری اور ٹھٹھہ میں اس کی ہمت شکن شکست نے شاہجہاں کے لیے کوئی اور راستہ بجز دکن جانے کے نہ رکھا۔ راہ سفر

میں اُس نے شہزادہ پرویز کے مرنے کی خوشخبری سنی اس کے دل میں نئی امنگیں مچلنے لگیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کی دوران سفر اس کو مہابت خان کے دوستانہ مراسلات ملے جس کا جواب اس نے حسب خواہش دیا۔ نومبر ۱۶۲۶ء میں وہ ناسک پہنچا جہاں اس کو خدمت پرست خان اور سید مظفر بارہہ ملے اس جگہ کی آب و ہوا اس کے موافق نہ تھی لہذا نظام الملک کی اجازت سے مارچ میں وہ جنّار چلا گیا یہاں ملک عنبر نے ایک خوبصورت گھر بنوایا تھا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۶۲۶ء کو دو ہزار سواروں کے ساتھ مہابت خان بھی آگیا ایسا معلوم ہوا کہ شاہجہاں کی قسمت دوسری بار جاگ اٹھی۔

جہانگیر کا انتقال

اس درمیان میں دربار کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ مہابت خان کے پنجے سے رہا ہونے کے بعد جہانگیر کشمیر چلا گیا اس کی صحت لاہور کی گرمی اب زیادہ نہ برداشت کر سکتی تھی لیکن یہاں اس کی ضیق النفس کی بیماری شدید ہوگئی۔ شہزادہ شہریار بھی جوع البقر میں مبتلا ہوگیا۔ لاہور واپس جانا قرار پایا۔ شہزادے کو حکم ہوا کہ وہ دربار کے روانہ ہونے سے پہلے روانہ ہوجائے اور وہاں علاج کا انتظار کرے۔ راستے میں جہانگیر کی حالت مایوس کن ہوگئی۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر بروز اتوار ۱۶۲۷ء کو اس کا انتقال بمقام راجوڑی ہوا۔

بادشاہ کی موت پر جانشینی کا سوال سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نورجہاں کو پہلے ہی سے اس نازک وقت کا اندیشہ تھا چنانچہ عرصہ سے وہ جان توڑ کوشش کر رہی تھی کہ اس کا اقتدار قائم رہے۔ اس نے شاہجہاں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا کیونکہ اس نے سمجھ لیا کہ وہ مزاج کا اتنا سخت ہے کہ اس کا غلبہ نہ برداشت کرے گا۔ اسی لیے اس نے شہریار کو تخت کا امیدوار بنایا تھا کیونکہ وہ لچک دار اور نکما آدمی تھا اس لیے اس کو حقدار ثابت کرنے اور بلند کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی تھی لیکن بد قسمتی سے اس نازک موقعہ پر وہ جائے وقوع سے بہت دور تھا۔ اس کی عدم موجودگی نے اس کی امیدوں پر بُرا اثر ڈالا کیونکہ بہت سے دوسرے ایسے کچے ارادہ کے امرا جو شاید اس کا ساتھ دیتے آسانی سے دوسرے امیدوار کے طرفداروں سے مل گئے

نورجہاں کی آخری کوشش

نورجہاں نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ایک آخری کوشش کی۔ اس نے فوراً ایک قاصد اپنے داماد شہریار کے پاس بھیجا۔ تاکہ وہ لڑائی کی تیاری کرے ساتھ ہی ساتھ اپنے بھائی کو بھی گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن آصف خاں اچھی طرح ہوشیار تھا وہ اس کے جال میں نہ آیا چنانچہ اس نے نورجہاں سے ملنے سے بھی انکار کر دیا اور اپنے طرفداروں کی مدد سے شاہجہاں کی تخت نشینی کا منصوبہ مکمل کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے میر بخشی ارادت خاں کو اپنا ہمخیال بنایا پھر اسی کے مشورہ سے ایک ایسی تدبیر سوچی کہ قانونی دقت بھی ختم ہوجائے اور

ایک ایسا موقعہ پیدا ہو جائے جو اس کی موافقت میں ہو۔

آصف خان کا منصوبہ

شاہجہاں یہاں سے دور دکن میں تھا اور عدم موجودگی میں اس کی موافقت میں عوام کی حمایت حاصل کرنا مشکل تھا اس لیے کہ لوگوں کا معمول تھا کہ سبب کے لیے نہیں بلکہ ایک شخص کے لیے لڑنا چاہیے۔ نفسیاتی طور پر گوشت پوست کا آدمی ان کے لیے بہ نسبت غیر مرئی خیال کے زیادہ قابل توجہ تھا۔ علاوہ بریں وہ شخص ان کی وفاداری کا پہلے مستحق ہوتا جو موقع پہ موجود ہوتا۔ موجودہ صورت حال میں شاہجہاں سے زیادہ شہریار نزدیک تھا اس لیے آصف خان کے سامنے یہ سوال تھا کہ شہریار سے عنقریب ہونے والے جھگڑے کے لیے کیسے عوام کی ہمدردی حاصل کرے۔ اب ایسا نازک موقعہ آ گیا کہ شاہجہاں کے بادشاہ ہونے کا بھی اعلان وہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا بہت کم اثر ہوتا اور شہریار سے وہ لڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ایسی جنگ بغاوت کے مترادف ہوتی رسم و رواج کے لحاظ سے ایک ایسے دستور کے جواز کی ضرورت تھی جو اس کی نقل و حرکت کو قانونی رنگ دے دے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ تدبیر سوچی کہ داور بخش کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دے۔ اس سے لوگوں کا خیال خلاف ہو جائے گا بلاشبہ یہ ایک بالکل سیاسی حکمت عملی کی تحریک تھی جہانگیر کچھ دنوں تک اس شہزادے کی موافقت میں بھی تھا اور مرحوم خسرو کے بیٹا ہونے کے لحاظ سے تخت پر اس کے حقوق بہ نسبت شہریار کے زیادہ تھے۔ شہریار ایک لونڈی کا لڑکا تھا یہ اور بات ہے کہ وہ ملکہ کا داماد بھی تھا۔

داور بخش کو سرغنہ بنا کر آصف خاں اور اس کے رفیق کار کوچ کر کے بھمبار تک آئے۔ نورجہاں کو اپنے دشمنوں کی اس غیر متوقعہ نقل و حرکت پر سکتہ ہو گیا۔ اس نے مرحوم شہنشاہ کی لاش لے کر ان سبھوں کا پیچھا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دارا، شجاع اور اورنگ زیب تھے۔ بھمبار میں آصف خان نے شاہجہاں کی موافقت میں اور آدمی توڑے اور خواجہ ابوالحسن کی امداد سے نورجہاں کے قبضے سے ان تینوں شہزادوں کو اپنی ہمشیرہ کے قبضہ سے الگ کرنے اور بادشاہ کی لاش لاہور میں دفن کے لیے بھیجنے کے لیے کامیاب ہوا اس کے بعد اس نے صادق خاں کو ہموار کیا۔ صادق خان بکلاحجان شاہ جہاں کی موافقت میں نہ تھا اس واسطے اس پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم پر زبردست اعتماد ہے۔ آصف خان نے تینوں شہزادوں کو اس کی سپردگی میں دے دیا۔ اب نورجہاں سے وہ نپٹ سکتا تھا۔ فوراً اس کی نگرانی ہونے لگی۔ اس کو کسی سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت بھی نہ رہی۔

شہریار کی تیاریاں

جب شہریار نے اپنے باپ کے مرنے کی خبر اور دشمن کی تیاریوں کا ذکر سنا تو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرا دیا۔ لاہور کا سارا خزانہ اپنے قبضے میں کر لیا اور پورا

توپ خانہ جو کشمیر جاتے وقت جہانگیر نے وہاں چھوڑا تھا وہ بھی لے لیا۔ اس کے علاوہ امرا کی جادادیں ضبط کرلیں اور ان کے اہل وعیال کو قید کر دیا۔ فضول خرچی سے روپیہ بانٹ کر اس نے ایک بڑی فوج بائسنغر ابن دانیال کی قیادت میں جمع کر دی۔ بائسنغر خواجہ ابوالحسن کے قبضہ سے نکل کر لاہور بھاگ آیا تھا۔ آصف خاں نے بھی جنگی لحاظ سے اپنی فوج مرتب کی۔ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔

شہریار کی شکست مخالف فوجیں لاہور سے تین میل کے فاصلے پر لڑیں۔ آصف خاں ہاتھی پر سوار تھا تاکہ اس کے آدمی اسے دیکھ بھی سکیں اور وہ ہمت افزائی بھی کر سکے اگرچہ اس کی فوج پوری طرح مسلح بھی لیکن اس میں ایسے لوگ تھے جن کو بہت سی لڑائیوں کا تجربہ تھا برخلاف اس کے شہریار کی فوج جس میں بے جانے بوجھے لوگ بھر لیے گئے تھے ایک گنوار دل سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اس میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے کبھی بندوق کی آواز بھی نہ سنی تھی پہلے ہی حملہ میں وہ منتشر ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شہریار اپنے سپہ سالار کے اشارے کا منتظر تھا کہ اگر دم پہ تو یہ امداد کے لیے آگے بڑھے افضل خاں نے ہتھکنڈوں سے اسے روک رکھا تھا وہ ابھی اپنے خیمہ میں تھا اپنے کو شہریار کا دوست ظاہر کرتا تھا۔ جب شہریار نے بائسنغر کی شکست کی خبر سنی تو وہ پسپا ہو کر قلعہ میں داخل ہوا دروازے بند کرلیے مگر اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

گرفتاری میدان جنگ سے آگے بڑھ کر آصف خاں قلعہ کے قریب آیا اور مہدی قاسم خاں کے باغ میں اپنے قدم جالیے اس مقام پر افضل خان اس سے ملنے آیا اس کے ساتھ بہت سے ایسے لوگ تھے جو شہریار کے طرفدار تھے مگر اب اس سے الگ ہو گئے تھے۔ قلعہ میں داخلہ اب آسان ہو گیا تھا۔ ارادت خان اور شایستہ خان رات کو قلعہ میں داخل ہو گئے اور اپنا خیمہ شاہی صحن میں گاڑ دیا۔ صبح کو انھوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور شہریار کی تلاش کرنے لگے۔ محلسرا سلطانی میں شہریار چھپا تھا لیکن خواجہ سرا فیروز خاں اور خدمت خاں آصف خان سے ملے ہوئے تھے انھوں نے شہزادہ کو دھوکا دیا اور اللہ وردی خان کے سپرد کر دیا وہ اسے داور بخش کے پاس لایا اور مجبور کیا کہ کورنش بجالائے۔ حکم ہوا کہ اسے قید کر دیا جائے۔ دو دن بعد اسے اندھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی تہمورث اور ہوشنگ پسران دانیال قید خانہ بھیج دیے گئے[۱۵]

داور بخش قربانی کی بھیڑ اس طرح آصف خان نے ہوشیاری سے شاہجہاں کے حریفوں کو ایک ایک کرکے ہٹا دیا سب ہی جانتے تھے کہ داور بخش قربانی کی بھیڑ ہے چنانچہ جب اس کو یہ خبر ملی کہ اس کو بادشاہ بنا دیا گیا ہے تو اس کو اس وقت تک یقین نہ ہوا جب تک آصف خان

اور ارادت خان نے قسم کھا کر اس خبر کی تصدیق نہ کی۔ لیکن ان دونوں امرا میں سے کوئی ایک بھی نہ جانتا تھا کہ اس کے اس اقدام سے ایک ایسی نظیر قائم ہو رہی ہے جو مستقبل میں بہت سے بے خطا شہزادوں کے خون بہانے کا سبب بن جائے گی۔ سردست صرف شاہجہاں اور کے پیش نظر تھا اس کی تخت نشینی کے لیے وہ ہر بات کرنے کو تیار تھے۔

شاہجہاں کو اطلاع بھیجی گئی

جس دن آصف خان نے داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کیا اسی دن اس نے بنارسی ہندو کو مع اپنی مہر کے شاہ جہاں کے پاس بھیجا۔ چونکہ خط لکھنے کا وقت نہ تھا اس نے قاصد کو زبانی پیغام دے کر حکم دیا کہ جتنی جلد وہ جا سکے پہنچ جائے۔ بنارسی نے بیس دن میں مسافت طے کی۔ ۱۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو بروز اتوار وہ جنّار پہنچا۔ راستے میں اُسے جہابت خان ملا دونوں مل کر شہزادے کو مبارک باد دینے گئے۔ لیکن شاہجہاں نے ظاہری طور پر باپ کے انتقال پر افسوس کیا اور کہا کہ دکن میں اس وقت رکنا ہے جب تک کہ سوگ کی مدّت پوری نہ ہو۔ اس کے مصاحبوں نے رائے دی کہ جتنی جلد ممکن ہو وہاں پہنچا جائے۔ جوتشی بلائے گئے کہ شمال کے سفر کے لیے نیک ساعت دیکھیں انہوں نے اگلی جمعرات کا دن مقرر کیا۔ شاہجہاں جنّار سے وقت مقررہ پر روانہ ہوا اس نے امان اللہ اور بایزید کو آصف خان کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیجا کہ وہ احمد آباد کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔

شاہجہان نے جان نثار خان کو خان جہاں کے پاس روانہ کیا

اگرچہ شاہجہاں کی بادشاہت کا اعلان باضابطہ نہیں ہوا تھا لیکن اب وہ مغل سلطنت کا واقعی حکمراں تھا اس پر جو ذمہ داریاں عاید ہوئیں ان کا پورا اُسے احساس تھا وہ دکن کے لیے زیادہ فکرمند تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب وہاں کوئی اور پیچیدگی پیدا ہو اس لیے جس دن اس نے جنّار چھوڑا اسی دن جان نثار خاں کو جہاں لودی کے پاس بھیجا۔ آخرالذکر کو اس کی جگہ نہ صرف بحال کیا بلکہ دوسری بہت سی دوسری مراعات سے بھی سرفراز فرمایا۔ لیکن خان جہاں نے قاصد کا سرد مہری سے استقبال کیا اور بغیر کسی جواب کے اُسے واپس کر دیا۔ اس کے بعد اس نے نظام شاہ سے اتحاد کر لیا۔ تاکہ مغلیہ اثرات سے دکن محفوظ رہے۔

شاہجہاں کا شمال جانا

شاہجہاں کا شمال روانہ ہونا ایک فتح مند جلوس کا نمونہ تھا۔ اس کے ایام مصیبت ختم ہو گئے اس کی عظمت کی دوسری صبح نمودار ہوئی۔ گجرات کی سرحد پر اسے بہر خان (شیر خان) سے سیف خان کے مشکوک رویّہ کی خبر ملی۔ شاہ جہاں نے اس کو ناظم بنا دیا اور حکم دیا کہ سیف خان کو قیدی کی طرح دربار میں پیش کریں۔ سیف خاں کی شادی ارجمند بیگم کی بہن سے

ہوگئی تھی۔ آخر الذکر اپنی بہن کی بڑی؛ لدادہ تھی سیف خان کی سلامتی کے خیال سے اس نے پرستار خان کو احمد آباد بھیجا تھا تاکہ وہ اس کے معزول بہنوئی پر کوئی آنچ نہ آنے دے۔

قمری سالگرہ کا جشن

بابا پیارے کے گھاٹ پر نربدا پار کیا گیا اور شاہی فوجی سواروں کا دستہ تقریباً نومبر کے آخر میں سینور پہنچا۔ یہاں مہینہ کی ۳۰ تاریخ کو شاہجہاں نے اپنی قمری سال گرہ منائی۔ ہنوز دعوت وغیرہ کا سلسلہ جاری تھا کہ شیر خان کا خط ملا۔ جس میں آصف خاں کی جنگ اور شہریار کی شکست کا تذکرہ تھا۔ اس خبر سے شاہجہاں کی مسرت اور زیادہ ہوگئی، حکم دیا کہ جشن فتح منانے کے نقارے بجائے جائیں۔

گجرات میں

شاہجہاں کو مبارک باد دینے کے لیے شیر خاں، محمود آباد تک آیا۔ یہ مقام احمد آباد سے بارہ کوہ کے فاصلہ پر تھا۔ کنکریا تالاب پر شاہی خیمہ نصب کیا گیا۔ ایک ہفتہ تک شاہجہاں انتظامی معاملات اور آرام کے لیے یہاں ٹھہرا رہا۔ شیر خان کو پنج ہزاری ذات اور آٹھ ہزار سوار کا منصب دیا گیا۔ مرزا عیسی کو چار ہزاری ذات ڈھائی ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔ خدمت پرست خان کو آصف خان کے پاس ایک فرمان دے کر بھیجا گیا جس کا منشا تھا کہ عوامی اور سیاسی حالات کے پیش نظر شہریار کی آنکھیں نکلوالی جائیں۔ داور بخش اور اس کے بھائی طہورث اور ہوشنگ کو ممکن ہو تو دربار بھیجا جائے۔ ورنہ ان کو صحیح مقام پر پہنچا دیا جائے۔ ان کے قتل کر دینے کا یہ پوشیدہ اشارہ تھا۔

راجپوتانہ میں

یکم جنوری ۱۶۲۸ء کو شاہجہاں گوکنڈہ پہنچا یہاں میواڑ کے رانا کرن سنگھ نے قیمتی نذریں گزاریں شاہجہاں نے اس کے عوض ایک اعزازی خلعت، ایک مرصع تلوار، ایک خنجر لعل و جواہر سے مرصع ایک ہار جس میں بدخشانی لعل قیمتی تیس ہزار روپیہ ایک ہاتھی جس پر چاندی کی عماری تھی اور ایک گھوڑا معہ نقرئی زین کے عطا کیے ۶ تاریخ کو شاہ جہاں نے اپنے وزن کیے جانے کی رسم شمسی مہینہ کے لحاظ سے منڈل تالاب کے کنارے منائی ۱۴ تاریخ کو وہ اجمیر کے اناساگر پر خیمہ زن ہوا۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح شیخ معین الدین چشتی کے مزار تک پاپیادہ گیا۔ حکم دیا کہ یہاں سنگ مرمر کی ایک مسجد تعمیر کی جائے یہ کارگزاری اس منت پوری ہونے کے تحت تھی جو میواڑ کی جنگ کو جاتے وقت اس نے مانی تھی۔ اجمیر کی نظامت پر مہابت خان کا تقرر ہوا۔ بعد وہ آگرہ روانہ ہوا۔ راستے میں بہت سے امرا مثلاً خان عالم، مظفر خان، ماموری، بہادر خان ازبک، راجہ جے سنگھ، راجہ بھارت، سید بارہہ وغیرہ نے مختلف مقامات پر احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

شاہجہاں کے نام سے خطبہ پڑھا گیا

امان اللہ اور بایزید کے واپس آنے پر آصف خان نے دوسرے

امرا کے مشورے سے شاہجہاں کے نام ۱۹ جنوری ۱۶۲۸ء کو خطبہ پڑھا گیا۔ اسی دن اس نے داور بخش کو قید خانہ بھیج دیا۔ اس کے بھائی گرشاسپ شہریار اور دانیال کے دونوں لڑکے طہمورث اور ہوشنگ کو تہ تیغ کیا گیا۔ اس طرح پانچ بے گناہ شہزادوں کا بلا وجہ خون بہایا گیا۔ اگرچہ شاہجہاں کی قسمت کا ستارہ اس وقت اوج پر تھا۔ لیکن آخر میں قدرت نے اس سے ان غلط کاریوں کا انتقام لیا۔ اس کو اپنی آنکھوں سے اپنے دو لڑکوں کا قتل اور تیسرے کا غائب ہونا دیکھنا پڑا۔

تاجپوشی تاریخ ۲۸ جنوری بروز پنجشنبہ ۱۶۲۸ء کو شاہجہاں آگرے کے قریب پہنچا دھارا باغ میں اٹھارہ دن ٹھہرا رہا۔ دارالسلطنت میں داخل ہونے کے لیے نیک ساعت کا انتظار تھا۔ ۱۴ فروری بروز دوشنبہ حسب منشا رنجمان درباری نئے بادشاہ کی تاجپوشی ہوئی۔ اس کے نام سے خطبہ پڑھا گیا اور اس نے پروقار لقب ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قرآن ثانی اپنے لیے پسند کیا۔ تیز رفتار ہرکارے دور دراز کے صوبہ جات میں تخت نشینی کی خبرے کر بھیجے گئے۔ شیوخ اور سادات، شعرا، منجمان، علما و پرہیزگار سب کو بادشاہ کی سخاوت کا فائدہ پہنچا۔ حکیم رکنائے کاشی سعیدائے گیلانی اور میر صالح نے مدحیہ قصائد پڑھے۔ ان سب کو دل کھول کر انعامات دیے گئے۔

دعوتیں ایوان خاص سے اٹھ کر بادشاہ حرم میں داخل ہوا۔ وہاں ارجمند بانو بیگم، جہاں آرا اور دوسری مستورات نے مبارکباد کے لیے اُسے گھیر لیا۔ بیگمات نے سونے چاندی کی بارش کر دی بے تحاشہ خیرات کی، یہ جوش مسرت کا اظہار شاہ جہاں کو پسند آیا اس نے جواب میں فیاضانہ انداز میں مستورات کو تحائف دیے۔ اپنی بیوی ملکہ ممتاز محل کو اس نے دو لاکھ اشرفی اور چھ لاکھ روپیہ تحفہ میں دیا اور اس کے لیے دس لاکھ روپے کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ جہاں آرا بیگم کو ایک لاکھ اشرفیاں اور چار لاکھ روپے دیے اور چھ لاکھ روپیہ سالانہ بطور وظیفہ مقرر کر دیا اس کا نصف شاہی خزانہ سے نقد ملے اور دوسرا نصف کے لیے مساوی جاگیریں عطا کی گئیں۔ وظائف و تحائف دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ شہنشاہ نے آٹھ لاکھ روپے اپنی بیوی کو دیے جس میں سے ساڑھے چار لاکھ روپے دارا، شجاع اور اورنگ زیب کے لیے مخصوص تھے۔ بقیہ روپیہ مراد، لطف اللہ، روشن آرا بیگم اور ثریا میں تقسیم کرنا تھا۔

ترقیات ایسے مواقع پر درباریوں اور افسروں کو اعزاز و درجات کی ترقی سے سرفراز کرنا رسمی دستور تھا۔ شاہ جہاں نے اپنے بزرگوں سے زیادہ دل کھول کر تاج پوشی کے وقت اس رسم کو بحال رکھا۔ ان افسروں میں سب سے زیادہ پہلا مشرف ہونے والا شخص آصف خان تھا اس کو ہشت ہزاری ذات اور ہشت ہزاری سوار دو اسپہ و سہ اسپہ کے منصب کے علاوہ سلطنت میں اس کو چچا کا خطاب اور سلطنت

کا اعلیٰ ترین منصب دار بنایا گیا۔ اس کے بعد مہابت خان کا نمبر تھا جس کو سات ہزار ذات اور سات ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب دار بنایا گیا نیز خان خاناں کے خطاب سے نوازا گیا۔ ایسے منصب داروں کی فہرست میں حسب ذیل اشخاص قابلِ ذکر لوگ ہیں۔

۱۔ وزیر خان
۲۔ سید مظفر بارہہ
۳۔ دلاور خان
۴۔ بہادر خان
۵۔ سردار خان
۶۔ راجہ وٹھل داس
۷۔ خدمت پرست خان۔

آخر الذکر کو میر توزک کا عہدہ دیا گیا۔

نظم و نسق میں تبدیلیاں

لوگوں کو ترقی دینے کے بعد انتظامیہ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ وفادار حضرات اپنے عہدوں پر بحال کیے گئے۔ مشکوک اور نافرمان عہدیداروں کو برخاست کر کے اہل وفا کو مامور کیا گیا۔ پہلی نوعیت میں حسب ذیل اشخاص آتے ہیں:۔

آصف خان۔ اعتقاد خان، خان جہاں اور باقر خان نجم ثانی۔

دوسری نوعیت میں یہ عہدیدار آتے ہیں:۔

بہار میں مرزا رستم کی جگہ پر خان عالم۔
کابل میں خواجہ ابو الحسن کی جگہ پر لشکر خان۔
بنگال میں فدائی خان کی جگہ پر قاسم خان جوینی
گجرات میں سیف خان کی جگہ پر شیر خان
مالوہ میں مظفر خان کی جگہ پر خان زماں ولد مہابت خان۔
الہ آباد میں جہانگیر قلی کی جگہ جان سپار خان۔
دلی میں مخلص خان کی جگہ پر قلیج خان

آصف خان کی آمد

تاج پوشی کا جشن اس وقت تک نہ ختم ہوا جب تک آصف خان نہیں آگیا۔ وہ آگرہ کے حدود میں ۲۶ فروری ۱۶۲۸ء کو داخل ہوا۔ پہلے وہ سکندرہ میں ٹھہرا۔ جہاں

ممتاز محل اور جہاں آرا بیگم اس سے ملاقات کو گئیں۔ اتنے دنوں کی مفارقت کے بعد اپنے بچوں سے مل کر ملکہ کو بڑی مسرت ہوئی۔ دوسرے دن شہنشاہ نے حکم دیا کہ آصف خان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ درجہ اول کے جملہ امرا، کو اس کے خیر مقدم کرتے ہوئے دربار تک آنے کا حکم ہوا۔ شہزادوں کے ساتھ اسے جھروکے تک لایا گیا شہزادوں نے باری باری نذریں پیش کیں۔ شاہ جہاں نیچے آیا اپنے بیٹوں کو گلے لگایا۔ آصف خاں کو قدم بوسی کی اجازت عطا کی گئی۔ اس زمانے میں یہ کمیاب اعزاز تھا۔ ملکہ کی درخواست پر اس کو شاہی مہر بھی سپرد کی گئی۔ شاہجہاں نے اس کو وکیل کا بھی درجہ عطا کیا۔

آصف خان کے بعد وہ امرا پیش کیے گئے جو اس کے ساتھ لاہور سے آئے تھے اور شاہجہاں کے لیے دلیری سے دادِ شجاعت دی تھی۔ شائستہ خان، صادق خان، اثبیر خواجہ، میر حسام الدین انجو، شاہ نواز خان۔ میر جملہ معتمد خان اور بہت سے لوگ شہنشاہ کے حضور میں پیش کیے گئے۔ شہنشاہ نے ان کی خدمات کا خاطر خواہ صلہ دیا۔ ان کی وفاداری کی تعریف کی۔ اس طرح اس عہد حکومت کا آغاز ہوا۔ جس کو مورخوں نے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شان دار عہد سمجھا ہے۔

باب ۴
بغاوتیں

تین اہم بغاوتیں جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئیں ان تینوں میں سے ہر ایک کی رہنمائی جہانگیر کے کسی منظورِ نظر نے کی یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ اکبر نے جاگیردارانہ نظام ختم کر کے بادشاہ اور امراء کے درمیان نئی نوعیت کا رشتہ قائم کیا۔ اس نظریہ کے مطابق حکومت نے زیادہ اطاعت و فرمانبرداری کا ان لوگوں سے مطالبہ کیا جن کی بادشاہ سے عقیدت مندی و وفا شعاری ان فرائض کا جزو تھیں جو ان کے لیے واجب الادا تھیں۔ اس کے عوض ان کو کوئی خاص حق بھی حاصل نہ تھا، بجز اس کے جو آقا کی خوشنودی سے ان کو نصیب ہو جاتا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کبھی امرا کا زیر بار احسان نہ ہو سکتا تھا۔ یہ بُرزور اصول جو شخصی حکومت کے لیے ضروری تھا جہانگیر کے عہد حکومت میں کمزور ہو گیا بلکہ متروک ہو گیا۔ اگرچہ نتائج مغلیہ حکومت کے لیے فوری تباہ کن نہیں ثابت ہوئے لیکن ایک بُرے نظام کو زبردست سرگرمی عطا کر گئے جس نے بالآخر حکومت تباہ کر دی جسب ذیل مثالوں میں یہ نظر آئے گا کہ جاگیریں خواہ کسی کو خواہ اس کے وطن میں دی گئیں یا غیر مناسب مراعات یا دونوں کے امتزاج کے مرکب کا، نونہ تھیں سلطنت کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ثابت ہوئیں۔

خان جہاں مردانہ شکل و دلپسند صورت کا آدمی تھا، وہ ناز و نعم کا پروردہ تھا لیکن خوش قسمتی کا منظورِ نظر تھا۔

اس نے اپنا وقت ذہنی آسانی اور خوشحالی میں گزارا۔ افغانی ہونے کے لحاظ سے وہ گستاخی نہیں برداشت کر سکتا تھا اس کے طور وطریق ناہموار تھے مزاج کے لحاظ سے وہ خود بین تھا۔ قدرت نے اسے زبردست ذاتی ہمت کا مالک بنایا تھا لیکن نہ تو وہ دانشمند سپہ سالار تھا نہ ہوشیار سیاست دان وہ جذباتی اور پُرجوش

انسان تھا۔ لیکن قوت برداشت نہ تھی وہ ہندوؤں سے بری طرح نفرت کرتا تھا حالانکہ اپنے اعتقادات میں سخت گیر بھی نہ تھا اپنے کو سنی بتاتا تھا لیکن زیادہ تر ایرانیوں سے ر [illegible] با اس کا ایک مقولہ یہ تھا کہ بغیر علی سے وابستگی کے کوئی بہادر نہیں ہو سکتا۔ شیخ فضل اللہ برہان پوری کے زیر اثر تصوف سے بھی لذت آشنا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت سی راتیں درویشوں اور علماء کے ساتھ گزاریں اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شہنشاہ جہانگیر کی اکثر خصوصیات اس میں ملتی ہیں، جو عہد جہانگیر میں اس کے فوری عروج کی نشاندہی کرتی ہیں[۱]۔

دکن کا ناظم

گزشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہجہاں کی بغاوت کیسے زیر کی گئی اور شہزادہ کو کس طریقہ سے دربدری نے اس وقت تک کے لیے بے ضرر بنا دیا تھا جب تک کہ نظام شاہ کی پناہ نہیں ملی۔ اس کی منضبط جاگیروں میں سے گجرات کا علاقہ داور بخش کو دے دیا گیا تھا۔ آخر الذکر کے نانا خان اعظم کو اس کا نگراں بنایا گیا، لیکن تقرر کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا اور داور بخش ایوان شاہی میں بلا لیا گیا۔ خان جہاں کو اس صوبہ کا ذمہ دار افسر بنا کر بھیجا گیا[۲]۔ بعد ازاں نورجہاں کی تجویز پر مہابت خان کی جگہ شہزادہ پرویز کا اتالیق بنا کر اسے بھیجا گیا۔ شہزادہ پرویز کی موت کے بعد وہ دکن کا مستقل ناظم بنایا گیا۔ یہاں نظام شاہ سے اس کا یارانہ ہو گیا۔ تین لاکھ روپیہ لے کر بالاگھاٹ اس کو سپرد کر دیا۔

سیاسی امور پر اس کی غلط نظری

اس لحاظ سے جہانگیر کی موت تک وہ حکومت کی نظر میں غدار کی حیثیت سے سامنے آیا اس درمیان میں دربار کی تیز رفتار تبدیلی کا وہ غور سے مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی نظر میں شہریار اور داور بخش میں رسہ کشی تھی۔ چونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہ تھا اس لیے اس نے اطمینان کر لیا کہ نورجہاں کی فتح ہو گی اور وہ اس کو آسانی سے خوش کر لے گا۔ بدقسمتی سے شاہجہاں کے حصول تخت کے امکانات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ امکانات کا وجود بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہوشیار سیاستدان نہ تھا اور پھر آصف خاں کے رازہائے سربستہ چند نفوس کو معلوم تھے۔ ان حالات میں تعجب نہیں کہ وہ اپنے احباب دریا خان روہیلا اور فاضل خان دیوان دکن کی غلط رائے سے بہک گیا ہو ان لوگوں نے اس کو مشورہ دیا ہو کہ مدمقابل دعویداروں کے جھگڑوں کے اختتام تک وہ خاموش رہے۔

شاہجہاں سے گفت و شنید پر انکار

حقیقتاً ان ہی دونوں نے اس کو شاہجہاں سے منحرف کر دیا، ان لوگوں نے یہ بات سمجھائی کہ شاہجہاں نے سپہ سالار کا لقب مہابت خان کو دیا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں یہ اس کا حق تھا۔ اسی لیے جب شاہجہاں کا ایک پیغام لے کر جان نثار خاں

برہان پور پہنچا تو خان جہاں کا ذہن متضاد خیالات سے پراگندہ تھا۔ اس نے پیامبر کا سرد مہری سے خیر مقدم کیا۔ بلا جواب دیے ہوئے، بغیر کسی رسم و اخلاق کے اس کو چلتا کر دیا۔ زبانی یہ کہلا بھیجا کہ وہ شاہجہاں کی خدمت کرنے سے معذور ہے۔

اس کی اطاعت

جان نثار خان کی واپسی پر خان جہاں برہان پور سے مالوہ اس لیے گیا کہ اس کے گورنر عبدالرزاق ماہری سے مانڈو چھین لے۔ اس کے ہمراہ راجہ جے سنگھ اور رنگ سنگھ بھی تھے لیکن یہ خبر سن کر کہ شاہجہاں اجمیر تک آ گیا ہے، خان جہاں سے ان لوگوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب خان جہاں کو ہوش آیا۔ خطرناک صورت کا اندازہ ہوا اس کے سامنے صرف ایک ہی ذریعہ جان بخشی کا رہ گیا تھا کہ وہ بادشاہ کی اطاعت میں سر جھکا دے۔ اس خیال سے اُس نے معافی نامہ لکھ کر شاہجہاں کے پاس ایک پیامبر سے آگرہ بھیجا۔ تحریر میں اپنی وفاداری اور فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ شہنشاہ نے ازراہِ عنایت اس کی درخواست منظور کر لی اس کو برار اور خاندیش کی گورنری عطا کر کے دکن کے کھوئے ہوئے مقبوضات واپس لینے کی ہدایت کی

دکن سے تبادلہ

لیکن خان جہاں اپنی بے دلی کی وجہ سے دکن میں ہاتھ پیر نہ مارنا چاہتا تھا جب شہنشاہ نے یہ محسوس کیا تو اس کو مالوہ بدل دیا دربار سے جھجھار سنگھ کے فرار ہونے پر خان جہ[ان] کو حکم ہوا کہ مہابت خان کے ساتھ مل کر غدار کو زیر کرے۔ اس نے فوراً اطاعت قبول کر لی۔ بعد ازاں مہابت خان دربار میں طلب کیا گیا۔ یہاں آنے پر جس طرح سے اس کا استقبال کیا گیا، اس پر اس کو بڑی مایوسی ہوئی نہ کوئی درباری اس کے خیر مقدم کو آیا اور نہ کوئی علامت اس کے استقبال کی نظر آئی۔ گزشتہ عہدِ حکومت میں اس کو جو اعزاز حاصل تھا اس کے پیش نظر شاہجہاں نے مہابت خان کو دہلی بلا لیا کیونکہ فوجی اعزاز کی برتری اور خان خاناں کے خطاب کے لحاظ سے وہ خان جہاں کے آگے سر جھکائے گا۔

اس کی افسردگی

لیکن یہ نوازشیں بھی اُن غیر معمولی مراعات اور امتیازات کے آگے ہیچ تھی جس کا وہ عادی ہو چکا تھا اس کا خیال تھا کہ ایسے اعزاز کا وہ مستحق ہے۔ ذلت و ندامت کے نتیجہ خیز احساس نے اس کو غمزدہ اور وہمی بنا دیا جب اس کے ہمراہیوں کی برطرفی اور جاگیروں کی ضبطی کا حکم ہوا تو وہ چوکنا[19] ہو گیا۔ طرہ یہ کہ جیسے یہ باتیں اس کے لیے کم تھیں ایک اور حادثہ ہوا جس نے اس کو بہت زیادہ ڈرا دیا۔ ایک رات مرزا لشکری ولد مخلص خان نے مذاق میں خان جہاں کے لڑکوں سے کہا کہ ان کے اور ان کے باپ کو جلد ہی قید خانے بھیج دیا جائے گا اس مذاق سے خان جہاں کا دل ٹوٹ گیا چپ چاپ اپنے گھر چلا گیا اپنے دو ہزار افغانیوں کو اُس نے اپنی حفاظت کے لیے متعین کر دیا دربار کا

جانا چھوڑ دیا۔

مصالحت شاہجہاں نے اس کی غیر حاضری جلد ہی محسوس کر لی۔ آصف خان سے سبب دریافت کیا۔ جب سرکاری اطلاع سے اس کو اطمینان نہ ہوا تو اس نے اسلام خان کو حکم دیا کہ وہ براہ راست خان جہاں سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کرے، خان جہاں نے بیباکی سے اپنے خوف کا اعتراف کیا اور کہا کہ مجھے سکون قلب اسی وقت حاصل ہو گا جب ایک شفقت آمیز فرمان شہنشاہ سے مل جائے گا۔ آصف خاں کی سفارش پر شاہجہاں نے خان جہان کو ایک تسکین بخش خط لکھ دیا۔ آخرالذکر وقتی طور پر مطمئن ہو گیا۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لیے یہ اطمینان دلا دے کہ شہنشاہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

اس کے خوف کے اسباب برخلاف اس کے وہ جتنا نئے انتظامات پر غور کرتا اتنا ہی اس کا ہراس بڑھتا جاتا تھا اس نے محسوس کیا نظام حکومت سخت ہوتا جا رہا ہے۔ بے ایمان ناوہندوں سے محاسبہ کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں نے انتشار کے زمانے میں کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا ہے ان سے جواب طلب کیا جا رہا ہے۔ جہانگیر کے منظور نظر ایک ایک کر کے ہٹائے جا رہے ہیں ان کی جگہ نئے بادشاہ کے مصاحبوں کو دی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں جھجار سنگھ کا واقعہ ایک مثال تھا۔ دوسری نظیر شاہی افسروں کی اس روپیہ کی وصولی تھی جو شہریار نے لاہور میں بے دریغ اڑا دیئے تھے۔ ان دو واقعات نے اس کو حواس باختہ کر دیا اس کے احساس جرم نے اس کو قطعی مایوسی سے ہمکنار کر دیا۔

اس نے نظام شاہ سے رشوت میں کثیر رقم لی تھی۔ مغلیہ حکومت سے نکلے ہوئے علاقوں کی واپسی کے لیے بھی اس نے کوئی عملی کوشش نہ کی تھی۔ ایک زمانے میں اس نے شاہجہاں کے پیامبر کو بڑی روا داری میں چلتا کر دیا تھا ان باتوں کو یاد کر کے وہ خود اپنی نظر میں مجرم اور دغاباز نظر آتا تھا۔ یہ خیال کہ اعزاز و اثر کی بلندی سے گر کر وہ قعر مذلت میں گر پڑا ہے اس کیلئے عذاب جان بن گیا۔ عنقریب سزا پانے کی افواہوں نے ضرور اس کی مصیبت و مایوسی میں اضافہ کیا ہو گا زیادہ دیر تک ظاہر داری کا نباہنا اس کے مزاج میں نہ تھا اس لیے اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

فرار کا ارادہ ۵ راکتوبر ۱۶۲۹ء کی رات کو جب آصف خاں گھوڑے پر سوار ہو کر نگرانی کے لیے نکلا تو اس کے بعض ان ہمراہیوں نے جن کا مکان خان جہاں کے مکان کے قریب تھا آصف خاں کو اطلاع دی کہ خان جہاں آگرہ سے بھاگنا چاہتا ہے۔ آصف خان نے وزیر خان کو شہنشاہ کی خدمت میں اطلاع کرنے کے لیے روانہ کیا، ساتھ ہی ساتھ یہ اجازت حاصل کی کہ خان جہاں کے گھر کا محاصرہ کیا جائے اور اس کو سزا دی جائے لیکن تازہ عفو تقصیر کے پیش نظر شاہجہاں نے اجازت نہ دی۔

آصف خاں سے کہلا بھیجا کہ وہ انتظار کرے جبتک کہ فرار ہونے کی خبر مکمل حقیقت نہ ہو جائے ۔

تعاقب

جب تخمیناً رات کا چوتھائی حصہ گزر گیا ۔ آصف خاں شہنشاہ کے پاس یہ اطلاع دیتے دوڑا گیا کہ خان جہاں معہ اعزا و اقربا کے فرار ہو گیا[19]۔ شاہجہاں نے خواجہ ابوالحسن، سید مظفر خاں ناصری خان، راجہ جے سنگھ خان زماں، صفدر خان، اللہ وردی خان، فدائی خان، معتمد خاں اور بہت سے دوسرے افسروں کو بھیجا، ان میں سے سید مظفر خاں، راجہ وٹھل داس، خواص خان، خدمت پرست خان، پرتھوی راج راٹھور نے نہ رات کے غیر مناسب وقت کا خیال کیا اور نہ قلت تعداد کا۔ علی الصباح نکل پڑے دھول پور کے قریب خان جہاں اور اس کے ساتھیوں کو جالیا ۔

خان جہاں کا محاصرہ

باغیوں کے آگے دریائے چنبل اور پیچھے تیغ انتقام تھی ۔ انھوں نے اپنا محاذ قرب وجوار کی پہاڑیوں اور متحرک لہروں میں قائم کیا ۔ اس انتظار میں تھے کہ شاہی افواج پہل کرے ۔ جنگ بہت مختصر لیکن خوفناک تھی ۔ شاہی فوج وفاداری کے جوش میں لڑی اور بہادر افغانوں نے اپنی پوری طاقت سے اپنی روک تھام کی ۔ اس لڑائی کے درمیان میں ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ پرتھوی راج راٹھور اور خان جہاں ایک دوسرے کے مقابل نظر آئے ۔ خان جہاں سوار تھا لیکن پرتھوی راج پیدل تھا اس کا گھوڑا مارا گیا تھا۔ بہرحال انھوں نے ایک دوسرے پر بڑے زوروں کا حملہ کیا اور دونوں بُری طرح زخمی ہوئے اسی طرح کا انفرادی مقابلہ شاہی فوج اور باغیوں میں کئی جگہ ہوا ۔ شاہی فوج کے تخمیناً سو آدمی مارے گئے، جس میں خدمت پرست خان، میر آتش، خواص خان بخشی، رحمت خان اور محمد شفیع نبیرۂ سید مظفر، راجہ وٹھل داس، پرتھوی راج راٹھور اور سید مظفر بُری طرح زخمی ہوئے ۔ باغیوں کے تخمیناً ساٹھ آدمی مارے گئے اس میں خان جہاں کے دو لڑکے عظمت اور حسین اور اس کا داماد شمس خان بھی تھے یہ حادثہ خان جہاں کی ہمت توڑنے کے لیے کافی تھا ۔ وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا ۔

دھول پور میں شاہی فوج کا قیام

شاہی فوج تعاقب کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکی اُس کے سربرآوردہ افسر زخمی ہو گئے تھے اس لیے بیماروں کو آرام پہنچانے کے خیال سے دھول پور میں رک گئی اس کے فوراً بعد معتمد خان، انی رائے، ابے سنگھ، خان زماں تیزی سے یکے بعد دیگرے پہنچے انھوں نے چاہا کہ باغیوں کا پیچھا کریں لیکن دریائے چنبل طغیانی پر تھا اس کا پار کرنا مشکل تھا۔ دوپہر میں خواجہ ابوالحسن بھی اپنی بقیہ فوجوں کے ساتھ یہاں پہنچ آیا چونکہ کوچ کی تیز رفتاری نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے طے کیا گیا کہ روانہ ہونے سے قبل تھوڑا سا آرام کرلیا جائے ۔ زخمیوں کو آگرہ واپس کیا گیا شاہ جہاں نے اُن کو انعامات اور درجات کی ترقی سے سرفراز فرمایا ۔

خان جہاں بچ کر دکن پہنچتا ہے شکست کے بعد خان جہاں دریائے چنبل پار کرنے کی تدبیریں کرنے لگا اس کا خاندان بھی بڑا تھا اور سامان بھی بہت تھا یہ ناقابل عمل معلوم ہوا کہ سب کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اس نے اپنا سارا سامان و خزانہ اور زیادہ بیگمات کو چھوڑ دیا اور اپنے دو لڑکوں اور پانچ افغانیوں کو ساتھ لے کر ہاتھی پر دریا پار کر گیا۔ دھولپور میں شاہی فوج کے رک جانے سے اس کو جان بچانے کا وقت مل گیا۔ وہ بندیل کھنڈ میں داخل ہوا اور کرا جیت کی مدد سے کسی سنسان راستے گونڈوانہ پہنچا تو یہاں اس نے تھوڑا سا آرام کیا اس کے بعد برار ہو کر سلطنت احمد نگر میں داخل ہوا۔ اسے امید تھی کہ یہاں اُسے پناہ مل جائے گی۔

اس کے تعاقب کی تجدید دو دن کے آرام کے بعد جب خواجہ ابوالحسن نے اس کے تعاقب کے لیے دریائے چنبل پار کیا تو اس کا سراغ نہ ملا۔ اس لیے اس نے گوالیار اور اندری سڑک پر چلنا شروع کیا امید یہ تھی کہ اس کو کہیں پائے گا اگرچہ وہ بڑی تیزی سے چلا مگر دشمن کی کوئی جھلک نظر نہ آئی۔ دکرم جیت سے بھی کوئی سراغ نہ ملا اس نے بندیل کھنڈ چھوڑ دیا۔ چندیری کی طرح گزرا اس کے بعد اودے پور گیا آخر میں سالوانا اس لیے ٹھہر گیا کہ دربار سے مزید ہدایات مل جائیں۔

خان جہاں کو اس کے کچھ دوست مل گئے جب خان جہاں نظام شاہی ملک میں پہنچا۔ یہاں جالنا پور کا جاگیردار نظام سکندر دوئم ثانی اور بالاپور کا جاگیردار بہلول میانی ملے وہ سب دولت آباد کی طرف بڑھے جب شہر کی حدود میں پہنچے۔ مرتضیٰ ثانی اپنے پرانے دوست کے استقبال کے لیے قلعہ کے باہر آیا اور خان جہاں کو اپنے خیمہ میں لے گیا خود مسند کے کنارے بیٹھا اور خان جہاں کو صدر نشین بنایا اپنے نیک ارادوں کے مزید ثبوت میں اُس نے خان جہاں کو بڈ (Bid) کا پرگنہ دیا کچھ روپیہ بھی اخراجات کے لیے دیے۔ خان جہاں کے ساتھیوں کو بھی اس نے بے امداد نہیں چھوڑا۔ ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا اور جاگیریں عطا کیں۔

مرتضیٰ کی اُمیدیں خان جہاں کی آمد نے مرتضیٰ ثانی کے دل میں نئی امیدیں پیدا کیں۔ اس نے سوچا کہ اس کی امداد سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنے وہ مقبوضات واپس لے لے جو اب تک مغلوں کی حکومت میں ہیں۔ دکن کے شاہی افسروں میں بہت سے خان جہاں کے دوست یا ملازم تھے۔ نظام شاہ کو امید ہوئی کہ خان جہاں کے اشارے پر وہ مقبوضات واپس کر دیں گے لیکن حالات میں واقعی ایسا ہوا بھی۔ اپنی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لیے مرتضیٰ ثانی نے ایک عجیب طریقے پر مغلوں پہ حملہ کی ابتدا کی۔

دکن میں مغلوں کے نقصانات

اس نے اپنے ماننے والوں کو وہ مقبوضات دے دیے جو مغلوں کے قبضے میں تھے۔ اس کی اجازت دی کہ وہ ساری جائداد اپنے قبضہ میں کرلیں اور ان کی آمدنی خود لے لیں۔ اس طرح مرتضیٰ ثانی نے اپنے آدمیوں میں آزادانہ حرارت کی اکنازہ لہر پیدا کردی۔ شاہ پرستوں کا قبضہ دکن میں کچھ یونہی سا تھا۔ اب ہمیشہ سے زیادہ حالت نازک ہوگئی ان کی بیرونی چوکیاں منتشر تھیں اور ان کے۔ ذرائع محدود تھے فی الحال وہ اس قابل نہ تھے کہ دکنیوں کا مقابلہ کرسکیں اس لیے مرتضیٰ ثانی کو بالادستی حاصل ہوئی۔ اس نے باہر سے آنے والوں کو اپنی سلطنت سے نکال باہر کیا۔ اسے اس کی خبر نہ تھی کہ اس کی یہ فتح چند روزہ ہے اور وہ اپنے لیے ایک خطرناک مہم کا سامان کررہا ہے۔ اگرچہ کسی بہانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس نے مغلیہ شہنشاہ کو ایک موقعہ دے دیا کہ وہ اپنی شاہانہ پالیسی دکن میں بھی شروع کرنے۔ آخرالذکر سردست حق بجانب تھا۔

شاہجہاں کے منصوبے

دکن کی نازک صورت حال سمجھنے میں شاہجہاں کو دیر نہیں لگی اس نے طے کیا کہ فوری اور موثر اقدامات سے کام لیا جائے اس نے اپنے باپ دادا کے عہد حکومت میں اپنی زیر قیادت محاربات سے ذاتی تجربہ حاصل کیا تھا اس نے ناکامی کا راز یہ معلوم کیا تھا کہ افسروں کی کسی ایک گروہ کی ذمہ داری سپرد کرنا فضول ہے خواہ اس گروہ کا ہر افسر کارآمد اور سرگرم ہو۔ اپنی حکومت کی پہلی جنگ کو وہ دیر تک چلتے ہوئے نہیں برداشت کرسکتا تھا اس لیے تمام ناکامیوں کے جملہ خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور افسروں کے مجموعی عمل سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے طے کیا کہ وہ خود جنگ کی نگرانی کے لیے جائے جیسا اس نے شہزادگی کے عالم میں کیا تھا۔ اس لیے ۲۶ دسمبر ۱۶۲۹ء کو اس نے آگرہ چھوڑ دیا۔ مالوہ میں داخل ہوا اور بغیر مانڈو میں قیام کیے ہوئے وہ آگے بڑھتا ہوا سیدھے نربدا پہنچا جسے اس نے اکبرپور میں پار کیا۔ ۱۲ فروری ۱۶۳۰ء کو اس نے اپنی پوری فوج کا جائزہ خاندیش کی سرحد پر لیا۔ دوسرے دن دکن کے گورنر ارادت خان نے اپنے صوبہ میں اس کا استقبال کیا۔

دکن میں لڑائیاں

دکن میں پہنچتے ہی شہنشاہ نے فوراً جنگ شروع کردی اپنی ٹڈی دل سپاہیوں سے اس نے بالاگھاٹ بھر دیا۔ تین بڑے دستے ارادت خاں کی سرکردگی میں دیے گئے ارادت خان کا اب خطاب خان اعظم تھا۔ اس نے نظام شاہی ملک کے وسط میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اس میں اس کے پیش نظر دو مصلحتیں تھیں ایک تو کھوئی ہوئی مملکت کا واپس لینا دوسرے خان جہاں کو شکست دینا۔ خان جہاں اب بھی بڈ میں تھا۔ بالاگھاٹ کی مہم برسات تک برابر جاری رہی اس کے بعد نقل و حرکت معطل کرنی پڑی۔ جون ۱۶۳۰ء میں ایک موقعہ پر شاہی فوجوں اور دکنیوں میں جم کر لڑائی ہوئی۔ آخرالذکر

کو شکست ہوئی اور لوگ بھاگ گئے۔ لیکن فتح کی خوشی میں شاہی فوج منتشر ہو گئی اور ایک دستہ اپنی مرکزی فوج سے علیحدہ ہو گیا۔ خان جہاں بارہ ہزار آدمی لے کر ان پر ٹوٹ پڑا اور شاہی فوج کی بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔

برسات میں دونوں حریف اپنی مختلف فوجی چوکیوں پر چلے گئے۔ اعظم خان اور اس کے سپاہی دیول گاؤں چلے گئے اور خان جہاں نے بذ کے قریب پناہ لی۔ دکینوں کا منصوبہ تھا کہ برسات بعد کسی ایک مرکزی جگہ پر اکٹھا ہو کر مغلوں سے جنگ کی جائے۔ اعظم خان نے ان کی شطرنجی چالوں کو مات دینے اور ان کے اجتماع کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا وہ دیول گاؤں سے خان جہاں پر حملہ کرنے کے لیے چلا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ راہوری میں بہت تھوڑی سی فوج کے ساتھ پڑا ہے اور مالِ غنیمت جو اسے قرب و جوار کے گاؤں سے ملاتھا تقسیم کر رہا ہے۔

چونکہ اعظم خان باغیوں پر اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا اس لیے صف شکن خان سپہ سالار پاتھری کو اس نے قلعہ کے باہر آنے اور خان جہاں کو مصروف بیکار رکھنے کا حکم دیا۔ یہ اس لیے کیا کہ اسے اندیشہ تھا کہ شاہی فوجوں کی آمد پر وہ بھاگ کھڑا نہ ہو۔ یہ منصوبہ قابل تعریف کامیابی سے ہمکنار ہوا کیونکہ جب صف شکن خان باغیوں سے لڑ رہا تھا۔ اعظم خان ان کی پشت پر آ گیا۔ خان جہاں گھبرا گیا اپنا کیمپ چھوڑ دیا کوشش کی کہ پہاڑیوں پر چڑھ کر اس پار چلا جائے۔ شاہی فوج کے لوگ اس کے چھوڑے ہوئے کیمپ کی لوٹ مار میں مصروف ہونے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے منتشر ہو گئے لیکن باہمت افسران مثلاً بہادر خان روہیلا، اہتمام خان اور نرہر داس جھالا نے باوجود قلت سپاہ کے جلدی سے پہاڑ کی چوٹی پر تیزی سے پہنچ گئے اور باغیوں کا پیچھا کرنے لگے۔ باغی گھوم پڑے۔ شاہی فوج سے لڑنے کے لیے رک گئے۔ بذ کی ناہموار پہاڑیوں میں کچھ دیر تک بڑی خوفناک لڑائی ہوئی۔ مغل شکست سے بال بال بچے کیونکہ ان کو کمک بر وقت مل گئی لیکن نرہر داس جھالا لڑتے ہوئے مارا گیا اور بہادر خان روہیلا دو بار زخمی ہوا۔ خان جہاں اور اس کے سپاہی گولیوں کی بوچھار میں شیو گاؤں کی طرف بھاگے۔ ان کے تعاقب کا سلسلہ تقریباً دو میل تک قائم رہا۔ راجہ پہاڑ سنگھ نے بہادر خان کو قتل کیا آخر الذکر خان جہاں کے بھروسے کا آدمی تھا۔

باغیوں کو بڑا سے بھگانے کے بعد اعظم خان چپل گاؤں واپس پہنچا کیونکہ اس کو اپنی فوج کے کچھ دکنی امرا کی وفاداری پر شک تھا۔ خان جہاں شیو گاؤں پہنچا یہاں دریا خان اس کا شریک کار ہوا، چونکہ اس کو اب تک تعاقب کا احتمال تھا اس لیے وہ دولت آباد چلا گیا۔ جہاں سے دریا خان پابن گھاٹ کوچ کر گیا۔ چالیس گاؤں اور دھارن گاؤں کو پوری طرح برباد کرنے کے بعد وہ بالا گھاٹ واپس گیا۔

مرتضیٰ کی سرد مہری

برخلاف اس کے شاہی افواج نظام شاہی مملکت کو ہر چہار طرف سے غارت کر رہی تھیں۔ دوسری طرف دولت آباد کے ارد گرد قحط سالی کا دور دورہ تھا جس نے لوگوں کی مصیبت کو خوفناک حد تک پہنچا دیا تھا۔ اب مرتضیٰ ثانی یہ سوچ کر خجل تھا کہ ناحق اس نے اپنے سر بے سود مقصد لے لیا۔ علاوہ اس احساس کے اس کو یہ بھی خیال ہوا کہ خاں جہاں اس کی امیدوں کو پورا نہ کر سکا۔ اس کے ہر کام میں افسوسناک نیم دلی و تذبذب کارفرما ہیں۔ مرتضیٰ ثانی کو یہ رجحان پسند نہ آیا اس نے مہمان سے اپنا رویہ بدل دیا اب وہ خان جہاں کا دوست نہ رہ گیا بلکہ اشارتاً یہ بھی جتا دیا کہ اب اس کا میرے علاقہ میں زیادہ قیام کرنا نامناسب ہے۔

خان جہاں دکن چھوڑتا ہے

اس اشارہ کی روشنی میں خان جہاں نے دریا خاں اور اپنے باقیماندہ لڑکوں کو ساتھ لے کر دولت آباد چھوڑ دیا۔ وہ مالوہ کی طرف روانہ ہوا خیال یہ تھا وہاں سے پنجاب پہنچ کر اپنے قبیلہ یعنی افغانیوں کے مشورہ سے سورش برپا کرے گا شہنشاہ نے پہلے ہی عبداللہ خان کو اس غرض سے روانہ کر دیا تھا کہ پاپن گھاٹ میں اسے روک دے مگر خان جہاں مغل افسر کی آنکھ میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ دھرمپوری میں اس نے دریائے نربدا پار کیا۔ اب شاہجہاں نے عبداللہ خان کی امداد کے لئے سید مظفر کو بھیجا اکبر پور میں دریائے نربدا پار کر کے وہ دیپالپور پہنچا۔ یہاں اسے علم ہوا کہ اجین کے مفتی کو خان جہاں کے ساتھیوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا ہے دیپالپور سے سید مظفر تال گاؤں گیا یہاں اسے عبداللہ خان ملا۔ دونوں خلجی پور روانہ ہوئے وہاں سے سرونج گئے جہاں پتہ چلا کہ باغی اس سے دو دن پہلے آئے تھے۔

تعاقب کا سلسلہ

سرونج سے خان جہاں داہنے طرف مڑ کر بندیل کھنڈ میں داخل ہوا لیکن اس بار دکرم جیت کے تیور بدلے ہوئے تھے اس نے دور اندیشی سے محسوس کر لیا تھا کہ باغیوں سے نپٹنے میں اگر کوئی بھی کوتاہی ہوئی تو انجام برا ہوگا۔ ۱۱ رجنوری ۱۶۳۱ء کو اس نے خان جہاں کے اس لشکر کے پشت پر حملہ کیا جس کا افسر دریا خان تھا۔ لڑائی میں آخرالذکر بری طرح گھائل ہوا۔ بندیلا نے غلط فہمی سے سمجھا کہ یہی خان جہاں ہے اس کی گردن کاٹ دی۔ اس کا سر دربار شاہجہاں میں بھیجا۔ اس طرح خان جہاں کو جان بچانے کا موقعہ مل گیا۔ وہ شمالی و مشرق کی طرف چلا اور بمقام نیمی بندھ میں داخل ہوا۔

خان جہاں شہنشاہ پرستوں سے لڑتا ہے

شہنشاہ پرستوں نے بڑی سرگرمی سے اس کا پیچھا کیا۔ سید مظفر نے اچانک ایسے وقت پر حملہ کیا کہ جب ایک طولانی فی ادا تھکا دینے

والے سفر کے بعد خان جہاں آرام کر رہا تھا۔ زرہ بکتر پہن کر جان پر کھیل گیا۔ اپنے پانچ چھ ہزار سپاہیوں سے اس نے سید کا مقابلہ کیا۔ دوران جنگ خان جہاں کا لڑکا محمود اور صدر روہیلا مارے گئے صدر روہیلا اس کا بڑا معتبر مشیر کار تھا۔ خان جہاں اپنے ہاتھی چھوڑ کر کالنجار کیطرف فرار ہوا۔ مگر یہاں کمانڈر سیتا احمد نے اس کا راستہ بند کر دیا۔ اس کے بائیس ہاتھی اور لڑکے حسن بھی گرفتار ہو گئے جس کو شہنشاہ کے حکم سے تہ تیغ کر دیا گیا۔

اس کی آخری جنگ اور موت

خان جہاں دریائے سنیدہ تک بڑی خستہ حالی و مایوسی کے عالم میں پہنچا۔ یہاں اس کے بعض ہمراہیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سید مظفر اور مادھو سنگھ اپنے آدمیوں کے ساتھ آ پہنچے۔ میدانِ جنگ کی موت کو پھانسی کے تختہ کی موت پر ترجیح دیتے ہوئے خان جہاں نے ایک بہادر افغان کی طرح شاہ پرستوں پر حملہ کیا۔ فوراً ہی وہ اپنے گھوڑے سے محروم ہو گیا لیکن وہ پا پیادہ لڑتا رہا۔ اس نے مادھو سنگھ کے گرز بردار پر حملہ کیا لیکن راجپوتوں نے اسے مغلوب کر دیا۔ مادھو سنگھ نے اپنے خنجر سے اسے زخمی کیا اور اس کے ماتحتوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھوڑی دیر میں عبداللہ خان موقع پر آ گیا اس نے خان جہاں کا سر بادشاہ کی خدمت میں بھجوا دیا۔ سر لے جانے والے خواجہ کامگار کو غیرت خان کا خطاب دیا گیا۔[۲۹]

تبصرہ

اس طرح خان جہاں کی بغاوت تخمیناً ۹ ماہ کے اندر ہی ختم ہو گئی۔ اس میں دو رائے نہیں کہ وہ غلطی پر تھا۔ اس کو اپنی اہمیت کا احساس مریضانہ ذہنیت کا نتیجہ تھا۔ جہانگیر کی غیر معمولی عنایات نے اس احساس کو اور ہوا دی۔ پناہ کے لئے دکن بھاگ جانا بھی غلط ثابت ہوا۔ اس کی بجائے وہ پنجاب جا سکتا تھا افغانوں کی امداد سے وہاں زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا اگر ناکامیابی ہوتی تو موقع ملتا کہ وہ سرزمین ایران میں پناہ لے۔ اپنی بغاوت کی ساری مدت میں اس نے جم کر کہیں مقابلہ نہ کیا اس رویہ سے اپنے ساتھیوں کی ہمدردی سے محروم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مرتضیٰ ثانی نے بھی کنارہ کشی کر لی۔ اس ناعاقبت اندیشی نے نہ صرف اس کو تباہ کیا بلکہ احمد نگر کی زوال آمادہ بلکہ جان بلب سلطنت کا خاتمہ تیز تر کر دیا۔

جہانگیر کی عنایات بیر سنگھ پر

دوسری بغاوت جس کا سرغنہ ججھار سنگھ تھا بہت سی باتوں میں خان جہاں کی سرکشی سے ملتی جلتی ہے۔ بعض اسباب بغاوت دونوں کے مشترک ہیں۔ ججھار سنگھ کا باپ بیر سنگھ دیو[۳۰]۔ خان جہاں کی طرح جہانگیر کا بڑا دوست تھا۔ جہانگیر کے برتاؤ اور رجحان نے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ بادشاہ اس کی نمایاں خدمات کی بنا پر اس کا ممنون احسان ہے مغل دربار میں بیر سنگھ کی وہ عزت تھی کہ کوئی شخص اس کی زیادتی کی برائی کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا

یہ مراعات شاہی جو شہنشاہ کی خوشنودی سے ملا کرتے اور شہنشاہ کسی وقت بھی انھیں اپنی مرضی کے مطابق بغیر سبب یا وجہ کے واپس لے سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان مراعات سے سرفراز ہونے والے ذہنی طور پر انھیں اپنا حق سمجھنے لگے ۔

جھجار سنگھ اور اس کا بیٹا

۱۶۲۷ء میں بیر سنگھ کا انتقال ہوا اس کی جگہ اس کا بڑا لڑکا جھجار سنگھ گدی نشین ہوا ۔ جب وہ شہنشاہ کو مبارک باد دینے گیا تو بندیل کھنڈ کا انتظام اپنے لڑکے وکرم جیت کے سپرد کر گیا ۔ جوان ہونے کے علاوہ وہ لڑاکا اور ظالم بھی تھا ۔ اس نے تھوڑے ہی دن میں اپنی ریاست کے پرانے افسروں سے جھگڑا کر لیا ۔ بلا وجہ کسی کو سزا دی کسی کو قید بھیج دیا ۔ قید خانے والوں میں کرپارام گوڑ بھی تھا ۔ وہ اس کے باپ کا وکیل اور مشیر خاص تھا ۔ وکرم جیت نے اسے اُوچھا کے قلعہ میں قید کر کے اذیت دینا شروع کیا ۔ پہرہ داروں کو رشوت دے کر کرپارام قید خانے سے بھاگ گیا ۔ وہ دکن کی طرف بھاگا جس کا پیچھا وکرم جیت نے دھولپور تک کیا مگر کرپارام برہان پور پہنچ گیا وہاں سے شاہی دربار پہنچا اور ملازم ہو گیا[31] ۔

جھجار سنگھ کا آگرہ آنا اور بھاگنا

۱۰ اپریل ۱۶۲۸ء کو جھجار سنگھ آگرے پہنچا اور اس نے شہنشاہ کو ایک ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی نذر کیا اس کو چار ہزاری ذات اور چار ہزار آدمی سوار کا منصب ملا بادشاہ نے اسے جواہرات سے مرصع ایک خنجر مع طبل و علم عنایت کیا اس طرح گویا اس کا استقبال دربار میں بہت قابل اطمینان ہوا[32] ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی شاہجہاں نے اس کے باپ کی غیر مستند آمدنی کی تحقیقات شروع کر دی ۔ جھجار سنگھ نے سوچا تحقیقات کا اطمینان بخش جواب دینا بالکل غیر ممکن ہے ۔ شہنشاہ کو وہ مطمئن نہیں کر سکتا ۔ اس کھلی ہوئی ذلت کے احساس نے اسے چونکا دیا وہ ۱۱ جون کو خفیہ طور پر آگرہ سے بھاگ کھڑا ہوا اس کا تعاقب فی الحال[33] ملتوی کیا گیا اس لیے کہ کابل پر نذر محمد نے حملہ کر دیا تھا لیکن جب فتنہ فرو ہو گیا تو شاہجہاں نے پھر جھجار سنگھ کی طرف توجہ کی ۔

مہابت خان اور جھجار سنگھ کا مقابلہ

مہابت خان کی سرکردگی میں آگرہ سے ایک زبردست فوج بھیجی گئی جس میں ۱۰ ہزار سوار، دو ہزار بندوقچی اور پانچ سو سفر مینا کے سپاہی شامل تھے ۔ مہابت خاں کی تند مزاجی کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے اس کے ساتھ اسلام خاں بھی لگا دیا گیا ۔ علاوہ بریں، خان جہاں کو حکم دیا گیا کہ وہ مالوہ سے کوچ کر کے اوڑچھا کی طرف ۸۰۰۰ فوج لے کر جائے ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہا گیا کہ راجہ بھرت بندیلا کو بھی ساتھ لے لے ۔ آخر الذکر بندیلا کی گدی کا حریف بھی تھا ۔ ایک تیسری فوج کو حکم ہوا کہ زیر قیادت عبداللہ خان و بہادر خان روہیلا پورب[34] سے روانہ ہو کر اوڑچھا میں جمع ہو جائے ۔

فوجوں کے اتحادِ عمل اور حملہ کی تیز رفتاری کو سرگرم رکھنے کے لیے شاہجہاں خود بھی اکتوبر ۱۶۲۸ء کو آگرہ سے روانہ ہوا۔ راستے میں تقریباً جابجا خاص کر باری میں شکار کے لیے رکا بھی۔ یہ سب کرتا ہوا وہ ۲۰ جنوری ۱۶۲۹ء کو گوالیار پہنچا۔ اس اثناء میں مہابت خاں جو شہنشاہ سے آگے چل رہا تھا گوالیار سے گزر کر بندیل کھنڈ میں داخل ہو گیا۔ اوڑچھا سے ۳۲ میل پچھم اس نے پڑاؤ ڈالا۔ جنوب سے خان جہاں نسبتاً بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ پاس پڑوس کے علاقوں کو تباہ کرتا رہا۔ عبداللہ نے بندیل کھنڈ کی مشرقی سرحد پار کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ باقر خان وغیرہ کے ساتھ اس نے قلعہ پر پورب کی جانب سے اور بہادر خان روہیلہ نے شمال کی طرف سے حملہ کیا۔ راجہ پہاڑ سنگھ نے اپنے ہاتھیوں سے باہر کی دیوار ڈھا دی لیکن بہادر خان صدر دروازے سے اندر آ گیا۔ مقابلہ کرنے والوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن تین ہزار ہندو مارے گئے۔

ججھار سنگھ کی سپردگی

ایراج کی تسخیر اور شاہی سپہ سالاروں کی یک جہتی نے ججھار سنگھ کو بدحواس کر دیا۔ علاوہ بریں اس کی رعایا بھی اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بھائی ہردیو سنگھ کو زہر دے دیا تھا۔ اسے صرف شک تھا کہ اس کی بیوی[۳۹] سے اس کا ناجائز تعلق تھا۔ ایسی صورت حال میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا اس کے لیے بیکار تھا۔ اُس نے راہ دے دی اور مہابت[۴۰] خان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس کی سفارش کر دے۔ شہنشاہ نے ججھار سنگھ کی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا۔

شاہجہاں کے حضور میں اس کا پیش ہونا اور معافی

معاملات کے کامیاب خاتمہ پر شاہجہاں، فروری ۱۶۲۹ء کو گوالیار سے چل پڑا۔ ایک ہفتہ بعد آگرہ پہنچا۔ یہاں مہابت خان نے باغی ججھار سنگھ کو حضور شاہ پیش کیا۔ مجرم نے شہنشاہ کو بطور تاوان پندرہ لاکھ روپیہ اور چالیس ہاتھی نذر کیے۔ اس کے عوض شاہ جہاں نے اس کا اصل منصب برقرار رکھا لیکن بعض جاگیریں ضبط کر کے خان جہاں، عبداللہ خان، رشید خان، سید مظفر خان اور پہاڑ سنگھ کو تقسیم کر دی گئیں۔ ججھار سنگھ کو حکم ہوا کہ وہ دکن میں دو ہزار سوار اور دو ہزار پیدل کے حاضر ہو۔[۴۱]

دکن میں اس کا کارنامہ

خان جہاں کے خلاف لڑائی میں ججھار سنگھ اعظم خان کی قیادت میں مغل پرچم کے نیچے بڑی بہادری سے لڑا۔ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے جنوری ۱۶۳۰ء میں وہ پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب دار بنا دیا گیا۔ اسی سال کے ۱۰ مئی میں وہ اور اس کے بھائی پہاڑ سنگھ دونوں کو راجہ[۴۲] کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ اعظم خان اس کی تدبیر اور ہمت سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ ججھار سنگھ کو وہ اکثر کونسل کی میٹنگ میں بلاتا اور اس کی تجویزات پر خاص طور پر غور کرتا۔ دھارور کے محاصرہ میں اس کی فوج نے دکن کی سرحدی چوکیوں پر دوبارہ حملہ کیا بہت سے ہاتھی، گھوڑے، خچر اور بیل اپنے

قبضے میں کیے، قلعہ کی تسخیر پر اس کی خدمات کا مناسب انعام دیا گیا۔ جب اعظم خان کو معزولی کا حکم ہوا تو آصف خان کو اس کی جگہ دی گئی تو جھجار سنگھ کو اس کے ساتھ رہنے کا حکم ہوا۔ ۱۶۳۲ء تک وہ دکن میں رہا۔ مہابت خان نے جو محاصرہ دولت آباد کی تسخیر کے لئے کیا اس نے اس میں بھی حصہ لیا۔ بعد ازاں مہابت خان کی اجازت سے اپنے لڑکے جگ راج کو دکن میں اپنے عوض دے کر وہ وطن چلا آیا۔[۴۴]

اس کی اورچھا کی واپسی اور زیادتی

اور چھا آنے کے بعد اس نے حوصلہ مند سرگرمی شروع کر دی اپنی توجہ ریاست کی توسیع پر کی۔ اپنے علاقہ کا کچھ حصہ پہلی غداری میں کھو چکا تھا اب مناسب وقت تھا کہ اس کی تلافی کرے۔ شہنشاہ آگرہ سے دور تھا۔ اور دکن میں ہنوز خاموشی نہ تھی، اس کے پیش نظر اس نے بغیر کسی اشتعال کے راجہ پریم نرائن کے خلاف حملہ کر دیا۔ چوراگڑھ کی گڑھی گھیر لی۔ پریشان ہو کر راجہ نے حملہ آور سے مصالحت کی کوشش کی، لیکن جھجار سنگھ کسی گفت و شنید کے لئے تیار نہ تھا پریم نرائن نے امداد کے لئے ایک قاصد شاہ جہان کے پاس بھیجا۔ آخرالذکر نے صرف ایک آدمی بھیجا کہ جھجار سنگھ کو سمجھا بجھا کر محاصرہ اٹھا لینے کے لئے کہے لیکن اس نے اس تجویز کو بھی حقارت کے ساتھ رد کر دیا۔ اب پریم نرائن کو روک تھام کی طاقت نہ تھی جس شرط پر بھی ممکن ہوا صلح کر لی۔ جب وہ قلعہ سے باہر آیا تو اس کے پیمان وفاداری کا خیال کیے بغیر بندیلیوں نے نہ لڑنے والے راجہ کو گھیر لیا۔ راجہ نے قطع امید کے بعد اپنی عورتوں کو مار ڈالا اور اپنے دو تین سو بہادر سپاہیوں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ چوراگڑھ کے قلعہ پر جھجار سنگھ نے قبضہ کر لیا۔

اس کے خلاف شکایت

اس درمیان میں راجہ پریم نرائن کا لڑکا، خان دوران سے مالوہ میں ملا۔ وہاں سے وہ جھجار سنگھ کے بلا وجہ جارحانہ اقدام کی اور باپ کے قتل کی شکایت کرنے شاہجہان کی خدمت میں گیا۔ جھجار سنگھ سے ناراض ہونے کی اب وجہ شاہ جہان کے پاس تھی اس نے اپنے ایک ساتھی خراج گزار سردار پر بغیر شاہی اجازت کے حملہ کر دیا تھا اور اس سے بھی خراب بات یہ ہوئی کہ اس نے شاہی احکام کی سبکی کی۔ علاوہ بریں یہ بالکل سیاست کے خلاف تھا کہ دکن کی سرحد پر ایک طاقتور راجہ کو بغیر سزا کے چھوڑ دیا جائے لیکن اس پر حملہ کرنے سے پہلے شاہ جہاں نے جھجار سنگھ کو اپنی شرائط سے آگاہ کیا جن کے مان لینے پر خطا معاف کر دی جائے گی۔

کوئی شاعر رائے کا مشن

بادشاہ نے جھجار سنگھ کے نام ایک خط لکھ کر بندر کوئی رائے سے بھیجا۔ خط حسب ذیل ہے :-

"پریم نرائن پر حملہ کرنا بغیر ہماری اجازت کے نامناسب حرکت تھی اور اس سے بھی خراب

بات یہ ہوئی کہ تم اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ اب تک جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اب تمہارے جرموں کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ جو حصہ تم نے زبردستی لے لیا ہے اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ تم کو دس لاکھ روپیہ جو پریم نرائن سے ملا ہے اسے شاہی خزانہ میں بھیج دو۔ لیکن اگر تم ان مقبوضات کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے ہو تو اپنے علاقہ سے اسی کے برابر حصہ چھوڑ دو۔"[۴۵]

شاہجہان کے رویہ پر تنقید

اس خط سے شاہ جہاں کے خسیس ارادے کا اندازہ ہوتا ہے۔ بجائے ایک کمزور فریق اور اپنے خراج گزار کو بچانے کے بادشاہ خود ہی یہ فائدے لینا چاہتا تھا جو ججھار سنگھ نے اپنی کوششوں سے حاصل کئے تھے۔ ججھار سنگھ نے شاہانہ اعزاز کو صدمہ پہنچایا، اخلاق کے روایتی آداب توڑے لیکن روپیہ سے سب کی تلافی ہو سکتی تھی۔ حصولِ زر کے بعد اس کے بھیانک کرتوت بھی مقدس ہو جاتے۔ پریم نرائن کے وارثوں کو معاوضہ دلانے کے لئے شہنشاہ نے ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ صرف اپنے لئے روپیہ چاہتا تھا جیسے ایک رہزن دوسرے ہم پیشہ رہزن سے مال غنیمت میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ بادشاہ کی طرح اپنی رعایا کے تحفظ کا اسے خیال نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حریص نظر میں ججھار سنگھ کی ناجائز دولت پر تھیں اس سے وہ آخرالذکر کو محروم کرنے کے لیے کوئی بہانہ چاہتا تھا۔

ججھار کو تعمیل حکم سے انکار

ان مطالبات کا صرف ایک جواب تھا۔ ججھار سنگھ نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اپنی سب دولت اور زمین جو آٹھ مہینے کی محنت شاقہ سے حاصل کی ہے وہ سب شاہی خزانہ میں جمع کر دیتا ہے تو اتنی تکلیف اٹھانے سے فائدہ کیا ہوا۔ یہ سوچ کر اس نے شاہی قاصد کو بڑی بے رخی سے واپس کر دیا۔ اس نے اپنے لڑکے جگ راج کو کہلا بھیجا کہ وہ چھپ کر دکن سے آجائے۔ جگ راج دولت آباد سے اس بہانے فرار ہوا کہ شکار کھیلنے جا رہا ہے۔ خان جہاں، ناظم بالا گھاٹ نے اس کا پیچھا نہ کیا۔ لیکن خان دوراں جو پایاں گھاٹ کا ذمہ دار افسر تھا اس کی نظر بڑی تیز تھی اس نے سرگرمی سے مفرور کا پیچھا کیا اس کو جا لیا اور مالوہ میں بہ مقام اشتہا اس کو شکست دی۔ اللہ وردی خان اگر خان دوراں سے ترک موالات نہ کرتا تو جگ راج گرفتار کر لیا گیا ہوتا۔[۴۶] وہ بچ کر دھامونی پہنچ گیا۔

اس کو زیر کرنے کی تیاریاں

پیش کردہ شرائط کی نامنظوری اور جگ راج کا دکن سے بھاگ کھڑے ہونے سے شاہ جہاں کی سخت گیری کا ایک موقعہ مل گیا۔ حکم ہوا کہ بیس ہزار زبردست فوج تین مشہور سپہ سالاروں کی قیادت میں بندیل کھنڈ جائے اور باغیوں کو نیست و نابود کر دے، ساتھ ہی ساتھ خان دوراں کو بھی حکم ملا کہ چھ ہزار فوج لے کر وہ چندیری کے راستے سے بچور جائے اور [illegible] ساتھ دیبی سنگھ کو بھی جانے کا حکم ہوا۔ آخرالذکر مندیلہ کی گدی کا دعویدار

تھا اس کو راجہ کا خطاب تین ہزار ذات اور تین ہزار سوار کا منصب بھی حاصل تھا۔ عبداللہ خان کو حکم ہوا کہ وہ ایلاچ پر قبضہ کر کے جہان دیر میں ٹھہرے۔ تیسرا خان جہاں سے کہا گیا کہ وہ برسات تک بدایوں میں ٹھہرے۔ برسات ختم ہونے کے بعد تینوں سپہ سالار مل جل کر اورچھا پر حملہ کریں۔

ججھار کی کوشش مصالحت کے لیے

اس بڑے پیمانے کی فوجی تیاریوں نے ججھار سنگھ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے آصف خان سے استدعا کی کہ اس کی سفارش شہنشاہ سے کر دے۔ شاہجہاں اس بات پر راضی ہو کہ وہ سندر کوی رائے کو دوسری بار اورچھا بھیجے لیکن اس بار اس نے اپنے مطالبات اور بڑھا دیے۔ ججھار سنگھ سے بتیس لاکھ روپیہ تاوان طلب کیا۔ چوراگڈھ کے عوض بیان[۴۹] دان سرکار سے دستبردار ہونا اور نیز یہ کہ جے راج کو خان زماں کی ماتحتی میں دکن بھیجنا ضروری قرار پایا۔ آخری شرط یہ تھی کہ وہ اپنے پوتے کو دربار میں بھیج دے جہاں وہ اس کی نیک چلنی کا یرغمال ہو کر رہے۔ سپہ سالاروں کو حکم ہوا کہ فی الحال وہ اپنے مجوزہ حملے اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیں جب تک قاصد واپس نہ آ جائے۔

پہلے کی طرح یہ شرائط بھی ججھار سنگھ کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ شاید اس کا اظہار خوف صرف تصنع تھا۔ وہ ابتدائی گفت و شنید کے وقت پر خلوص نہ تھا اپنی جنگی تیاریوں کی تکمیل کے لیے وہ ایام گذاری کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے ججھار سنگھ نے سندر کوی رائے کو پھر اسی طرح واپس کر دیا بلکہ اس بار اس نے شرائط بھی نہیں سنیں۔ یہ تو نہیں تھا کہ وہ شاہی مطالبات پورا نہیں کر سکتا تھا اس کے پاس روپیہ بہت تھا لیکن وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے باغیوں کی طرح شاہی طاقت اور دشمنوں کے خلاف شاہجہاں کے ارادے کی پختگی سے وہ بھی بے خبر تھا۔

جنگ کی ابتدا

ججھار سنگھ کے جارحانہ برتاؤ کی اطلاع پر اس نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ مجوزہ منصوبہ کے تحت لڑائی شروع کی جائے چونکہ تینوں فوجی سردار برابر[۵۰] مرتبہ کے تھے۔ شاہجہاں نے شہزادے اورنگ زیب کو اعلیٰ سپہ سالار مقرر کیا اور شائستہ خان کو اس کا اتالیق اور مشیر بنا دیا۔ شہزادے کا منصب پندرہ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا ہوا۔ شاہی افسروں کو حکم ہوا کہ عمل میں لانے سے پہلے اپنی کارروائیوں کی توثیق اس سے حاصل کریں۔

اورنگ زیب کا حصہ

کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کا تقرر اس ذمہ دار عہدے پر اس کی خواہش کے پیش نظر ہوا تھا کہ اس کو دکن کا نائب سلطان بنا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مغلیہ خاندان میں دستور تھا کہ شہزادوں کو عملی انتظام سے جلد از جلد واقف کار بنایا جائے لیکن اورنگ زیب کے اس وقت کا یہ تقرر حقیقت سے زیادہ نام نہادی تھا۔ اس کا مقابلہ شاہ جہاں کے اس سپہ سالاری

سے نہیں کیا جا سکتا جو رانا کے خلاف یا دکن کی مخالفت میں اس کو حاصل ہوئی۔ ان دونوں معرکوں میں شاہجہاں کی آواز موثر تھی اور مہم کی ابتدا اس کے ہاتھ میں تھی لیکن بندیلہ کی لڑائی میں اورنگ زیب نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی جو کچھ تجربہ اس نے حاصل کیا وہ ایک تماشائی کی حیثیت سے۔ عملی کارروائی سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔

جھجار سنگھ کا گھیراؤ۔ جانوروں کی طرح کا

شاہی فوجوں نے فوراً ججھار سنگھ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن شہنشاہ کو تسکین نہ ہوئی وہ ججھار سنگھ کے قتل کا خواہاں تھا ایسے باغیوں کی سزا صرف موت تھی اس لیے موجودہ کامیابیوں سے جوش میں آکر فوجی افسر چوراگڑھ کی طرف بڑھے۔ ججھار سنگھ کی ہمت ٹوٹ چکی تھی اب اس میں طاقت نہ تھی کہ چوراگڑھ میں ٹھہر کر مردانہ وار مقابلہ کرے، شاہ پرستوں کی آمد پر اس نے اپنی بندوقیں اور توپیں برباد کر دیں، عمارتیں مسمار کر دیں اور شاہ پور بھاگ گیا۔ وہاں سے لاقی ہوتے ہوئے دکن گیا۔ یہ سن کر شاہی فوج تیز رفتاری سے چوراگڑھ پہنچی خان دوراں قلعہ میں داخل ہو گیا۔ خاص مندر کی چوٹی پر چڑھ گیا اذان دی اور شاہجہاں کے نام سے خطبہ پڑھا۔ قلعہ کی دیکھ بھال کا ذمہ دار احداد خان دغسو کو بنا کر وہ عبداللہ خان کے پاس آیا۔ تاکہ ججھار سنگھ کا تعاقب شروع کیا جائے۔

پکڑا جانا اور مارا جانا

شاہ پور میں راگھو چودھری نے خان دوراں کو باغی کی نقل و حرکت کی خبر دی۔ عبداللہ خان کے ساتھ اس کے پکڑنے کے لیے وہ فوراً چل پڑا۔ شہزادہ اورنگ زیب ان کے پیچھے تھا۔ اطمینان سے فوج کے پچھلے حصے کو دیکھتا رہا جو خبریں افسروں سے ملتی رہیں وہ دربار بھیجتا رہا۔ شاہجہاں نے شہزادہ کو حکم دیا کہ وہ دھمونی واپس آئے لیکن خان دوراں اور عبداللہ خان نے چاندا تک باغیوں کا پیچھا کیا اور قریب قریب ان کو جا لیا۔ خان دوراں نے تجویز کی کہ رات کے سناٹے میں ان پر ٹوٹ پڑا جائے۔ لیکن عبداللہ خان نے اسے روک دیا۔ ججھار سنگھ کو بروقت خبر مل گئی جان بچا کر گونڈوانا پہنچا۔ لیکن بہت جلد خان دوراں اس کے قریب پہنچ گیا۔ انتہائی ناامیدی کے عالم میں بندیلوں نے بیر سنگھ دیو کی خاص رانی پاربتی کو بری طرح زخمی کیا۔ اپنی عورتوں کی شکلیں بگاڑ دیں تاکہ وہ مغل کے حرم میں داخل نہ کی جائیں۔ لیکن درگ بھان ولد ججھار سنگھ اور اس کا پوتا درجن سال زندہ پکڑ لیے گئے۔ ججھار سنگھ اور جگ راج کسی طرح بچ کر قریب کے جنگلوں میں پہنچ گئے یہاں گونڈوں نے ان کو مار ڈالا، ان کے مردہ جسم خان دوراں کو ملے جس نے ان کے سر کاٹ کے دربار میں بھیج دیے۔

مغلوں کے فائدے

اس درمیان میں شہنشاہ نے سید خان جہاں کو حکم دیا کہ ججھار سنگھ کے چھوڑے ہوئے خزانوں کو وہ جنگل اور کنویں کھود کر برآمد کرے۔ اسحاق بیگ یزدی، باقی بیگ قلماق

اور مکرمت خان، خان جہاں کی امداد کے لئے بھیجے گئے۔ مقامی باشندوں کے بتلائے ہوئے نشانات پر انہوں نے دھامونی اور دیتیا کے درمیان کی زمین کھودی بہت کم وقفہ میں اٹھائیس لاکھ روپیہ برآمد ہوا لا لجملہ۔ ایک کروڑ روپیہ شاہی خزانے میں داخل کیا گیا۔ جو کچھ شاہی افسروں کو نہ مل سکا وہ وہاں کے باشندوں یا سپاہیوں اور راجادیوں کو ملا۔

شاہجہاں کی مذہبی ناروا داری

اس طرح بندیلہ خاندان کی سب سے زیادہ خوشحال شاخ جس کو جہانگیر کی سرپرستی حاصل تھی اسی کے لڑکے شاہ جہاں کے ہاتھوں بڑے دردناک انجام کو پہنچے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باغی ہونے کی حیثیت سے جج بار سنگھ سخت سزا کا مستحق تھا لیکن اس کے زندہ گرفتار کئے ہوئے لڑکوں کا مذہب بہ جبر تبدیل کرانا۔ اس کی مستورات کو کنیز بنا کر شاہی حرم، یا دوسرے امراء کے گھروں میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا اور بالآخر مندروں کا باقاعدہ منہدم کرانا بغیر جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہ بالکل طے ہے کہ ان اقدامات کے پس پشت، اورنگ زیب کا ہاتھ نہ تھا اس قسم کی پالیسی کو وجود میں لانے کے لیے وہ بہت کم عمر تھا۔

اس رویہ کی تہ میں یہ حقیقت نہاں ہے کہ خود شاہ جہاں نے مسلمان افسروں کے مذہبی جوش کو مشتعل کیا، اور اسی نے اورچھا کے شاندار مندر کے مسمار کرنے کا حکم دیا۔ اپنے دادا کی مصالحتانہ پالیسی بدنیتی میں اس لیے کامیاب ہوا کہ اس کو مخالفت کا اندیشہ نہ تھا۔ یہ تو نہیں تھا کہ شاہجہاں کے پورے ہندو افسروں میں ہمت کی کمی تھی ہاں ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی وہ لوگ مرتبہ میں بھی کم تھے اور ان کے کردار بھی بہت پست ہو گئے تھے راجہ جے سنگھ، راجہ جگت سنگھ، وٹھل داس گوڑ، نرہر داس جھالا، کشن سنگھ بھادریا وغیرہ صاحب اقتدار تھے لیکن مذہب سے زیادہ ان کو اپنی طاقت و منزلت عزیز تھی۔ راجہ دیبی سنگھان سبھوں میں بدتر تھا جو بغیر کسی تاسف و پشیمانی کے حالات دیکھتا رہا، بلکہ بعض باتوں میں اس نے حصہ بھی لیا۔ وہ بندیلہ گدی حاصل کرنے کی فکر میں تھا وہ اس کو مل گئی حالانکہ گدی اُس کے عزیزوں کے خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کو بندیل کھنڈ کی حکومت مل گئی، بیر سنگھ دیو اور جج بار سنگھ کی سی عزت حاصل نہ ہو سکی۔

بندیل کھنڈ کے دوسرے قلعوں پر قبضہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ دیتیا پر بھی جلد ہی قبضہ ہو گیا۔ البتہ جھانسی میں جج بار سنگھ کے ایک ساتھی بسنت نے کچھ رکاوٹ پیدا کی۔ مکرمت خان نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ فتح کرنے والوں کو یہاں کافی مال غنیمت ملا۔ پورا توپخانہ مع بارود، ایک غلہ سے بھرا ہوا گودام اور بہت سا زر و مال ان کے ہاتھ آیا۔ قلعہ گردھر ولد وٹھل داس کو دے دیا گیا۔ اس پر عنایت اس کے باپ کی خدمت کا اعتراف تھا۔

شاہجہاں کا بندیل کھنڈ آنا شہزادہ اورنگزیب نے اپنے باپ کو جو خطوط لکھے ان میں بندیل کھنڈ کے فطری مناظر کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا۔ لکھا کہ یہاں کے جنگلات قابل شکار جانوروں سے بھرے پڑے ہیں۔ مصنوعی جھیلیں بہت بڑی ہیں۔ پہاڑیاں سرسبز و شاداب ہیں۔

شاہجہاں کا جذبہ تحیر بیدار ہوا اگرچہ اس کا گوالیار سے دکن جانا ضروری تھا لیکن وہ مشرق کی طرف چلا اور بندیل کھنڈ میں داخل ہوا بھوم گڑھ کے خوشگوار آبشار، دتیا کی خوبصورت عمارات نے اسے اصل مسرت عطا کی اور اورچھا میں بیر سنگھ کے شاندار محل میں اس کا قیام رہا۔ سیر ساگر بھی اس نے دیکھا۔ یہاں آبی پرندوں کا شکار کیا۔ دھامونی کے قریب اورنگ زیب نے اپنے باپ کا استقبال کیا یہاں سے دونوں سرونج گئے تاکہ دکن کا سفر اختیار کریں۔

چمپت رائے کی نقل و حرکت ججھار سنگھ کے بعد بندیلا تاریخ کے تسلسل میں فرق آگیا۔ لیکن ان کے حکمرانوں کے انجام اور رفاقتوں کی سنگین بداخلاقیاں دیکھ کر مقامی بندیلوں میں مخالفت پیدا ہوگئی جلد ہی ایک لائق اور پرجوش رہنما کے پرچم تلے لوگ جمع ہوگئے۔ مغلوں کے خلاف اعلان جنگ ہوگیا اس رہنما کا نام چمپت رائے تھا وہ مہوبا کے، اودے جیت خاندان کا فرد تھا۔ اودے جیت کا خاندان اورچھا کی شان و شوکت کے سامنے دب گیا تھا۔ چمپت رائے، بیر سنگھ کا دوست تھا اور بغاوت میں اسی نے ججھار سنگھ کی مدد بھی کی تھی آخرالذکر کی پامالی کے بعد اس نے پرتھوی راج کو بندیلا گدی کا دعوے دار بنایا۔ پرتھوی راج ججھار سنگھ کا وہ لڑکا تھا جو اب تک گرفتار نہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے پرجوش ساتھیوں کے ساتھ چمپت رائے نے جھاترا کے مغلوں پر حملہ کیا۔ جھاترا کا نام اب اسلام آباد پڑ گیا تھا۔ اس سرکار کے فوجدار، باقی خان نے چمپت رائے کی پورش کی۔ بہت کچھ روک تھام کی مگر بندیلا کے چھاپہ ماروں کی نقل و حرکت نے اس کی یہ اسکیم ناکام بنادی۔[۵۶]

اس کی سرکوبی کیلیے عبداللہ خاں کا بھیجا جانا وسط جنوری ۱۶۳۹ء میں شاہ جہاں آگرہ سے لاہور گیا۔ اس وقت چمپت رائے کا حوصلہ ہمیشہ سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اس نے مغل کی سرحدی چوکیوں پر بلا خوف و تردد حملے کر دیے۔ صوبہ داروں کی فوجی رسد کی روک تھام کی۔ اس کی غارت گری کا سلسلہ سرونج، بھلسا اور دھامونی تک پہنچا۔ دکن کا راستہ غیر محفوظ ہوگیا۔ شاہ جہاں نے مجبور ہو کر عبداللہ خاں کو سرکوبی کے لیے بھیجا۔[۵۷] سال بھر عبداللہ خاں چمپت رائے کو زیر کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار اپریل ۱۶۴۰ء میں جاسوسوں نے خبر دی کہ چمپت رائے اور پرتھوی راج اورچھا اور جھانسی کے درمیان جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ عبداللہ خاں باغی کو زیر کرنے کیلیے

خود جانا چاہتا تھا لیکن باقی خان نے درخواست کی کہ اس مہم کا کام اسے سپرد کر دیا جائے۔ اس نے بندیلوں پر کامیابی سے اچانک حملہ کیا۔ پرتھوی راج کو گرفتار کر لیا گیا حکم ہوا کہ اسے گوالیار میں قید کیا جائے۔ لیکن خاص باغی یعنی چمپت رائے غائب ہو گیا۔ بندیل کھنڈ میں شورش قائم رہی۔

بہادر خان کی کوشش

عبداللہ خان کی اس دیر طلب مہم نے شاہجہاں کو غیر مطمئن کر دیا اس نے اسے واپس بلا لیا۔ ایک نوجوان و پُرجوش افسر بہادر خان روہیلا اس کی جگہ مقرر ہوا اس افسر نے اپنا کام بڑی سرگرمی سے شروع کیا۔ باغیوں کی ایک جماعت کو جلد ہی نیست و نابود کر دیا لیکن اس کے درباری دشمنوں نے بادشاہ کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ کہا گیا کہ اگر اس کو بندیل کھنڈ میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے تو وہ اس کو دوسرا روہیل کھنڈ بنا دے گا۔ چنانچہ بادشاہ نے اسے واپس بلا لیا اور عبداللہ خان کو دوسری بار روانہ کیا۔ وہ صورتِ حال میں بہت کم تبدیلی کر سکا۔ چمپت رائے اب بھی دھوکہ دھڑی سے بچتا رہا کیونکہ بندیل کھنڈ کے باشندے پوری طرح اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

پہاڑ سنگھ کی کامیابی

بادشاہ نے پہاڑ سنگھ کو حکم دیا کہ اپنے مقامی ملک میں آتشِ بغاوت فرو کرے۔ چونکہ وہ بیر دیو سنگھ کا لڑکا تھا اس لیے اپنے گروہ کے لوگوں سے وفاداری کی امید کر سکتا تھا جس سے چمپت رائے کی قوت کم ہو جاتی۔ علاوہ اس کے اپنی جنم بھومی سے وہ اچھی طرح واقف تھا اس لیے باغیوں سے ان ہی کی طرح لڑ سکتا تھا۔ وہ ۱۶۴۲ء میں بندیل کھنڈ آیا ایک ہی مہینہ میں چمپت رائے نے اپنے کو اس کے سپرد کر دیا اس کی ملازمت میں شہنشاہ کی رضامندی سے داخل ہوا کچھ دنوں تک تو یہ معلوم ہوا کہ چمپت رائے پہاڑ سنگھ کی اطاعت صدقِ دل سے کرتا ہے لیکن آخر الذکر اس کی ہر دلعزیزی پر رشک کرنے لگا۔ اس لیے چمپت رائے نے اس کو چھوڑا اور شہزادہ دارا کی ملازمت میں داخل ہو گیا[۱۲]۔

چمپت رائے، دارا کی ملازمت ترک کرتا ہے

باوجود پہاڑ سنگھ سے کشیدگی کے چمپت رائے نے کوشش کی کہ ظاہری اطوار سے خوش دلی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن پہاڑ سنگھ بددیانت تھا ایک موقعہ پر جب چمپت رائے اس سے ملنے آیا تو اس نے اس کو زہر دینے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ بعد میں ایک موقعہ پر پہاڑ سنگھ نے کچھ مال مسروقہ چمپت رائے کے خیمہ میں پہنچا کر اس پر چوری کا الزام لگایا جس سے اس کو ندامت ہو۔ چمپت رائے نے شہزادہ سے شکایت کی، اس نے بغیر کسی تحقیقات کے پہاڑ سنگھ کا الزام صحیح مان لیا۔ نہ صرف اس کو نکالا بلکہ اس کو جاگیر[۱۳] سے بھی محروم کر دیا۔ شہزادے کی اس حرکت نے چمپت رائے کو منحرف کر دیا۔ مغلوں سے اس کی دشمنی کا جذبہ پھر مشتعل ہوا۔ اس نے دارا سے اس کا پورا انتقام

لیا اورنگ زیب کو چنبل پار کرنے کے لیے ایک ایسا راستہ بتایا جو بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ساموگڑھ کی لڑائی میں وہ اورنگ زیب کے ساتھ دارا کے خلاف لڑتا رہا۔

لیکن اورنگ زیب سے اس کا سمجھوتہ عارضی تھا چپت رائے کا مشہور لڑکا چھترسال تخت نشین ہوا تو اس نے شاہی حکومت کو پیام جنگ دے کر بندیل کھنڈ میں اچھا خاصہ انتشار پیدا کر دیا۔

نورپور کے زمیندار

نورپور کا زمیندار راجہ باسو، جہانگیر کا منظور نظر تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی جگہ اس کا لڑکا سورج مل بیٹھا۔ لیکن وہ شاہی اغراض کے لیے غدار ثابت ہوا۔ اس لیے اس کی جگہ اس کے بھائی جگت سنگھ کو دیدی گئی۔ جہانگیر نے جگت سنگھ کو ایک ہزار ذات اور پانچ سو سوار کا منصب دے کر کانگڑا کے محاصرہ کے لیے بھیجا۔ وہ حکومت کی نوکری میں بیکار رہا۔ یہ صحیح ہے کہ گاہے بگاہے نافرمانی بھی کرتا رہا لیکن جہانگیر کے عہد حکومت کے اختتام تک وہ تین ہزار ذات اور دو ہزار کا منصب دار ہو گیا۔ جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اس کا منصب بحال رکھا۔ شاہجہاں کے خیر مقدم کے لیے ۱۲ مارچ ۱۶۲۸ء میں وہ بمقام سرائے اعتماد الدولہ حاضر ہوا۔

جگت سنگھ کی خدمات

اسی سال نومبر میں جگت سنگھ وسط بنگش کا تھانہ دار اس لیے بنایا گیا کہ وہ باغی گھکھڑوں کو سزا دے۔ تین سال تک اپنے فرائض افسران بالا کی خوشنودی مد نظر رکھ کر اس نے انجام دیے۔ ۱۶۳۴ء میں وہ صوبۂ کابل میں تعینات کیا گیا۔ اس نے کریم داد ولد احداد کو زیر کرنے اور گرفتار کرنے میں وہاں کے صوبہ دار کی مدد کی۔ فروری ۱۶۳۵ء میں وہ لاہور آیا اور دوسرے ہی مہینے میں پورے بنگش کا تھانہ دار بنایا گیا۔ اس کے ایک سال کے بعد جب شہنشاہ کشمیر جا رہا تھا تو اُسے حکم دیا گیا کہ وہ راستہ صاف کرائے۔

راج روپ

اس کی عدم موجودگی میں نورپور ریاست کا سارا انتظام جگت سنگھ کا لڑکا راج روپ کرنے لگا۔ اس نے اپنے لیے کانگڑا وادی کی فوجداری بھی حاصل کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ شہنشاہ کی خدمت میں زرِ کثیر پیش کرے گا۔ لیکن اپنی فضول خرچی کی وجہ سے ذمہ داری پوری نہ کر سکا۔ جب شاہی خزانے سے اس کا مطالبہ ہوا تو اس کا رویّہ باغیانہ ہو گیا۔ اس کا باپ خفیہ طور پر اس کی ہمت افزائی کرتا رہا۔ کانگڑا وادی کے سرکاری ملازمین راج روپ سے معاملہ کرنے میں ناکامیاب رہے۔

جگت سنگھ اپنے گھر واپس آتا ہے

جگت سنگھ اپنے لڑکے کے چال چلن پر بظاہر ناخوشی کا اظہار کرتا رہا چنانچہ اس نے درخواست کی کہ اس کے خلاف مہم کا اسے سرغنہ بنا دیا جائے۔ اس کے معاہدے پر کہ وہ سالانہ چار لاکھ روپیہ خراج ادا کرے گا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ وہ

غیر وفادار اور مکار ہے۔ شاہ جہاں نے اجازت دی کہ اگست ۱۶۴۰ء میں وہ اپنے گھر آسکتا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آگیا۔ دوسرے بارہ مہینے جب تک جگت سنگھ اپنے وطن میں رہا کوئی بات نامعقول نہیں ہوئی وہ پوری طرح شاہی احکام کی پابندی کرتا رہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اس کے رویہ سے مطمئن نہیں تھا اس نے کانگڑا وادی کے فوجدار کے عہدہ سے اسے برطرف کر کے اس کی جگہ خانہ زاد خان ولد سعید خان ظفر جنگ[۲] کو مقرر کر دیا۔

اس کی فرد جرم

جگت سنگھ کے خلاف کسی خاص جرم کا اندراج نہیں۔ صرف ایک دلیل جو اس کی غداری کے سلسلے میں عصری مؤرخین کے یہاں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جگت سنگھ کو اپنے تحفظ کا ضرورت سے زیادہ اعتماد ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر کافی تسکین بخش نہیں۔ ہندوستان کے زمینداروں کی حکومت کی مخالفت کا عام رویہ اور مال گزاری ادا کرنے میں دفع الوقتی سے کام لینا منجملہ دیگر اسباب بغاوت کے ایک سبب ہو سکتا ہے لیکن کسی خاص اشتعال کے بغیر کسی بغاوت کی مثال کمیاب ہے۔ برخلاف اس کے یہ بھی سوچنا فضول ہوگا کہ جگت سنگھ نے بے سبب بغاوت کی۔ نہ وہ بے وقوف تھا نہ بدمعاش، اس کے بعد کے کارناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہادر بھی تھا اور لڑاکا بھی لیکن نادان نہ تھا۔ کیوں غلط راستے پر چل کر تباہی کا متمنی ہوا۔ پہلی نظر میں یہ بات بے معنی نظر آتی ہے۔

لیکن بغاوت سے پہلے کے حالات اس مسئلے کی ضرور تشریح کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ تھی کہ اس کو شہنشاہ کے رویہ میں بیگانگی نظر آئی۔ باوجود قابل قدر خدمات کے اس کو کوئی ترقی نہ ملی۔ اس کو بیزاری اور بے اطمینانی ہوئی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے علاقہ کی آمدنی سرکاری مطالبات پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ جو جاگیر اسے دی گئی تھی وہ ناہموار اور پتھریلی تھی آمدنی زیادہ نہ ہو سکتی تھی بلکہ اس سے بھی کم تھی جو اندرونی سکون برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب وہ اپنی ریاست میں آیا تو چمبا کے راجہ کے ایک حصے زمین پر قبضہ کر لیا اس پر تارہ گڑھ کا قلعہ بنا لیا اس جارحانہ اقدام اور استقرار نے بادشاہ کو جگت سنگھ سے برگشتہ کر دیا۔[۳] آخرالذکر نے ایسے سرکش کا وجود کشمیر کے راستہ میں خطرناک سمجھا۔ آخری سبب یہ تھا کہ اس نے اپنے لڑکے راج روپ کے خلاف سخت گیری سے کام نہ لیا جو شاہجہاں کی ناراضگی کا فوری سبب ہوئی۔ اسی لیے اس نے جگت سنگھ کو ہٹا کر کانگڑا کی فوجداری دوسرے افسر کو دے دی۔

چال چلن کی جوابدہی سے انکار

گورنمنٹ کے حکم کی نافرمانی یعنی اس کا دربار میں طلب کیا جانا اور نہ آنا بغاوت کا پہلا اعلان تھا۔ شاہ جہاں نے سندر کوی رائے کو جگت سنگھ کے پاس جواب طلب کرنے

اوراس کے مستقبل کے منصوبات کی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے بھیجا۔ کوئی رائے نے اطلاع دی کہ جگت سنگھ کا رویہ بظاہر اطاعت و فرمانبرداری پر محمول تھا لیکن دراصل وہ بغاوت پر آمادہ ہو رہا تھا۔ اس خبر کے پاتے ہی شاہ جہاں نے تین جنرلوں سید خان جہاں، سعید خان بہادر، ظفر جنگ، اصالت خان کو حکم دیا کہ پہاڑی علاقہ میں داخل ہو کر اس کی پناہ گاہوں پر حملہ کر کے انتشار ختم کریں۔ شہزادہ مراد جو کابل سے آ رہا تھا، اس کو اس مہم کا سپہ سالار بنایا۔[73]

مہم یہ مہم برسات کے ختم ہونے تک شروع نہیں ہوئی۔ جب شہزادہ مراد پٹھان پہنچا تو سعید خان بہادر اس سے جا ملا، اول الذکر بہرام پور میں برسات کی وجہ سے رُکا ہوا تھا، ساتھ جموں[73] کے زمینداروں سے مال گزاری وصول کر کے اصالت خان بھی آ گیا۔

شہنشاہ کے مرتب کردہ منصوبہ کے مطابق مؤ اور نور پور کے قلعے کا بیک وقت محاصرہ شروع ہونا تھا منصوبہ کے مطابق سعید خان، اصالت خان اور جے سنگھ ماؤ کے محاصرہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ یہ جگہ پٹھان سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی یہاں شہزادہ مراد فوجوں کی رسد کی نگرانی کر رہا تھا۔ سعید خان ہاوا وادی سے چلا، جے سنگھ اور اصالت خان نے چاکی پار کر کے درّہ کا راستہ لیا۔ سعید خان سب سے پہلے ماؤ پہنچا یہاں ایک ہموار زمین پر خیمہ زن ہوا۔ یہ جگہ راجہ باسو کے باغ کے متصل اور وہ ماؤ پہاڑیوں کے درمیان میں تھی بعد میں جے سنگھ اور اصالت خان بھی یہاں جلدی پہنچے۔ ان کی کمک کے لیے عبداللہ خان، قلیج خان، بہادر خان اللہ وردی خان اور ظفر خان بھی آ پہنچے۔

ماؤ کا محاصرہ ماؤ کا قلعہ ناہموار پہاڑیوں میں گھنے جنگل کے درمیان واقع تھا جس سرزمین کی آغوش میں قلعہ کھڑا تھا اس کے اردگرد کا ہر درہ گچ کے کام سے بند تھا۔ قلعہ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا فوج کا ایک دستہ خیمہ میں چھوڑ کر مغلیہ فوجی افسروں نے بقیہ فوج کو کئی حصّوں میں تقسیم کر کے بھیجا کہ مصنوعی رکاوٹوں کو دور کریں۔ دشمن نے روک تھام کے لیے ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ بعض اوقات انہوں نے ان غیر جنگی سپاہیوں پر بھی حملہ کیا جو پاس پڑوس کے جنگلوں میں ایندھن اور چارہ جمع کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ دوران محاصرہ راجہ جے سنگھ اپنی جوش جوانی سے متاثر ہو کر صرف اپنے راجپوت سپاہیوں کو لیکر دشمنوں سے لڑنے چل پڑا۔ بندوقوں سے ایسی ہلاکت خیز آگ برسائی کہ وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس سانحہ نے ساری فوج کو اتنا افسردہ کیا کہ بعد کے تین مہینوں میں مشکل سے کوئی کامیابی حاصل ہوئی۔

بعض مقامی زمینداروں کی تجویز پر طے کیا گیا کہ ماؤ کا محاصرہ زیادہ سرگرمی سے کیا جائے۔ اس منصوبے کی روشنی میں نجابت خان، نظر بہادر خویشگی، اکبر قلی، سلطان گکھڑ اور راجہ مان گوالیاری نور پور کی فوج

سے کمک کے لیے ماؤ کی فوج میں بلا لیے گئے۔ ان لوگوں کے آنے کے بعد ۹ نومبر ۱۶۴۱ء کو سعید خان ماؤ سے روانہ ہوا۔ "راپر" کے راستے سے اس بلا موقع پہاڑی پر دھاوا کیا جو قلعہ کے پشت پر تھی۔ سعید اللہ، عبداللہ اور ذوالفقار خان کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ اس لیے بھیجا کہ پہاڑ کی چوٹی پر کوئی مناسب جگہ قیام کے لیے تلاش کریں۔ لیکن انھوں نے دیکھا تو پہاڑی گھنی جھاڑیوں سے بھری پڑی تھی۔ باپ سے کہلا بھیجا کہ جب تک جگہ صاف نہ ہو سکے، وہ جہاں ہیں وہیں ٹھہریں۔ ہنوز یہ لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ باغیوں نے ایک نزدیکی ٹیلے سے بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ مغلیہ فوجی دستہ پراگندہ ہو گیا۔ یہ خبر پا کر سعید خان نے اپنے دوسرے لڑکے لطف اللہ کو مدد کے لیے بھیجا لیکن لطف اللہ مارا گیا، زخمی ہوا اور واپس آیا۔ آخر کار ذوالفقار خان دشمنوں کو بھگانے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے دن سعید خان "راپر" پہنچا اور آگے بڑھتا رہا۔ ہر مقام پر وہ کانٹوں اور جھاڑیوں کا دھس اپنے خیموں کے ارد گرد بناتا گیا تاکہ باغیوں کے شب خون سے بچا رہے۔ وہ آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ دشمن سے ایک ایک انچ پر مقابلہ ہوتا رہا۔

۱۵ نومبر کو نجابت خان جو سعید خان کی فوج کے ہراول دستہ کا رہنما تھا اس مقام پر پہنچ گیا جو دشمنوں کے تحفظ کی خاص جگہ راجہ باسو کے باغ کے سامنے تھی جہاں اس نے ایک مضبوط فوجی دستہ تعینات کر دیا تھا لیکن ذوالفقار خان اور اس کے بندوقچیوں نے ایک طرف سے حملہ کیا اور نظر بہادر خویشگی، شیخ فرید، راجہ مان نے دوسری طرف سے۔ بہرحال باغیوں نے بہادری سے مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کی فوج کو سخت نقصان پہنچایا۔ دشمنوں کے مورچوں پر حملہ بے کار گیا۔ مئو کے خلاف حملے فی الحال روک دیئے گئے۔ راجہ مان کو الگ کر کے ایک قریبی قلعہ کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے فتح کر لیا۔

محاذ جنگ کے دوسرے مرکز کا بھی حال بہت امید افزا نہ تھا۔ شمال اور جنوب کے اطراف ایسی بلند پہاڑیوں سے محفوظ تھے جو نور پور کے قلعہ کی پہاڑیوں سے بلند تر تھیں۔ مغربی کنارے پر ایک تیر کے نشانے کے لگ بھگ ایک تند و تیز دشوار گذار چشمہ بہہ رہا تھا۔ مشرقی کنارے پر جہاں صدر دروازہ تھا، وہاں ایک ایسا ناہموار میدان تھا جو فوجی قیام گاہ کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔ علاوہ بریں محافظ فوج کے پاس کافی رسد اور سامان جنگ تھا۔ دشمنوں نے تمام ہمسایہ عمارتیں گرا دی تھیں۔

۲۸ ستمبر ۱۶۴۱ء کو نور پور جاتے ہوئے سید خان جہاں بلہوان پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ راج روپ ایک مضبوط دستے کے ساتھ اس کی راہ روک رہا ہے۔ ۱۵ اکتوبر کو وہ اس سے جنگ کرنے نکل پڑا۔ نجابت خان جو ہراول دستہ کا کمانڈر تھا اس نے راج روپ کو بھگا دیا۔ دوسری فوج نے ان رکاوٹوں کو مسمار کر دیا جو مغلیہ فوج کے راستے روکنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ یہ فتح بھی سید خان جہاں کو منزل مقصود کے قریب نہ لا سکی۔ نور پور

کا راستہ اب تک نہ کھلا۔ ہر سرحدی چوکی پر مستعد بندوقچی اور تیرانداز تعینات تھے لیکن ایک مقامی پہاڑی باشندہ کی مدد سے خان جہاں ایک سنسان راستے سے ۹ر نومبر کو نورپور سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ جگت سنگھ نے قلعہ کی حفاظت کے لیے زبردست تیاریاں کی ہیں۔ یہاں دو ہزار بندوقچی تعینات تھے باایں ہمہ سید نے محاصرہ پُرجوش طریقے پر کیا۔ قلعہ میں داخل ہونے کی رکاوٹوں کو دور کر کے بڑی مشکلوں سے وہ قلعہ تک پہنچ پایا اس نے چاہا کہ سرنگ سے قلعہ اڑا دے، لیکن محافظ فوج نے ہر بار مختلف طریقہ سے اس کی کوششوں کو بے اثر بنا دیا۔ کبھی تو سرنگوں میں پانی بھر دیا اور کبھی فصیل پر اتنی روشنی کر دی کہ شاہی فوجیں نہ صرف اُن کی آتشباری کی زد میں آگئیں، بلکہ سرنگ بچھانے کا کام بالکل ناممکن ہو گیا۔ جب نجابت خان اور دوسرے لوگ اس کی فوج سے الگ تعینات ہوئے تو اس وقت سید خان جہاں کے قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ باایں ہمہ اس کے توپچیوں نے سات سرنگیں عمارتوں کے نیچے بچھا دیں۔ جس میں سے چھ کا پتہ فوج کو مل گیا۔ لیکن ساتویں سرنگ نظر نہ آئی۔ سید خان جہاں کو ڈر تھا کہ مبادا اس کا بھی ان کو پتہ چل جائے۔ لہٰذا اس میں بارود بھر دیا اور باپ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں آگ لگانے کے لیے احکام کا انتظار کر رہا ہوں۔ سید خان جہاں اپنے آدمیوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ حملہ کرنے کی نیت سے تیار ہو گیا لیکن چونکہ سرنگ میں بارود پوری طرح نہ بھری گئی تھی اس لیے فصیل کا صرف ایک حصہ اڑا اور کوشش بیکار ہو گئی۔

ماؤ اور نورپور کے حملوں کی ناکامیابی نے شاہجہاں کو کسی قدر اپنا منصوبہ بدلنے پر مائل کیا۔ اس نے اصالت خان کو نورپور بھیجا اور سید خان جہاں کو ماؤ تبدیل کر دیا۔ شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ وہ راؤ امر سنگھ اور مرزا حسن صفی کو انتظام سپرد کر کے پٹھان چھوڑ کر ماؤ چلا جائے اور بذاتِ خود محاصرہ کی نگرانی کرے۔ شاہی قوت کے اس اجتماع نے جگت سنگھ کو خوفزدہ کر دیا۔ اللہ وردی خان کی وساطت سے اس نے اپنے لڑکے راج روپ کو شہزادے کے پاس معافی کے لیے بھیجا۔ شاہانہ عفو تقصیر کا یقین کر کے وہ شاہزادہ مراد کے پاس ۲۰ر نومبر ۱۶۴۱ء کو حاضر ہوا۔ لیکن گفت و شنید کے درمیان اس نے بعض ناقابل قبول شرائط پیش کیں جس پر شہزادے نے کہا "اطاعت کے معنی ہیں جو کچھ دیا جائے اسے قبول کرنا نہ کہ اپنی خواہش کے لحاظ سے مطالبہ کرنا" اس جملہ پر جگت سنگھ کا دماغ بدل گیا وہ قلعہ واپس آیا تاکہ اپنی کوشش از سرِ نو شروع کرے۔

ہمیشہ سے زیادہ اب جوش و خروش سے ماؤ کا محاصرہ شروع ہوا۔ سید خان جہاں، رستم خان اور بہادر خان کو حکم ہوا کہ کنگ کی طرف سے قلعہ پہنچیں۔ بہادر خان ہراول دستہ کو لے کر آگے بڑھا دشمن سے بھاگتے جانا اور لڑتے رہنا کے انداز میں لڑائی جاری رکھی جس میں ان کے سات سو آدمی مارے گئے۔ لیکن فوجی افسروں کے چہرے پر شکن نہ پڑی۔ انھوں نے اپنی کارگزاری جاری رکھی۔ ۱۲ر دسمبر کو شہزادہ مراد نے قلعہ کے سامنے کی پہاڑی فتح کر لی

اور ایک عام دھاوا بول دیا۔ جے سنگھ اور اللہ ویردی خاں نے دڑہ کی طرف، حملہ کر دیا اور قلعہ میں آسانی سے داخل ہو گئے۔ قلیج خان نے بائیں سے حملہ کیا۔ دوسرا افسر جنگلوں میں داہنی طرف آئے اور اس پہاڑی پر پہنچ گئے جو قلعہ کے مقابل تھی۔ جگت سنگھ کی ہمت چھوٹ گئی، وہ تارا گڑھ بھاگ گیا۔ بیک وقت نور پور کی محافظ فوج بھی دل شکستہ ہوئی۔ اس نے بھی قلعہ خالی کر دیا۔ جس پر قبضہ کر لیا گیا۔

اگرچہ جگت سنگھ کے علاقہ کا خاص حصہ قبضہ میں کر لیا گیا تھا لیکن لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ تارا گڑھ کا پہاڑی قلعہ اب بھی اس کے قبضہ میں تھا۔ ۲۰ر دسمبر کو بہادر خان اور اصالت خان قلعہ فتح کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ راستہ بنانے والے اور سفر مینا کی بڑی تعداد ان کے آگے جنگل صاف کرنے اور سڑک چوڑی کرنے کے لیے بھیجی گئی۔ اس کے علاوہ پرتھی چند، راجہ چمبا کو حکم ہوا کہ وہ گھر واپس آئے اور قلعہ کی تسخیر میں امداد کرے اس کے ساتھ جگت سنگھ کا ایک جانی دشمن راجہ مان گوالیاڑی بھی تھا۔ ان لوگوں کو حکم ہوا کہ اس پہاڑی پر قبضہ کریں جہاں سے تارا گڑھ پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پہاڑی ضلع چمبا میں تھی۔

تارا گڑھ کے محاصرہ کی ابتدا اوائل جنوری ۱۶۴۲ء میں ہوئی اور دو مہینے تک رہی۔ اگرچہ شاہی فوج کو بہت کم آگے بڑھنے کا موقعہ ملا لیکن جگت سنگھ تھک گیا تھا۔ اپنے لڑکے راج روپ کو سید خان جہان کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ شہزادے اور شہنشاہ سے اس کی سفارش کرے، اور اس کے منصب اور علاقہ بحال کرا دے۔ شہزادہ مراد کی سفارش پر سید خان جہاں کو جگت سنگھ کو لانے کے لیے بھیجا۔ جب وہ تارا گڑھ پہنچا جگت سنگھ نے اس کو قلعہ میں داخل کر لیا اور اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت دی جس میں خان جہاں اور اصالت خان کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی حکم ہوا کہ تارا گڑھ کا قلعہ مسمار کر دیا جائے۔ اس حکم کی وجہ سے شاہی افسروں میں اختلاف رائے ہوا۔ بہادر خان اور اصالت خان کی رائے میں حکم کی تعمیل فوراً ہونی چاہیے تھی۔ خان جہان نے دیر کرنے کی صلاح دی بہادر خان کے رویّہ پر جگت سنگھ مشتعل ہو گیا اس نے ان لوگوں سے کہا آپ لوگ قلعہ میں اس لیے آ گئے کہ میں لے آیا۔ لیکن اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا میں اس قلعہ کا باہری حصّہ سید خان جہاں کی نذر کرتا ہوں اور میں دفاع کی دوسری صف میں چلا جاتا ہوں مجھے دیکھنا ہے کہ تم مجھے کیسے زیر کر سکتے ہو۔ جگت سنگھ واقعی دوسری صف میں چلا گیا اور مزید مقابلے کی تیاری کرنے لگا۔

خان جہاں کا کام خان جہاں نے حسب ذیل مراسلہ شاہ جہاں کی خدمت میں روانہ کیا "میں نے جگت سنگھ کی سفارش اس لیے نہیں کی، کہ میں اس سے ڈرتا تھا۔ حقیقتاً میں اس کے خون کا پیاسا تھا۔ میری دشمنی کے اسباب مختلف تھے۔ یہ جنگ جو شہزادے اور دوسرے افسروں کی سرکردگی میں

لڑائی گئی بہت طولانی ہو گئی اور جگت سنگھ نے اس قلعہ میں پناہ لی، جو ناقابل تسخیر تھا اس سے آگے جنگ بحال رکھنے میں شاہی اقتدار کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ میں جمال خان کو بھیج رہا ہوں وہ جہاں پناہ کو پورے حالات سے آگاہ کر سکتا ہے اب یہ حضور کے فیصلہ کی بات ہے کہ باغی کو معاف کیا جائے یا نہیں۔"
مراسلہ کے بعد خان جہاں نے کامیابی سے دوسرے افسروں کو شاہی احکام پر عمل کرنے سے روک رکھا اور اس سلسلے کی ساری ذمہ داریاں بذریعہ تحریر اس نے اپنے سر لیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کو اس پر اصرار تھا کہ تاراگڑھ کی ساری عمارتیں مسمار کر دی جائیں کیونکہ بعد کے ایک مراسلہ میں خان جہاں نے شہنشاہ کو لکھا کہ جگت سنگھ اس پر رضامند ہو گیا ہے بشرطیکہ وہ عمارتیں چھوڑ دی جائیں جو اس نے اپنے خاندان کے لیے بنوائی ہیں۔ باہر کی عمارتوں کو مسمار کرنے کے بعد خان جہاں نے اپنے داماد سید فیروز کو بقیہ فصیل و قلعہ کے استعمال کا حکم دیا اور خود جگت سنگھ کو اپنے ہمراہ لے کر ۱۱ مارچ ۱۶۴۲ء کو شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جگت سنگھ کو شہنشاہ کے روبرو ایک ہفتہ بعد پیش کیا گیا۔ اس کا منصب بحال کر دیا گیا۔ اس نے اپنی بقیہ زندگی شاہی ملازمت میں گزاری۔

بندیلا کی بغاوت سے تقابل

یہ بغاوت بندیلوں کی بغاوت سے بالکل متوازی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے غیر معمولی طور پر مشابہ ہیں۔ دونوں یکساں حالت میں پیدا ہوئیں۔ دونوں بغاوتوں کی بعض تفصیلات میں نمایاں مطابقت ہے۔ چوراگڑھ پر جھجار سنگھ کا زبردستی قبضہ کر لینا ریاست بجھار کے غاصبانہ قبضے جگت سنگھ کے اس مداخلت بیجا سے مشابہ ہے۔ پریم نرائن کو دغابازی سے قتل کر دیا جانا ویسا ہی ہے جیسا برتھی چند کے باپ کا قتل۔ دونوں یکساں حالات میں ہوئے اگر جھجار سنگھ کا بیٹا پریم جیت کسی وقت برداشتہ خاطر تھا تو جگت سنگھ کا لڑکا راج روپ بھی کچھ عرصہ تک غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ گو کہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ رویہ صرف دکھانے کے لیے ہو۔ دونوں بغاوتوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ ایک صورت میں باغیوں کی پوری صف کی صف نیست و نابود کر دی گئی اور دوسری صورت میں باغیوں کو معاف کیا گیا بلکہ نوازا بھی۔ اسباب کی تلاش میں دور جانا نہیں ہے۔ بندیلہ کی بغاوت کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی دولت نے مغلیہ شہنشاہ کی حرص کو مشتعل کر دیا تھا اور بغیر ان کی بنیاد ختم کیے دولت کا پانا ناممکن تھا۔ البتہ جگت سنگھ کے واقعہ میں لالچ کی ایسی وجہ نہ تھی جہاں ایک مرتبہ وہ اس پر راضی ہو گیا کہ اس کا قلعہ مسمار کر دیا جائے تو پھر شاہ جہاں نے بھی آگے قدم بڑھانا ضروری نہ سمجھا کیونکہ باغی اب بے ضرر ہو گئے تھے۔

باب ۵

معمولی فتوحات اور انتشارات

اہل پرتگال

۱۵۳۰ء میں سان دیپ کے بعض پرتگالی سوداگروں نے بنگال[1] کے حکمران سے ہگلی کے کنارے کی زمین کا عطیہ حاصل کیا ہگلی شروع میں ایک چھوٹا شہر تھا جلد ہی وسعت و آبادی میں بڑھ گیا۔ باشندوں نے پائیدار مکانات بنوائے اور ان کی چھتوں پر چھوٹی چھوٹی جنگی توپیں چڑھا دیں گنگا کی ایک شاخ نے شہر کے ایک طرف قدرتی آبگاہ کا کام دیا اور ایک مصنوعی خندق نے دوسری تین سمتوں کو محفوظ کر دیا اس کی جائے وقوع بنگال کی شاہراہ تجارت کے دہانے پر تھی۔ اس لیے تھوڑے عرصہ میں وہ اس علاقہ بہت متمول و خوشحال بندرگاہ بن گیا یہاں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے علاوہ چین، ملکا، منیلا کے جہاز اور مغلوں، ایرانیوں، ارمینوں کی تجارت کا بازار تیزی سے گرم ہوا[2]۔

بنگال میں ان کا مقام

بقیہ سولھویں صدی میں بنگال کی غیر اطمینانی سیاسی حالت نے پرتگالیوں کو بڑے فائدے پہنچائے۔ انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا اور تجارت کو وسعت دی۔ حکومت سے نمک کی اجارہ داری بھی ان کو مل گئی جس کے عوض دس ہزار ٹنکا مغلوں کو دینا طے ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دولت، مند اور حکمرانی کے لحاظ سے تقریباً آزاد جماعت کی صورت میں ہو گئے۔ مغلیہ گورنروں نے ان کے اندرونی معاملات میں کبھی دخل دینا پسند نہ کیا یہاں کے انتظامات ایک سردار اور چار نمایندہ شہری کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی مذہبی ضرورتیں کم تھیں تاہم ان کی انجام دہی کے لیے ایک گرجا تھا جس کی نگرانی اُغطسی مشنری کرتے تھے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر مخلوط النسل تھے، ان لوگوں نے گودا، کوچین، اور ملکا کے آقاؤں سے روگردانی کی تھی۔ یہ لوگ نڈر بھی تھے اور بے ایمان بھی[3]۔

چٹا گانگ کے پرتگالی بھی اسی قماش کے تھے ان کی ساز باز سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے ہمسایہ سمندروں

میں بھاگ دوڑ کی۔ گنگا کی مختلف شاخوں میں داخل ہوئے نچلے بنگال کے جزیروں کو لوٹ لیا اور اکثر چالیس پچاس فرسنگ تک ملک میں گھس کر ساری آبادی کو بازار کے دن زیر و زبر کر دیتے اور کبھی کبھی ان موقعوں پر کہ جب مقامی باشندے شادی یا کسی اور تہوار میں جمع ہوتے سب کو گرفتار کر لیتے، گرفتار کردہ غلاموں کے ساتھ ان کا برتاؤ قابل نفرت تھا وہ اکثر بوڑھے لوگوں کو ان کے مکان ہی میں نیلام کرتے اور نوجوانوں کا اپنے والدین کو آزاد کرانا بڑا دردناک منظر ہوتا۔

ان کی تجارت کا فروغ ست گاؤں اسنار گاؤں کی بحالی پر ایک گھونسہ تھا۔ ان کی غارت گری نے ہمسایہ آبادیوں کو تباہ کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ بھی ظلم تھا کہ جو ان کی حکومت میں آجاتے تھے ان کو زبردستی عیسائی بنا لیتے تھے۔ یہ نو مذہب لوگ یا تو غلام بنا کر دوسرے پرتگال علاقوں میں یا اراکان کے ماگھ بادشاہ کی جنگی کشتیوں کے کھینے کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ اراکان کا بادشاہ مغلوں کا جانی دشمن تھا جس کو وہ لوگ بارود، اسلحہ، شورہ اور دوسرے سامان حرب مہیا کرتے تھے۔ اس طرح ان کا وجود بنگال کے امن و سکون و خوشحالی کے لیے زبردست خطرہ ہو گیا کیونکہ صلح پسند سوداگر ہونے کے بجائے وہ بحری ڈاکو ہو گئے۔

جہانگیر کے زمانے تک ان کو آزادی تھی جو چاہتے تھے کرتے تھے بشرطیکہ سرکاری مطالبہ بے باق ہوتا رہے۔ شاہجہاں کی ناراضگی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ جب وہ بہ حیثیت باغی بنگال گیا تو ان لوگوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ برخلاف اس کے انھوں نے شہزادے پرویز سے ہمدردی کی اور ان سے ایک نے شاہجہاں کے ساتھ دغابازی بھی کی۔ ہگلی کے ایک باشندہ مانوئل تیورس نے پہلے شاہجہاں کا ساتھ دیا لیکن ایک نازک موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قیمتی اسباب سے لدی ہوئی کچھ کشتیاں گرفتار کر لیں، کچھ کنیزوں کو بھی لے گیا جس میں ممتاز محل کی دو لونڈیاں تھیں۔ اسی وقت ایک دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ میگوئل روڈری گز[1] ایک خوش پوشاک، معزز نوجوان اور ابراہیم خاں گورنر بنگال کے منظور نظر کا گستاخانہ سلوک تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ شاہجہاں کی ملازمت کرے اس نے انکار کر دیا۔ شاہجہاں کے دل میں یہ دلیلیں ٹیس مارتی رہیں۔ اس نے طے کیا کہ جیسے ہی وہ صاحب اقتدار ہوگا، فوراً بدلہ لے گا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد بھی پرتگالیوں نے اس کے خوش کرنے کا کوئی رویہ اختیار نہ کیا، نہ تحفے نہ مبارکباد۔

انتقام لینے کا موقعہ ابھی تک نہ آیا ان کی خوش قسمتی تھی کہ شاہجہاں سلطنت کے دوسرے معاملوں میں الجھا رہا۔ اپنی قریبی تباہی سے بے خبر پرتگالیوں نے جبر ستانی اور غارت گری کا بازار گرم رکھا۔ ۱۶۲۹ء میں ڈائی گوڈاسا[2] نے ماگھ علاقہ سے خروج کر کے ڈھاکہ کے قریب ایک بڑے گاؤں پر دھاوا بول دیا اور بے رحمی سے

1- Miguel Rodriguez   2- Diego Desa

سب کچھ لوٹ لے گیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک معزز مغلیہ خاتون کو گرفتار کیا جو جان بچا کر اپنی لڑکی اور بہو کے ساتھ ایک بند گاڑی میں جا رہی تھی۔ اس کی عصمت دری کی بھی کوشش کی اس بدمعاش کی شکایت اس کے شوہر نے شہنشاہ سے کی۔ شہنشاہ بہت مشتعل ہوا لیکن ۱۶۳۲ء سے پہلے پرتگالیوں کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہ ہو سکی۔

ست گاؤں اور ہگلی کے دو پرتگال سوداگروں نے جھگڑا کر کے شاہجہاں کے مجوزہ حملہ کو عمل میں لانے کا موقعہ دیا۔ پہلے سوداگر مارٹن آفونسو ڈی میلو[1] دوسرے حریف مارٹن وتھو نے جھگڑا طے کرنے کے لیے ہگلی شہر بلایا لیکن چونکہ فریق ثانی آفنسو کا بعید قریبی رشتہ دار تھا اسے منصفانہ فیصلہ کی امید نہ تھی اس لیے وہ قاسم خاں گورنر ڈھاکہ کی طرف گیا اور پورے ہگلی شہر کی شکایت کی سارے باشندوں پر ایسے جرائم کا الزام لگایا جن کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ قاسم خاں کا جب اس عہدہ پر تقرر ہوا تھا تو اس کو واضح طور پر شہنشاہ نے ہدایت کی تھی کہ اہل پرتگال کو نیست و نابود کرو۔ یاد دہانی کے لیے متواتر فرمان بھی بھیجے تھے۔ افنسو کی شکایت اور امداد کے وعدے نے وہ موقعہ دیا جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا۔

اس نے پرتگالیوں پر اچانک حملہ کا منصوبہ بنایا۔ اپنے لڑکے عنایت اللہ کو اس بہانہ سے بھیجا کہ وہ بردوان میں ہجلی کی مہم پر جا رہا ہے۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ وہاں خواجہ شیر معصوم زمیندار، محمد صالح وغیرہ کے بحری بیڑے کی آمد کا سری پور میں انتظار کرے علاوہ بریں بہادر کو پانچسو فوج دے کر اس لیے مخصوص آباد بھیجا گیا کہ وہ عنایت اللہ کے ساتھ متحد ہو کر اسی وقت کام شروع کرے جس وقت خواجہ شیر اپنا بحری بیڑا لے کر پہنچے۔ مقررہ اشارے پر عنایت اللہ بردوان سے چل پڑا اور چوبیس گھنٹے کے اندر بلدی پور پہنچا جو ست گاؤں اور ہگلی کے درمیان میں ہے۔ بہادر اپنا دستہ لے کر فوراً اس سے مل گیا انھوں نے ہگلی کا راستہ بند کرنا شروع کر دیا تاکہ پرتگالی بچ کر نہ جا سکیں۔ حملہ آور فوج کے ساتھ چھ سو کشتیاں چودہ ہزار سوار نوے ہاتھی اور بہت سے پیدل سپاہی تھے۔

جب پرتگالیوں نے اس جم غفیر کو خشکی اور تری سے آتے دیکھا تو گھبرا گئے۔ وہ فادرس آف دی سوسائٹی آف جیس کے پاس گئے تاکہ وہ لوگ حملہ آوروں سے دوستانہ مصالحت کرادیں۔ جان کبرل[2] دو گھرانے لے کر مغل سردار کے پاس گیا۔ اس نے مرشد آباد پر بادشاہ کے حملہ کرنے اور تباہ کرنے میں ہگلی کے پرتگالیوں کی امداد کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کا بھی الزام لگایا کہ ان ہی لوگوں میں کسی نے سید خاندان کی ایک عورت کو زر خرید کنیز بنایا اور آخری جرم یہ بتایا کہ یہ لوگ غلاموں کی خرید و فروخت میں بھی شامل ہیں۔

1- Martin affouso de Mello. 2- John cabral.

فریقین نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کچھ دن تک ہگلی میں بڑی گڑبڑ رہی کیونکہ سارے باشندے ایک خیال کے نہ تھے۔ بعض ان میں سے ایسے تھے جو نہ صرف غلاموں کو سپرد کرنے کے لیے تیار تھے بلکہ مغلوں کی دوسری شرط بھی ماننے کے لیے تیار تھے۔ ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں مسئلہ پوری طرح بحث میں لایا گیا۔ اکثریت لڑنے کے موافق تھی اس لیے اس کی رائے غالب رہی۔ ازودو کو شہر کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اس کو بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ مقامی باشندوں پر اس کو اعتماد نہ تھا اور اس کے ساتھ کام کرنے والے سفید آدمیوں کی تعداد صرف تین سو تھی علاوہ بریں شہر کے بچاؤ کے لیے کوئی مضبوط تعمیر نہ تھی۔ اس کی مدافعت کے لیے صرف ایک خندق تھی جو کچھ ازودو نے کیا وہ یہ تھا کہ جو کچھ سامان موجود تھا اس سے متعدد مکانات کو متحد کر کے کچی مورچہ بندی کر دی جس پر چھوٹی توپیں چڑھا دیں۔ اس عارضی انتظام کے ساتھ وہ مغلیہ فوجوں کے حملے کا مقابلہ کرنے کھڑا ہوا۔

پہلے دن محافظ دستہ کو مرعوب کرنے کے لیے مغلوں نے ایک فوجی مظاہرہ کیا۔ انھوں نے دکھانا چاہا کہ وہ ان پر حملہ کر رہے ہیں اور پھر واپس ہو گئے۔ پہلی جولائی کو وہ شہر سے قریب تر اور پرتگالی توپ خانے کے اس زد تک پہنچ گئے جو اُن سے پوشیدہ تھا۔ محافظ دستہ نے خوفناک آتشبازی کی۔ حملہ آوروں کو بھاری نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا۔ دوسرے دن مغلوں نے بحری اور بری فوجوں کا ایک متحدہ حملہ کیا خشکی پر وہ پرتگالیوں کے دفاعی محاذ سے اتنے قریب ہو گئے کہ بندوق و توپ اُن سے چھین سکے۔ لیکن بحری لڑائی میں ان کا حال بُرا رہا اس لیے کہ چھ سو آدمی مارے گئے۔

آدمیوں کی ایسی خوفناک بربادی نے مغل افسروں کی ہمت شکنی کی افسروں نے عنایت اللہ سے درخواست کی کہ جس مقام پر وہ پہنچ گیا ہے اس سے پیچھے ہٹ آئے لیکن آخر الذکر نے اس طرز عمل میں مغلیہ سلطنت کے اقتدار کی توہین دیکھ کر اس رائے کو پسند نہ کیا تھا جہاں تھا وہیں رہا لیکن دشمن بھی تھک گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے لڑائی رک گئی۔ انھوں نے فادر فرائی انٹونوڈی کرسٹو[*] کو صلح کی بات چیت کرنے کے لیے مغل سپہ سالار کے پاس بھیجا اس کے ساتھ ایک مغل عورت بھی تھی تاکہ مسلمانوں پر اثر ڈال سکے۔ عنایت اللہ نے تین مطالبے کیے۔ (۱) پرتگالیوں نے جو تین جنگی جہاز گرفتار کیے ہیں وہ سپرد کر دیں۔ (۲) جملہ بنگالی غلاموں کو آزاد کر دیں۔ (۳) ان میں سے ہر ایک فرد اس کے احترام اور سربلندی تسلیم کرنے کے لیے آئے۔ یہ شرط یقیناً بڑی ذلت آمیز تھی۔

کپتان پہلی شرط کے لیے فوراً راضی ہو گیا۔ جہاز سپرد کر دیے۔ دوسری شرط کے لیے اس نے اپنی برادری کی

---

[*] ... Azredo

ایک جنگ کی جس میں اکثریت نے شرط منظور کرنے کی موافقت میں فیصلہ کیا۔ اگرچہ فادر مانوئل کوٹھو کی زیر قیادت، فادرس آف سوسائٹی آف جیسس نے بڑے زور و شور سے لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھار کر کوشش کی کہ صلح کی موافقت کے خلاف راستہ اختیار کیا جائے۔ کپتان نے نوسے عیسائی غلام مغلوں کو سپرد کیے اس کے بعد مطالبہ ہوا کہ وہ جملہ ہندوستانی عورتیں تجربہ کار باورچی، ناچنے والی عورتیں ان کے نان بائی اور کپڑے بیننے والی عورتوں کو بھی سپرد کریں۔ کچھ توان باتوں پر بھی راضی ہو گئے اور مطلوبہ افراد کو ایک گرجے میں اکٹھا کیا لیکن پرتگالی سپاہیوں نے سب کو منتشر کر دیا کیونکہ یہ لوگ کسی اور دست برداری کے لیے تیار نہ تھے لیکن تمیرا مطالبہ حقیقتاً پورا ہوا۔

اس کے بعد تاوان جنگ کی رقم کے تعین کا سوال آیا۔ مغل سپہ سالار نے سات لاکھ پونڈ طلب کیا لیکن پرتگالیوں نے اتنی بڑی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے مدار المہام جان کبرال ڈی کرسٹو اور مغل عورت کو عنایت اللہ نے روک لیا دوسرے دن اس نے کبرال کو آزاد کیا تاکہ وہ اپنے دوستوں کو شرائط منظور کرنے پر راضی کرے لیکن چلتے وقت ایک آدمی نے اس سے کہا کہ مغل سپہ سالار ایام گزاری کر رہا ہے، تاکہ مزید کمک آجائے اس خبر کی تائید جاسوسوں نے بھی کی اور پرتگالیوں نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن وہ لوگ بال اور ہگلی دونوں کو بچا نہ سکتے تھے اس لیے ہگلی چلے آئے۔ مغلوں نے بال پر قبضہ کیا اور باشندوں کی جان لینے کے بعد ان کے گھروں کو آگ لگا کر جشن فتح منایا۔ مگر کیمین کالج اور کچھ گھر باقی رہنے دیا۔

بے ترتیب لڑائی مغلوں اور پرتگالیوں میں ڈیڑھ مہینہ تک ہوتی رہی اس کے بعد ایک سو بیس توپیں بارہ پونڈ یا اس سے زیادہ وزن کے گولے چلانے والی ہگلی آئیں۔ مارٹن آنا نومحافظ دستہ کا جانی دشمن بھی سرنگ بچھانے والوں اور کچھ جنگی جہاز نے کر محاصرہ کرنے والوں کی امداد کو آگیا یہ کمک پانے کے بعد مغلوں نے ہگلی پر ہر طرف سے گولے باری شروع کر دی اس کے علاوہ پرتگالیوں کے مقامی ملازم ملاحوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مغلوں نے چار ہزار گھرانے گرفتار کر لیے۔ اپنے بال بچوں کو بچانے کے لیے ملاحوں نے ایک ساتھ ہی پرتگالیوں سے قطع تعلق کر لیا اور مغلوں سے مل گئے۔[۱۲]

اس سے پرتگالیوں کا زور گھٹ گیا، چونکہ کمک کی زیادہ امید بھی نہ تھی اس لیے انھوں نے تیسری بار صلح کی گفت و شنید شروع کی۔ عنایت اللہ نے بات چیت کرنے پر فوراً رضامندی ظاہر کی کیونکہ اس کے یہاں بھی غلہ کی وقتی قلت کی وجہ سے فوجیوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ کچھ بات چیت کے بعد پرتگالیوں نے دس ہزار ٹن کا تاوان جنگ کی پہلی قسط ادا کی اور وعدہ کیا کہ دو لاکھ ٹن کی دوسری قسط میں جلد ادا کر دیں گے۔ اس رقم سے مغلیہ خزانہ پھر بھر گیا عنایت اللہ نے فوجی طاقت بڑھالی۔ اس درمیان میں مارٹن انسنو نے اپنے

دشمنوں کی بربادی کی دوسری اسکیم تیار کی۔ اس نے بر وقت موجودہ سامان سے کشتیوں کا ایک پل تیار کیا بڑی بڑی شہتیریں کیلیں، لوہے اور زنجیروں سے سب کو منسلک کر دیا۔ اس پل کی لمبائی کو یکجا رکھنے کے لیے اس نے ایک تار ہگلی کے آرپار تک لگا دیا۔ اس کے علاوہ باہر جانے کے سب راستے بند کر دیئے۔

اس بڑے پیمانے کی تیاری نے پرتگالیوں کو خوف زدہ کر دیا۔ کچھ دیر کی افراتفری اور اختلافی فیصلے کا ان پر غلبہ رہا۔ فطرتاً اس درمیان میں مغلوں سے بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حقیقتاً عنایت اللہ خود معاہدے کی خلاف ورزی کے لیے بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ اب اس نے محاصرے کی شدت بڑھا دی اور حملہ آوروں نے اپنی یورش گرجے کی طرف شروع کی۔ یہاں خندق تنگ اور چھچھلی تھی۔ یہاں سے پانی آسانی سے نکالا جا سکتا تھا بہادر خان، اللہ یار خاں اور سعید حسن کمبوہ نے اپنی خندق کا سلسلہ گرجے تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے سرنگ بچھا کر بارود بھر دی محافظ دستہ نے دو سرنگوں کا پتہ چلا لیا ان میں بارود کے بجائے مٹی بھر دی، لیکن ایک تیسری خندق کی ایک سرنگ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہی مغل وہاں اکٹھا ہوئے پرتگالی بھی زیادہ تر اس مقام پر آ گئے ان کے جمع ہوتے ہی سرنگ اڑا دی گئی اس دھماکے نے محافظ دستہ کو زبردست نقصان پہنچایا باقی ماندہ لوگوں کو ناقابل تلافی پست ہمتی سے دوچار کر دیا۔

پچاس ساٹھ آدمیوں کو چھوڑ کر ایک کشتی میں بیٹھ کر سارے پرتگالی ہگلی سے چلے گئے اور مغلوں نے شہر پر فوراً قبضہ کر لیا۔ کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ تمام سڑکوں پر لاشیں بچھی ہوئی تھیں لاتعداد گھر جل چکے تھے۔ پرتگالیوں کے بحری بیڑے نے دریا سے بھاگنے اور مغلوں کی صف کاٹتے ہوئے جان بچانے کی کوشش کی۔ ان کے پاس بہت سی کشتیاں تھیں لیکن سوار ہونے والے کمزور تھے اور غیر منظم تھے۔ صرف مانوئل از ویدو کا جہاز البتہ ہلکی توپیں چول چھلا اور بندوق سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن مقابلہ کرنے والے کے پاس پانچ سو کشتیاں ایک لاکھ سپاہی، خندقوں کی پانچ قطاریں اور ایک سو بیس عدد توپوں کے علاوہ بے شمار بندوقیں تھیں۔

جب مغلوں نے پرتگالیوں کو دریا پر دیکھا تو ایک آتش بار بحری بیڑا سو لکشیتوں کا آگ لگانے کا سارا سامان معہ شورہ، رال اور گندھک بھیجا۔ لیکن دشمنوں کے بحری بیڑے میں آگ لگانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری طرف پرتگالیوں نے ان کا بحری بیڑا پکڑ لیا۔ اس قطار کو کاٹ دیا جس سے راستہ مسدود تھا۔ اب ایک جھلک بھاگ دوڑ شروع ہوئی سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ یکے بعد دیگرے وہ پرتگالی کشتیاں جن میں پناہ گزیں بھرے تھے پکڑ لی گئیں یا ڈبو دی گئیں۔ ان کشتیوں میں ایک کشتی بڑے قیمتی سامان سے لدی تھی یہ ہگلی کے ایک بڑے سوداگر کی ملکیت تھی اس میں عورتیں بھی بھری تھیں۔ مغلوں نے قبضہ کر کے مسافروں کو گرفتار کر لیا [illegible]

ایک ہگوڈا کو قلعہ بنالیا وہاں سے جان کبرل، اراکان کے مگھ بادشاہ کے پاس صلح کرنے کے لیے روانہ کیا گیا اس طرح ہگلی کو لٹیروں سے صاف کر دیا گیا۔

اس لڑائی میں دس ہزار آدمی مارے گئے، جن میں بوڑھے جوان۔ عورت بچے بھی تھے۔ تخمیناً چار ہزار چار سو عورت و مرد معہ اہل یورپ قید کر لیے گئے ان اسیروں میں کافی تعداد ان لوگوں کی تھی جو بہ جبر عیسائی بنا لیے گئے تھے اور پاس پڑوس کے پرگنوں اور قصبہ جات کے رہنے والے دس ہزار باشندے جو پرتگالیوں کے ہاتھ پڑ گئے تھے سب کو رہائی نصیب ہوئی۔ مغلوں کا بھی نقصان کم نہیں ہوا۔ ان کی بتیس کشتیاں آتشبار لڑائی میں تباہ ہوئیں۔ ساٹھ کشتیاں عارضی پل کی تعمیر میں ختم ہوئیں اور ایک سو سے زیادہ ساحل دریا پر بیکار ہو کر پڑی تھیں، زخمیوں اور مرنے والوں کی بھی تعداد ہزاروں میں تھی۔

قیدیوں کے لیے بڑی مصیبت کا زمانہ تھا۔ گیارہ مہینے دشوار گزار سفر کرنے کے بعد یہ لوگ آگرے پہنچے۔ نازک عورتیں معصوم بچے ناخوشگوار مصیبت برداشت کرنے پر مجبور تھے یہ سب قیدی شاہجہاں کے سامنے پیش کیے گئے۔ اس نے حکم دیا کہ ان سب کو شہزادوں، امیروں میں بانٹ دیا جائے۔ کچھ خوبصورت عورتوں کو اپنے حرم میں بھی رکھ لیا جائے۔ اس کے بعد شہنشاہ نے کوشش کی کہ کچھ پرتگالی پادری مسلمان ہو جائیں۔ ان کو عالی مرتبہ اور خاطر خواہ انعام کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ بلکہ ڈی کرسٹو نے ہمت سے کام لے کر بادشاہ کو عیسائی ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ عذاب روحانی سے محفوظ رہے۔ ڈی کرسٹو کو حراست میں لے لیا گیا۔ ایک سچے عیسائی کی طرح نو سال تک وہ اپنی صلیب لیے رہا۔ دو اور پادری جو ہگلی میں رہ گئے تھے ان کے ساتھ ڈھاکہ کے ملاؤں نے تحقیر آمیز سلوک کیا۔ ایک کو مارتے مارتے مار ڈالا اور دوسرے کو بھی بُری طرح زخمی کر دیا۔ دوسرے پرتگالی جنھوں نے اسلام قبول کیا وہ فوراً آزاد کر دیے گئے ان کے علاوہ اور لوگ قید خانے میں رہے۔ ان کو شدید اذیت کے ساتھ رکھا گیا[۵]۔

ہگلی کی بربادی اور پرتگالیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کو شاہجہاں کی مذہبی ناروا داری سے بار بار منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ صحت ہے بھی مگر ساری بات سچ نہیں۔ مذہبی جوش و جنون کے علاوہ دوسرے اسباب جو گزشتہ بیان میں پیش کیے گئے ہیں، ان پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جو لوگ شاہجہاں کو مطعون کرتے ہیں وہ پرتگالیوں کی موافقت میں ایک لفظ نہیں کہتے۔ پرتگالیوں کو صلح پسند اور صالح تاجر نہیں بتایا جاتا ان کے لٹیرے پن تبلیغی سرگرمی اور بے ایمانی تذکرہ ہر عصری تاریخ ہندوستان و غیر ہندوستانی میں ملتا ہے۔ جو کچھ ان کا انجام ہوا اس کے وہ سزاوار تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ضرورت سے زیادہ سختی برتی گئی، لیکن اگر ان کا استعمال اور شاہجہاں کی ناروا داری میں اتفاقی مطابقت ہے تو یہ نتیجہ نکالنا

غلط ہوگا کہ آخرالذکر اول الذکر کا سبب تھا۔

کوچک تبت

اس عہد کے مختصر الحاقات میں سب سے زیادہ دلیرانہ الحاق چھوٹے تبت کا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں ہاشم خان نے اس ملک کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کو تباہ کن ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہ جہاں نے اپنے دور میں اس کوشش کی تجدید کی اس کو کچھ کامیابی ہوئی، تعجب ہوتا ہے کہ اس دور کے مورخین نے حسب دستور بادشاہ کی اس لڑائی کا جواز نہیں پیش کرتے جو شمال کی غیر جہان نواز پہاڑی علاقہ میں ہوئی۔ حقیقت یہ تھی کہ کوچک تبت میں بہت کم بایہ فخر سامان تھا اس کی پیداوار میں بجز بعض کم حیثیت اُون کے کچھ نہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حکمران ابدال نے کشمیر کے اصل حکمراں چکوں کو پناہ دے کر مغلوں کو ناراض کر دیا تھا۔ یہ چک یہاں سے اکثر اوقات اپنے قدیمی ملک میں داخل ہو کر انتشار پیدا کیا کرتے تھے۔

کشمیر کے گورنر ظفر خان نے ابدال کو مغل حکومت کی اطاعت اور بادشاہ کے نام پر خطبہ پڑھنے کے لیے ۱۶۳۲ء میں راضی کیا۔ لیکن چار سال کے اندر وہ اپنا وعدہ بھول گیا اور اس نے معاہدے رد کر دیے۔ اس لیے ۱۶۳۶ء میں شاہ جہان نے تبت کی تسخیر کی اور ظفر خان دو ہزار سوار اور دس ہزار پیدل لے کر چھوٹے تبت میں داخل ہوا۔ ابدال کو ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر بھاگنا پڑا۔ بالآخر جب اس نے دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے تو اپنے کو ظفر خان کے سپرد کر دیا۔ پھر شاہ جہاں کے نام خطبہ پڑھا گیا اور ابدال کو دس لاکھ روپیہ تاوان جنگ دینا پڑا۔

چھوٹے تبت کی تسخیر میں اسلحہ کے زور کی بہ نسبت ریاکاری و دغابازی سے زیادہ کام لیا گیا۔ لیکن ابدال کی اطاعت سے بھی زیادہ حبیب چک اور احمد چک کے خاندان کا خدشہ اہم تھا۔ اعتقاد خان کے دورِ نظامت میں آخر الذکر نے بے پناہ شرارتیں کی تھیں اور اب بھی ابدال کی طرف سے بھیجا گیا تھا کہ شاہی فوج پر عقب سے دباؤ ڈالے۔ ان کی رسد کا راستہ مسدود کر دیے۔ لیکن ابھی حبیب چک تبت ہی میں تھا کہ معہ سو سپاہیوں کے اس نے اپنے کو ظفر خان کے حوالے کر دیا۔ ظفر خان اس اندیشہ سے کہ اس کے صوبہ میں بغاوت نہ ہو جائے ابدال اور چک کو قید کر کے ظفر خان فوراً کشمیر واپس آیا۔

آسام

شاہ جہاں کی تخت نشینی کے وقت شمال مشرق کی سرحد کے سیاسی حالات کسی لحاظ سے پیچیدگی سے خالی نہ تھے۔ کوچ بہار میں بیر نرائن ولد لکشمی نرائن حکمراں تھا اور کام روپ میں مغل افسر شیخ زاہد برائے نام نگراں تھا۔ دس سال ان علاقوں میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، اس کا خاص سبب آسام کے بادشاہ آہوم کی احتیاط پسندی تھی جو خواہ مخواہ مغلوں سے کام روپ کی سیاست میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس پُرسکون فضا کو قیام عطا کرنے کے لیے قاسم خان ناظم بنگال نے اپنے بیا مبر آسامی سوداگر کے ساتھ

آہوم بادشاہ کے پاس بھیجا۔ لیکن آخرالذکر نے اپنے کسی خودغرض مشیر کار کی رائے کے زیر اثر اس سوداگر کو قتل کرادیا اور مغل سفیر کو اپنے یہاں بلانے سے انکار کردیا۔ اس کے علاوہ اس نے بالی نرائن ولد پرکشت کی اس وقت مدد کی جب وہ کام روپ پر حملہ کرنے جا رہا تھا۔ کام روپ سے اس کو مغلوں نے بے دخل کر دیا تھا۔ اس طرح پر اک آگ بھڑکی جو دو سال تک اپنا کام کرتی رہی اور خوفناک طریقہ پر جان و مال کی تباہی کا باعث ہوئی۔

مغل حملے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے کام روپ سے انھیں جلدی نکال دیا گیا اور اس کی راجدھانی ہاجو پر حملہ آوروں نے قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں بنگال سے قاسم خان کا تبادلہ ہو گیا تھا اس کی جگہ اسلام خان آگیا تھا۔ اسلام خاں نے آتے ہی اس بات کی بڑی کوشش کی کہ مغلوں کے مشرق میں ضائع شدہ اقتدار کی تلافی ہو جائے۔ اس نے زوردار کمک کام روپ کو بھیجی جس نے بالی نرائن اور اس کے مددگاروں کو بھگا دیا۔ مغلوں کا حملہ ابھی ہو ہی رہا تھا کہ بالی سنگھ کا انتقال ہو گیا اس طرح مشرقی علاقہ سے ایک شر انگیز محزن کا خاتمہ ہو گیا۔

جو کچھ آہوم بادشاہ نے کام روپ میں کیا تھا اس کے بدلہ لینے کے لیے شاہ پرستوں نے طے کیا کہ لڑائی آسام تک کی جائے اور مغل سلطنت کی مشرقی سرحدیں جتنا ممکن ہو بڑھادی جائیں۔ انھوں نے آہوم کی سرحدی چوکی کجلی پر حملہ کیا اور قبضہ بھی کر لیا۔ محافظ دستہ کجلی میں چھوڑ کر مغل آگے بڑھ گئے۔ سام دھارا میں رک کے آہوم بادشاہ نے حملہ آوروں کو روکنے کے لیے جلدی جلدی تیاریاں کیں۔ سام دھارا کے قلعہ کو مکمل طور پر ٹھیک ٹھاک کر دیا اور محافظ دستہ مقرر کیا۔ اس نے پوری طرح سے قلعہ کی حفاظت کا انتظام کیا دشمن سے مقابلہ کے لیے تیار ہوا۔ آسام میں داخل ہونے سے پہلے ہی مغلوں کو اپنے دشمن کی قوت کا اندازہ نہ تھا۔ آہوم کے بادشاہ نے سرگرمی سے حملہ کیا اور ان کو دریائے برہمپتر کے اس پار بھگا دیا۔ کجلی کا قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انھوں نے کام روپ کا دارالسلطنت گوہاٹی کو بنایا۔

اس وقت سے ۱۶۵۸ء تک مغلوں اور آہوم بادشاہ کے تعلقات اگرچہ بہت دوستانہ نہ تھے مگر پُرامن ضرور تھے کبھی کبھی جھگڑے ہوئے سرحد کے بارے میں یا تجارتی حقوق کے لیے یا ایسے ہی دوسرے معاملوں کے لیے لیکن کبھی کشیدگی زیادہ نہیں بڑھی۔ ۱۶۴۷ء میں آہوم بادشاہ کے پاس گوہاٹی کے فوجدار کے دوستانہ مشن بھیجنے کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ مغل بادشاہ کی اجازت سے ہوا تھا۔ حقیقتاً ۱۶۳۹ء کے بعد مغل مورخوں نے آسام کا بہت کم ذکر کیا ہے اور یہ بعید از قیاس ہے کہ کوئی سوچی سمجھی پالیسی اس علاقہ میں انھوں نے اختیار کی ہو۔ کام روپ پر قبضہ کرنا ایک انفرادی واقعہ ہے جس کا تعلق تمام شاہانہ پالیسی سے شاہجہاں کے دور میں نہ تھا۔ وہ اپنی سلطنت شمال مغرب اور جنوب کی طرف بڑھانا چاہتا تھا۔ بنگال سے آگے بڑھ کر مشرقی علاقہ کا خیال شاہجہاں نے کبھی [illegible] نہیں پیدا کر سکا۔ آسام سے جنگ صرف کام روپ کے بچانے کے لیے کی گئی تھی

اگر بال نرائن کی ہمت افزائی آ ہوم بادشاہ نہ کرتا تو اس میں بھی شک ہے کہ اتنا وقت اور زور اس علاقہ میں مغل ضائع کرتے یا نہ کرتے۔

بیربھوم اور پاچیت سے لے کر رتن پور متوسط ہند اور روہتاس گڑھ موتوعہ جنوبی بہار سے لے کر اڑیسہ کی سرحد تک عہد متوسط میں یہ سارا علاقہ جھار کھنڈ کے نام سے مشہور تھا۔ بعد میں کئی ایک خود مختار حکومتوں میں تقسیم ہوا جس سے کبھی کبھی مغلوں کو دردسری ہوئی۔ اس علاقہ کی پہاڑی اور جنگلی خصوصیات کے سبب یہاں کے سرداروں کو زیر کرنا دیر طلب ثابت ہوا۔ علاوہ بریں دوسرے زمینداروں کی طرح وہ بھی وقت پر جھک جاتے تھے اور بعد میں خلاف ورزی کرتے تھے۔

اجینا

شاہ جہاں نے عبداللہ خان فیروز جنگ کو حکم دیا کہ وہ بکسر کے قریب اجینیا کے زمیندار پرتاب کی سرکوبی کرے۔ ہنوز عبداللہ خان اس کے بھوج پور کے قلعہ کا محاصرہ قریب سے کیے ہوا تھا کہ ایک دوسرے فوجی دستہ نے زبردست خان کی قیادت میں طوفانی حملہ کر کے دشمن کی طرف سے کو ہی پور کا قلعہ فتح کر لیا۔ بھوج پور کا محاصرہ چھ مہینہ تک رہا۔ محافظ دستہ کی حالت دیگر گوں ہوئی۔ بالآخر پرتاپ نے خالی قلعہ خالی کر کے اپنے باغ میں پناہ لی۔ یہاں بھی وہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔ چاہتا تھا کہ اپنی گڑھی میں چلا جائے لیکن اس پر ظفر خاں کے لڑکوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ ایک خوفناک لڑائی ہوئی جس میں آخر الذکر مارے گئے۔ مغلوں نے پرتاپ کی گڑھی کا بھی محاصرہ کر لیا۔ اس کو سپردگی پر مجبور کیا۔ وہ عبداللہ خان سے ملنے آیا صرف کمر پر ایک کپڑا باندھے تھا، اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے تھا۔ عبداللہ خان نے اسے قید خانہ بھیج دیا اور اپنی کامیابی کی اطلاع بادشاہ کو دی۔ شاہ جہاں نے پرتاپ کے قتل کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی بیوی کو کسی مسلمان افسر کو دیے جانے کا حکم دیا۔

رتن پور ۔ ۳۵-۱۶۳۴ء

دوسرا مقام عبداللہ خان کے حملہ کا مرکز رتن پور تھا جس کا زمیندار بابو لچھمن سرکش اور نافرمان بردار ہو گیا تھا۔ باندھو کے زمیندار امر سنگھ کی مدد سے عبداللہ خان نے رتن پور پر چڑھائی کی۔ راستہ میں بابو لچھمن کے ہمدردوں نے راستہ بند کر دیا لیکن عبداللہ خان نے آسانی سے اُن کو زیر کر کے ناگی انتر کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ مایوسی کے جذبہ سے متاثر ہو کر محافظ دستہ نے اپنے بال بچوں کو مار ڈالا اور دلیرانہ انداز میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، انھوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن کثرت تعداد سے زیر ہو گئے۔ اُن کا ایک ایک آدمی مارا گیا۔ شاہی فوج نے گڑھی پر قبضہ کر لیا عبداللہ خان رتن پور کے لیے روانہ ہوا۔ بابو لچھمن نے امر سنگھ کے ذریعہ صلح کی بات چیت شروع کی عبداللہ خان نے کوبی رائے" کو اس کے پاس شاہی رحم و کرم کا یقین دلانے کے لیے بھیجا۔ بابو لچھمن نے اطاعت قبول کی اور فیروز جنگ کے ہمراہ دربار گیا۔

پالامئو ان دونوں فتوحات سے زیادہ دلچسپ پالامئو کی تسخیر تھی۔ آس پاس کے علاقوں کی طرح یہ ضلع بھی مخلوط جنگل کا لبادہ پوشش پہاڑیوں کا مجموعہ تھا درمیان میں چھوٹا ناگپور کے محدب میدان اور زرخیز وادیاں تھیں۔ اس پر ایک کوہری قبیلہ چیروں کا عمل دخل تھا اور اس وقت ان کا راجہ پرتاپ حکمراں تھا۔ گورزبہار سے اس کی نافرمانی اس کا ایک ناقابل عفو جرم تھی جس کے لیے وہ سخت سزا کا مستحق تھا۔ لیکن پرتاپ کی خوش قسمتی تھی کہ جب عبداللہ خان اس صوبہ کا ناظم تھا تو آخر الذکر کو اتنی مہلت نہ تھی کہ اس کی طرف توجہ کرے۔ بقول مغل مورخ کے راجہ ضدی ہو گیا۔ نئے ناظم شائستہ خان سے ناشائستہ حرکات کرنے لگا اس کی اطلاع جب شہنشاہ کو ہوئی تو حکم ملا کہ پرتاپ کو بھگا کر اس کے کثیف وجود سے زمین پاک کی جائے۔"

حسب الحکم اپنے لڑکے کو پٹنہ کا انتظام سپرد کر کے شایستہ خان ۱۲ر اکتوبر ۱۶۴۱ء کو پانچ ہزار گھوڑے پندرہ ہزار پیدل سپاہی لے کر پالامئو کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی نقل وحرکت مکمل جنگ کی آراستگی کا نمونہ تھی۔ قلب فوج میں خود رہا، ہراول دستہ کا ذمہ دار زبردست خان کو بنایا داہنے بازو پر بختیار خاں اور بائیں پر آتش خان دکنی کو اور عقب میں سید مرزا کو تعینات کیا گیا۔ گیا سے آگے شایستہ خان بہت احتیاط کے ساتھ بڑھتا رہا۔ ہر مقام پر اپنی فوج کے اردگرد کچی مٹی کا دھس بنا تا گیا اس خیال سے کہ کوئی اچانک حملہ نہ ہو فوج کے آگے راستہ صاف کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت روانہ ہوئی جنگل صاف کیے گئے سڑکیں کشادہ کی گئیں اور دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے پاس پڑوس کے دیہاتوں میں غارت گری و بربادی کا بازار گرم ہوا۔ بایں ہمہ چیروس کبھی کبھی پڑوس کے جنگلوں سے نکل کر مغل فوج کے بھٹکے ہوئے سپاہیوں پر اچانک حملے کرتے رہے۔

۲۶ر جنوری ۱۶۴۲ء کو شاہی فوج آرو سے روانہ ہو کر پالامئو کے قلعہ کے شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ دشمنوں نے ان راستوں کو روکا جہاں شاہراہ سے مختلف راستے پھوٹتے تھے لیکن ایک تیز جھڑپ کے بعد مزاحمت کرنے والے بھاگ گئے۔ اب شائستہ خان نے اپنے ایک امیر کو اس مقام کے لیے روانہ کیا جہاں وہ خیمہ لگا سکے لیکن دشمنوں نے اس کی فوج کو شدید نقصانات پہنچائے۔ بالآخر بڑی جاں فشانی کے بعد شایستہ خان اس ندی پر پڑاؤ ڈالنے میں کامیاب ہوا، جو قلعہ کے پاس سے گزرتی تھی۔ لیکن دشمن اس کے آدمیوں کو پریشان کرتے رہے۔ شاہی فوج نے ایک ایسے ٹیلے پر قبضہ کیا جس سے قلعہ پر آتش باری ہو سکتی تھی۔ چنانچہ پرتاپ بدحواس ہو گیا اور پیام بھیجا کہ وہ اسی ہزار روپیہ بطور پیش کش حاضر کرنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اس کو شاہی رحم وکرم کا اہل سمجھا جائے۔ وہ اس پر بھی راضی ہوا کہ پٹنہ جا کر مغل ناظم کی خدمت میں اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دے۔ یہ شرائط شایستہ خان نے منظور کریں کیونکہ وہ خود بھی عنقریب آنے والی برسات کے ڈر سے

حملہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پالامئو میں اندرونی خلل سے وہاں کے معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت پڑی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پرتاپ نے اپنے ان حکام کے خلاف بُرے برتاؤ شروع کیے جنھوں نے اُن کے خلاف سازش کی اس کا تختہ الٹ جائے ۔ شائستہ خان کی جگہ پر اب بہار میں اعتقاد خاں آگیا تھا ۔ اُس کے آتے ہی چیرو کے دو سردار دریا رائے اور تیج رائے نے اس کی امداد کا وعدہ لے لیا ۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ پرتاپ کو قیدی بنا کر بھیج دیں گے ۔ وہ لوگ پالامئو واپس گئے ۔ دوستوں کی مدد سے پرتاپ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ اب اس قبیلہ کا سردار تیج رائے ہو گیا ۔ اعتقاد خان نے جب اس سے وعدہ وفا کرنے کا تقاضا کیا تو اس نے ٹال مٹول شروع کی ۔ لیکن تیج رائے زیادہ دیر تک اڑا نہ رہ سکا کیونکہ اس کا بھائی دریا رائے اس کے خلاف ہو گیا تھا تیج رائے کو سزا دینے کے لیے اعتقاد خان نے دریا رائے کو ملا لیا ۔ آخر الذکر نے وعدہ کیا کہ وہ دیوگاؤں اس کے سپرد کر دے گا ۔ بشرطیکہ ناظم اپنے آدمی وہاں بھیجے ۔

اعتقاد خان نے اپنا ایک فوجی دستہ زبردست خان اور شاہ آباد کے زمیندار کی قیادت میں بھیج دیا ۔ یہ لوگ اکتوبر ۱۶۶۱ء کے آغاز میں دیوگاؤں پہنچے ۔ دریا رائے مع اپنے لڑکوں اور دوسرے چیرو سرداروں کے ان کے استقبال کو آیا ۔ قلعہ سپرد کر دیا ۔ زبردست خان دریا رائے اور اُس کے ہمراہیوں کو پٹنہ روانہ کر کے دیوگاؤں میں اپنے کو مستحکم کرنے لگا ۔ فرمانبرداروں کو انعام اور سرکش اور ضدی لوگوں کو سزا دے کر زمین ہموار کر لی ۔ اس کے بعد اُس نے پالامئو کی سڑک چوڑی اور جنگل صاف کرنے کے لیے قراولی دستہ روانہ کیا ۔ ۱۵ اکتوبر کو خبر ملی کہ تیج رائے نے چھ سو سوار اور سات ہزار پیدل راستہ روکنے کے لیے بھیجے ہیں ۔ پہلی فوج نے شب خون مارنے کا ارادہ کیا ۔ زبردست خان نے اطمینان کے ساتھ دشمن کا انتظار کیا اور موقعہ پر اُن کو پسپا کر دیا ۔

اس اثنا میں تیج رائے کی زبردست تیاری کی افواہیں اعتقاد خان تک پہنچیں ۔ اس نے فوراً باقر خان نجم ثانی کو اپنی فوج کی امداد کے لیے دیوگاؤں بھیجا ۔ لیکن آخر الذکر کے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی پالامئو میں ایک انقلاب آگیا ۔ تیج رائے شکار کھیلنے چلا گیا تھا اس کی عدم موجودگی میں مدن سنگھ ٹھکائی کے دولڑکوں صورت سنگھ اور سیال سنگھ نے پرتاپ کو رہا کر کے دشمنوں کے سرداروں کے سپرد کر دیا ۔ تیج رائے ایک بے گھر کی طرح ادھر اُدھر آوارہ مارا مارا پھرا ۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں سر چھپانے کی جگہ تلاش کرتا رہا اس کا دکیل مان سنگھ بھی ایسے ہی پریشانیوں میں مبتلا ہوا ۔ دیوگاؤں کو دھیر ندر راجیا کے سپرد کر کے زبردست خان اب گھنے جنگلوں کو پار کرتا ہوا ۔ ۱۰ مان گڑھ پہنچا ۔ یہاں اس کو پرتاپ کا ایک خط ملا ۔ جس میں عاجزی اور فرمانبرداری

کا اظہار کیا گیا تھا۔ لیکن زبردست خان نے جواب دیا کہ اس پر اس شرط سے اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ میرے ساتھ پٹنہ چلے۔ پرتاپ نے یہ شرط منظور کرنے میں تکلف کیا۔ زبردست خان نے اس انکار پر جواب میں اس نحس انجام کا اشارہ کیا جو باقر خان کے آنے پر ہوگا۔ یہ سُن کر پرتاپ گھبرا گیا۔ اس نے شرط منظور کر لی۔ زبردست خان کے ساتھ ۷ر نومبر کو پٹنہ روانہ ہوا۔ باقر خان اور ان گوں سے ملاقات راستے میں ہوئی۔ پٹنہ پہونچ کر ایک لاکھ روپیہ تاوان ادا کرنے کے لیے پرتاپ راضی ہو گیا۔ اعتقاد خان نے ایک سرکاری منصب کے لیے اس کی سفارش کی۔ شہنشاہ نے یک ہزاری منصب دار کا اعزاز عطا کیا۔ اس طرح پالامئو سرد ست اُس تباہی سے محفوظ رہا جو اس عہد کے بعد اس پر نازل ہوئی[۲۲]۔

مالوہ

مالوہ میں گونڈ اور بھیل نے گاہے ماہے شاہی افسروں کو تکلیف پہنچائی۔ یہاں ایک بھاگرت بھیل "کھاتا کھیری" کا زمیندار تھا۔ جس نے اس وقت تک کسی گورنر کا اثر نہ لیا تھا۔ اپنے مستحکم جگہوں کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۷۲۳ء میں اس نے کچھ زیادتیاں کیں۔ ناصری خان گورنر مالوہ اس کی سرکوبی کے لیے گیا۔ بھاگرت گھبرا گیا اس نے اپنے پڑوسی سنگ رام زمیندار گنار سے کہا کہ وہ اس کی وکالت کرے اور یہ وعدہ کیا کہ وہ وفادار و فرمانبردار رہے گا جو قلعہ عرصہ دراز تک اس کا گھر تھا اس پر قبضہ رکھنے کے عوض برابر محصول ادا کرتا رہے گا۔ یہ بھی درخواست کی کہ دربار میں حاضر ہونے سے اُسے معاف کر دیا جائے۔ لیکن اس ناقابل اطمینان شرائط سے ناصری خان کو آسودگی نہ ہوئی اس نے اپنے کوچ کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب وہ کھاتا کھیری" سے چار میل کے فاصلے پر پہنچا تو بھاگرت کی ہمت نے جواب دیا وہ قلعہ سے اس وعدہ پر دست بردار ہوا کہ اسے معاف کر دیا جائے گا اور نیک سلوک بھی کیا جائے گا۔ ۲۴ر دسمبر ۱۷۲۳ء کو ناصری خان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہاں بادشاہ کے نام پر خطبہ پڑھا گیا اور مسلم رسوم کے لحاظ سے اسے وقف کر دیا[۲۳]۔

دس سال بعد گونڈوانہ کی پہاڑیوں میں بمقام گنار کچھ جھگڑا ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ سنگ رام زمیندار وفادار سلطنت مغلیہ کا جب انتقال ہوا تو اُس کے افسر اعلیٰ نے ماروی گونڈ نے سنگ رام کے لڑکے بھوپت کو جائداد سے محروم کر دیا۔ خود قابض ہو گیا ایک حقیر رقم اس نے بھوپت کے گزارہ کے لیے مقرر کر دی۔ جتھا کی حمایت سے اپنے کو مضبوط کر لیا۔ اس کے بعد اس نے مغلوں کی اطاعت سے بھی انکار کر دیا سالانہ خراج دینا بھی بند کر دیا۔ اس کا یہ اقدام دوسرے زمینداروں کے لیے دلکش ثابت ہوا۔ انھوں نے بھی محصول روک لیا سرکشی پر آمادہ ہوئے۔

صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی ضرورت محسوس ہوئی کہ فوری دیرپا اثر قدم اٹھائے جائیں۔ خان دوراں

رائے سین سے باغی کی سرکوبی کے لیے چلا۔ وہ اس کے علاقہ میں داخل ہوگیا اور وہاں اس وقت تک رہا جب تک کہ جنگل کا راستہ صاف نہیں ہوگیا۔ واپس آنے کے راستے میں مختلف مقامات پر محافظ دستہ مقرر کرکے گنار کی وادی میں گیا۔ ۲۶ر اپریل ۱۶۴۳ء کو اس فوجِ مخالف کا مقابلہ کرنا پڑا اس فوج میں پانچ ہزار گونڈ تھے جس میں سات یا آٹھ بندوقچی بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے شاہی فوج کا راستہ روکا۔ خان دوراں نے ایک مختصر لڑائی کے بعد ان سب کو مار بھگا دیا۔ برسات بھر وہیں ٹھہرا رہا۔ اس درمیان میں اس نے ایک فوجی دستہ بھیج کر آس پاس کے چھوٹے بڑے مسمار کرادیے۔ مغل سپہ سالار کے اس تیور نے ماروی گونڈ کو خوفزدہ کردیا اب وہ مرزا دلی اور گوبند داس کے پاس گیا۔ یہ دونوں خان دوراں کے بھروسے کے آدمی تھے۔ ان لوگوں سے اس نے ایک پرامن مصالحت کی درخواست کی۔ اپنے دوستانہ رویّے کے ثبوت میں اس نے بھوپت کو چند سربرآوردہ لوگوں کے ساتھ مغلیہ خیمہ میں بھیجا۔

ہنوز گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا کہ محسوس ہوا کہ محافظ دستے کے کچھ لوگ بھوپت سنگھ کو چھڑا لے جانا چاہتے ہیں اس پر خان دوراں نے ان سرداروں کو قید کردیا جو بھوپت کے ساتھ آئے تھے اور بھوپت کو بھی حراست میں رکھا۔ ماروی گونڈ کے قلعہ نہ دینے پر خان دوراں آگے بڑھا اور لکھرا پہاڑی پر قبضہ کرلیا لیکن تسخیر قلعہ کی کوئی خاص صورت نہ دکھائی دی۔ کیونکہ گنار کا جائے وقوع دو منزلہ پہاڑی تھی جو ٹھوس چٹانوں کا ایک عمودی ٹکڑا تھی۔ ان قدرتی استحکامات میں ایک راستہ تھا وہ بھی بھاری پتھروں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ اس کا ایک ایک انچ توپوں سے محفوظ تھا۔

ان حالات میں بغیر زبردست توپ خانہ کے قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا اس لیے خان دوراں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ دو بڑی توپیں اور کمک بھیج دی جائیں۔ شاہ جہاں نے رشید خان انصاری کو برہان پور سے، پہاڑ سنگھ بندیلہ کو اس کی جاگیر سے، جان سپار خان کو مندسور اور پرتھوی راج راٹھور کو رامپور سے، خان دوراں کی امداد کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا۔ اس امدادی فوج کے آنے پر خان دوراں نے ۱۸ر فروری ۱۶۴۴ء کو قلعہ کے محاصرہ کی ابتدا توپوں کی بمباری سے کی۔ ماروی گونڈ نے محسوس کیا کہ مقابلہ کرنا بے کار ہے۔ اس نے صلح کی درخواست کی۔ مارچ کے خاتمہ پر خان دوراں سے ملنے آیا۔ خان دوراں نے قلعہ پر قبضہ کرلیا اپنے بھائی محمد صالح کے انتظام میں دے دیا۔ پانچ سو گھوڑوں اور سات سو بندوقچیوں کا ایک دستہ بھی ساتھ کردیا۔[۲۳]

گڑھوال اور کمایوں

گڑھوال اور کمایوں کے پہاڑی علاقوں پر بھی مغل بادشاہوں کی نظریں تھیں۔ کبھی کبھی ان پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ جہانگیر کے عہد حکومت

میں کماؤں کا راجا حاضر دربار ہوا تھا اس کو اچھے خاصے انعامات سے سرفراز بھی کیا[25] تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغل خاندان کا عمر بھر وفادار رہا۔

شاہ جہاں کے زمانے میں سب سے پہلی کوشش گڑھوال کو قبضہ میں لانے کی اپریل ۱۶۳۵ء میں ہوئی، یہ اس وقت کی بات ہے جب کانگڑہ کے فوجدار نجابت خان نے سری نگر پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ سری مور پہاڑیوں میں داخل ہو کر دریائے جمنا کے کنارے شیر گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ ہردوار تک برابر قبضہ کرتا چلا گیا۔ یہاں دریائے گنگا پار کر کے گڑھوال میں داخل ہوا۔ اب سری نگر کا فاصلہ صرف چھ میل رہ گیا۔ راجا نے اس سے دغا بازی کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دس لاکھ روپیہ بحیثیت خراج گزار ادا کرے گا لیکن اس کو پہاڑیوں میں ایسا گھیر دیا کہ راہِ فرار بھی نہ رہی۔ اس بُری طرح سبھوں کی جان لی کہ بجز نجابت خان کے کوئی آدمی[26] نہ بچا۔ نجابت خان نے شہنشاہ کو اس تباہی کی اطلاع دی بادشاہ نے اس کو کانگڑا کی فوجداری سے برطرف کر دیا۔

بیس سال بعد ۱۶۵۴ء میں خلیل اللہ نے سری نگر فتح کرنے کی دوسری کوشش کی۔ یہ کوشش بھی لاحاصل رہی۔ شاہ پرست بہادر پور تک دھاوا مارتے چلے گئے۔ کماؤں کے راجا نے اطاعت قبول کرائی اور واپس آ گئے[27]۔ جنوری ۱۶۵۶ء میں قاسم خان میر آتش نے چار ہزار فوج سے گڑھوال پر حملہ کیا۔ اسی سال جولائی میں میدنی سنگھ ولد راجہ سری نگر شہنشاہ کی خدمت میں اپنے باپ کی جانب سے اطاعت پذیری کی درخواست پیش کرنے حاضر دربار ہوا[28]۔

ہندوستان کے شمال و مغربی سرحدی پہاڑی قبیلوں میں ہمیشہ سرکشی اور بغاوت کی روح کارفرما رہی۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں شاہی حکام کی بڑی پریشانیوں کا سرچشمہ تھی۔ لیکن ۱۶۲۵-۲۶ء میں ظفر خاں نے اس پر دباؤ ڈالا اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جہاں بامی ایک اتفاقیہ نشانہ کا شکار ہو گیا[29]۔ احداد کا جانشین اس کا لڑکا عبدالقادر ہوا۔ ظفر خان درہ خیبر کی طرف سے کابل جا رہا تھا راہ میں عبدالقادر نے اس پر حملہ کیا۔ سارا سامان لوٹ لیا۔ اس موقعہ پر گورنر کی ساری فوج تباہ ہو گئی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد شاہ جہاں نے ظفر خاں کی جگہ لشکر خان کو کابل کا گورنر بنا دیا[30]۔

خان جہاں کی بغاوت کے زمانے میں ایک کمال الدین نے کابل اور اٹک کے درمیان افغانی قبائل میں شورش پیدا کر دی تھی۔ لیکن سعید خان نے فوراً اس کا مقابلہ کیا۔ عبدالقادر کو شکست دی۔ فتنہ فرو ہو گیا[31]۔ اس کے بعد ۱۶۳۸ء میں تیغ قبائل نے کریم داد کی قیادت میں عام بغاوت شروع کی۔ آخر الذکر کو زندہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا[32]۔ دو سال بعد یوسف زئی قبیلہ بغاوت پر آمادہ ہوا۔ لیکن سید دلیر خان تھانہ دار نوشہرہ نے آسانی سے سرکوبی کر دی۔ ۱۶۵۰ء میں خوشحال خٹک نے خود یوسف زئی قبیلہ کی تادیب کرنے کی درخواست

کی وہ کامیاب ہوا اور اس کے بعد شاہجہاں کے بقیہ دورِ حکومت تک فوجیں ہندوستان سے قندھار کے لیے برابر آتی جاتی رہیں اس لیے بھی قبیلے خاموش رہے ۔

قزوینی لکھتا ہے کہ لاہور کے قریب کی شکست کے بعد باسنغر کولاس (بدخشان) بھاگ گیا اور وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ایک غیر معروف شخص اپنا نام بائسنغر رکھ کر بلخ آ گیا جہاں اس کا بڑا احمد ردانہ خیر مقدم ہوا ۔ بلخ کے حکمران نے ایک بار اپنے خاندان میں اس کی شادی کرنے کا بھی قصد کیا۔ لیکن اس کی صداقت میں شک و شبہ پیدا ہوا اور شادی نہ ہوئی ۔ بھیس بدلنے والا بلخ سے ایران گیا ۔ وہاں کے بادشاہ نے بغیر اس کی ملاقات کے بالواسطہ اس کی ایک شاندار دعوت کا انتظام کر دیا۔ ایران سے وہ بغداد اور ترکی گیا ۔ بالآخر ٹھٹھہ پہنچا ۔ یہاں بھی اس نے اپنے پر فریب دعوے دولت خان گورنر کے سامنے پیش کیے ۔ گورنر نے اسے قید کیا اور شہنشاہ کے پاس بھیج دیا ۔ وقائع حاجی نے اسے پہچان لیا اور [illegible] میں اس کو پھانسی دینے کا حکم دیا ۔

باب ۶

احمد نگر کا اختتام

حکومت احمد نگر کا جائزہ

احمد نگر کی سلطنت ۱۴۹۰ء میں ملک احمد نظام الملکؒ نے بہمنی سلطنت سے الگ ہو کر اور اس کے نام نہاد بادشاہ سلطان محمود کو شکست اور اس کے متعدد حملوں کو رد کر کے قائم کی تھی۔ لیکن ملک احمد کے بعد ملک میں تفرقہ انگیز تحریکات پُر زور ہو تی گئیں اور اس کے وجود کی طولانی کشمکش کے آخری عہد تک ہم کو ایسا اور کوئی حکمران نظر نہیں آتا جس نے کارآمد اقدامات پیش کرنے یا استحکام سلطنت کی قابل قدر فکر کی ہو۔ اس لیے احمد نگر جنگجو رہنماؤں کی طبع آزمائی کا ہمیشہ میدان تفریح بنا رہا۔ ان رہنماؤں کا مقصد اپنی برتری برقرار رکھنا تھا چاہے سلطنت قائم رہے یا نہ رہے۔ ان خرابیوں میں اگر بیجاپور اور گولکنڈہ سے مسلسل لڑائیاں بھی شامل کر لی جائیں تو سلطنت کے پراگندگی کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ جب سلطنت کی تخلیقی قوت ختم ہو گئی تو اس کے ذرائع آمدنی بھی کمزور ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتظام کی مشین بے کار ہو گئی۔ ۱۶ویں صدی کے آخری دہائیوں اور ۱۷ویں صدی کے ابتدائی حصوں تک پہنچتے پہنچتے احمد نگر تن بے جان ہو گیا۔ ملک عنبر نے اس کے پرانے دبے دبائے جوہر جمع کر کے پھر روح پھونکنے کی کوشش کی لیکن اس کے انتقال کے بعد ہی اس پر زوال چھا گیا۔

مغلوں سے سابقہ

احمد نگر اور مغلوں میں باضابطہ تعلقات بُرہان اول کے دورِ حکومت میں شروع ہوئے۔ بُرہان اول نے بابر اور ہمایوں سے گجرات کے حکمران بہادر شاہ کی چیرہ دستیوں سے بچانے کی درخواست کی لیکن تیسرے مغل بادشاہ کی تخت نشینی کے سولہ سال تک یہ تعلقات سیاسی سطح پر قائم نہ ہوئے۔ گجرات پر اپنی پہلی مہم بھیجنے کے وقت اکبرؒ نے میر محسن رضوی کو نظام الملک کے دربار میں بھیجا۔ گویا یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ گجرات فتح کرنے کے بعد اکبر احمد نگر کا بھی بادشاہ ہو گیا ہے۔ لیکن وقتی طور پر وہ نظام شاہ

کی مشکوک اطاعت اور بھیجے ہوئے تحفہ جات سے مطمئن ہو گیا۔ اکبر کی بھی حکومت شمال میں ہنوز مضبوط نہ ہوئی تھی اس لیے دکن کے حکمرانوں کو دعوت جنگ دینا خلاف مصلحت تھا۔

دکن کی طرف اکبر کے اقدامات کے اسباب

لیکن مستقبل کے بیس سال کے اندر ہی مغلوں کی حکومت سب سے برتر ہو گئی۔ مشرق میں بنگال کی سرحد سے لے کر مغرب میں قندھار اور شمال میں کشمیر سے لے کر جنوب میں دریائے نربدا تک سارے علاقوں نے ایک بادشاہ کی قوت کا لوہا مان لیا اور ہر جگہ ایک ہی نظام سلطنت کا سایہ رہا۔ اس بھاری بھرکم سلطنت کی بنیاد ایسی فوجی آمریت پر تھی جس کو برقرار رکھنے کے لیے سلطنت کی دائمی توسیع ضروری تھی۔ علاوہ اس کے اس زبردست سلطنت کے وجود کا انحصار اک زبردست فوج پر تھا اور یہ فوج تعداد میں برابر بڑھتی رہتی تھی اس فوج میں ہزاروں بہادر سپاہی اور قابل قدر افسر تھے جن کو بے کام رکھنا اندرونی انتظام اور سکون سلطنت کے لیے خطرناک تھا۔ علاوہ بریں کام میں لگائے رکھنا کا خیال اکبر کی دکنی پالیسی کی تشکیل کا ایک سبب تھا۔

ایک دوسرا جذبہ بھی ممکن ہے۔ اکبر کے دل میں رہا ہو کہ اس کو چکرورتیشہ کا اعزاز حاصل کرنا تھا۔ اس کے سامنے ان ہندو حکمرانوں کی مثالیں تھیں جنھوں نے شمال کی تسخیر کے بعد جنوب کا رُخ کیا تھا۔ اگر یہ سوچا جائے کہ ہندو حکمرانوں کی مثال عہد ماضی کی داستان تھی تو علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی مثالیں بہت پرانی نہیں تھیں اور اکبر ان دونوں سے کسی خداداد قابلیت میں کم نہ تھا۔

علاوہ اس خیال کے جو کسی شمالی حکمران کو جنوب کی تسخیر کا پیدا ہوتا ہے اکبر کو ایک احساس یہ بھی تھا کہ وہ منجانب غیبی قوت اس امر پر مامور تھا کہ ہر ملک میں اس کو صالح حکومت قائم کرنا ہے۔ اس کے نزدیک مغل گورنمنٹ اچھی گورنمنٹ ہے۔ اس نظریہ کے تحت اس کی جدوجہد کا احمد نگر ایک موزوں میدان عمل تھا۔

احمد نگر میں بد نظمی

مرتضیٰ نظام شاہ کے پاگل پن نے حکومت میں جماعتی جھگڑوں کو تقویت پہنچائی۔ حسین اور اسمٰعیل کے سریع الزوال اثر نے قتل عام دغارت گری شہر اور احمد نگر کی حکومت کا ایسا رواج ہو گیا جیسے امن و آشتی دنیا سے اٹھ گئی تھے۔ اپنے مخبوط الحواس بھائی کے مظالم سے بچنے کے لیے برہان ثانی نے بھاگ کر اکبر کے یہاں پناہ لی۔ اسی طرح سے اور بھی افسروں نے مغل دربار کو آماجگاہ بنایا۔ احمد نگر میں انتشار اور ایک حق دار کا دربار میں موجود ہونا، اس کا امداد کے لیے درخواست کرنا یہ سب ایسی باتیں تھیں جنھوں نے مغلیہ شہنشاہ کو احمد نگر کے معاملات میں دخل اندازی کا معقول بہانہ پیدا کر دیا۔

برہان کی سرتابی اکبر کو خیال تھا کہ برہان ثانی کی امداد کر کے وہ اپنی برتری دکن میں زیادہ موثر طریقہ

سے قائم ہو سکے گا۔ لیکن جس کی پشت پناہی وہ کرتا رہا تھا وہ اتنا اطاعت شعار ثابت نہ ہوا جتنی امید تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے اکبر کی اطاعت سے انکار کر دیا اور خاندیش کا حکمراں جو اس کا ہمسایہ تھا اس کی بھی دوستانہ رائے سے گریز کرنے لگا۔ علاوہ اس کے جب مغل سفیر فیضی، برہان ثانی کے دربار میں پہنچا تو اس کے ساتھ بھی نہ صرف نامعقول برتاؤ سے پیش آیا بلکہ بادشاہ کو مناسب تحائف بھیجنے سے اس نے انکار کر دیا۔ اس کی یہ حرکت اکبر کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ برہان ثانی کے انتقال کے بعد جو خانگی جھگڑے احمد نگر میں پیدا ہوئے انھوں نے اکبر کی مزید ہمت افزائی کی۔ چنانچہ اس نے زبردست فوج شاہزادہ مراد کی قیادت میں بھیج دی۔ شہزادے نے احمد نگر کو گھیرا اور برار کی علیحدگی حاصل کر لی۔

برار کا الحاق و نتائج

برار کا الحاق مغلوں کی مستقبل کی پالیسی کا پیش خیمہ ہے۔ اس نے شمال و جنوب کی رکاوٹ ختم کر دی۔ اسی نے شاہ پرستوں کو نظام شاہی حکمرانوں سے متواتر مسلسل جھگڑوں میں لگا دیا۔ سیاسی شہرت قائم رکھنے کا مغلیہ ذہنیت کو احساس تیز تر ہوا اس لیے احمد نگر کے وجود کا پورا اختتام اب صرف وقتی سوال تھا۔ مراد کی کارگزاری کی تکمیل کے لیے اکبر خود ۱۵۹۹ء میں دکن آیا۔ اس نے خاندیش ختم کیا، برار پر قبضہ کیا، بالاگھاٹ کو مغلیہ سلطنت کا جزو بنایا۔ ایک فوری ضرورت نے اکبر کو شمال واپس آنے پر مجبور کیا۔ دکن میں اپنا کام ناتمام چھوڑ کر وہ چلا آیا۔

عنبر کی بغاوت

مقبوضہ علاقوں کے الحاق نے مغلوں کو مجبور کیا کہ احمد نگر کے بعض حصوں کو چند حوصلہ مند سرداروں کے سپرد کر دیں۔ ایسے لوگوں میں دو آدمی عنبر اور راجو نامی ہوئے۔ اپنی برتری کے لیے دونوں لڑنے لگے۔ عنبر نے اپنی دانشمندی و شجاعت سے اپنے حریف کو شکست دی۔ اپنے مقبوضات مضبوط کیے احمد نگر کی قسمت کو بیدار کیا اور نام نہاد شخص کو مرتضیٰ ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد اس نے شمال سے آنے والے حملہ آوروں کو خاندیش بھگا دیا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ملک عنبر ایسے حاضر دماغ و خوش تدبیر آدمی اور مغل کے کام چور سپہ سالاروں میں برابر جنگ رہی۔ خان خاناں، خان جہاں، عزیز کوکہ۔ ہر ایک نے باری باری اپنی دانشوری کو آزمایا، لیکن بہادر حبشی نے ان سب کو شکست دی۔ بالآخر شاہزادہ شاہجہان دکن بھیجا گیا دو جنگوں کے بعد اپنے اس خاندانی وقار کو بحال کرنے میں وہ کامیاب ہوا جو اس کے بغاوت کے زمانے میں دوبارہ کمزور ہو گیا تھا۔ ملک عنبر کا انتقال ۱۶۲۶ء میں ہوا اس وقت مغل کے دکنی مقبوضات میں خاندیش، برار، قلعہ احمد نگر اور بالاگھاٹ کے حصے بھی شامل تھے۔

مرتضیٰ ثانی اور فتح خاں

ملک عنبر کی جگہ اس کے لڑکے فتح خان نے لے لی۔ لیکن مرتضیٰ ثانی کو اس پر اعتماد نہ تھا۔ غلط فہمی اس وقت زیادہ ہوئی جب فتح خان، خان جہاں کو گرفتار نہ کرسکا۔ اگر آخرالذکر کو اس وقت شاہجہاں کے تعاقب کی بھاگ دوڑ اور شدید برسات نے خستہ حال کر دیا تھا۔[12] دارالسلطنت میں جب وہ واپس آیا تو مرتضیٰ ثانی نے اسے ستارا کے قلعہ میں قید کر دیا لیکن فتح خان نے پہرہ دار کو رشوت دے کر راہ فرار اختیار کی۔ سیدھے احمدنگر کے مغل سپہ سالار، سپہ دار خان کے یہاں پہنچا۔ یہاں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔[13] جلد ہی ایک زبردست فوج تیار کرکے وہ مرتضیٰ ثانی سے جنگ کرنے کو بڑھا۔ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہو گیا۔ اس بار اس کو قلعہ دولت آباد میں قید کیا گیا۔ مرتضیٰ ثانی نے مقرب خان کو سپہ سالار مقرر کیا اور اخلاص خان کو پیشوا۔[14]

خان جہاں کی دغابازی

مہابت خان کی بغاوت اور جہانگیر کے بعد نور جہاں و آصف خان کی حاسدانہ رقابت سے جو مغلیہ سرکار میں ہلچل پیدا ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر جب مرتضیٰ ثانی، خان جہاں نائب سلطان کو ملانے میں کامیاب ہوا۔ آخرالذکر بالا گھاٹ اور دکن کے دوسرے مغلیہ مقبوضات سے دستبردار ہو گیا۔ مغلوں کی قلمرو، اب صرف قلعہ تک محدود رہ گئی جس کو سپہ دار خان نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا، تو اس نے خان جہاں کو دکن کی نظامت پر مستقل کرکے حکم دیا کہ کھوئے ہوئے علاقے واپس لیے جائیں۔ لیکن آخرالذکر دفع الوقتی سے کام لیتا رہا اس لیے اُسے معزول کر دیا گیا۔ اس کی جگہ زیادہ پُرجوش افسر خان زماں، مہابت خان کو تعینات کیا گیا۔

لیکن ناظموں کی تبدیلی سے بھی صورت بہتر نہ ہوئی۔ حسب معمول مہم اور گفت و شنید کا سلسلہ دکن میں جاری رہا۔ علاوہ بریں مغلوں کی مداخلت بیجا کی روک تھام کے لیے مرتضیٰ ثانی کی امداد اس کے پڑوسی کرتے رہے۔ احمدنگر کا وجود بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں کے لیے بہت اہم تھا باوجود دونوں کی باہمی دشمنی کے ہم دیکھتے ہیں کہ مشترکہ دشمن سے جنگ کرنے میں ایک بار سے زیادہ دونوں متحد ہو گئے تھے لیکن یہ جتھے زیادہ تر وقتی تھے بنتے ہی بگڑ بھی گئے۔ شکوک، دھمکیاں۔ اگر سالمیت کے لئے نہ سہی مگر ظاہری ٹھاٹ باٹ برقرار رکھنے میں احمدنگر کی امداد بیجاپور اور گولکنڈا دونوں نے کی۔ اوّل الذکر کا ہاتھ اس مد میں زیادہ تھا در اصل یہی خارج الاصل امداد نے احمدنگر کے آخری اختتام کو عرصہ تک چلا یا۔

خان جہاں کی بغاوت

خان جہاں کو ہٹا کر فوراً ارادت خان[15] کو دکن کا ناظم بنایا گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد خان جہاں مغلیہ دربار سے بھاگ کر مرتضیٰ ثانی کے پاس پناہ کے لیے پہنچا۔ اس کی دولت آباد پہنچتے اور گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم نے شاہ جہاں کے لیے صورت حال ناقابل برداشت

بنا دی۔ مغل سلطنت پر دو طرح سے شبہ پڑنے لگی۔ نظام شاہ نے خفیہ طور پر بالاگھاٹ قبضہ میں کر لیا۔ اور اب علانیہ خان جہاں کی امداد کر کے شاہی اقتدار کو پیام جنگ دے رہا تھا۔ شاہجہاں کے لیے مناسب اور ضروری وقت آگیا کہ مرتضیٰ خاں کی بے باکی پر سبق دے۔ احمد نگر کا وجود اب قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

احمد نگر کی سلطنت کا رقبہ شاہ جہاں کے منصوبے

اس وقت اورنگ آباد کا پورا صوبہ جالنا، ناسک، تا گلانا اور ضلع کلیان سب اس کے حدود اربعہ میں تھے، اس ناہموار ملک کی جغرافیائی شکل دکینوں کے لیے کار آمد تھی کیونکہ ان لوگوں کی تربیت خاص طور سے چھاپہ ماروں کی حکمت عمل کے نمونے پر ہوئی تھی۔ اچانک حملے مغل فوج کے لیے شب خون کی طرح تھے۔ ان لوگوں کی تیزی اور ہوشیاری نے شاہی سپہ سالاروں کو چکر میں ڈال دیا۔ میدان جنگ کی اس ناموافق فضا کو دیکھ کر شاہجہاں نے منصوبہ بنایا کہ دشمنوں کو کثرت تعداد سے زیر کیا جائے اور ان کے مختلف فوجی اڈوں پر بیک وقت حملے کیے جائیں۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی فوج اعظم خان (ارادت خاں) کی ماتحتی میں اس قصد سے روانہ کی کہ وہ بالاگھاٹ میں داخل ہو کر خان جہاں کو مغلوب کر دے۔ دوسری فوج خواجہ ابوالحسن کی سرکردگی میں ناسک اور سنگمنیر کی غارت گری و تسخیر کے لیے بھیجی گئی۔ ایک اور فوج ناصری خان کی قیادت میں تلنگانہ کی طرف مشرق[2] بھیجی گئی۔

مرہٹوں کی عزت افزائی

شاہی فوجی حکومت میں ایک اہم تحریک یہ ہوئی کہ اپنے فوجی مرہٹہ افسروں کا اعزاز بڑھایا جائے یہ رویہ نظام شاہ کے فوجی افسروں کے لیے ایک طرح کا دعوت نامہ تھا کہ وہ بھی اپنی فوج چھوڑ کر ادھر چلے آئیں اور نظام شاہ کی فوج کمزور ہو جائے چنانچہ شاہ جہاں کے دکن آتے ہی کھیلوجی، مالوجی اور اُداجی رام دکھنی، حضوری میں پیش کیے گئے اور شہنشاہ نے ان کو اعزاز و خطابات سے سرفراز فرمایا[1]۔ بعد ازاں بد دیانت، جادیو راؤ کے اعزاز بھی دربار شاہ میں حاضر ہوئے ان کو بھی اعزاز بخشا گیا[2]۔ مسلمان افسروں میں جو ادھر سے ٹوٹ کر مغلیہ فوج میں آئے ان میں آتش خان، یاقوت خان اور خداوند خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

دھارور کی تسخیر

اعظم خان نے مہم کی ابتدا نظام شاہیوں کی ایک سخت شکست سے کی۔ اس نے خان جہاں کو احمد نگر سے مار بھگایا اور دھارور کا محاصرہ شروع کیا۔ یہ مقام محاذ جنگ کے لیے اہم تھا کیونکہ اس کی سڑک پار بالاگھاٹ تھا۔ شاہی فوج نے مخالفوں کی تعداد کم کرنا شروع کی۔ دراڑوں کی آڑ سے بندوق چلانے والوں کو نشانہ بنالیا۔ اتفاق سے اسی عالم میں ایک توپ فصیل سے گر پڑی۔ اس اتفاق نے محافظ فوجی دستے کو اور بھی کم ہمت بنا دیا۔ جب حملہ آوروں کا ایک دستہ سیڑھی اور کمند کا

سہارا لیتے ہوئے فصیل پر پہنچنے میں کامیاب ہوا تو محافظ دستہ کے سرغنہ سیدی سلیم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے فوراً ہار مان لی۔

پارنداکی غارت گری

پارنداکی تسخیر کے بعد اعظم خان نے رن دولاخان سے مصالحت کی بات چیت میں بے کار وقت ضائع کیا۔ رن دولاخان عادل شاہی فوج کا سپہ سالار تھا۔ ان اطراف میں وہ سرحدوں کی نگرانی کرنے آیا تھا۔ یہ افواہ سن کر کہ خواص خان بیجاپور کے آمر خان کا زادہ نظام شاہ کی ہمدردی کا پہلو لیے ہوئے ہو اعظم خان نے شہنشاہ سے کمک کی درخواست کی۔ اس کے فوراً بعد ہی اس کو آصف خان کا حکم ملا کہ شیخ معین الدین اور شیخ محی الدین کو بہ حفاظت محفوظ راستہ سے یہاں تک پہنچانے کا انتظام کردے۔ یہ ہر دو شیوخ بیجاپور اور گولکنڈہ سے سمجھوتے کر آرہے تھے، دکنیوں کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے طے کیا کہ پارندا پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالے۔ اس نے جے سنگھ اور ملتفت خان کو شہر اور مضافات کی غارت گری کے لیے روانہ کیا۔ شاہ پرستوں کو مال غنیمت بہت کچھ ملا۔ اس میں سات ہاتھی بھی ہاتھ آئے۔

احمد نگر اور بیجاپور میں مصالحت

پارنداکی غارت گری اور شاہی فوج کے قرب نے مقرب خان کو بدحواس کردیا بڑی گرم جوشی سے رن دولاخان سے امداد کی درخواست کی۔ اس نے احمد نگر کی خستہ حالی کا ذکر کیا اور لکھا کہ حقیقت میں احمد نگر کا وجود ختم ہوگیا ہے کیونکہ سارا ملک مغلوں کے قبضے میں آگیا ہے۔ ناسک اور سنگم نیر دونوں کو ابوالحسن نے لوٹ کر قبضے میں کرلیا ہے۔ رخبار جاکن اور پونا اب شاہ جی کے ہاتھ میں ہیں، جو فی الحال مغلوں کا حلیف ہے دھاڑ ختم ہوچکا ہے کارندھار بھی قریب الفتح ہے اور دولت آباد کے اردگرد شدید قحط کا غلبہ ہے اس کے علاوہ مقرب خان نے لکھا کہ اگر پارندا کو بھی مغلوں کے ہاتھوں جانے دیا گیا تو نظام شاہی خاندان کا خاتمہ مکمل ہوجائے گا۔ اس نے رن دولا کو آگاہ کیا کہ اگر وہ یہ ہونے دیتا ہے تو گویا بیجاپور کے مسخر ہوجانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔

پارنداکا ناکام محاصرہ

رن دولاخان اور مقرب خان کے خط و کتابت کی خبر اعظم خان کو برابر ملتی رہی جب یہ بات اس پر پوری طرح واضح ہوگئی کہ دونوں میں صلح ہوگئی ہے اور خواص خان نے رن دولا کو حکم دے دیا ہے کہ وہ مقرب خان کی امداد کرے۔ اعظم خان نے اپنی جگہ پر طے کیا کہ پارندا پر دھاوا کردیا جائے۔ اس نے فوراً محاصرہ شروع کردیا یہاں تک کہ اس نے کمک کے آجانے کا بھی انتظار نہ کیا قلعہ تین طرف سے گھیر لیا گیا۔ مختلف فوجی دستے کی ذمہ داری متعدد افسروں میں تقسیم کردی گئی۔ ایک سخت لڑائی کے بعد قلعہ کی خندق تک رسائی حاصل ہوئی۔ شاہی فوج نے خندق بھرنا شروع کردی۔ محافظ فوجی دستہ

نے اپنی مصیبت میں مقرب خان سے امداد کی درخواست کی۔ اس نے دشوجی کو حکم دیا کہ محاصرہ کرنے والے لشکر پر حملہ کر دے۔ اس نے حملہ کر دیا۔ مگر واپس ہونا پڑا۔

اس اثنا میں مغل فوجوں کی رسد میں کمی ہو گئی۔ ضروری ہو گیا کہ چارہ تلاش کرنے والوں کی ٹولیاں بنا کر ان اضلاع میں بھیجی جائیں جو یہاں سے کچھ دور ہیں۔ اس کارگزاری نے دکھنیوں کو اچھا خاصا موقع چارہ جمع کرنے والوں کو پریشان کرنے کا فراہم کر دیا۔ چنانچہ ایک ایسے وقت پر جب ملتفت خان اور خداداد خاں فوجی دستہ کے ساتھ ایندھن اور چارہ لے کر واپس آ رہے تھے مقرب خان نے ان پر دھاوا کر دیا لیکن اعظم خان کی بروقت آمد نے صورت حال بدل دی۔ دشمنوں کو زبردست خسارہ اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ چھ سو اونٹ اور دو سو گھوڑے اور بہت سے بیل مال غنیمت میں شاہی فوج کے ہاتھ آئے۔

لیکن بایں ہمہ ان صبر آزما حالات میں محاصرہ برقرار رکھنا نا ممکن تھا۔ مغلوں کو شدید قحط کا بھی سامنا تھا اور دشمن ان کو اپنی جگہ سے ذرا بھی ہٹنے نہ دیتے۔ بیجاپور کے عملی اتحاد سے نظام شاہی قوت دو دنی ہو گئی تھی۔ علاوہ ان دقتوں کے ایک بڑی پریشانی یہ تھی کہ جس کمک کے آنے کی امید کی جاتی تھی وہ بھی نہ آئی۔ اس لیے اعظم خاں کو مجبوراً پرندا سے ہٹنا پڑا۔ وہ دشمنوں کے نرغہ میں دھارور کی طرف واپس ہوا۔ راستہ میں بیک وقت اس کے آگے پیچھے دونوں طرف سے اتحادی حملے کرتے رہے، بڑے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے وہ منزل مقصود پر پہنچا۔

کندھار کی تسخیر دھارور میں کچھ دن آرام کرنے کے بعد اعظم خان نے اپنی مہم کی تجدید کی۔ اس نے ایک اچانک حملہ نظام شاہی افسر بہلول نامی پر کیا۔ بہلول، رندولا سے الگ ہو گیا تھا۔ اعظم خان کو اس مہم میں نو سو گھوڑے دو سو اونٹ اور بے شمار بیل مل گئے اس کے بعد وہ احمداباد آیا۔ اتحادی کاندھار کو چھٹکارا دلانے کے لیے چل پڑے۔ لیکن اعظم خان نے کامیابی سے ان کے راستے بند کر دیے۔ برخلاف اس کے ناصری خان جو جانبازی سے کاندھار کا محاصرہ کر رہا تھا۔ اس نے دکنی افسر سفراللہ خان کے اچانک حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ قلعہ کے نیچے خندقوں میں سرنگ بچھانے کا کام جاری تھا۔ ۹ مختلف سرنگوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ منجملہ چھ مکمل ہو گئی تھیں۔ اعظم خان کے پہنچنے پر تین سرنگوں میں آگ لگائی گئی۔ ایک بے کار ہوئی۔ بقیہ دو نے فصیل کے باہر کی دھس کو تباہ کر دیا ساتھ ہی ساتھ نصف فصیل بھی اڑا دی گئی۔ قلعہ کی محافظ فوج برابر آتشباری کرتی رہی لیکن حملہ آور بڑھتے رہے یہ سلسلہ جنگ دوپہر سے غروب آفتاب تک جاری رہا لیکن قلعہ میں کوئی شگاف کرنا ناقابل عمل تھا اس لیے حملہ آور مجبوراً واپس ہوئے۔ رات میں خندقوں کا کام شروع کیا گیا۔ بقیہ تین سرنگوں میں

آگ لگانے کی تیاری ہوئی۔ قلعہ کے محافظ دستہ نے جب دیکھا[30] کہ اب بغیر ہتھیار ڈالے کوئی چارہ نہیں، تو شرائط کے ساتھ ہار مان لی شاہی فوج نے ۰ ر مئی ۱۶۳۱ء کو قلعہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔

شاہی فوجیں مغربی اضلاع میں

احمد نگر کی مغلیہ مہم کی مکمل تصویر پیش کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دو افسروں کی کارگزاری کا بھی ذکر کیا جائے جو برار اور ناسک بالترتیب بھیجے گئے تھے۔ وزیر خان نے دشمنوں سے بہت جلد برار خالی کرا لیا۔ اس کے بعد وہ برہان پور چلا آیا لیکن ابوالحسن کا کام آسان نہ تھا۔ فرمان شاہی کے مطابق اس نے اپنے ماتحت افسروں کو گانا اور نہوار کے محلات لوٹنے کے لیے بھیجا۔ مرتضیٰ ثانی نے محل دار خان اور دادا پنڈت کو حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے بھیجا لیکن وہ ہار گئے شاہی فوج نے سنگم نیر تک ان کا پیچھا کیا۔ تخت نشینی کے سال ختم ہونے تک ابوالحسن نے ناسک اور سنگم نیر پر قبضہ کر لیا۔ اسے حکم ملا کہ ناسک شاہ جی کے سپرد کر دے کیونکہ اب وہ مغلوں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ناصری خاں[31] کی امداد کے لیے روانہ ہو جائے۔

احمد نگر میں انقلاب

ہنوز یہ وسیع ہو . . . کو تباہ کر رہی تھیں کہ نظام شاہی دربار کے ایک انقلاب نے سلطنت کی ب ی پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی۔ اب تک مقرب خان نے مغلوں کی روک تھام قائم رکھی تھی لیکن اس کی کارگزاریوں سے مرتضیٰ ثانی مطمئن نہ تھا۔ علاوہ بریں وہ اپنی بیوی[32] کی اس فرمائش سے بے حد پریشان تھا کہ اپنے سالے فتح خان کو رہا کر دے۔ بیوی کہتی تھی کہ وہ صورت حال میں قابل قبول تبدیلی پیدا کر دے گا۔ اس کو خوش کرنے کے لیے مرتضیٰ ثانی نے فتح خان کو آزاد کر دیا اس کو وکیل اور پیشوا کے عہدہ پر بحال کر دیا۔ لیکن فتح خان کی بحالی نے بجائے کسی سرگرمی پیدا کرنے کے جو کچھ مغلوں کے خلاف ہو رہا تھا اس کو بھی ختم کر دیا۔ دوسری طرف مقرب خان اپنی معزولی پر دل برداشتہ ہوا۔ اعظم خاں کے ذریعہ اس نے شاہی ملازمت کر لی اس کو رستم خان کا خطاب[33] دیا گیا

مرتضیٰ ثانی کی اسیری اور قتل

فتح خان نے مرتضیٰ ثانی کی بے اعتمادی ابھی دل سے دور نہ کی تھی اس نے فوراً موقعہ ملتے ہی بادشاہ کو تخت سے اتار کر قید خانے بھیج دیا۔ اس نے شاہ جہاں کو لکھا کہ میں آپ کی اطاعت قبول کرنے پر تیار ہوں۔ اس کو ہمت افزا جواب ملا لیکن اس کے خلوص کی صداقت کے لیے اپنے قیدی کو قتل کرنے کی شرط بھی لگا دی گئی۔ اس کو پورا کرنے کے لیے فتح خان نے مرتضیٰ ثانی کو مجبور کیا کہ وہ زہر کا پیالہ پی لے۔ مشہور یہ کیا کہ وہ اپنی فطری موت سے مرا۔ مرتضیٰ کی جگہ اس نے حسین کو تخت پر بٹھایا[34]۔ یہ دس برس کا لڑکا تھا۔

فتح خان کی اطاعت

شاہ جہاں نے فتح خان کو حکم دیا کہ وہ نظام شاہ کے سارے جواہرات اور ہاتھی حاضر

کرے۔ لیکن فتح خان نے تعمیل ارشاد میں دیر لگائی اس لیے شہنشاہ نے رستم خان اور وزیر خان کو حکم دیا کہ دولت آباد پر حملہ کردیں۔ فتح خان چونک پڑا اور ابوالفتح کو اپنی طرف سے معافی مانگنے کے لیے بھیجا۔ اسی درمیان میں عبدالرسول دربار پہنچا۔ اس نے شہنشاہ کو تیس ہاتھی نو گھوڑے اور آٹھ لاکھ روپے کی مالیت کے جواہرات نذر کیے[۱]۔ فتح خان نے شاہجہاں کا خطبہ پڑھا سکہ جات پر اس کا نام کھدوایا۔ شاہجہاں مطمئن ہوا اور ۶ مارچ ۱۶۳۲ء کو برہان پور چھوڑ دیا۔

شاہ جہاں کا شمالی ہند واپس آنا احمد نگر کی تسخیر کی پہلی منزل کا ختم ہونا تھا۔ لیکن جو نتائج حاصل ہوئے تھے ان میں اب تک استقلال نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ خان جہاں کی بغاوت ختم کی گئی۔ بالا گھاٹ واپس لیا گیا۔ مغلوں کی برتری بحال ہوئی لیکن حقیقی امن و سکون اب تک قائم نہ ہو سکا۔ بے اطمینانی کی آگ ابھی سلگ رہی تھی۔ اب تک جنار اور آس پاس کے اضلاع میں شاہ جی کی حکمرانی تھی۔ مغلوں کی طرف اس کا رجحان اچھا نہ تھا۔ علاوہ بریں فتح خان کی وفاداری ابھی تک مشکوک تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں چھوڑنا زبردست غلطی تھی۔ اس سلسلہ کی آخری بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بیجاپور اپنے مفاد کے پیش نظر احمد نگر کی حکومت کو زندہ کرنے کے لیے امداد کرنے کو تیار تھا۔

شاہ جہاں کی واپسی کے اسباب

یہ بات بالکل واضح ہے کہ شاہ جہاں پوری طرح صورت حال سے واقف تھا۔ آصف خان کو دکن کی نائب سلطانی پیش کرنا اس مصلحت سے تھا کہ سب سے زیادہ بااثر افسر کو وہاں بھیجا جائے۔ لیکن آصف خان نے اس اعزاز کو قبول نہ کیا۔ اس کے بعد شاہجہاں کی نظر انتخاب مہابت خان پر پڑی جو تجربے کار سپاہی بھی تھا اور مغلیہ فوج کا سپہ سالار بھی۔ شاہجہاں کی شمال کی واپسی دو خاص وجہوں سے ہوئی۔ پہلی یہ تھی کہ شدید قحط نے اس کے جملہ ذرائع مجروح کر دیے۔ اس کے آدمیوں کو بے چین کر دیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کی وفات کا اس پر زیادہ اثر ہوا کہ وہ دکن سے بیزار ہو گیا۔ اب وہاں قیام نہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ انسانی کمزوری اس موقعہ پر غالب آئی ورنہ شاذ و نادر ہی اس نے معاملات کو نامکمل چھوڑا ہوگا۔

گالنا کی تسخیر

خان زماں کو حکم ملا کہ اپنے باپ کے پہنچنے تک وہ بحیثیت قائم مقام فرائض ادا کرتا رہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی پر اس کی آنکھیں بڑی تیزی سے کام کر رہی تھیں۔ بادشاہ کے چلے آنے پر خان زماں کو خبر ملی کہ گالنا کے سپہ سالار محمود خان کی وفاداری سے الگ ہو کر سوچ رہا ہے کہ قلعہ شاہ جی کو سپرد کر دے۔ آخر الذکر بھی مغلوں کا جانی دشمن تھا۔ خان جہاں نے میر قاسم ہروی آتنگ کے مغلیہ سپہ سالار کو اس کام کے لیے بھیجا کہ وہ محمود خان کو ترغیب و تدبیر سے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ قلعہ

شاہ پرستوں کے سپرد کر دے۔ میر قاسم اس سے دلفریب وعدے کرتا رہا۔ محمود خان نے شاہ جی کے نمایندوں کو برطرف کر دیا۔ اپنے لڑکوں منظفر اور منصور کو اپنے وکیل قاضی ابو الفضل کے ساتھ خان زمان کے پاس بھیجا۔ آخر الذکر نے بڑی عزت سے ان کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے ان کو منصب عطا کرنے کی سفارش کی۔ شاہ جہاں نے محمود خان کو چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور کالنا کے قلعہ پر خان زمان نے قبضہ پالیا۔

دولت آباد کی تسخیر

دکن پہنچنے پر مہابت خان نے اپنے کو ایک پیچیدہ صورت حال سے دو چار پایا۔ شاہ جی نے جب شاہ جہاں کی اطاعت قبول کی تھی تو کئی محلات ایسے عطا کیے گئے تھے جو فتح خان کی ذاتی ملکیت میں تھے۔ لیکن جب آخر الذکر نے اطاعت قبول کی، تو اس کو وہ جائداد پھر دے دی گئی۔ اس نئے انتظام سے شاہ جی آزردہ ہوا۔ اب وہ مغلوں اور فتح خان دونوں سے خفا تھا۔ فتح خان کی عوامی نامقبولیت کا فائدہ اٹھا کر اس نے عادل شاہ کے ایک بااثر وزیر مراری پنڈت سے بات چیت شروع کی۔ اسی پنڈت کی وساطت سے محمود عادل شاہ کو آمادہ کیا کہ وہ دولت آباد کی فتح کے لیے ایک بڑی فوج بھیج دے۔ شاہ جی اور عادل شاہیوں کی متحدہ کوشش اور اپنے افسروں کی ناآسودگی نے فتح خان کو چونکا دیا۔ اس نے مہابت خان سے درخواست کی کہ وہ اس کو اور دولت آباد کو دشمنوں کے پنجہ سے بچائے۔ مہابت خان نے فوراً لبیک کہا اپنے لڑکے خان زمان کو فتح خان کی امداد کے لیے بھیج دیا۔

شاہی فوج کا آگے بڑھنا اور ان کے روکنے کی کوشش کی ناکامی سے متاثر ہو کر عادل شاہی سپہ سالار رندولا خان نے فتح خان سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ تین لاکھ ہن اس کو دے گا اور قلعہ کو رسد سے بھر دے گا بشرطیکہ فتح خان اپنی وفاداری کا رخ بدل دے۔ رندولا خان نے فتح خان پر یہ بات اور واضح کر دی کہ مغل بادشاہ اس کی امداد کی بہ نسبت قلعہ پر قبضہ کرنے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ فتح خان اس کی باتوں میں آگیا اور شاہی فوج سے ناتا توڑ لیا۔ جب اس فریب کاری کی اطلاع مہابت خان کو پہنچی تو اس نے خان زماں کو حکم دیا کہ رندولا خان اور فتح خاں کا رابطہ منقطع کر دے اور دشمن جو نظام پور میں پڑا ہے اسے مار بھگائے ساتھ ہی ساتھ دولت آباد کا محاصرہ بھی شروع کر دے۔

اس اثناء میں مہابت خان نے وسیع پیمانے پر اپنے لڑکے کی امداد کی۔ بالاگھاٹ میں اپنے پیش رو افسروں کی ناکامی سے سبق لیتے ہوئے مہابت خان نے پہلا کام یہ کیا کہ غلہ کی رسد پہنچانے کا مکمل انتظام کیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے شمالی ہند کے بنجاروں کو ہموار کیا۔ ان کو ہاتھی گھوڑے اور اعزازی خلعت بخشے۔ ان کی امداد سے اس نے آگرہ اور گجرات سے رسد بھیجنے کا ایسا سلسلہ قائم کیا جو ہر خطرہ سے پاک تھا۔ اس وقت آگرہ اور گجرات غلہ کی برآمد کے دو خاص مرکز تھے۔

انتظامات کی تکمیل سے مطمئن ہونے پر مہابت خان برہان پور سے چلا اور یکم مارچ ۱۶۳۳ء کو دولت آباد پہنچا۔ قلعہ کا محاصرہ اب پُرزور طریقے پر کیا گیا۔ مختلف فوجی محاذ پر توپیں لگائی گئیں۔ خوفزدہ ہوکر فتح خان نے حسین نظام شاہ کو کالاکوٹ بھیج دیا خود مہاکوٹ میں رہ گیا۔ عنبرکوٹ دولت آباد کے دوسرے قلعہ جات کو اس نے مستحکم کیا۔ اپنے دکنی افسروں کی مکاری اور رندولا خان شاہ جی کی شرپسند حرکتوں سے نڈر ہوکر مہابت خان نے عنبرکوٹ کو گھیر لیا اور فتح بھی کر لیا۔ بعدازاں وہ مہاکوٹ کی طرف بڑھا۔

باوجود شاہی فوجوں کے ہاتھ سے متعدد شرمناک شکست پانے کے رندولا خان اور شاہ جی نے ایک بار اور تہیہ کیا کہ محصور فوج کو غلّہ پہنچادیں کیونکہ وہ فاقہ کر رہی تھی۔ مردار جانوروں کی ابلی ہوئی کھال اب ان کی واحد غذا تھی۔ اس لیے غلہ کے تین ہزار بورے ان کو کرناٹک کے بندوقچیوں کی حفاظت میں بھیجا گیا۔ مہابت خان نے ناصری خان کو حکم دیا کہ غلہ کے محافظ دستے پر حملہ کردے اور رسد پر قبضہ کرے۔ محافظ بندوقچی بغیر لڑے ہوئے بھاگ گئے اور شاہی فوج سامان لے کر اپنی قیام گاہ پر آگئی۔

ان حالات میں مراری پنڈت بیجاپور سے تازہ دم فوج لے کر آگیا۔ اس کی آمد سے رن دولا خان کی ہمت بڑھ گئی۔ چنانچہ کھڑکی اور دولت آباد کے درمیان اس کی نقل وحرکت تیز ہوگئی۔ اس نے کوشش کی کہ مغلیہ فوج کو چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تب ان ٹکڑوں کو شکست دی جائے۔ مگر مہابت خان کی چوکسی نے مغلیہ فوج کو رن دولا خان کے پھندے سے بچا لیا۔ اسی درمیان میں مہاکوٹ کے قلعہ میں ایک سُرنگ مکمل ہوگئی۔ مہابت خان نے فیصلہ کیا کہ اس میں آگ لگا دی جائے۔ فتح خان پریشان ہوگیا۔ اس نے مہابت خان سے وقفہ کی درخواست کی لیکن جواب میں مہابت خان نے کہلا بھیجا کہ بطور یرغمال نیک چلنی کے ثبوت میں اپنے لڑکے کو بھیجدو۔ جب فتح خان اس مطالبہ کو پورا کرنے میں دفع الوقتی سے کام لینے لگا تو مہابت خان نے حکم دے دیا کہ سرنگ میں آگ لگا دی جائے۔ دھماکہ سے ایک برج اور پندرہ گز قلعہ مسمار ہوگیا۔ شاہی فوج نے اس شگاف سے حملہ کرکے مہاکوٹ کا قلعہ قبضے میں کر لیا۔

مہاکوٹ کی تسخیر اور محافظ دستہ کی مصیبتوں سے مراری کا نہ بچا سکنا فتح خان کو بے انتہا مایوس کن ہوا۔ وبائی بیماری کی ہنگامہ خیزی نے مزاحمت کا سوال باقی نہ رکھا۔ فتح خان نے اپنے لڑکے عبدالرسول کو اپنی طرف سے مہابت خان کے پاس اپنی موجودہ عیارانہ چال چلن کی معافی کے لیے بھیجا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ درخواست بھی کی کہ قلعہ خالی کرنے کے لیے اسے ایک ہفتہ کی مہلت دی جائے۔ مہابت خان نے اس کی درخواستیں منظور کرلیں بلکہ پندرہ لاکھ روپیہ بھی فتح خان کو دیا کہ قلعہ سے جانے میں اس کے اخراجات کی مدد ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس نے فتح خان کے استعمال کے لیے ہاتھی اونٹ اور دوسرے باربرداری کے

سامان بھی دیے۔ منظور شدہ معاہدہ کے لحاظ سے فتح خان نے ایک ہفتہ کے بعد قلعہ خالی کر دیا اور شاہی فوج نے ۱۷ر جون ۱۶۳۳ء میں اپنا قبضہ جمالیا۔[۴۲]

دولت آباد کو ناصری خان، سید مرتضیٰ وغیرہ کے سپرد کر کے مہابت خان ظفر نگر چلا گیا۔ راستے میں عادل شاہی اس کے میمنہ یا میسرہ پر منڈلاتے اور پریشان کرتے رہے۔ جب وہ ظفر نگر کے قریب پہنچا، تو مراری پنڈت کا فرستادہ فرہاد خان اس کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ صلح کی بات چیت کرلے لیکن اس نے بغیر گفتگو کے قاصد کو واپس کر دیا[۴۳]۔ ظفر نگر میں اس نے اپنے سپاہیوں کو آرام کرنے کی اجازت دی۔ اس درمیان میں دشمنوں نے دولت آباد واپس لینے کی جان پر کھیل جانے والی آخری کوشش کی۔ انھوں نے سوچا کہ ناصری خان اور اس کے سپاہی تھک گئے ہیں اور دفاعی تعمیرات بے مرمت پڑی ہیں اس لیے قلعہ بآسانی ان کے حملوں سے زیر ہو جائے گا۔ لیکن ناصری خان اس موقع پر بھی مرد میدان ثابت ہوا۔ قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں پر حملے کرتا رہا۔ ان کو شدید نقصانات پہنچائے۔ مہابت خان بھی ظفر نگر سے آگے بڑھا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن بھاگ کھڑے ہوئے[۴۴]۔

مہابت خان کی باثر کارکردگی

دولت آباد کی مہم اور اس کی تسخیر احمد نگر کے الحاق کی دوسری منزل کی نشاندہی کرتی ہے۔ حملے سست رفتار تھے کبھی کبھی مغلیہ فوج کے دکھنی ملازموں کی فریب کاری بھی پیچیدگی پیدا کر دیتی۔ لیکن مہابت خان کی زبردست مستقل مزاجی اور سوجھ بوجھ بڑے کام آئی۔ بڑی سے بڑی دقتوں پر وہ غالب آیا، ناموافق حالات میں بھی کامیابی حاصل کرتا رہا۔ اس موقع پر اس کی غیر معمولی فوجی فراست انتہائی نقطۂ عروج پر نمایاں ہوئی۔ بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے اس نے خطرناک مواقع کا پتہ لگایا۔ اپنے کو مضبوط کر کے دشمنوں کے منصوبے بیکار کر دیے۔ بعض اوقات اس کو بےشمار ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن حالات کو کبھی بے قابو نہ ہونے دیا۔ مراری اور رندولا خان اور شاہ جی نے ہر ایسی کوشش کی جو دباؤ سے اس کے مقصد کو ختم کرنے کے لیے وہ کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر پورے استقلال سے قائم رہا۔ جو فتح اس کو حاصل ہوئی اس لحاظ سے عدیم المثال ہے کہ اس کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس سے پیشتر کبھی کسی مغلیہ سپہ سالار نے ایسی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظاہرہ دکن میں نہ کیا تھا۔

دولت آباد کی تسخیر کی خبر ایک ہفتہ میں شاہ جہاں کو مل گئی۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ مہابت خان کے لیے اس نے خلعت اعزاز ایک مرصع تلوار دو گھوڑے جس میں ایک کا ساز و سامان نقرئی اور دوسرے کا طلائی، ایک نر ہاتھی جس کی ہودج کا کنارہ مخمل اور ایک مادہ ہاتھی بھیجے، ایک اعزازی خلعت ایک گھوڑا

اور ایک ہاتھی خان زماں کو عنایت کیے گئے۔ ناصری خان کو خان دوراں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ دوسرے افسروں کو بھی انعام واعزاز حسب قابلیت عطا ہوئے۔

فتح خان کی سابقہ فریب کاریوں نے مہابت خان کو مشکوک کر دیا تھا۔ برہان پور پہنچ کر اُس نے اسے حراست میں لے لیا۔ شاہ جہاں نے مہابت خان کو حکم دیا کہ قیدی اسلام خان کی سرکردگی میں یہاں بھیج دیا جائے۔ آخرالذکر گجرات سے شمال جا رہا تھا۔ فتح خان اور حسین نظام شاہ ۲۱ ستمبر ۱۶۳۳ء کو آگرہ پہنچے آخرالذکر قید خان جہاں کے سپرد کیا گیا کہ گوالیار کے قلعہ میں اسے قید کیا جائے یہاں (بہادر نامی اسی خاندان کا ایک دوسرا شخص بھی تھا) جو احمد نگر کی فتح کے وقت قید کیا گیا تھا اور اب یہاں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا فتح خان کے جرائم نظر انداز کیے گئے اس کو جاگیریں واپس کر دی گئیں۔ دو لاکھ روپیہ سالانہ اس کے گزارے کے لیے مقرر کیے گئے[۲۲]۔

اگرچہ دولت آباد پر قبضہ ایک اشارہ فتح تھی۔ لیکن پھر بھی تسخیر احمد نگر کی آخری منزل نہ ثابت ہوئی نہ مفتوحہ علاقہ میں سکون و امن قائم ہوا۔ بلکہ برخلاف اس کے فوجی قبضہ کی وجہ سے بہت سی برائیاں ملک میں پیدا ہوئیں۔ علاوہ بریں ایسے علاقے ہر وقت موجود اور چکر میں ڈالنے والے دشمن کے ہاتھوں میں تھے مغربی اضلاع خاص کر جنار، پونا، چاکن اور "کون کن" مغل اقتدار سے باہر تھے۔ اس علاقہ میں مرہٹہ کی مستقبل حکومت کے بیج بوئے جا رہے تھے جنوب میں ادگیر اور اوسا ان نظام شاہی حکام کے قبضے میں تھے، جو نئے آنے والوں کے سپرد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انتشار کا مرکز پارندا تھا جو کبھی نظام شاہ کی ملکیت تھا لیکن اب عادل شاہی حکام کے قبضے میں تھا۔

شاہ جی کی نقل و حرکت

مہابت خان نے ایک اور فیصلہ کن کوشش اس کے فتح کرنے کی کی لیکن وہ ناکام ہوا اور شکستہ دل ہو کر مر گیا۔ شاہ جی نے اپنی نقل و حرکت نظام شاہی خاندان کی تجدید کے لیے پھر شروع کی۔ اس سلسلے میں اُس کو نمایاں فائدہ یہ تھا کہ شاہی فوج کمزور تھی۔ شاہزادہ شجاع پہلے ہی جا چکا تھا۔ خان دوراں بھی مالوہ واپس ہو گیا تھا۔ اب مشکل ہی سے کوئی ایسا لائق رہنما رہ گیا تھا جو دکنیوں کی روک تھام یا ان کو مرعوب کر سکے۔ مرتضیٰ خان دولت آباد کا ناظم تھا اور اللہ وردی خان پیانی گھاٹ کا، اگرچہ یہ دونوں اپنی ذاتی بہادری کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایک سپہ سالار کی خصوصیات کی شہرت نہ رکھتا تھا وہ ہمیشہ ماتحتوں کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ کبھی آزاد سپہ سالار نہ تھے۔ برخلاف اس کے شاہ جی یقیناً زیادہ سوجھ بوجھ کا آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمت میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کم رہا ہو۔ علاوہ بریں وہ دکھنی تھا اپنے اہل وطن کی ہمدردی نسبتاً زیادہ کامیابی

سے حاصل کرسکتا تھا۔ مغل ان لوگوں کے لیے اجنبی اور ناخواندہ مہمان تھے۔

شاہ جی کا اصل مقصد دولت آباد واپس لینا تھا اس نے ہمسایہ علاقوں پر قبضہ کیا اور اپنے نام نہاد حکمراں نظام شاہ کی طرف سے مالگذاری وصول کرنے لگا۔ مرتضیٰ خان اس حالت میں نہ تھا کہ قلعہ کی محافظت کرسکے یا دشمن کو بھگا سکے لیکن جیسے ہی خان دوراں نے دکن کی خطرناک حالت کی خبر پائی فوراً برہان پور کے لیے چل پڑا۔ مادھو سنگھ اور میر فتح اللہ کو اس شہر کا انتظام سپرد کرکے وہ تیزی سے دولت آباد ۲۷ر جنوری ۱۶۳۵ء کو پہنچا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ دشمن پسپا ہوکر رام دوہ پہنچ گیا ہے اس لیے وہ یہاں ایک دن آرام کرنے کے لیے رُک گیا

دوسرے دن وہ شاہ جی کے آدمیوں کے تعاقب میں نکلا۔ ان کو شیوگاؤں میں پالیا لیکن وہ لوگ منتشر ہوکر بھاگ گئے۔ خان دوراں نے ان لوگوں کا بُری طرح پیچھا کیا ان کی قیام گاہ پر قبضہ کرلیا۔ یہاں سے وہ پتھری گیا اور وہاں سے احمد نگر۔ قلعہ کو اس نے غلہ اور چارہ سے بھر دیا اس کے بعد ہی اسے اطلاع ملی کہ خان زماں بالاگھاٹ پہنچ گیا اور دولت آباد کی طرف بڑھ رہا ہے جب اس کو پیاں گھاٹ کی نظامت کی تقرری ملی تو وہ احمد نگر چھوڑ کر برہان پور چلا گیا۔

باین ہمہ شاہ جی کے وسائل ہنوز ختم نہ ہوئے تھے۔ اب بھی وہ مغل علاقوں پر ہمیشہ کی طرح بے باکی کے ساتھ غارت گری کر رہا تھا۔ لیکن یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس کی اس کارگزاری میں عادل شاہ اس کا یار و مددگار تھا۔ علاوہ بریں جھجار سنگھ کی بغاوت اور شاہی فوجوں کا بندیل کھنڈ جانا شاہ جی کے لیے مفید مطلب ثابت ہوا۔ عصری مؤرخ اس کی نقل و حرکت کی تفصیلات نہیں بیان کرتے صرف اتنا کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ اس نے بہت زیادہ تکلیف پہنچائی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کو توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ مجبور ہوکر دکن آیا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال نازک تھی اور خان زماں کے بس میں اس کا علاج نہ تھا۔

شاہ جہاں دوسری بار دکن آتا ہے

شاہ جہاں ۲۱ر ستمبر ۱۶۳۵ء کو آگرہ سے روانہ ہوا۔ اس کے پیش نظر دو باتیں تھیں ایک تو یہ کہ اس کے وہ افسر جو بندیل کھنڈ میں مہم سر کرنے گئے تھے ان میں اتحاد عمل پیدا کرانا اور دوسرے یہ کہ دولت آباد پہنچ کر احمد نگر کی تسخیر مکمل کرانا۔ دریائے نربدا کے کنارے ایک مقام ہنڈیا سے اس نے اپنے قاصد عادل شاہ اور قطب شاہ کے پاس روانہ کیے، کہ اگر اس کے مفتوحہ علاقوں میں امن قائم کرتے وقت انھوں نے ساتھ نہ دیا یا مزاحمت کی کوشش کی تو انجام بڑا بھیانک ہوگا۔ دریائے نربدا اس نے ۴ر جنوری ۱۶۳۶ء میں پار کیا برہان پور کے قریب اللہ وردی نے اس کا استقبال کیا۔ اپنی شمسی سالگرہ شہر کے باہر منانے کے بعد شاہجہاں دولت آباد روانہ ہوا۔ جب وہ

اس شہر کے قریب پہنچا تو خان زماں استقبال کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے چند دکنی افسروں کو حضورِ شاہ پیش کیا۔ ان میں مبارز خان، راؤ ستر سال، پرتھوی راج راٹھور، راؤ بھاؤ سنگھ، مالوجی بھونسلا، پرسوجی اور دانش خان حبشی قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے منصوبے

دولت آباد پہنچ کر شاہ جہاں نے آخری بار اپنے دار و گیر کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔ ناگہانی صورتوں کے پیش نظر اس نے اپنی فوج تین حصوں میں تقسیم کی۔ بارہ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج خان دوران اور راجا جے سنگھ کی قیادت میں کان وہار اور نان دیر روانہ کی، تاکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے متعدد سرحدوں پر نظر رکھے۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا کہ مخدوش مقامات سے امداد طلب ہونے پر کمک کے لیے تیار رہیں اور آدگیر اور اوسا کو تسخیر کریں۔ دوسری فوج خان زماں کی قیادت میں احمد نگر اس لیے بھی گئی کہ شاہ جی کے محلات جو چاکنڈہ اور راستھائی میں ہیں ان پر قبضہ کیا جائے۔ کون کان کو مطیع کیا جائے اور عادل شاہی سلطنت پر حملہ کرنے کے لیے مزید احکام کا انتظار کرے۔ تیسرا لشکر شائستہ خان کی قیادت میں جنار فتح کرنے کے لیے بھیجا یہ مقام شاہ جی کے اقتدار[15] کا مرکز تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرض اس کے سپرد کیا کہ سنگم نیر، ناسک اور ترمبک پر قبضہ کر لے۔

شاہ جی بے دخل کر دیا گیا

دو ہزار فوج اللہ وردی کو دے کر شائستہ خان نے شمال کی طرف روانہ کیا، تاکہ وہ اس علاقہ کے قلعے مسمار کر دے۔ اللہ وردی خان نے چاندور پر قبضہ کر لیا اور ایک با اثر مرہٹہ سردار ہمبیر راؤ کو ملا لیا۔ اس کو دو ہزار ذات ایک ہزار سوار اور پچاس ہزار روپے دیے گئے۔ اس کی امداد سے اللہ وردی خان نے کئی ایک قلعہ کے محافظ دستوں کو ملا کر ان سب پر قبضہ کر لیا۔ ان ہی بعض قلعوں میں نظام شاہی خاندان کے لوگ قیام پذیر تھے جب اللہ وردی خان وہاں پہنچا تو انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفتار کر لیے گئے[16]۔

اسی درمیان میں شائستہ خان نے شاہ جی کے آدمیوں کو سنگم نیر سے مار بھگایا اور وہاں کے باشندوں کو کاشتکاری کی طرف متوجہ کر کے امن کا وعدہ لیا۔ ان اضلاع میں سکون و چین قائم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کے بعد جنار کی طرف بڑھا۔ باقر خان کو بھیجا کہ شاہ جی کی فوج سے یہ علاقہ واپس لے لے۔ جنار پر دباؤ کم کرنے کے لیے دشمن نے باقر خان کو کون کان کی طرف متوجہ کر لیا۔ لیکن اس طریقہ کار سے قلعہ کی محافظت خطرہ میں پڑ گئی۔ شائستہ خان احمد نگر میں تھا۔ جس وقت ان باتوں کی خبر اسے ہوئی۔ اس نے پانچ سو فوج کا ایک دستہ الگ کر کے جنار پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ نقل و حرکت کامیاب ہوئی۔ شاہی فوج نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد ہی باقر خان کی نظر بچا کر دشمن جنار کے سامنے نظر آئے اور انھوں نے کوشش کی کہ اپنے آقا

شاہ جی کے خاندان کو آزاد کرا دیں۔ شاہی فوج پر دباؤ پڑا لیکن شائستہ خان کی بر وقت آمد نے صورت حال بدل دی۔ اس طرح احمد نگر کے مغربی اضلاع میں مغلوں کا اقتدار کافی بڑھ گیا لیکن خطرہ سے خالی نہ تھا۔

شاہ جہاں کی واپسی، اورنگ زیب کی نیابت سلطانی

شاہ عادل کی اطاعت حاصل کرنے کے بعد شہزادہ اورنگ زیب کو دکن کا نائب سلطان بنا کر شاہ جہاں دولت آباد سے چلا آیا۔ شہزادے کی توجہ کے لیے بہت سی باتیں تھیں شاہ جی اب بھی آزاد تھا۔ ادگیر اور اوسا کے قلعے اب تک دشمن کے ہاتھ میں تھے۔ بیجاپور سے صلح ہو جانے کے بعد خان دوراں نے صلح و آشتی کے ساتھ ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب یہ اسکیم ناکامیاب ہوئی تو ادگیر کی طرف وہ ۱۱ر اگست ۱۶۳۶ء کو بڑھا۔ قلعہ کے نیچے اس نے سرنگ کھدا دی ایک میں آگ بھی لگائی لیکن جو شگاف پیدا ہوا وہ کام کا نہ تھا۔ اس نے دوسری سرنگوں کو آگ نہ دی اس لیے کہ ڈر تھا کہ مبادا عام چڑھائی اس سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے پوتے کو صدمہ پہنچے کیونکہ وہ ہنوز قلعہ میں تھا اس لیے اس نے محافظ دستہ سے ایک نمائندے کو بلایا اور جنگ کی ساری تیاریوں کا اسے معائنہ کرا دیا۔ جب یہ نمائندہ واپس ہو کر سپہ سالار کے پاس پہنچا اور خطرے کی نزاکت کا حال بتایا تو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہی طریقہ کار اوسا میں بھی اختیار کیا گیا، وہاں کے کمانڈر بھوج راج کو مایوسی ہوئی اس نے بھی قلعہ سپرد کر دیا۔

شاہ جی کا گھیراؤ

شاہ جی کے محاصرہ کے لیے اورنگ زیب نے خان زماں کو بھیجا۔ مغلوں سے جنار، چاکن اور پونا لے کر شاہ جی اپنے وطن میں ہمیشہ سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ خان زماں نے جنار پر دھاوا کیا قلعہ کے محاصرہ کے لیے ایک دستہ چھوڑ کر شاہ جی کو پونا سے اکھاڑنے کے لیے خود روانہ ہوا۔ عادل شاہ نے رندولا خان کو حکم دیا کہ وہ خان زماں کے ساتھ تعاون کرے۔ شمال و جنوب دونوں طرف سے حملے ہوتے ہوئے دیکھ کر شاہ جی ہوشیاری سے شادری پہاڑیوں میں داخل ہو کر کونکن پہنچ گیا۔ یہاں اس نے راستے کی الٹ پھیر کی۔ جن راستوں سے گیا تھا ان ہی سے واپس آیا اور دیش پہنچا۔ ہنوز ان کا پیچھا کرنے والے شادری کے مغرب میں تلاش کر رہے تھے۔ بالآخر خان زماں اس راستے کی کھوج لگانے میں کامیاب ہوا اور شاہ جی کا پیچھا ہر جگہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ جی نے ماہولی میں پناہ لی۔

ماہولی کے قلعہ کا محاصرہ مغل اور عادل شاہی فوجوں نے متحد ہو کر کیا۔ محافظ دستہ صرف دو سو آدمیوں کا تھا۔ حملہ روکنا بعید از قیاس تھا۔ پھر بھی شاہ جی نے کوشش کی کہ دھوکا دھڑی سے نکل جائے۔ جب ناکامیاب ہوا تو صلح کی درخواست کی۔ اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ نام نہاد نظام شاہ کو سپرد کر دے۔ احمد نگر کے چھ قلعے جو اب تک اس کے ہاتھ میں ہیں ان سے دستبردار ہو جائے۔ اس نے یہ شرطیں مان لیں اس کو

اجازت دی گئی کہ وہ عادل شاہ کی ملازمت کرے۔ عادل شاہ نے اس کو پونا اور سوپا بطور جاگیر عطا کیے۔[۶۰]

اس طرح چالیس برس کی لڑائی جھگڑے کے بعد دکن میں بالآخر تسلط قائم ہوا۔ شہنشاہ کا اقتدار شک وشبہ سے بالاتر ہوا۔ اس کی سرحدیں مقرر کی گئیں اور دکنی سلطنتوں پر اس کی برتری باقاعدہ قائم ہوگئی۔[۶۱] اگرچہ اورنگ زیب کی ہشت سالہ نائب سلطانی میں کوئی تعمیری کام نہیں ہوا لیکن مجموعی حیثیت سے ملک میں امن چین قائم رہا۔ دو معرکہ آرائیاں ضرور ہوئیں ایک تو خان دوراں کی قیادت میں گونڈ راجاؤں سے خراج وصول کرنے کے لیے اور دوسری مالوجی اور محمد طاہر خراسانی کی سربراہی میں باگلانا کو زیر کرنے کے لیے لیکن ان مہموں سے اندرونی امن وچین میں کوئی فرق نہ آیا۔ اپنی مدت نیابت سلطانی میں اورنگ زیب دوبارہ آگرہ گیا۔ ایک مرتبہ ۱۶۳۷ء میں دل رس بانو بیگم سے شادی کرنے اور دوسری مرتبہ اپنی بہن جہاں آرا کی عیادت کے لیے جب وہ ۱۶۴۴ء میں بُری طرح جل گئی تھی۔

دکن میں اصلاحات جب اورنگ زیب دوسری بار دکن کا ناظم ہوا تو اس وقت مفید یا کارآمد اصلاحات عمل میں آئیں۔ یہاں کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نائب سلطانوں کا تیزی سے ردوبدل اور ان میں سے بعض کے جارحانہ استحصال بالجبر رویّہ سے زائد مطالبہ وصول کرنے نے ریاست کا حال تباہ کر دیا۔ زراعت کو کوئی ترقی نہیں دی گئی کاشتکار خوش نہ تھے نئی زمینیں کاشت کے لیے تیار نہ کی گئیں بجائے اس کے بہت سی زمینیں جنگل ہوگئیں کاشتکاروں کی تعداد اور ذرائع میں کافی کمی ہوئی۔ مال گذاری بھی کم ہوئی۔ شہزادے کے دیوان مرشد قلی خان نے ان خرابیوں کا علاج بڑی خوبی سے کیا۔ اس نے دل وجان سے اس کام کو ترقی دینے میں حصّہ لیا۔

اس نے ٹوڈرمل کے طریقہ کار دکن میں بھی رائج کیے۔ اس سلسلے میں اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ وہ ویران بستیاں پھر سے آباد کرے اور لوگوں کو امن وسکون سے زندگی بسر کرنے کا موقع دے۔ ہر جگہ ہوشیار امین اور ایماندار زمین ناپنے والے بھیجے گئے تاکہ وہ لوگ کھاتہ، کھتونی تیار کریں۔ قابل کاشت اور بنجر زمین کا فرق کریں۔ پانی کے راستوں کا بھی اندراج کریں۔ جہاں کہیں گاؤں کا مکھیا نہ رہ گئے تھے وہاں اُس نے اُن نئے لوگوں کو یہ منصب دیا جو اپنے کردار سے زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی ہمدردی کے خواہاں تھے۔ غریب رعایا کو شاہی خزانہ سے اس لیے قرض دیا گیا کہ وہ مویشی، بیج اور دوسرے آلات زراعت خرید سکے۔ یہ تقاوی آیندہ موسم بہار میں قسط وار وصول کی جاتی۔[۶۲] اس طرح نیا صوبہ ترقی کرکے بیجاپور اور گولکنڈہ کے الحاق کا ذریعہ بن گیا۔

باب ۷

بیجاپور اور گولکنڈا

اکبر کے تعلقات عادل شاہ سے

بہمنی سلطنت کے انتشار کے بعد جتنی حکومتیں وجود میں آئیں ان میں سب سے زیادہ پائیدار بیجاپور کی حکومت تھی۔ اس کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ قریب قریب اسی زمانے میں اس کا بھی وجود ہوا جب احمد نگر کی سلطنت ظہور میں آئی۔ اور دو سو سال تک چلتی رہی۔ مغلوں سے اس کو واسطہ تیسرے حکمران علی عادل شاہ کے زمانے میں ہوا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ خواجہ عبداللہ کی واپسی ۱۵۸۰ء میں ہوئی اور لکھتا ہے کہ اگرچہ عادل شاہ احکام کی پابندی پوری طرح نہ کرتا تھا لیکن دکن کے دوسرے حکمرانوں کی طرح وہ ہوشیار آدمی اور منتخب تحفے بھیجا کرتا تھا۔ اعلیٰ حضرت شہنشاہ نے خواجہ عبداللہ کے ہمراہ حکیم گیلانی کو بھی مخصوص صلاح کار کی حیثیت سے بھیجا۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر وہ ان لوگوں کی باتیں گوش دل سے سنے گا تو اس سے جلد ... جائے گا۔ علی عادل شاہ نے حکیم گیلانی کا خیر مقدم کیا اس کو بڑے تزک و احترام کے ساتھ بیجاپور لے گیا ... کے بعد مغلیہ سلطنت کے دوسرے ایلچی عین الملک شیرازی کا بھی ایسا ہی استقبال ہوا۔ حکیم علی کو مناسب تحفے دے کر واپس کر دیا گیا لیکن اس کا ہم منصب ہنوز بیجاپور ہی میں تھا کہ ۱۵۸۱ء میں عادل شاہ قتل کر دیا گیا۔

دانیال کی شادی ابراہیم ثانی کی لڑکی سے

اس کی جگہ ابراہیم عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے سینتالیس سالہ عہد حکومت میں مغلیہ سلطنت اور اور بیجاپور کی حکومت میں قریب تر رابطے قائم ہوئے کیونکہ مغلوں کی سلطنت کی حدیں زیادہ پھیل گئی تھیں۔ ۱۶۰۰ء میں اکبر نے میر جمال الدین حسین کو ابراہیم ثانی کے دربار میں بھیجا اور تین سال بعد شہزادہ دانیال

کی شادی عادل شاہ کی لڑکی سے کی۔ لیکن باوجود مغلیہ شہنشاہ سے دوستی کے اقرار کے ابراہیم ثانی نے ملک عنبر کو پناہ دینے میں تکلف نہ کیا۔ ازروئے انصاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیم ثانی نے اپنی سینائی خطر پسند کی امداد و ہمت افزائی محض اس لیے کی کہ نظام شاہی خاندان برقرار ہے یقیناً اس کا یہ رویہ سیاسی اقدام کا نتیجہ فکر تھا۔

جہانگیر اور ابراہیم ثانی جہانگیر کے عہد میں مغلیہ اور ابراہیم ثانی کے سیاسی تعلقات متلون تھے۔ ابتدائی دور میں آخر الذکر ملک عنبر سے ہمیشہ متحد رہا اس لیے کہ شاہی اقدام کی روک تھام ہوتی رہے۔ اس لیے شاہ جہاں پہلی بار دکن میں آیا تو اس نے سب سے پہلے دکھنی جتھا ول کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے ملک عنبر کو سب سے الگ کر کے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد ہی پھر وہی صورت حال پیدا ہو گئی اور اس کو پیچیدہ حالات درست کرنے کی فکر ہوئی۔

ملک عنبر کے عروج اور حکومت احمد نگر کی تجدید نے اگرچہ مغلیہ مزاحمت کی فوری اقدام سے احمد نگر کو بچا لیا لیکن پھر بھی ان دونوں حکومتوں میں پرسکون تعلقات پیدا کرنے میں معاون نہ ہوا۔ جب شاہجہاں نے اپنے باپ سے بغاوت کی اور مہابت خان اور شہزادہ پرویز اس کے تعاقب میں دکن پہنچے تو اس وقت بھی بیجاپور اور احمد نگر آپس میں لڑ رہے تھے اور دونوں مغلیہ حکومت سے مصالحت کی فکر میں تھے۔ ملک عنبر سے بے اعتمادی نے مہابت خان کو ابراہیم ثانی سے دوستانہ رویہ کی طرف مائل کیا۔ ابراہیم ثانی نے مغلوں سے جنگ و دفاعی معاہدہ کر لیا۔

اس کے بعد ہی شاہجہاں کی نقل و حرکت بنگال و بہار میں تیز ہوئی اور مہابت خان و شہزادہ پرویز کو حکم ہوا کہ باغی کی سرکوبی کے لیے وہ شمال واپس آئیں۔ ملک عنبر کو پھر موقع مل گیا۔ اس نے عادل شاہی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ملک میں داخل ہوا۔ بدار کو تباہ کیا تیزی سے بیجاپور کی طرف کوچ کیا۔ نورس پور میں لوٹ مار مچا دی اور قلعہ کا محاصرہ کر دیا۔ لیکن جب اس کا تعاقب ہوا تو وہ پلٹ پڑا۔ اس نے لاری کو شکست دی اور مار ڈالا۔ بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ شعلہ پور پر دھاوا بول دیا۔ اس اثنا میں شہزادہ پرویز اور مہابت خان پھر دکن واپس آ گئے اس لیے ملک عنبر بیجاپور سے چلا گیا۔ جنار کے قیام میں شاہجہاں نے ابراہیم ثانی سے دوستانہ مراسلات قائم رکھے۔ ابراہیم ثانی اس کو گاہے ماہے روپیہ، سامان اور خاص تحائف بھیجتا رہا۔ اس کا انتقال بتاریخ ۱۲ ستمبر بروز چہار شنبہ ۱۶۲۷ء میں ہوا۔

ابراہیم ثانی کا انتقال اور محمد کی تخت نشینی اس کے انتقال کے بعد عمائدین سلطنت نے جانشینی کے

مسئلے پر صلاح و مشورہ کیا بالآخر مادر شاہ کے اتفاق رائے سے بڑے صاحب محمد عادل شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا مبارک باد کے پیامات حکمرانوں نے بھی بھیجے۔ چنانچہ شاہجہاں نے بھی افضل خان کو اور محمد قطب شاہ نے شیخ محمد طاہر کو مبارک باد پیش کرنے کے لیے بھیجا۔ مرتضیٰ ثانی نے کوئی سفیر نہ بھیجا۔ اس کی خاموشی شگون بد ثابت ہوئی۔ جب اس نے مہر خاموشی توڑی تو معلوم ہوا کہ وہ شہزادہ درویش محمد کو عادل شاہی تخت کے لیے مدمقابل بنانا چاہتا ہے۔ اس نے ایک بڑا لشکر لے کر بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ عادل شاہی فوج کو جو اخلاص خان کی قیادت میں مقابلہ کر رہی تھی شکست فاش ہوئی۔

عادل شاہ و مرتضیٰ ثانی میں شاہجہاں کی مصالحت کی کوشش

جب شاہجہان نے دو بادشاہوں کے لڑنے کی خبر سنی تو اس نے شیخ معین الدین کو آپس میں صلح کرانے کے لیے روانہ کیا۔ دونوں سلطنتوں کے نمائندے بیجاپور میں مصطفیٰ خان کے مکان پر ملے۔ لیکن یہ اجتماع شعلہ پور کے مسئلے پر ختم ہو گیا۔ ہر دو حریف میں سے کوئی دوسرے کے ہاتھ میں شعلہ پور نہیں دینا چاہتا تھا۔ عادل شاہی نمائندہ ابوالفتح بدمزاج آدمی تھا خفا ہو کر پنچایت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پنچایت ختم ہو گئی۔ اس طرح شیخ معین الدین کا مقصد ناکامیاب ہوا۔ احمد نگر اور بیجاپور کے اختلافات اپنی جگہ پر رہے۔ لیکن شاہی سفیر کا عادل شاہ نے اچھا خاصا استقبال کیا[13]۔ اس نے شہنشاہ کے لیے قیمتی تحفے بھیجے۔

مصطفیٰ خان مغلوں کا حامی

اس درمیان میں خان جہاں کی بغاوت کے سلسلہ میں شاہجہاں دکن آیا۔ اس نے بڑے پیمانے پر احمد نگر میں اپنی مہم کا آغاز کیا۔ بیجاپور میں دو طاقتور رہنما اس بات میں مختلف الرائے تھے کہ مغلوں کی مدد کی جائے یا نہیں۔ مصطفیٰ خان موافق تھا اس لیے وہ نظام شاہ کا سخت دشمن تھا کیونکہ اس کا خسر محمد لاری ملک عنبر کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اس لیے اس نے مغلوں کے اتحاد سے احمد نگر کے وجود ختم کرنے کی وکالت کی۔ لیکن رندولا خان اور بعض دوسرے سربلند امرا نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ ان لوگوں نے عادل شاہ کو بھی مصطفیٰ خان کی رائے سے متفق ہونے کے لیے منع کیا۔ لیکن سردست آخرالذکر اپنے مخالفین کی رائے پر غالب رہا۔ بادشاہ نے رندولا خان کو سرحد پر کوچ کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ شاہی فوج اگر امداد طلب کرے تو وہ مدد کے لیے تیار رہے[14]۔

رندولا خان اور اعظم خان میں گفت و شنید

جب اعظم خان نے دھارور فتح کر لیا تو رندولا خان اور اس کے باپ فرہاد خان نے اعظم خان سے ان علاقوں کی تحلیل کے منصوبہ کے متعلق باتیں کرنی چاہیں جو شہنشاہ نے عادل شاہ کو دیے تھے۔ ان لوگوں کے

عہد و پیماں کی آزمائش کرنے کے لیے اعظم خان نے نظام شاہیوں کے تعاقب میں امداد کی فرمائش کی۔ چند روز دھارور میں ان کی امداد کے انتظار میں وہ رکا رہا۔ ان لوگوں کے شکوک رفع کرنے کے لیے اعظم خان نے اس کی بھی اجازت دی کہ پانچ سو آدمی لے کر ملاقات کے لیے آسکتے ہیں۔ اُن کے آجانے پر اعظم خان نے شان دار استقبال کیا ان کو چوبیس گھوڑے اور بیس اعزازی خلعت سے سرفراز فرمایا۔

رندولا خان کے مطالبات نامنظور

باضابطہ گفت و شنید کے بعد جو کانفرنس ہوئی اس میں رندولا خان نے اعظم خان سے درخواست کی کہ دھارور اس کو دے دیا جائے کیونکہ یہ مقام ان پانچ قلعوں میں سے ہے جو نظام شاہی علاقہ میں ہیں اور اس کے دینے کا وعدہ شہنشاہ نے عادل شاہ سے کیا تھا۔ اعظم خان نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ پہلی وجہ تو یہ کہ رندولا خان نے اعظم خان کی اس مہم میں ساتھ نہیں دیا تھا جو نظام شاہیوں کے خلاف اس نے انجام دی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ موجودہ حالات میں دھارور مغلوں کے لیے بہت اہم تھا۔ لیکن اعظم خان نے اس کی درخواست کو شہنشاہ کے پاس روانہ کرنے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ دشمن کے خلاف مزید جنگ کرنے میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن رندولا خان مغلوں کی کوئی مدد نہ کرنا چاہتا تھا اس لیے کانفرنس بالکل ناکام رہی۔

رندولا خان اور مقرب خان میں معاہدہ

مقرب خان کا پیچھا کرتا ہوا اعظم خان شاہ گڑھ پہنچا۔ اس نے رندولا خان سے فرمائش کی کہ دشمن کو بالاگھاٹ آنے سے معذور رکھا جائے، لیکن اس نے اپنی فوج کی قلت کا عذر پیش کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ نل ڈرگ جاکر اپنے کو وہاں تیار کرے گا اور اپنی سرکار کے احکام کا انتظار کرے گا۔

اس درمیان میں مقرب خان نے اس کو لبھاتے ہوئے پیش کش سے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ وعدہ دیا کہ اگر وہ مغلوں کے خلاف اس کی امداد کرے تو اس کے عوض میں شعلہ پور دے دیا جائے گا۔ اس دربار میں مصطفیٰ خان کا اثر کم ہوگیا تھا۔ اس کے اور خواص خان کے درمیان غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ اس اختلاف سے رندولا خان کو موقع مل گیا اس نے خواص خان کو مجبور کیا کہ مقرب خان کی شرائط منظور کرے۔ اس بدلے ہوئے ماحول کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ معین الدین جو تحائف لے کر بیجاپور سے آرہا تھا۔ بیدار میں روکا اور قید کر دیا گیا۔ خواص خان نے شاہی پیامبر کو ہر ساز و سامان سے محروم کر دیا بالآخر خواص نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔

مغلوں کی بے خبری میں رندولا خاں کا حملہ

فتح خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد رندولا خان نے پھر ایک بار اعظم خان سے صلح کی بات چیت کی کہ اگر اس کے آقا کو عفو تقصیر مل جائے تو وہ مغلوں کے خلاف عمر بھر نہ ہوگا۔ نیز یہ کہ شیخ معین الدین کو بیدار سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔ اور وہ سارے تحفے جو شہنشاہ کے ہمراہ تھے واپس کر دیے جائیں گے۔ اس کے قول و فعل کی آزمائش کے لیے اعظم خان نے بھالکی کی تاخت و تاراج کے لیے قدم اٹھائے دیکھا تھا کہ رندولا خان کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب اعظم خان منیرا دریا کے کنارے اپنے خیمے نصب کر رہا تھا تو رندولا خان نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ شاہی فوج کے دستہ کا سرغنہ بہادر خان تھا جو زخمی بھی ہوا اور گرفتار بھی۔ بھالکی دو پڑاؤ کے فاصلے پر تھا مگر اعظم خان کو عجلت کے ساتھ اپنی جگہ سے پسپا ہونا پڑا۔ برسات کا زمانہ گزارنے کے لیے وہ ناندیر پس پا ہو گیا۔ اس طرح رندولا خان کی گفت و شنید بارآور نہ ہو سکی اور مغلوں اور بیجاپور کے تعلقات میں کشیدگی جاری رہی۔

آصف خان کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم

فتح خان کی اطاعت کے بعد ہی شاہجہاں اس قابل ہوا اب عادل شاہ کی طرف توجہ کرے۔ ۳۰ر دسمبر ۱۶۳۱ء کو اس نے آصف خان کو بیجاپور پر حملہ کرنے کی اجازت دی۔ جملۂ کل فوج وہی تھی جو حال ہی میں احمدنگر کے جنگ میں تھی۔ کاندھار سے بھالکی تک شاہی فوج بغیر کسی مزاحمت کے سرگرمِ سفر رہی۔ بھالکی میں محافظ دستے نے کچھ لڑائی کی مگر آسانی سے زیر کر لیا گیا۔[۲۲] کملاپور میں آصف خان کو عادل شاہ کا قاصد رزاق شیخ ملا۔ یہ قاصد ایک خط لایا تھا جس میں عادل شاہ نے اپنے اعمال پر اظہارِ تاسف کیا تھا اور عفو تقصیر کی درخواست کی تھی۔ نیز تاوانِ جنگ ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ رزاق اللہ، عادل شاہ کا معتمد علیہ قاصد نہ تھا۔ اس لیے آصف خان نے اس کے نامہ و پیام کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اس کو یوں ہی چلتا کر دیا۔ بیجاپور کا سفر جاری رہا۔ راستے میں شاہی فوج نے گلبرگہ کو تباہ کر دیا۔ شہر لوٹ لیا گیا۔ انسانوں کو تہِ تیغ کیا گیا۔[۲۳] بیجاپور پہونچ کر آصف خان نے اپنی تیس ہزار فوج کا جائزہ لیا۔

شاہی فوج کا بغیر مزاحمت بڑھنا

شاہ پرستوں کا پڑاؤ نورس اور شاہ پور کے درمیان تھا۔ یہیں سے انھوں نے بیجاپور کا محاصرہ شروع کیا۔ محاصرین و محصورین میں روزانہ جھڑپ ہوتی رہی۔ قلعہ سے مسلسل آتشباری کی وجہ سے مغلیہ فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی درمیان میں عادل شاہ کے بعض افسروں نے حملہ آوروں سے پُرامن صلح کی بات چیت شروع کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شیخ دبیر نے خواص خان کی طرف سے پیش قدمی کی۔ اس نے چند شرائط پیش کیں۔ لیکن فوراً ہی

سب شرطیں منظور ہوئیں۔ اس کے بعد بیجاپور کے معزز اشخاص نے مصطفیٰ خان سے اصرار کیا کہ وہ درمیان میں پڑ کر مغلوں سے صلح کرا دے۔ عام خیال تھا کہ مصطفیٰ خان کا کچھ اثر مغلوں پر ہے۔[۲۹]

صلح کی بات چیت

واقعہ یہ ہے کہ مصطفیٰ خان پہلے ہی سے آصف خان سے اس موضوع پر گفت و شنید کر رہا تھا۔ بعض وقت اس نے اپنی تائید میں دلفریب وعدے بھی کیے۔ ایک موقعہ پر تو اس نے اپنے متبنیٰ لڑکے علی رضا کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ وہ شاہی فوج کو خندقوں سے قلعہ میں بلائے گا لیکن باوجود بہت سے حلفیہ وعدوں کے وہ مُکر گیا۔ اُس کی دورنگی نے آصف خان کو اس پر اعتماد کرنے سے معذور رکھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ جب تک مصطفیٰ خان اور خیریت خان خود اُن شرائط کی توثیق کے لیے نہ آئیںگے وہ صلح نہ کرے گا۔ جب معاہدہ دونوں رات کے وقت قلعہ سے باہر آئے اور رچانک پر ناصری خان نے استقبال کیا۔[۳۰]

مصطفیٰ خان شرائط طے کرتا ہے

ایک طویل مباحثہ کے بعد طے ہوا کہ عادل شاہ ۴۰ لاکھ روپیہ تاوان جنگ ادا کرے۔ رقم کی ادائیگی کچھ نقد اور کچھ جواہرات اور کچھ دوسری صورت میں ہو۔ ان شرائط کا ایک مسودہ تیار ہوا۔ مصطفیٰ خان قلعہ میں گیا کہ اپنے آقا کی توثیق حاصل کر کے باقاعدہ سربہ مہر کر دے۔ آصف خان کا ملازم عبدالریحان مصطفیٰ خان کے ساتھ گیا تاکہ دستاویز واپس لائے۔ نیک نیتی کے ثبوت میں عادل شاہ نے دو افسر بہادر خان اور یوسف خان جن کو اس کے افسروں نے پہلے کسی موقعہ پر گرفتار کر لیا تھا واپس کر دیئے۔

خواص خان نے مسترد کر دیا

لیکن جب مصطفیٰ خان نے خواص خان سے معاہدہ کی شرطیں بیان کیں تو آخرالذکر نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بہت سے امراء بھی اس کے ہمخیال تھے خواص خان نے عبدالریحان کو دو دن تک روک رکھا اس کے بعد اسی سے کہلا بھیجا کہ معاہدے پر باقاعدہ دستخط کرا کے وہ اپنے نمایندوں سے بھیج دیگا۔ نمایندوں نے کچھ نئی شرطیں پیش کیں۔ آصف خان نے منظور کرلیں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ عہد نامہ دوسرے دن بھیج دیا جائے گا۔

خواص خان کی فریب کاری

لیکن صلح کی گفت و شنید کو طول دینا خواص خان کا ایام گزاری کے لیے ایک بہانہ تھا۔ وہ مغل لشکر کے صحیح حالات معلوم کرنے کی فکر میں تھا اسے کچھ واقفیت ہو گئی تھی۔ جب اسے شاہی فوجوں کی کمزوری کا یقین ہو گیا تو اس نے وعدہ توڑ دیا اور ان مغلیہ سپاہیوں پر حملہ بھی کر دیا جو شہر میں خرید و فروخت کے لیے آئے تھے۔

آصف خان کی غلطیاں

آصف خان صلح کا اس لیے خواہشمند تھا کہ اس کی فوج قحط کی وجہ سے خستہ حال

تھی رسد کا بغیر مناسب انتظام کیے ہوئے بڑی بیوقوفی سے وہ دشمن کے قلب سلطنت میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک ایسا موقعہ تھا جب اس کی سپہ سالاری کی آزمایش ہوئی اور وہ امتحان میں ناکامیاب رہا۔ مغلیہ فوجوں کے آنے سے پہلے ہی عادل شاہ نے پڑوس کے اضلاع اس لیے تباہ کر دیے کہ محاصرہ کے وقت شاہی فوج کو غلہ نہ ملے۔ قحط اتنا شدید تھا کہ ایک سیر غلہ ایک روپیہ کا ملتا تھا اور جانوروں کا چارا بالکل نہ ملتا تھا۔ ان حالات نے خواص خان کے رویّہ میں تبدیلی پیدا کی اور اس کو مغلوں کی طاقت سے بے پرواہ کر دیا۔

آصف خان کی پسپائی جب مصطفےٰ خان کے نمایندے مغلیہ کیمپ سے وطن واپس آرہے تھے تو ان ہی میں سے ایک نے خواص خان کی دوعملی تحریری اطلاع کی آصف خان کے لیے چھوڑ دی تھی۔ ضرورتوں سے مجبور ہو کر آصف خان نے اپنا خیمہ اٹھایا تاکہ ایسے اضلاع میں جائے جہاں لشکر کے آدمیوں کو کھانے پینے کا سامان مل سکے۔ راہ سفر میں مغل بے سوچ سمجھے تخت و تاراج کرتے رہے جن علاقوں سے وہ گذرے اسے لوٹ مار کر برباد بھی کیا عورتوں اور لڑکوں کو پکڑ کے غلام بنا لیا۔ اس طرح وہ لوگ اپنی تباہی کا انتقام بے گناہ لوگوں سے لیتے ہوئے اپنے پیچھے مصیبت و ویرانی چھوڑتے ہوئے بڑھے۔ بیجاپور کی ایک فوج ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ حملہ شرمناک ناکامی کا نمونہ ثابت ہوا اور عادل شاہ کا رتبہ کم نہ کیا جا سکا۔

مہابت خان کا حوصلہ پارندا فتح کرنے کا مہابت خان کو دکن کا نائب بنا کر شہنشاہ شمال چلا آیا۔ دولت آباد کے محاصرے کے وقت رندولا خان اور شاہ جی وغیرہ مستقل طور پر اسے تکلیف پہنچاتے رہے۔ لیکن اس قلعہ کی تسخیر کے بعد پارندا پر قبضہ کرنے کا جذبہ اس پر غالب آیا۔ اگرچہ یہ مقام اصل میں نظام شاہ کی ملکیت میں تھا لیکن اس کے سپہ سالار آقا رضا نے ۱۶۲۲ء میں عادل شاہ کے سپرد کر دیا تھا۔ مہابت خان نے شہنشاہ کو لکھا کہ دولت آباد کی تسخیر نے دکنی حکومتوں میں خوف اور مایوسی کی لہر دوڑا دی ہے اور بیجاپور کو زیر کرنے کا یہ مناسب وقت ہے۔ اس نے یہ بھی درخواست کی کہ اس کے اپنے سپاہی تھک چکے ہیں۔ اگر کوئی شہزادہ تازہ دم افواج لے کر اس مہم کے لیے آجائے تو کامیابی یقینی ہے۔

اس کے غلط اندازے اس میں کوئی شک نہیں کہ مہابت خان کا اندازہ بالکل غلط تھا۔ اس کی تازہ حاصل کردہ فتوحات اور خاص کر دولت آباد کی تسخیر اہم کارنامے سہی لیکن بیجاپور کی طاقت کا اندازہ اس نے کم کیا اور احمد نگر میں جو کشمکش تھی

اس نے بالکل نظر انداز کیا۔ جہاں تک شہنشاہ کا تعلق ہے وہ دکن کے اصل حالات سے باخبر نہ تھا۔ اس نے جائے وقوع پر متعین آدمی کے فیصلے پر پورا اعتماد کیا اور وہ آدمی بھی کون تھا مہابت خان علاوہ بریں آخر الذکر کا حوصلہ مغلیہ شہنشاہیت کی پالیسی سے متفق تھا اس لیے شاہ جہاں نے اس کی درخواست ماننے میں تکلف نہ کیا۔

شہزادہ شجاع دکن بھیجا گیا

اسی لحاظ سے شہزادہ شجاع کو دس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کے منصب پر ترقی دے کر ایک متاثر کرنے والی فوج لشکر کے ساتھ دکن بھیجا گیا شہنشاہ نے کامیابی کی دعائیں دیں اور حکم دیا کہ وہ رتھ پر سوار ہو کر محل سے نکلے۔ جن امراء اور منصب داروں کو اس کے ساتھ کیا گیا ان میں سے چند نام قابل ذکر ہیں مثلاً سید خان جہاں، راجہ جے سنگھ، راجہ وٹھل داس، اللہ وردی خان اور رشید خان انصاری۔ ایک ہزار بندوقچی اور بیشمار پیدل سپاہیوں سے اس لشکر کی تکمیل ہوئی۔ مہم کے اخراجات کے لیے ڈھائی لاکھ روپیہ شاہی خزانہ سے پیشگی دیے گئے۔ اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ مالوہ کے خزانے سے لینے کی اجازت[٣٩] دی گئی۔

سیدھا پارندا گیا

جب شہزادہ شجاع دکن گیا تو راستے ہی میں اسے مہابت خان ملا۔ اس نے مشورہ دیا کہ وہ پارندا جائے۔ ملکاپور سے خان زماں بھیجا گیا کہ وہ بیجاپور کے سرحدی علاقوں کو اس لیے برباد کر دے کہ پارندا کمک نہ بھیجی[٤٠] جا سکے۔ دشمن رسد سے محروم ہو جائے۔ اس سلسلے رابطہ کو برہان پور سے برقرار رکھنے کے لیے مہابت خان نے متعدد چوکیاں ظفر نگر، جالن پور، شاہ گڑھ اور بڈ میں قائم کر دیں۔ ان کی محافظت کے لیے فوجی دستے مقرر کیے گئے۔

شاہ جی کی نقل و حرکات

بدقسمتی سے یہ مہم ابتدا ہی سے پیچیدہ ہوتی گئی۔ شاہ جی نے نظام شاہ کے ایک رشتہ دار کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کو بادشاہ بنا[٤١] دیا۔ اس کے جھنڈے کے نیچے وہ سب لوگ جمع ہو گئے جن کو قدیم بادشاہ کے خاندان سے اب بھی محبت تھی اور مغلوں سے کینہ تھا۔ شاہ جی اب اس پر تلا ہوا تھا کہ مغلوں کو دکن سے باہر کر دے۔ بیجاپور سے ایک حلیف ہونے کی وجہ سے مطمئن تھا[٤٢] اس نے اپنی نقل و حرکات کا منصوبہ پارندا پر سے ہٹانے کا بنایا۔ اس نے کوشش کی کہ مغلوں کا سلسلہ آمد و رفت ظفر نگر میں ختم ہو جائے لیکن شہزادہ نے خواص خان کو تین ہزار فوج دے کر شاہ جی کو پسپا کرنے اور جناد تک بھگانے اور اس کے گھر چر گنڈہ کو لوٹ لینے اور سنگم نیر سے اس پر دباؤ ڈالنے کو بھیجا۔

خان زماں کی ناکامی

خان زماں پارندا پہنچا اور ایک ندی پر خیمہ زن ہوا جو قلعے سے دو میل کے فاصلے پر بہتی تھی۔ اس نے اپنے آدمی ہمسایہ اضلاع میں بھیجے تاکہ وہ جانوروں

کا چارہ اور گھاس مہیا کریں۔ اپنے افسروں کو اس نے سرکردگی تقسیم کی۔ اللہ وردی خان کو قلعہ کے نیچے سرنگ بچھانے اور توپ خانہ نصب کرنے کا کام سپرد کیا۔ محافظ دستہ نے اللہ وردی خان کا راستہ گولہ باری سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بڑی توپوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتا رہا۔ بایں ہمہ اس کامیابی کا موقعہ ہنوز دور ہی تھا کہ مہابت خان نے راجہ وٹھل داس کو خان زمان کی کمک کے لیے بھیجا لیکن حالت نہ بدلی۔[۴۵]

شاہی کیمپ میں رسد کی کمی

آخر کار مہابت خان ملکا پور چھوڑ کر شہزادہ کے ساتھ پرینڈا گیا۔ ان لوگوں نے قلعہ سے کچھ ہی دور پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ مصلحت یہ تھی کہ پیچھے ہٹنے کا راستہ بھی محفوظ ہے اور محافظ دستہ تک کمک پہنچنے میں رکاوٹ بھی رہے۔ لیکن مغلوں کے ایک ہی جگہ پر اجتماع نے بے انتہا مشکلات پیدا کریں۔ مہابت خان کے حفظِ ماتقدم کے باوجود شاہی فوج میں رسد کم ہو گئی جس کی وجہ سے ضروری ہو گیا کہ چارا جمع کرنے والے چھوٹے ٹکڑوں میں دور کے مقامات پر بھیجے جائیں۔ یہ تدبیر بھی دشمنوں کو سازگار ہوئی۔ انھوں نے شاہی فوجیوں کو چھاپہ ماروں کے ہتھکنڈے سے پریشان کر دیا یہاں تک کہ شاہی فوج فاقہ زدگی کی حد تک پہنچ گئی۔

مہابت خان بال بال بچ گیا

ایک موقعہ تو ایسا بھی آ گیا کہ دشمنوں کے دس ہزار آدمیوں نے مہابت خان کو گھیر لیا تھا۔ اس کا ہراول دستہ جو مہیش داس راٹھور اور رگھوناتھ بھٹ کی قیادت میں لڑ رہا تھا۔ حملہ کرنے والوں میں وہ کچھ ایسا گھر گیا کہ سارا دستہ ختم ہو گیا۔ ایک آدمی بھی جانبر نہ ہوا۔ اس نقصان نے مہابت خان کو پریشان کن حالات میں ڈال دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے خان دوران فوج لے کر اس کی امداد کے لیے بروقت آ پہنچا۔ اس کی آمد نے دشمن کو شکستہ دل کر دیا۔ وہ منتشر ہو کر بھاگ گئے۔ ایسے اچانک حملے اکثر ہوتے رہے جو شاہی فوج کے لیے پریشانیوں کا سرچشمہ بن گئے۔

پرینڈا کے محافظ دستے کا دلیرانہ مقابلہ

علاوہ بریں محافظ دستہ بڑی دلیری و چالاکی کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ اس نے قلعہ کے نیچے کی ہر سرنگ کا پتہ چلا لیا، یا تو بارود ہٹا کر سرنگوں کو بیکار کر دیا یا ان میں پانی بھر دیا۔ لیکن کچھ دن کے بعد اللہ وردی خان کی بنائی ہوئی ایک سرنگ مکمل ہوئی اور محافظ دستہ کو خبر نہ ہوئی اور وہ شہزادے کی موجودگی میں اڑی۔ اگرچہ اس سے ایک فصیل گر گئی لیکن کام کا شگاف نہ بنا۔ اس ناکامی نے محاصرین کو بددل بنا دیا اور اس حربے کا دہرایا جانا بہت دور کی بات ہو گی۔

مہابت خان کی پسپائی کے اسباب

ان تمام حادثات میں اضافہ یہ بھی ہوا کہ مہابت خان اور خان دوراں میں بڑی بد دلی پیدا ہو گئی۔ خان دوراں مہابت خان کی جان بچانے پر شیخی مارا کرتا تھا جس سے مہابت خان میں ترش مزاجی پیدا ہو جاتی تھی۔ اپنی بد اخلاقی سے وہ دوسرے افسروں کو بھی رنجیدہ کر دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب اس کے مخالف ہو گئے۔ ان لوگوں نے اس کی کسی اسکیم کو چلنے نہ دیا۔ ان حالات میں کامیابی سے ناامید ہو کر اس نے شہزادے کو مشورہ دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ چنانچہ فوج نے خیمہ اکھاڑا اور پیچھے برہان پور چلی آئی۔

اس کی وفات

دولت آباد کی شاندار فتح کے بعد پارندا کی ناکامیابی مہابت خان کے لیے بڑی شرمناک بات تھی۔ شہنشاہ نے سختی سے اس پر نکتہ چینی کی اور شہزادہ شجاع کو حکم دیا کہ سارا لشکر[54] لے کر وہ فوراً آ جائے۔ مہابت خان پہلے ہی سے زوال پذیر عمر کی منزل پر تھا۔ اس کھلم کھلا بے عزتی نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ وہ بواسیری ناسور میں مبتلا تھا۔ اس حادثہ نے اس زخم کو اور بڑھا دیا۔ اس کے لڑکے خان زمان کا بھاگ کر دربار شاہی میں جانا اس کی دل شکستگی کا باعث ہوا۔ آخر میں اس کا دماغ کام نہ دیتا تھا۔ وہ کوئی بات برداشت نہ کر سکتا۔ پارندا پر دوبارہ حملہ کرنے کی فکر میں وہ برہان پور کے باہر خیمہ ڈالے پڑا تھا۔ لیکن اس کی بڑھتی ہوئی کمزوری میں مایوسی بڑھتی گئی اسی عالم میں اس نے ۴ ہزار اشرفی اپنے آدمیوں میں تقسیم کی اور اپنے ذخیرہ کا باقی حصہ سر بمہر کر کے دربار شاہی میں بھیج دیا۔ اس کی موت نے جلد ہی اس کا شاندار مگر المناک کردار اکتوبر ۱۶۳۴ء میں ختم کر دیا۔[55]

بیجاپور میں انتشار

اس کی موت نے دکن میں سخت بد نظمی پیدا کر دی اور شاہ جی پھر ایک دفعہ سرگرم عمل ہو گیا۔ بیجاپور کے جارحانہ اقدام کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ وجہ تلاش کرنے کے لیے دور نہیں جانا۔ اس وقت مصطفیٰ خان اور خواص خان کی جتھا بندی سے سارے علاقہ میں انتشار تھا خواص خان نے گورنمنٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہر ایک سے لڑنے کو تیار رہتا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ مراری پنڈت تھا جس پر اسے اعتماد کلی تھا اور اس کی نظروں میں وہ بڑا معزز تھا۔ اس کے ہاتھ میں بادشاہ صرف ایک شاہ شطرنج کی طرح تھا جو کچھ وہ لکھوا تا وہ لکھ دیتا۔ آخر کار اس نے محمد عادل شاہ کو ترغیب دی کہ وہ مصطفیٰ خان کو حکم دے کہ شاہی مہر واپس کر دے جو ابراہیم ثانی کے زمانہ سے اس کے قبضہ میں چلی آرہی ہے۔ جب اس نے دینے سے انکار کیا خواص خان نے اسے قید کر دیا۔[56]

خواص خان کی کوشش شاہجہاں کو ملانے کی

جب شاہ جہاں بندیل کھنڈ پہنچا اور اس کے دکن کوچ کرنے کے ارادہ کی خبر خواص خان تک پہونچی

تو اس نے شہنشاہ کی خدمت میں شیخ دبیر کو قیمتی تحائف کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نذرانہ میں ایک ایسا نیلم بھی تھا جس کی قیمت تیس ہزار روپے تھی لیکن جب خواص خان کی چیرہ دستی کی خبر اسے ملی تو اس نے شیخ دبیر سے ملنے سے انکار کر دیا[۳۳]۔ بنا برایں شہنشاہ نے عادل شاہ کے نام ایک فرمان لکھا اور مکرمت خان کے ہاتھ بھیج دیا۔ اس فرمان کے مضامین دلچسپ ہیں۔ کیونکہ اظہار بیان میں خوش خلقی اور دھمکی، ترغیب، انتباہ کی عجیب و غریب آمیزش ہے۔ ان میں پوری وضاحت کے ساتھ وہ حالات بیان ہوئے ہیں جن سے شاہجہاں کی بیجاپور سے متعلق پالیسی کی تشکیل ہوئی۔ کیسے عادل شاہ کو مراعات عطا کرنے پر رضامند تھا اور ساتھ ہی ساتھ بشرط ضرورت کیسے وہ بزور شمشیر اپنی رائے منوانے پر تیار تھا۔

خواص خان کا زوال و قتل

قبل اس کے کہ ان معاملات کی مزید تفصیلات بیان کی جائیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کی تاریخ کے چند ایسے واقعات کا ذکر کر دیا جائے جن کے زیر اثر مغلیہ حکومت سے اس کے تعلقات قائم ہوئے۔ مصطفیٰ خان کو قید کرنے کے بعد خواص خان کی زیادتیاں بے حد بڑھ گئیں۔ اس کی مخالفت تیزی سے ہونے لگی۔ چنانچہ ایک جماعت سیدی ریحان بعدہٗ ملقب بہ اخلاص خان کی قیادت میں علانیہ اس کی مخالفت کرنے لگی۔ رندولا خان کی عملی امداد سے فائدہ اٹھا کر سیدی ریحان نے خواص خان اور اس کے منظور نظر مرارپنڈت کو قتل کرا دیا۔ خواص خان کے قتل کا ایک فوری نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ خان قید سے رہا کر کے پیشوائی کے عہدے پر مامور کر دیا گیا، لیکن دربار بیجاپور میں فضا کچھ عرصہ تک شک و شبہ سے گراں بار رہی۔

مکرمت خان کی رپورٹ

مکرمت خان جب بیجاپور پہنچا اس کو ایک عجیب صورت حال ملی۔ بایں ہمہ محمد عادل شاہ نے اس کا پر اعزاز استقبال کیا۔ اس کے خیر مقدم کے لیے بازکھید اٹک گیا[۳۴]۔ اس درمیان میں مصطفیٰ خان کو جیسے ہی اقتدار حاصل ہوا اس نے اپنے داماد ابوالحسن کو شہنشاہ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ روانہ کیا کہ حال میں جو بے وفائی عادل شاہ نے کی ہے اس کی معافی دی جائے۔ ابوالحسن کے ساتھ رندولا خان کا نمائندہ قاضی ابوسعید بھی تھا۔ آصف خان نے ان لوگوں کو شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا جو تحائف یہ لوگ بیجاپور سے لائے تھے وہ بھی نذر کیے[۳۵]۔

بیجاپور کی تباہی و تحقیر

لیکن بیجاپور کے امراء کے معاندانہ رجحان کی اطلاع جو مکرمت خان نے بھیجی تھی اس نے شاہجہاں کا مزاج بدل دیا اور اس نے اپنے افسروں کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا[۳۶]۔ اس حملہ کا مقصد عادل شاہ کو مرعوب و مغلوب کرنا تھا تو اس بدقسمت ملک کو تین مغلیہ فوجی افسروں نے جس طرح غارت و برباد کیا اس سے شاہ جہان کا مقصد کلیتاً پورا ہو گیا۔ اب

رندولا خان اور مصطفیٰ خان دونوں متحد ہو گئے کہ بادشاہ سے صلح کر لی جائے۔ اپنے نمایندوں کو ان لوگوں نے حکم دیا کہ جلد از جلد مغلوں سے معاہدہ کی تکمیل کریں۔ لیکن جب آصف خان نے عادل شاہی سفیروں کو پیش کیا (ان میں سے چار مغلیہ دربار میں قیام پذیر تھے) شاہجہاں نے بڑی طرح عادل شاہ کے بدلتے ہوئے رویّہ کی شکایت کی۔ اس کا غصہ اتنا بڑھا کہ اس نے شیخ دبیر اور شاہ داؤد کے قتل کا حکم دے دیا۔ خواص خان نے ان کو شاہی دربار میں بھیجا تھا۔ لیکن آصف خان کی سفارش پر دونوں کی جان بخشی ہوئی۔

ابوالحسن صلح کرنے کی کوشش کرتا ہے

شہنشاہ کے غیظ و غضب سے نڈر ہو کر ابوالحسن اس کو ہر قیمت پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر شاہجہاں صلح کرنے پر راضی ہو گیا جب ذیل شرائط مرتب ہوئیں۔ عادل شاہ کا مغلیہ برتری تسلیم کرنا، بیس لاکھ روپیہ صلح کرنے کی قیمت ادا کرنا گولکنڈہ سے صلح کرنا قطب شاہ اور اپنے نزاعی معاملات کو شہنشاہ کے فیصلہ کے لیے پیش کرنا علاوہ ان شرائط کے شاہجہاں نے بیجاپور کی سرحد متعین کرتے وقت نظام شاہی علاقہ کا ایک جزو عادل شاہ کے حصہ میں دے دیا۔ آخری بات یہ طے ہوئی کہ کوئی حکومت دوسری حکومت کے افسروں کو ان کے آقا سے بہکانے کی کوشش نہ کرے۔ عادل شاہ اس پر بھی راضی ہوا کہ شاہ جی کی سرکوبی میں مغلوں کا شریک کار رہے گا۔ اگر اول الذکر جنار اور ترمبک سے دستبردار نہ ہو جب یہ شرائط طے ہو گئیں تو شاہ جہاں نے ۶ رمئی ۱۶۳۶ء کو عادل کے پاس پُر تقدس ایک فرمان بھیجا جس پر شنگرف میں خود یا ہوا بادشاہ کا پنجہ منقش تھا اور خدا اور رسول کو درمیان میں رکھتے ہوئے شرائط پوری کرنے کی قید تھی۔ اسی سال کی ۱۱ر جولائی کو کرمت خان بیجاپور سے مع تحائف حاضر ہوا۔

شاہ جہاں پہلی مرتبہ عادل شاہ کے اعمال پر ملامت کرتا ہے

اس کے بعد محمد عادل شاہ اور مغل تعلقات بحیثیت مجموعی پُر امن رہے۔ صرف دو موقعے ایسے آئے جب شاہ جہاں کو عادل شاہ کی تنبیہ کے لیے کچھ لکھنا پڑا۔ ۱۶۴۲ء میں مصطفیٰ خاں کی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی طاقت پر خفا ہو کر عادل شاہ نے اسے قید کر دیا۔ اس اقدام پر شاہجہاں ناخوش ہوا اس لیے کہ مصطفیٰ خان مغلوں کا طرف دار تھا شاہ جہاں نے عادل شاہی سفیر مرزا رجب کو روک رکھا۔ اس کے ساتھ مرزا مظفر حسین خوافی کو اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ عادل شاہ مصطفیٰ خاں کو رہا کر کے اس کے عہدے پر بحال کر دے[65]

دوسری بار

جو صلح محمد عادل شاہ نے اپنی اطاعت پذیری سے مغل شہنشاہ سے خریدی تھی وہ

اس کی سلطنت کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ شمال کی مداخلت سے مطمئن ہو کر اس نے جنوبی کرناٹک پر قبضہ کر کے مملکت کی توسیع کرلی۔ اس طرح اس کے عہد میں سلطنت بیجاپور بہ لحاظ توسیع، اقتدار، شان و شوکت اپنی بلند ترین منزل پر پہنچ گئی۔ اس کی سلطنت کی حد بحر عرب سے خلیج بنگال تک جزیرہ نما ہند پار کرتی ہوئی پہنچ گئی۔ شاہ جہاں نے یہ حقیقت تسلیم کر کے اس کو ۱۶۴۸ء میں شاہ کا خطاب عطا کیا۔ اس نئے اعزاز نے بیجاپور کے بادشاہ کے غرور میں بھی اضافہ کر دیا۔ اپنا دربار قلعہ سے باہر ایک بلند محل میں کرنے لگا۔ ہاتھیوں کی لڑائی کھلے میدان میں دیکھنے لگا اپنے سب سے بڑے اعلیٰ مرتبت شخص کو خان خاناں کا خطاب بھی دے دیا۔ اس پر شاہ جہاں نے اس کو ایک فہمائشی خط بھیجا۔ محمد عادل شاہ نے چپکے سے سر تسلیم خم کر لیا اپنے بیباک اقدامات سے باز آیا۔ شاہ جہاں کی خفگی کا یہ دوسرا موقع تھا۔

بیجاپور پر اورنگ زیب کی چڑھائی

محمد عادل شاہ کا انتقال ۴ نومبر ۱۶۵۶ء کو ہوا۔ اس کی جگہ اس کا لڑکا علی تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں شہزادہ اورنگ زیب دکن کا نائب سلطان تھا۔ اس کی للچائی آنکھیں بیجاپور پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے باپ کو آمادہ کیا کہ اس سلطنت پر حملہ کرنے کی اجازت دے۔ اس لیے کہ نیا حکمران ایک مجہول نسب کا فرد ہے اور ملک میں بڑی بدنظمی پھیلی ہے۔ شاہجہاں راضی ہو گیا۔ بیٹے کو حکم دیا کہ میر جملہ کو ساتھ لے کر بیجاپور کی سرحد پر چڑھائی کرے۔ اگر ممکن ہو تو پورا ملک فتح کرے ورنہ قدیم احمد نگر کا وہ حصہ ملحق کر لے جو ۱۶۳۶ء کے معاہدہ میں بیجاپور کو دیا گیا تھا۔ بیجاپور کا خاص علاقہ اس شرط سے چھوڑ دیا جائے کہ حکمران ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان ادا کرے اور شہنشاہ کی برتری تسلیم کرے جس کا مطلب تھا کہ سکہ اس کے نام سے جاری ہوگا۔ خطبہ بھی اس کے نام سے مسجد میں پڑھا جائے گا۔ دوسری بات پر عمل کرنے کے لیے اورنگ زیب کو اپنے پرچم کے تلے ایک زبردست فوج جمع کرنے کی ضرورت تھی جو گولکنڈہ فتح کر سکے۔

شہزادہ نے اس مہم کی تیاری کے سلسلے میں عادل شاہی افسروں کو زبردست رشوتیں دے کر اپنی طرف مائل کیا۔ تب وہ بیجاپور میں داخل ہوا۔ بیدر، کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کی مدافعت سدی مرجان نے بڑی بہادری سے کی۔ لیکن جب وہ ایک دھماکے سے زیادہ زخمی ہو گیا تو اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد کلیانی کا محاصرہ کرنا تھا چار مہینے کے مستقل محاصرہ کے بعد وہ بھی فتح ہو گیا۔ اب بیجاپور کا راستہ صاف تھا۔ لیکن اچانک اورنگ زیب کو لڑائی ختم کرنے کا حکم ملا۔ اس نے عادل شاہ سے ایک معاہدہ کر لیا، جس کے رو سے آخر الذکر وہ رقم ادا کرنے پر راضی ہو گیا جو شہنشاہ نے مقرر کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بیدر، کلیانی، پارندا اور دوسرے نظام شاہی کوکن کے قلعہ جات اور

دانکی کے دوسرے اضلاع سے دستبردار ہونے پر راضی ہو گیا۔

گولکنڈہ سلطان قلی قطب شاہ آخری انسر اعلیٰ تھا جس نے بہمنی خاندان کی اطاعت کا بوجھ سر سے اتار پھینکا۔ جس خاندان کی بنیاد اس نے ڈالی اگرچہ اس کے افراد ہمت و شجاعت کے لحاظ سے ممتاز نہ تھے اس کا فخر اس خاندان کو ضرور حاصل تھا کہ اس نے فنون لطیفہ کو پروان چڑھایا اس خاندان کے اکثر افراد نفس پرستانہ تعیش کے خوگر تھے۔ یہی رجحان ان کے بردباری اور ہمسایوں کی اطاعت پذیری کی نشان دہی کرتا ہے۔ مغلیہ شہنشاد نے نیازمندی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس خاندان کی تاریخ میں بہت کم قطب شاہی حکمرانوں کی فوجی فتوحات نظر آتی ہیں۔ برخلاف اس کے گولکنڈہ کے بادشاہوں کا میدان جنگ سے بھاگنا غیر معمولی بات نہ تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسی ناقابل بیان بات ضرور ہے کہ جب ہم اس خاندان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان سے ہمدردی بھی ہوتی ہے اور ان کی مدح و ثنا کا بھی جی چاہتا ہے۔

مغلیہ خاندان سے رابطہ اکبر کا ہمعصر محمد قلی قطب شاہ اس خاندان کا پانچواں حکمران تھا اور اگرچہ دکنی مؤرخ مغل اعظم اور اس کے تعلقات کا تذکرہ نہیں کرتے لیکن پھر بھی اکبر نامہ میں جابجا ان تحفہ جات کا اندراج ملتا ہے جو گولکنڈہ سے آتے رہتے تھے۔ بجائے خود یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ دوستانہ مبادلہ تحفہ جات عہد متوسط کے بادشاہوں میں تہذیب و اخلاق کا مقدس نمونہ تھا۔ اس سے یہ لازمی نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے کہ یہ رویہ کسی ماتحتی یا اقرار برتری کی نشان دہی کرتا ہے۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں پہلے محمد قلی اور بعد میں اس کے جانشین شاہ ملک عنبر کی امداد مغلوں کے خلاف برابر کرتے رہے۔ انھوں نے زیادہ روپیہ سے اس کی اعانت کی۔ بیجاپور نے فوجی مدد کی، یہ صرف شہزادہ شاہجہاں کا دباؤ تھا جس نے دوبار محمد قطب شاہ کو نظام شاہ سے بچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ دکن کی پیچیدہ سیاست میں خود قطب شاہ مبتلا ہونے کے خلاف تھا۔

محمد قطب شاہ بدقسمتی سے محمد قطب شاہ کے عہد حکومت سے متعلق تفصیلی دستاویزات ہم تک نہیں پہنچیں اور عصری مغلیہ مورخین ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہ لوگ اس سلطنت کے اندرونی تاریخ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ مغلیہ تعلقات کے سلسلے میں صرف یہ ایک اہم بات ملتی ہے کہ ۱۶۲۱ء میں محمد قطب شاہ بیس لاکھ روپیہ بطور خراج ادا کرنے پر راضی ہوا۔ اس لحاظ سے اس کا حصہ سب سے زیادہ تھا کیونکہ بیجاپور کو ایک لاکھ اسی ہزار ادا کرنا پڑا اور احمد نگر کو صرف ایک لاکھ بیس ہزار دینا پڑا۔ جب شہزادہ شاہجہاں نے اس واقعہ کے ایک سال بعد بغاوت کی تو گولکنڈا

کے بادشاہ نے نہ صرف اس کو اپنے علاقہ سے گزرجانے کی اجازت دی بلکہ روپیہ سے اس کی امداد بھی کی۔

عبداللہ اور شاہ جہاں

محمد قطب شاہ کا انتقال ۲۱ر جنوری ۱۶۲۶ء کو ہوا۔ اس کا جانشین اس کا لڑکا عبداللہ ہوا۔ اس کی عمر تخت نشینی کے وقت گیارہ سال چھ مہینے کی تھی۔ مروجہ دستور کے مطابق ہمعصر بادشاہوں نے اپنے اپنے سفیر مبارک باد پیش کرنے کے لیے بھیجے۔ عادل شاہ ثانی نے شاہ ابوالحسن کو اور مرتضیٰ نظام شاہ ثانی نے شاہ میر جعفر کو بھیجا۔ اگرچہ شاہجہاں اس وقت بادشاہ نہ تھا مگر پھر بھی مرحوم بادشاہ کے احسانات یاد کر کے اس نے اخلاص خان قزوینی کو گولکنڈہ روانہ کیا۔ قزوینی کا یہاں باعزت خیر مقدم ہوا۔ ضروری رسوم ادا کرنے کے بعد اس کو واپس بھیجا گیا۔

عہد نابالغی کا انتظامیہ

سلطان کی نابالغی کے زمانے میں سلطنت کے انتظامات کے لیے افسروں کی ایک کونسل مقرر ہوئی۔ اس کے ممبر ایک دوسرے سے رشک کرتے تھے۔ محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد شاہ محمد کو پیشوا کا منصب ملا۔ لیکن ذمہ داریوں کا تنہا انجام دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے شیخ محمد کو نائب پیشوا کا خطاب دے کر دبیر کا عہدہ دیا گیا۔ منصور ایک ناخواندہ ابی سینا کا رہنے والا میر جملہ بنا دیا گیا۔ اس نے برہمنوں کی سرپرستی کی اور ان کو شعبۂ مالیات میں وسیع اختیارات کے ساتھ کام کرنے کی آزادی تھی۔ ان تقررات کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا کہ ان کا اثر قطب شاہی اور مغلیہ شہنشاہ کے تعلقات پر بالواسطہ اثر انداز ہوا۔

محی الدین کی سفارشات

اپنی تخت نشینی کے بعد شاہ جہاں نے شیخ محی الدین کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈا بھیجا۔ دارالسلطنت کے قریب اس کا استقبال میر قاسم نے کیا۔ قطب شاہی دربار کے دوران قیام شاہ محمد اور اس کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ شاہ محمد اس کے شایان شان برتاؤ نہ کرتا۔ اس کو جلد ہی برطرف کر کے اس عہدہ پر شیخ محمد کو مامور کیا گیا۔ یہ شخص دانشمند بھی تھا اور قابل بھی۔ اس نے سختی سے آداب دربار کی پابندی نافذ کی۔ شیخ محی الدین کو یہ کارگزاری ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بد اخلاقی سے پیش آیا۔ شیخ محمد نے آصف خان کو شیخ محی الدین کی شکایت لکھ بھیجی۔ آخر الذکر کی تنبیہ ہوئی۔ جب شاہجہاں دکن آیا تو اس نے میر وفا خان کے ساتھ گولکنڈہ سے تحائف لے کر واپس ہوا اور شہنشاہ کی خدمت میں ۲۲ر مارچ ۱۶۳۱ء کو پیش کیا۔

قطب شاہ کا خطرہ سے ہوشیار ہونا اور کھیدپارا کی تسخیر

دکن میں ایک زبردست فوج کی موجودگی اور بالخصوص ناصری خان کے کاندھار کے

محاصرے نے قطب شاہ کو چونکا دیا۔ اس نے آدم خان حبشی ملقب بہ عین الملک اور اللہ قلی ترک مزاکو کو لاس بھیجا تاکہ یہ لوگ سرحد کی دیکھ بھال اور مغلوں کی مداخلت پر نظر رکھیں۔ لیکن اس علاقے میں کوئی واقعہ ایسا نہ ہوا جو دونوں حکمرانوں کے تعلقات خراب کرے۔ برخلاف اس کے باقر خان نجم ثانی الحریسہ کے جنگ جوگوربز نے دسمبر ۱۶۳۰ء میں منصور گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قطب شاہی علاقہ میں اندر گھس آنا چاہتا تھا۔ ۱۶۳۱ء میں اس نے چند افسروں کو شکست بھی دی جو اس کے خلاف بھیجے گئے تھے۔ لیکن جب عبداللہ نے اس بات کی اطلاع شاہجہاں کو دی تو اس نے باقر خان کو سرحد سے واپس چلے آنے کا حکم دیا۔

شاہ علی بیگ گولکنڈہ بھیجا گیا

شاہ جہاں نے فوراً وفا خاں کو رخصت کر دیا۔ اس کے ساتھ شاہ علی بیگ کو بھیجا۔ آخر الذکر ایک ہزار فوج کا افسر علی تھا۔ راہ سفر میں وفا خاں کا اسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ شاہ علی بیگ تنہا حیدر آباد کی طرف چلا۔ دارالسلطنت کے قریب فصیح الدین محمد نے اس کا استقبال کیا۔ ۲۲ر نومبر ۱۶۳۱ء کو وہ شاہ کی حضوری میں پیش ہوا۔ اس نے وہ خط بھی دیا جو شاہجہاں نے بھجوایا تھا۔ آخر الذکر نے ایک کثیر رقم اور کچھ جواہرات کا قطب شاہ سے مطالبہ کیا تھا۔ عبداللہ جو اس کے علاوہ تعمیل فرمایش میں مذبذب تھے۔ لیکن مغلیہ شہنشاہ کے فوجی اقتدار کا بھی ان کو خوف تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت آصف خان کے زیر قیادت ساری فوج بیجاپور کی مہم میں مصروف تھی اور قطب شاہ بڑی دلچسپی سے اس کی کارگزاریوں کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس درمیان میں قطب شاہ کے سفیروں کو وعدوں سے بہلاتا رہا۔ ان کو روکے رہا۔ حالانکہ شاہ جہاں کا بار بار تقاضا ہوا کہ اس کو واپس کر دیا جائے۔ جب قطب شاہ کو بیجاپور میں مغلیہ فوج کی ہزیمت کی اطلاع ہوئی تو اس نے شاہ علی بیگ کو غیر رسمی طور سے رخصت کر دیا۔

گولکنڈا میں جشن اور دوسرے واقعات

شاہ جہاں کے شمال واپس جانے پر گولکنڈہ میں بڑا جشن منایا گیا۔ اس کے بعد چار سال تک مغلوں نے بہت کم مداخلت کی۔ عبداللہ خود بھی الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب مہابت خان نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کیا اور محمد عادل شاہ نے دولت آباد کی رہائی کے لیے مدد مانگی تو وہ خاموش رہا۔ برخلاف اس کے قطب شاہ نے مغلیہ پالیسی کے ایک بدنام دشمن خواص خان کے زیر کرنے میں خاص حصہ لیا اور پھر جب عبداللہ خان فیروز جنگ اور خان دوران گولکنڈا کی سرحد پر جھجار سنگھ کے خلاف تعاقب میں پہنچے اور انھوں نے متوفی باغی کے پس ماندگوں کی سپردگی کا مطالبہ کیا تو قطب شاہ نے حکم کی تعمیل کی۔

لیکن اس تعمیلِ حکم میں خوف کارفرما تھا کیونکہ شاہ جہاں کے دولت آباد آنے کی خبر گولکنڈہ پہنچ چکی تھی۔

قطب شاہ اور مغلوں کے تعلقات میں تبدیلی

اس طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ مغل اور قطب شاہ کے سیاسی تعلقات میں خوف کا جذبہ دوسرے جذبات سے زیادہ کارفرما تھا۔ لیکن یہ عہد ہی فوجی کارگزاریوں کا تھا اس کے علاوہ کس بات کی توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔ قطب شاہ معاملات طے کرنے کے لیے تلوار درمیان میں نہ لانا چاہتا تھا۔ اس نے ہمیشہ روپیہ دے کر ناخوشگوار ایام کو دُور رکھا۔ شاہ جہاں کی نظر میں ایک مرتبہ گولکنڈہ کی دولت آ چکی تھی اس لیے اس کے مطالبات کا معیار بلند سے بلند تر اور خوف و ہراس پیدا کرنے کا جذبہ مضبوط تر ہوتا رہا۔ شاہ جہاں کے دوسری بار دکن آنے پر دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں ایک نیا رُخ دکھائی پڑا۔ اب تک قطب شاہ کے گاہے ماہے بھیجے ہوئے تحفہ جات پر اس لیے قانع تھا کہ نذرانہ کو وہ اپنی برتری کا اعتراف باضابطہ کی علامت سمجھتا تھا۔ لیکن اب اس سے بھی کچھ زیادہ وصول کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

گولکنڈہ سلطنت کی نوعیت

اس منزل پر پہنچ کر نامناسب نہ ہوگا اگر سلطنت گولکنڈہ کی سیاسی حیثیت کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے۔ سلطنت قطب شاہی کے پہلے بادشاہ سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے نام پر خطبہ جاری کیا۔ شیعہ مذہب کو سلطنت کا مذہب قرار دیا۔ اس کے جانشینوں نے بھی اس کے نظریے پر عمل کیا۔ برخلاف بیجاپور اور احمد نگر کے حکمرانوں کے سترھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ایران سے الگ رہے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی سفیر ۱۶۰۳ء میں گولکنڈہ آیا اور اپنے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے لیے ایک تاج لایا۔ آخر الذکر نے پہلے قنبر علی اور بعد میں مہدی قلی سلطان طالش کو شاہِ ایران کی خدمت میں اظہارِ تشکر کے لیے بھیجا بعد ازاں سفراء کے تبادلے کا دونوں درباروں میں ایک سلسلہ جاری رہا۔ دونوں سلطنتوں کے روز افزوں قرب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈا میں شاہ ایران کا نام بھی خطبہ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ تبدیلی کب آئی۔ اس کے زمانے کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اس زمانے میں ضرور تھی جب شاہجہاں نے اس کی شکایت کی۔ مختصر یہ ہے کہ گولکنڈہ کی دنیاوی اور روحانی وفاداری شاہ ایران اور مغلوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

شاہجہاں اپنا مذہب عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے

یہ صورت حال شاہجہاں کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ شاہ جہاں سنی تھا۔ اس حیثیت سے اپنے مذہب کے عقائد محکوم سلطنتوں پر مسلط کرنا اس کا فرض تھا اور یہ بھی دیکھتا تھا کہ صحابی رسول اور تین خلیفہ کی توہین نہ ہو۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہ سیاسی تضاد بھی تھا کہ مغل

شہنشاہ کے زیر سایہ رہ کر خطبہ شاہ ایران کے نام پڑھا جائے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت سب سے زیادہ مضبوط تھی اس لیے سب کو اس کے زیر اثر رہنا تھا۔ یہ اس زمانے کا سیاسی نظریہ تھا، پھر کیسے ایسی سلطنت سے ہمدردی کی جا سکتی تھی جو خارج الملک ہو۔ لیکن تعجب خیز یہ واقعہ ہے کہ یہ عقیدہ صرف عبداللہ قطب شاہ پر مسلط کیا گیا۔ محمد عادل شاہ سے کوئی باز پرس نہ ہوئی حالانکہ اس کا بھی رویہ قطب شاہ کی طرح تھا۔ وجہ تلاش کرنے کے لیے دور نہیں جانا۔ اوّل الذکر مسکین مزاج اور فرمانبردار تھا لہٰذا اس کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا گیا۔

شاہجہاں کے مطالبات

چنانچہ جب شاہجہاں نربدا کے دوسرے کنارے پر بمقام ہنڈیا پہنچا تو وہاں سے اس نے عبداللطیف گجراتی کو گولکنڈہ روانہ کیا۔ جو خط اس نے بھیجا تھا وہ کافی دلچسپ ہے۔ اس کی ابتدا گولکنڈہ سے شیعہ مذہب ختم کرنے کی باقاعدہ مطالبہ سے ہوتی ہے۔ شہنشاہ کا فرمانا ہے کہ بحیثیت سنی بادشاہ کے میرا فرض ہے کہ مذہبی برگشتگی کا قلع قمع کردوں۔ اس کے بعد وہ عبداللہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ صحابی رسول کی بے حرمتی وہ روک دے، جو لوگ نہ مانیں ان کو سزا دے ورنہ اس کے ملک پر قبضہ کرلینا وہ اپنا فرض منصبی سمجھے گا۔ خطبہ کے سلسلے میں شہنشاہ کہتا ہے کہ جب تم میرے متعلق ہونے کا اقرار کرتے ہو تو پھر ایرانی بادشاہ کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ اور آخر میں یہ لکھا گیا ہے کہ خراج کا بقایا، جواہرات، زیورات اور ڈاک سمندر اور لبرگ جیسے ہاتھیوں سے ادا کیا جائے۔ ایک خاص وقت مقرر کیا جاتا ہے کہ جس میں ان تحفہ جات کا دربار تک پہنچنا ضروری ہے ورنہ جو نقصان تم کو اور تمھاری رعایا کو پہنچے گا اس کی ذمہ داری تمھارے افعال پر ہوگی[٦٨]۔

عبداللہ وفاداری کا ثبوت دیتا ہے

اس فرمان کے اجرا سے پہلے ہی عبداللہ نے اپنے اطاعت پذیر رجحان کا ثبوت اس تعمیل ارشاد سے دیا جو عبداللہ فیروز جنگ اور خان دوران نے ججھار سنگھ کے تعاقب میں گولکنڈہ کی سرحد پر پہنچ کر [illegible] انھوں نے عبداللہ سے یہ کہا کہ ججھار سنگھ کے ان عزیزوں کو سپرد کر دے جنھوں نے اس کے یہاں پناہ لی تھی۔ عبداللہ نے ان کو عالم خان کے ساتھ بھیج دیا جس نے ان لوگوں کو شاہجہاں کے سامنے [illegible] پیش کیا۔ شہنشاہ بے حد خوش ہوا۔ عالم خان کو ایک گھوڑا اور خلعت اعزاز عطا کیا۔ اس کے بعد ملا تقی نفیسائی شیرازی بڑی تیز رفتاری سے نذرانے لے کر مغل شہنشاہ کے پاس پہنچا اور دولت آباد میں شاہجہاں[٦٩] سے ملا۔

شاہی سفیر کا استقبال

شیخ عبداللطیف ٥ فروری ١٦٣٦ء کو گولکنڈہ کی سرحد میں داخل ہوا۔ وہاں کریم خان سے ملاقات ہوئی۔ اس کے آگے بڑھا تو میر معز الدین مشرف

نے خیر مقدم کیا اور کچھ دور تک اس کے ہمراہ رہا۔ حیدر آباد کے قریب شیخ محمد طاہر نے اس کا استقبال کیا اور اس کو اس مکان تک پہنچایا جو اس کے لیے نامزد تھا۔ بادشاہ کی حضوری میں ۱۱ر فروری کو وہ پیش کیا گیا۔ عبداللہ نے سفیر کی بڑی دھوم دھام کی دعوت کی۔ اس کی خوشنودی کے لیے صرف دلفریب باتیں کرتا رہا۔ اس اثناء میں خان دوراں سرحد پر نمودار ہوا۔ وہاں اس نے کچھ اضلاع میں لوٹ مار کی۔ اس پر قطب شاہ چونک پڑا۔ اس نے ایک دستہ افسروں کا سرحد کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ اور گول کنڈہ قلعہ کی مرمت کا حکم دیا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ ان مقامات پر اسلحہ اور آتش بار سامان پوری طرح بھیج دیے جائیں۔ ماہر توپچی مقرر کیے گئے کہ توپ خانے کو بہتر بنائیں، ان جگہوں پہ کافی رسد جمع کر دی گئی تاکہ محاصرے کے وقت محافظ دستہ کو غذائی تکلیف نہ ہو۔ ہر وہ سڑک بند کر دی گئی جو گول کنڈہ جاتی تھی۔ ان پر حفاظت کے لیے پہرے بھی بٹھا دیے گئے[91]۔

لیکن ایسی وسیع پیمانے کی فوجی تیاریوں نے شاہجہاں کو مرعوب[92]

عبداللہ شاہجہان کا حکم مان لیتا ہے

نہ کیا۔ وہ اپنے مطالبات کی تعمیل پر اڑا رہا۔ خاص کر اس بات کے لیے جس کا تعلق خطبہ میں شاہ ایران کا نام ہٹا کر اس کا نام لانا تھا۔ بالآخر بڑے کشمکش و پیچ کے بعد عبداللہ شاہی احکام کی تعمیل پر رضامند ہوا۔ لیکن عوامی ملامت سے اپنے کو بچانے کے لیے اس نے علماء و قضاۃ کی ایک کونسل طلب کی تاکہ ان بزرگوں کی بھی رائے سن لی جائے۔ ان لوگوں نے بالاتفاق ان نفرت انگیز احکام کو مان لینے کی صلاح دی کیونکہ نہ ماننے میں بڑی خوں ریزی کا اندیشہ تھا[93]۔ اس مشورے کی روشنی میں عبداللہ نے حکم دیا کہ شاہ جہاں کا نام خطبہ میں شامل کر لیا جائے اور جب تک عبداللطیف کا قیام گولکنڈہ میں رہا بادشاہ ہر جمعہ کو مسجد جاتا تھا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کے احکام کی تعمیل ہوئی یا نہیں۔ شہنشاہ مطمئن ہو گیا۔ خان دوران کو گول کنڈہ کی سرحد سے واپس چلے آنے کا حکم ملا[94]۔

شرائط صلح

۲۶ر مئی ۱۶۳۶ء کو عبداللہ نے عبداللطیف گجراتی کو رخصت کیا۔ اس کے ہمراہ شیخ محمد طاہر کو بھیج دیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی دیا جس میں حسب ذیل شرطیں تھیں۔

۱۔ کہ چاروں طرف خلفاء کا نام ارکان نماز میں لیا جائے۔ خطبہ شہنشاہ کے نام پر پڑھا جائے اور سکہ اسی کے نام سے مسکوک ہو۔

۲۔ نویں سنہ جلوس سے عبداللہ سالانہ خراج دو لاکھ ہن ادا کرے۔ رقم مذکورہ بالا کسی ایسے شہزادہ کے پاس جو دکن کا ناظم ہو یا کسی اور امیر کے پاس بھیجی جائے جسے شہنشاہ نامزد کر دے۔ علاوہ بریں آٹھ لاکھ روپیہ بقایا منجملہ بیس لاکھ روپیہ جو اس کے ذمہ آٹھویں سن جلوس تک واجب الادا ہے

یہ رقم بحساب دو لاکھ ہن سال رواں یعنی نویں سال جلوس سے بھیجی جائے گولکنڈہ ہو شاہی دربار کے مبادلہ قیمتوں کا فرق (بٹہ) شاہی خزانے میں نمایندوں کے ہاتھ بھیجا جائے اس پر سالہائے آیندہ سے عمل ہو۔

۳۔ یہ کہ عبداللہ ہمیشہ شہنشاہ کا وفادار رہے گا جیسا کہ عبداللطیف کے سامنے اس نے حلفیہ اقرار کیا ہے۔ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو شہنشاہ کو اس کا ملک لے لینے کا حق ہوگا۔

۴۔ یہ کہ اگر بیجاپور کی طرف سے مداخلت ہو تو شاہی نمایندے اس کی مدد کریں۔ اگر عادل شاہ اس کو مجبور کرے کہ وہ کچھ رقم اس کو دے تو اس کے برابر رقم شاہی خراج سے منہا کرلی جائے۔

تبصرہ

ان شرائط کی سختیاں محتاج بیان نہیں۔ صرف عبداللہ اور اس کے مشیر کاروں کی بزدلانہ کاہلی پذیری اس کی تشریح کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ہمعصر ہمسایہ عادل شاہ کی بہ نسبت قطب شاہ زیادہ فرمانبردار تھا۔ باوجود اس کے بیجاپور سے معاہدہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ کیا گیا۔ وہاں کے مذہبی امور میں نہ کوئی دخل دیا گیا اور نہ کوئی مستقل خراج عائد کیا گیا۔ مجموعی حیثیت سے شاہ کے ساتھ بہ نسبت عبداللہ قطب شاہ کے زیادہ اچھا برتاؤ کیا گیا۔ حالانکہ آخرالذکر نے شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے اپنی عزت اور مذہبی عقائد کو بھی قربان کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شرائط تلوار کی نوک پر منظور کرائی گئیں۔

عبداللہ کے تحائف شاہجہاں کے لیے

شاہ جہاں نے دولت آباد میں قاصدوں کے آنے کا انتظار کیا۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچے تو شاہ علی بیگ کیمپ کوتوال، مرزا جان قلی اور افضل خان نے ان کا استقبال کیا۔ شیخ طاہر نے شہنشاہ کے حضور وہ نذرانے پیش کیے جو وہ اپنے آقا سے لایا تھا۔ ان تحائف میں جواہرات، قیمتی پتھر کئی ہزار اشرفیاں اور سکے جو شاہجہاں کے نام پر مسکوک تھے۔ سو ہاتھی، پچاس گھوڑے معہ طلائی ساز و سامان کے شامل تھے۔ ان تمام تحائف کی قیمت چھ لاکھ روپیہ تھی۔ قطب شاہی سفیر کو ایک نادر عزت یہ حاصل ہوئی کہ شاہجہاں نے اس کو خلوت میں بلاکر اپنے جواہرات کا ذخیرہ دکھایا۔ وہ شاہی خیمے کے ساتھ مانڈو تک گیا۔ وہاں سے اُسے واپسی کی اجازت ملی۔ اسی کے ساتھ شہنشاہ نے خواجہ طاہر کو بھی بھیجا۔ آخرالذکر راہ سفر میں برہان پور میں بیمار ہوکر مرگیا۔ اس کی جگہ خواجہ زاہد کا تقرر ہوا۔ یہ دونوں دسمبر ۱۶۳۶ء کے اواخر یا سال آیندہ کی جنوری کے اوائل میں گولکنڈہ پہنچے۔ خواجہ زاہد نے شہنشاہ کی طرف سے عبداللہ قطب شاہ کو ایک ہاتھی معہ طلائی ہودج پیش کیا۔ پچاس پارچہ جات زمرد کی ایک تسبیح بھی نذر کی۔ منجملہ شاہ جہاں کی ایک تصویر ایک خوبصورت فریم میں ایک سنہری تختی جس پر معاہدے کی شرائط نقش تھیں پیش کی گئیں۔ شاہی قاصد چند دنوں کے بعد واپس آیا۔

معاہدہ کی شرطیں

مذکورہ بالا طلائی تختی پر منقوش معاہدہ کی شرطیں اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ پابندی سے زیادہ ان کی عہد شکنی ہوئی۔ اختصار کے ساتھ شرائط حسب ذیل ہیں:۔ "چونکہ تم نے ہمارے احکام کی تعمیل کی اور خطبہ سنی مذہب کے لحاظ سے پڑھا، سکے بھی ہمارے نام پر جاری کیے اور وعدہ کیا ہے کہ ان باتوں پر ہمیشہ عمل ہوتا رہے گا نیز یہ کہ سالانہ خراج معہ دو لاکھ ہن جو برابر آٹھ لاکھ روپیہ کے ہوتے ہیں تم نے نظام الملک کو ادا کیا۔ ان کے پیش نظر ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کر کے تم کو تمہارا ملک بخشتے ہیں۔ مزید برآں ہم خدا اور رسول کو درمیان میں رکھ کر وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک تم اور تمہارے جانشین ان شرائط کی پابندی کرتے رہیں گے ہم اور ہمارے لڑکے اور جانشین بھی تمہارے ملک کو نقصان نہ پہنچائیں گے اور یہ کہ جو شرائط اس تختی پر کندہ ہیں ان کے خلاف ورزی نہ ہو گی۔ لیکن جیسا کہ بعد ازاں گولکنڈہ سے تعلقات کی تاریخ سے ظاہر ہوگا یہ معاہدہ بادشاہوں کے نزدیک صرف ایک ردی کاغذ تھا۔

اورنگ زیب اور عبداللہ

اٹھارہ سال تک شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد دکن کے معاملات تھے۔ اورنگ زیب کا رجحان اس کے مستقبل کے منصوبوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے اپنے نمائندہ گولکنڈا میں رکھے اور جن کو خوش رکھنے کی عبداللہ ہمیشہ کوشش کرتا رہا۔ پہلا نمائندہ بندہ رضائی تھا عبداللہ اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اپنے امراء کو بھی حکم دیا تھا کہ وہ بھی اس کو خوش رکھیں۔ اس نے وہاں بڑی دولت اکٹھا کی اور متکبر بھی ہو گیا۔ علاوہ برایں بعض وقت اس نے اس رقم میں بھی خیانت کی جو عبداللہ نے شہزادے کو بھیجی۔ آخر کار عبداللہ نے اس کی شکایت کی۔ اورنگ زیب نے اسے واپس بلا لیا اور قید میں ڈال دیا اس کی جگہ قاضی عزیز کا تقرر ہوا۔

اورنگ زیب کے نائب سلطان ہونے کے صرف ایک ہی سال بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو اس کی تحکم پسندی اور حوصلہ مند مزاج کا غماز ہے۔ ۱۶۳۷ء میں عبداللہ قطب شاہ نے ملا مقیم کو شہزادے کی خدمت میں دولت آباد بھیجا۔ اور اپنی طرف سے تین ہاتھی معہ نقرئی ہودج اور کچھ تحفے بھیجے، لیکن اورنگ زیب نے قبول کرنے سے انکار کیا کہ یہ تحفہ جات اس کی توقع کے خلاف تھے۔ اس انکار نے عبداللہ کو مجبور کیا کہ وہ اور دو ہاتھی، ایک لاکھ ہن مقررہ خراج سے اور ایک بڑا ہیرا جو وہ پہلے شہنشاہ کو بھیجنا چاہتا تھا یہ سب اس نے اورنگ زیب کو بھیج دیے۔ اس بار شہزادہ نے مطمئن ہو کر تحفے قبول کیے۔ اس طرح سے گولکنڈہ کے بادشاہ کی کھال ہر لائق موقعہ اور ہر بہانے سے کھینچی گئی۔

میر حفیظ اللہ کی سفارت

۱۶۳۶ء کی ابتدائی جولائی میں ایک شاہی سفیر میر حفیظ اللہ گولکنڈہ پہنچا۔ حسب معمول اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ۲۰ جولائی کو وہ بادشاہ کی خصوصی

پیش کیا گیا۔ اس نے چند مینا کاری کے برتن اپنے آقا کی طرف سے عبداللہ قطب شاہ کو نذر کیا۔ پیشوا شیخ محمد نے اس کی بڑی شاندار دعوت کی۔ اس کی واپسی حسب ہدایت شاہجہاں آنے والے نومبر میں ہوئی۔ قطب شاہ نے اس کو ۴ ہزار ہن اور ایک ہیرا ساٹھ رتی وزن کا بادشاہ کے لیے دیے۔ لیکن بدقسمتی سے عبداللہ کے سفیر مرزا محمد جوہر کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے میر حفیظ اللہ کو رکنا پڑا۔ اور وہ جنوری ۱۶۴۳ء کے پہلے روانہ نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ مرزا نامر تھا۔ اس کے بعد ۱۶۴۳ء میں شافیہ شاہجہان کا سفیر ہو کر آیا۔ سدس مہینے کے قیام کے بعد دسمبر میں اُسے واپس جانے کی اجازت ملی۔ میر فصیح الدین اس کے ساتھ شہزادے اورنگ زیب کے پاس گیا۔ دو لاکھ ہن اور قیمتی تحفے اس کے لیے بھی لے گیا۔[101]

۱۶۴۴ء میں نظام الدین احمد عبداللہ قطب شاہ کی اپنی تاریخ ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سے گولکنڈہ سلطنت کی اطلاعات منتشر صورت میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ دہلی اور حیدرآباد درباروں کے تعلقات رسمی طور پر قائم تھے، حقیقتاً خوشگوار نہ تھے۔ برابر بقایا خراج کی شکایت اور ادائیگی نہ ہونے پر سخت گیری کی دھمکی دی جاتی تھی۔ چنانچہ جب شایستہ خان دکن کا ناظم تھا اور اس نے بھی جب بقایا کی یاد دہانی کے لیے عبداللہ کو لکھا، عبداللہ نے جواب میں لکھا کہ بقایا ادا کرنے کا میں خاص خیال رکھونگا۔ فی الحال دو لاکھ ہن بھیجے جا رہے ہیں باقی رقم بھی جلد ہی ادا کر دی جائے گی۔ واضح رہے کہ بقایا صرف زر مبادلہ کی قیمت کے اختلاف کی وجہ سے تھا۔[102]

اورنگ زیب کی نیابت سلطانی دوسری بار

جب اورنگ زیب دوسری بار ۱۶۵۳ء دکن میں نائب سلطان ہو کر آیا تو اس کا رویہ قطب شاہ کے ساتھ اور سخت ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ بقایا فوراً ادا کیا جائے ورنہ وہ اپنے علاقہ کا ایک حصہ چھوڑ دے۔ جیسے کہ سالانہ باج گزاری کا بوجھ دو لاکھ ہن کافی نہ تھا۔ شہزادے نے اب اس بقایا کا تقاضا کیا جو زر مبادلہ کی قیمت کی کمی بیشی سے گزشتہ تمام سال میں ہوا تھا۔ اس طرح قطب شاہ کے کاندھے پر بیس لاکھ روپیہ کا مزید بار ڈالا گیا۔ ایک اور بھی وجہ شکایت کی یہ پیدا کی گئی کہ بغیر اجازت کے عبداللہ نے کرناٹک کا علاقہ کیوں فتح کیا؟ ان سب باتوں کو ہوا دینا میر جملہ کا معاملہ تھا۔

گولکنڈہ پر چڑھائی۔

ظاہر ہے عبداللہ قطب شاہ ان بعید از قیاس مطالبات کو پورا نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے شہنشاہ اور شاہزادہ دونوں کا عتاب نازل ہوا۔ نازک صورت اس وقت پیدا ہوئی جب ۲۱ نومبر ۱۶۵۵ء میں میر جملہ کے خاندان اور اس کے لڑکے محمد امین کو نافرمانبرداری کے الزام میں اس نے قید کر دیا۔ اورنگ زیب نے فوراً اس بات کی شکایت اپنے باپ سے کرتے ہوئے گولکنڈہ سے

جنگ کی منظوری کی درخواست کی۔ شاہی احکام کی منظوری کی اُمید پر اس نے اپنے بیٹے محمد سلطان کو ناندار
یں فوج اکٹھا کرنے کا حکم دیا۔ اس درمیان میں اُس نے اپنے باپ کا فرمان عبداللہ قطب شاہ کے پاس بھیجا۔
اس کو حکم دیا گیا کہ میر جملہ کے خاندان کو رہا کر دے اور اس کو شاہی دربار تک آنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرے۔
اس لیے کہ وہ ۵ ہزار کا منصب دار ہے۔ قطب شاہ نے ان احکام پر توجہ نہ کی۔ اورنگ زیب نے اپنے لڑکے کو گولکنڈہ
پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ محمد امین کو رہا کر کے اس کے پاس بھیج دیا گیا تھا لیکن پھر بھی شہزادے محمد نے چڑھائی
کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ وہ حیدرآباد پہنچ گیا اس کو لوٹا مارا اور غارت کیا۔

عبداللہ گولکنڈہ بھاگ گیا اپنے کو قلعہ میں اس نے محفوظ کر لیا وہ روزانہ شہزادے محمد کے پاس سفیر
بھیجتا تھا۔ اطاعت اور صلح کی درخواست کرتا تھا لیکن آخر لڑکر بغیر باپ کے آئے ہوئے کچھ نہ کر سکتا تھا۔
اورنگ زیب ۶ فروری ۱۶۵۷ء کو آیا اور اس نے گولکنڈہ کا محاصرہ کرنا شروع کیا۔ اس درمیان میں عبداللہ
نے ایک طرف تو اورنگ زیب کو راضی کرنے کی پوری کوشش کی اور دوسری طرف شہنشاہ اور اس کے ولی
عہد دارا کو خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ باوجود اورنگ زیب کی اس پُرجوش درخواست کے کہ گولکنڈہ کا
الحاق کر لیا جائے۔ شاہ جہاں نے لڑائی ختم کرنے اور صلح کا حکم دیا۔ بادشاہ کے حکم بجا آوری کے پیش نظر
اورنگ زیب نے ۳۰ مارچ کو محاصرہ اٹھا لیا لیکن باوجود ۱۶۵۷ء کے معاہدہ کے گولکنڈہ اور دلی میں کشمکش
جاری رہی۔ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی شاہانہ پالیسی
آگے بڑھائی۔

باب ۸

ماوراء النہر

مغلانِ اعظم کے حملے آباؤ اجداد کے ممالک کو واپس لینے کے خواب نے ہندوستان کے مغلیہ حکمرانوں کے خیال کو سولہویں اور سترھویں صدی میں مشتعل کر دیا۔ چونکہ ان لوگوں کی رگوں میں تیمور کا خون تھا۔ اس لیے انہوں نے خیال کیا کہ ماوراء النہر ان کا قانونی ورثہ تھا۔ شمال کے اس بنجر علاقہ کو انہوں نے ہمیشہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ سمرقند اور بخارا کو واپس لینے کے لئے بابر نے اپنے مذہبی شعور کو بھی قربان کر دینے میں دریغ نہ کیا۔ ہمایوں کی نقل و حرکت بدخشاں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اکبر کو عبداللہ خان ازبک ایسے زبردست حکمران کا سامنا تھا اس لیے وہ صوبہ کابل سے آگے قدم نہ اٹھا سکا اور جب دکنی لڑائیوں سے اُسے فرصت ہوئی تو اس کا ذہن اپنے بیٹے کی بغاوت میں مرکوز ہو گیا۔ جہانگیر نے بادشاہی تو باپ کا حوصلہ پایا تھا لیکن عملی ذہانت نہ ملی تھی۔ پہلے خسرو کی بغاوت اور اس کے بعد اندرونی معاملات کی صورت نے باہر کے کسی علاقہ کو قبضہ میں لانے کی اجازت نہ دی تھی۔ اس لئے اس کے عہد حکومت میں ماوراء النہر کے دوسرے حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔

استراخانان اس وقت یہ ملک استراخانان کی زیر حکومت تھا۔ یہ لوگ چنگیز خان کی اولاد کی ایک شاخ میں سے تھے۔ دو صدی تک یہ گمنامی میں رہے۔ آخر کار ان کے اخراج کا باعث بنا روسی اقتدار کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لیے کوئی نئی سرزمین تلاش کریں۔ اور یار محمد خان بمعہ اپنے لڑکے جانی خان کے ترکِ وطن کر کے ماوراء النہر چلا گیا۔ یہاں ان کا خیر مقدم شیبانی اسکندر خان نے کیا اور اپنی لڑکی زہرہ خانم کی شادی ۱۵۶۷ء میں یار محمد سے کر دی۔ اس کے بعد سے استراخانیوں نے اپنے کو اس نئے وطن کی سیاست سے وابستہ رکھا۔ قسمت کی بہت سی الٹ پھیر کے بعد یار محمد کے بیٹے

کا پوتا امام قلی ۱۶۱۱ء میں سمرقند کے تخت کا مالک ہو گیا۔ شاہانہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد امام قلی نے اپنے بھائی نظر محمد سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا۔ اس کو بلخ کا علاقہ سپرد کیا۔

امام قلی کا رویہ جہانگیر کے ساتھ

جب شاہ عباس اول نے قندھار فتح کیا (۱۶۲۲) امام قلی نے عبدالرحیم خواجہ کو مغلیہ دربار میں بھیجا اور پیشکش میں کہلا بھیجا کہ اگر شہزادہ شاہجہاں کی قیادت میں اس صوبہ کو آپ واپس لینا چاہیں تو میں اتحاد عمل کے لیے تیار ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے متحدہ فوجوں سے خراسان فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں اس نے بتایا کہ مفتوحہ علاقہ دونوں شرکت کرنے والی جماعتوں میں تقسیم ہو جائے۔ لیکن یہ منصوبہ کبھی عمل میں نہ آ سکا۔ عبدالرحیم لاہور میں شہریار اور جہانگیر کے انتقال کے بعد کے واقعات دیکھنا چاہتا تھا۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد آگرہ آیا۔ بہت اعزاز کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا۔ نئے شہنشاہ نے اس کا اتنا احترام کیا کہ اس کی سفارش پر عبداللہ خان فیروز جنگ کی خطائیں معاف کر کے باعزت اس کی جگہ پر بحال کر دیا۔

نظر محمد کا کابل پر حملہ

امام قلی ایک صلح پسند بادشاہ تھا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہ کی کہ مغل شہنشاہ سے تعلقات خراب ہوں۔ لیکن اس کا بھائی نظر محمد بیقرار امنگوں کا آدمی تھا۔ بلخ کا باجگزار علاقہ اس کی تگ و دو کے لیے بہت کم تھا۔ لیکن اپنے فراخ دل بھائی کی طاقت ور شاہانہ ہستی سے ٹکر لینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اتفاق سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک ایسا طوفان آیا کہ اس کو بڑا اچھا موقعہ اپنے علاقہ میں اضافہ کرنے کا ملا۔ جہانگیر کے جانشینی کے لیے شہریار اور داور بخش نے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ مغلیہ دربار انتشار کا مرکز بن گیا۔ علاوہ بریں اس موقعہ پر مغلیہ اقتدار کابل میں بڑی نیچی سطح پر آ گیا تھا کیونکہ سرحدی قبائل نے مغلیہ فوج پر ایک مصیبت ڈھا دی تھی۔ ان حالات میں باوجود بڑے بھائی کی مخالفت و نصیحت کے نظر محمد نے کابل فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

اس نے اپنے لڑکے عبدالعزیز کو اس کے اتالیق عبدالرحمان بی کے ہمراہ بطور ہراول بھیجا۔ وہ کوچ کرتے ہوئے ضحاک تک پہنچے اور مغلیہ سپہ سالار خنجر خان کو قریب قریب اچانک پا لیا۔ لیکن آخرالذکر نے اطمینان سے قلعہ کے تحفظ کا انتظام کیا اور جب ازبک ہراول دستہ قلعہ کے پھاٹک سے قریب ہوا، تو باہر نکل کر اس نے سب کو مار بھگایا۔ دوسرے روز یعنی ۸ مئی ۱۶۲۸ء کو نظر محمد خاص لشکر لے کر اپنے بیٹے کی کمک کو آ گیا۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کی ناکامیاب کوشش کی۔ اس ناکامی نے اسے مشتعل کر دیا۔ اس نے اپنے افسروں کی بری طرح خبر لی۔ ایک بار پھر اس نے اپنی فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ایک بڑے پیمانے پر حملہ کیا۔ لیکن خنجر خان نے اسے شدید نقصانات کے ساتھ پسپا کر دیا۔ اب چونکہ ضحاک میں ذرا بھی وقت ضائع

کرنے کا موقع نہ تھا اس نے اس مقام کی تسخیر اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جب تک کابل نہ فتح کر لے۔ نذر محمد نے محاصرہ اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

جب اس نے دیکھا کہ غوربند اور چاریکاراں کے راستے اس کے لیے بند ہو گئے ہیں تو وہ سیاہ سنگ کے راستے سے برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھا۔ عیاری اور طاقت کے ساتھ وہ پغمان میں داخل ہوا اور بے رحمی کے ساتھ پورے ضلع کو برباد کر دیا۔ دوسرے کوچ میں وہ کابل سے دس میل کے فاصلے پر رک گیا۔ یہاں سے اس نے شاہی حکام کو خطوط بھیجے۔ ان سے دلفریب انعامات کا وعدہ کیا اور خوفناک انتقام کی دھمکی بھی دی۔ اس کے قاصد نذر خواجہ اور کل بابا نے محافظ دستہ کے نمائندوں سے دہلی دروازہ [illegible] نے خط کا مذاق اڑایا اور صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہٹیں گے۔ شہنشاہ کی وفاداری کا [illegible] کیا اور قاصدوں کو جواب دیا کہ وہ اپنے آقا سے واپس جانے کی درخواست کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اس شاہی فوج کے ہاتھوں ان کا برا انجام ہو جو تیزی سے کمک کے لیے آ رہی ہے۔

لیکن اس انتباہ کا اثر نذر محمد پر کچھ نہ ہوا کیونکہ اس کا ارادہ تھا کہ ہندوستانی کمک کی آمد سے پہلے ہی اپنا کام مکمل کرے۔ وہ شہر کابل کی طرف اس لیے بڑھا کہ قلعہ کا محاصرہ کرے۔ ۲۹ مئی ۱۶۲۸ء اس کے خبر رساں نہر قستح کے کنارے اور بی بی ماہرو پر نظر آئے۔ شاہی فوجیوں نے دیہہ افغاناں کے ٹیلے اور مہدی خواجہ کے مقبرے پر اپنے کو اس طرح جما لیا کہ مخالف فوج کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ ملے۔ دونوں فوجوں میں دن بھر جھڑپیں ہوتی رہیں۔ شام کو مغل قلعہ میں چلے گئے۔ اب راستہ صاف دیکھ کر نذر محمد شہر میں داخل ہو گیا۔ اپنے قیام کے لیے اس نے عبد الرحمان بیگ ترنابی کا گھر منتخب کیا۔ یہ مقام قلعہ کے شمال میں تھا۔

دوسرے دن اس نے خندقوں سے قلعہ کے محاصرہ کی ابتدا کی۔ محافظ دستہ نے حملہ آوروں پر زبردست آتشباری کر کے ڈرانے کی کوشش کی لیکن دشمن بے خوف ہو کر اس خندقوں کا جال پھیلاتا رہا۔ آخر کار وہ قلعہ کی خندق کے بہت قریب پہنچ گیا۔ اس نے توپ لگا کر قلعہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس یورش نے محافظ دستے کو گھبرا دیا۔ کیونکہ وہ لوگ محاصرہ کے لیے پوری طرح تیار نہ تھے نہ اتنے آدمی تھے نہ غلہ تھا کہ صورت حال برقرار رکھی جائے۔ روز بروز حالت نازک ہوتی جاتی تھی۔ آخر کار خواجہ ابوالحسن کا ایک متعلق میر موسیٰ قلعے سے باہر نکلا۔ محمد باقی بی قلماق کی خندقوں کو بے کار کر دیا بڑی تعداد میں ازبکوں کو قتل اور ان کے توپ خانے کو پامال کر دیا۔

شاہجہاں کا اقدام

اس درمیان میں کابل کے حملے کی خبر بڑی تیزی سے دربار میں پہنچی۔ ۲۰ جون ۱۶۲۸ء کو شہنشاہ نے مہابت خان کو حکم دیا کہ فوراً محافظ دستہ کی کمک کے لیے روانہ ہو جائے۔

لیکن کابل کے نئے گورنر لشکر خان نے جس نے حال ہی میں اپنا عہدہ سنبھالا تھا راستہ میں خبر سنی تو اپنی رفتار تیز کرکے وہ پشاور پہنچا۔ اپنے لڑکے سزاوار خان کو ایک فوجی دستہ دے کر آگے بھیجا۔ ظفر خان کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ جائے۔ لشکر خان خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ خطرناک صورت حال کو محسوس کرکے اس نے مہابت خان کے آنے کا انتظار کیا۔ جلال آباد کی طرف بڑھتا گیا وہاں سے نیرو لا پہنچا۔ یہاں طوغائی کے آدمی اس کو مل گئے۔ انھوں نے آرام کرنے کی رائے دی۔ لیکن یہ تجویز اس نے رد کر دی۔ اور گندا ماک کی طرف بڑھا۔ یہاں پہنچ کر وہ دو روز اس لیے رکا کہ اپنا بندوبست مکمل کرے۔

نذر محمد کی پسپائی

یہ سن کر کہ شاہی فوج کابل سے چوبیس میل کے فاصلے پر "باریک آب" پہنچ آئی ہے نذر محمد نے محاصرہ اٹھالیا۔ بگرام کی طرف واپس ہوا تاکہ لشکر خان سے جنگ کرے۔ آخر اللہ کریلچ کے سردار سے تیغ آزمائی کا بے حد مشتاق تھا۔ فوراً ہراول دستہ سے جا ملا۔ لشکر خان کی تیزی نے نذر محمد کو خوف زدہ کر دیا اور اب اپنی نازک حالت کا اسے احساس ہوا۔ وہ ایک غیر ملک میں تھا اس کی فوج سمندری قزاقوں اور کرائے کے سپاہیوں کا اجتماع تھی جو صرف اس لیے جمع ہو گئے تھے کہ غارت گری کا زریں موقعہ تھا۔ محاصرہ شروع ہوتے ہی اس میں سے بہت سے لوگ اپنی لالچ آسودہ کرنے کے لیے ادھر ادھر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نذر محمد کی فوج خالی ہو گئی۔ ایسی فوج سے کہ مغلوں کی منظم و مرتب فوج کا مقابلہ کرنا شکست سے ہمکنار ہونا تھا۔ علاوہ بریں ضحاک کی چوکی اب تک مقابلہ کر رہی تھی اور اگر شکست اس کو ہوتی تو یہ قطع دستہ اس کے پسپا ہونے کا راستہ بھی کاٹ دیتا۔ ان سب باتوں کو سوچ کر نذر محمد نے فیصلہ کیا کہ جنگ کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ ۲۰ راگست ۱۶۲۸ء کو اپنے ملک کی طرف واپس ہو گیا۔ لشکر خان ایک ہفتہ بعد کابل میں داخل ہوا۔

نذر محمد کے پسپا ہونے کی خبر مہابت خان کو سرہند میں دی گئی۔ وہ یہاں رک گیا کہ شہنشاہ کا حکم اب کیا ہوتا ہے۔ شہنشاہ نے اسے واپس آنے کا حکم دیا اور معتقد خان کو مرحوم بادشاہ کے حرم کو لانے کے لیے لاہور بھیجا۔ حملہ آوروں کی عائد کردہ مصیبتوں سے ساکنان کابل کو چھٹکارا دلانے کے لیے شہنشاہ نے ایک لاکھ روپیہ حاجت مندوں اور غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجا۔

کابل پر نذر محمد کے ناکام حملے کے باوجود اس کے بھائی امام قلی سے دوستانہ تعلقات رکھنے میں شاہجہان کو کوئی امر مانع نہ ہوا۔ چنانچہ ۳ر نومبر ۱۶۲۸ء کو اس نے حکیم حاذق کو سفارتی مقصد کے ساتھ بخارا کے دربار میں بھیجا۔ اس کے ساتھ محمد صدیق خواجہ ابن متوفی عبدالرحیم خواجہ بھی گیا۔ جو تحفہ جات بھیجے گئے ان میں جواہرات اور دوسرے ہندستانی سامان مالیتی ڈیڑھ لاکھ روپیہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ۳۰ ہزار روپیہ

صدیق خواجہ کو اور دس ہزار روپیہ اس کے چچا حسن خواجہ کو بھیجے گئے۔

امام قلی کے پاس سفیر بھیجا گیا

امام قلی کو جو خط بھیجا گیا اس میں کئی باتوں کا ذکر آتا ہے مثلاً جہانگیر کے نام جو خط امام قلی نے بھیجا تھا اس کی رسید عبدالرحیم خواجہ کا رخصت جانا، اس کا آگرہ پہنچنا، اس کی وفات، بعد ازاں یہ بھی لکھا ہے کہ شہنشاہ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی ایک سفیر بھیجنا چاہتے تھے لیکن خواجہ کی اچانک موت نے معذور رکھا۔ کابل پر نذر محمد کا بے وجہ حملہ کرنا اور شاہی افواج کے ہاتھوں اس کے ہار جانے کا ذکر کرنے کے بعد یہ خط اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اگر اس کی (نذر محمد کی) ناعاقبت اندیشی سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو تو اس کے دور کرنے اور دونوں حکومتوں میں خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لیے وہ حکیم حاذق کو روانہ کر رہا ہے۔[9]

شاہجہاں کے یہ عمل و رجحان جو ایسے موقع پر ظہور میں آئے بڑی دور اندیشی پر مبنی تھے۔ شمالی سرحد پر امن کی ضرورت تھی اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ نذر محمد اپنی خطر پسندی کا اعادہ کرے۔ مغلوں اور ماوراء النہر کے حکمرانوں کے دیرینہ خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنے کی خواہش اور امام قلی کو خوش اخلاقی سے خط لکھنے سے شاہ جہاں کا مقصد یہ تھا کہ نذر محمد اپنی قوم میں چشمِ ملامت سے دیکھا جائے اور وہ کوئی ہمدردی یا امداد بخارا دربار سے نہ حاصل کر سکے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ تحریر اس کے لیے آگاہی کا بھی کام دے۔ دہشت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے سنہ ۱۶۲۹ء میں شاہی افواج نے اس استراخانی سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا جو بامیان میں تھی۔

نذر محمد صلح کرتا ہے

اس تحریک کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ نذر محمد خاموش ہو گیا۔ کہہ سکتے ہیں کہ مغل شہنشاہ کے لیے اس نے صلح روّیہ اختیار کر لیا۔ لیکن یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی کہ بعد میں اس نے دوستانہ تعلقات کیوں قائم کیے۔[1] ۱۶۳۲ء میں اس نے وقاص حاجی کو مغل دربار میں بھیجا۔ وہ اسی سال کی ۲۰ جولائی کو دربار میں حاضر ہوا۔ شہر آگرہ کے باہر اس کا استقبال معتمد خان نے کیا۔ اس کو شہنشاہ کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوئی۔ اس سفیر نے اپنے آقا کی طرف سے شاہ جہاں کو گھوڑے، اونٹ اور بلخ کی دوسری چیزیں نذر کیں۔ ان سب کی قیمت ۱۵ ہزار روپیہ تھی۔ شہنشاہ نے اس دن اس کو ایک اعزازی خلعت، ایک جواہرات سے مرصع تلوار قیمتی چار ہزار روپیہ عنایت کی۔[11]

تربیت خان کا مقصد

دوسرے سال فروری ۱۶۳۳ء میں شاہ جہاں نے تربیت خان کو بطور جوابی سفیر نذر محمد کے دربار بھیجا۔ اس موقع پر جو خط اس کو بھیجا گیا اس میں دکنی فتوحات کا مختصر تذکرہ ہے۔ وہاں کے متعدد قلعہ جات پر قبضہ کرنے کا بھی ذکر اختصار کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد

شاہجہاں اس مبارک باد کو قبول کرتا ہے جو اس کی تخت نشینی کے سلسلے میں کسی قدر تاخیر سے پہنچی اور اس عفو تقصیر کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو کابل پر حملہ کرنے کے سلسلے میں سفیر نے زبانی پیش کی ۔ اس کے بعد شاہجہاں نذر محمد پر اعتراض کرتے ہوئے شکایت کرتا ہے کہ میری تخت نشینی کی خبر سننے کے بعد تم نے کابل پر بلا وجہ حملہ کیا اپنے ہی ہم مذہب کے ملک پر حملہ کرنا نامعقول رویہ تھا خط ختم ہونے کے بعد ہی ہگلی کی تسخیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے[۱۲]۔

شاہجہان کا کابل جانا

اس کے بعد کے چھ سالوں تک سفیروں کا تبادلہ دونوں درباروں میں اکثر ہوا فروری ۱۶۳۹ء میں شاہ جہاں لاہور سے کابل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل مقصد ماوراالنہر کی سڑکوں اور دوسرے خبر رسانی کے رابطوں کا پتہ چلانا تھا ۔ اس نے اپنے جانے سے پہلے شہزادہ دارا کو ایک بڑی فوج اور محاصرہ کرنے والی توپوں کے ساتھ روانہ کر دیا ۔ تو شیرا پر شاہجہان نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کے پاس پچاس ہزار فوج ہے۔ کابل پہنچ کر سعید خان کو حکم دیا کہ ان سرحدی قبائل کو زیر کرے جن کو کاہ مرد کے گورنر یلنگ توش نے نذر محمد کے اشارے پر اپنا لیا تھا۔ شاہ جہاں کی کابل میں موجودگی اور اس کے جارحانہ انداز نے فطری طور پر امام قلی اور نذر محمد کو چونکا دیا ۔ ان لوگوں نے کم مایہ تحفے اور خراسان فتح کرنے میں اپنے اتحاد عمل پیش کرنے کے لیے اپنے سفیر بھیجے ۔ لیکن ابھی اس اقدام کا معقول وقت نہ آیا تھا۔ اس لیے قاصدوں کو موافق جوابات دے کر شاہجہاں ۱۵ ر اگست ۱۶۳۹ء کو لاہور واپس آیا۔

ماوراالنہر میں سیاسی انقلابات

لیکن چند مہینوں میں ماوراالنہر کے سیاسی معاملات پر دور رس انقلابات اثر انداز ہوئے۔ ان سے باخبر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ مغل شہنشاہ کے اس رجحان کی تشکیل کا اندازہ ہو سکے جو استراخانیوں سے وابستہ تھا۔ طولانی حکومت جو قدرت نے زیادہ لوگوں کو اس ملک میں عطا نہیں کی وہ امام قلی کو نصیب ہوئی ۔ بالآخر وہ آشوب چشم میں مبتلا ہوا اور تھوڑے ہی دن میں اندھا ہو گیا۔ بھائی کی بدقسمتی نذر محمد کی خوش قسمتی ہو گئی ۔ اس نے انتظامی امور کے لیے اپنی خدمات پیش کیں ۔ امام قلی اپنے بھائی کی موافقت میں دستبردار ہونے کے خلاف نہ تھا لیکن جب اس نے اپنے حکام سے مشورہ کیا تو انھوں نے نذر محمد سے سخت تنفر کا اظہار کیا۔ اس کے بعد امام قلی نے جواب میں لکھا کہ ابھی کچھ دن تک انتظار کرو ۔

لیکن نذر محمد بے چین تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے قاصد کو روک لیا اور اپنے لڑکے عبدالعزیز کو حصار اور سمرقند فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ بخارا کے امرا کو قابو میں لانا آسان ہے ۔ لیکن آخر الذکر اپنے جوش و خروش میں امام قلی کو سمرقند لائے تاکہ نذر محمد کے منصوبے ختم ہو جائیں ۔

بدقسمتی سے حصار جلد ہی فتح ہو گیا۔ اور اندر سے حکمران کے ساتھیوں کا جوش بلبلا کی طرح ختم ہو گیا۔ ان میں سے بہتوں کو نظر محمد نے ملا لیا اور امام قلی قریب قریب تنہا رہ گیا۔ بھائی کے سامنے سر جھکانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ۱۰ر اکتوبر ۱۶۴۲ء کو نظر محمد کے نام سے خطبہ پڑھا گیا۔

تین دن بعد امام قلی حج کے لیے مکہ روانہ ہوا۔ وہ ہندوستان ہو کر جانا چاہتا تھا مگر جب نظر محمد نے اس راستہ سے جانے کی اجازت نہ دی تو وہ خراسان ہو کر گیا۔ نظر محمد کا کینہ جن میں نہیں ختم ہوا اس نے اپنے بھائی کا سارا املاک ضبط کر لیا۔ اس کی بیوی اے خانم کو روک لیا۔ شکاری کتے کی طرح مرد تک اس کا پیچھا کرتا رہا اور آخر میں شاہ ایران سے قاصدوں کے ذریعہ یہ التماس کی کہ امام قلی کی امداد نہ کی جائے۔ شاہ ایران نے اس التماس پر اعتنا نہ کی۔ اس نے پناہ گزیں کا خیر مقدم کیا حسن سلوک سے پیش آیا۔ اس کے حصول مقصد میں ہر طرح کی مدد کی۔ امام قلی نے ۸۲ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔

نظر محمد نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگرچہ وہ اپنے بھائی کی سلطنت پر قابض ہو گیا ہے لیکن اس کو وہ عزت نصیب نہیں ہوئی جو عوام میں اس کے بھائی کی تھی۔ انتظامی امور کی سخت گیری نے لوگوں کو اس سے بیزار کر دیا۔ اس نے نااہل افسروں کو برطرف کر دیا۔ یہ بھی کوشش کی کہ جاگیردارانہ نظام ختم کر کے اس کی جگہ نقد روپیہ دے دیا جایا کرے۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ سیورغال اپنے ہاتھ میں لے کر مذہبی پیشواؤں کو بھی ناراض کر دیا۔ اس کے خلاف جذبات بڑی تیزی سے مشتعل ہوئے لیکن مخالفت اس وقت تک پس پردہ بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے خوارزم کے حکمران اسفندیار خان کے مرنے کے بعد خوارزم فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی۔ اس کے لڑکے بہرام سلطان کے اتالیق باقیہ مس نے تاشقند میں فوراً علم بغاوت بلند کیا۔ یہ تحریک اس آگ کی ابتدا ثابت ہوئی جو اس کی ساری سلطنت میں پھیل گئی۔

نظر محمد نے اپنے دیوان بیگی عبدالرحمان کو بغاوت ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ تاشقند پہنچ کر اس نے عیاری سے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ سن کر باغیوں نے خوجند پہنچا اور امام قلی کے ایک پوتے سنجر کے 'خان' ہونے کا اعلان کر دیا۔ نظر محمد نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے عبدالعزیز کو روانہ کیا۔ عبدالعزیز خجند روانہ ہوا۔ اس نے ۱۵ دن تک قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ بخارا کی فوج باغیوں کی تحریک سے متفق ہو گئی اور عبدالعزیز سے مطالبہ کیا کہ ان کی مخالف بلخی فوج کو برخاست کر دے اور اپنے کو خان بخارا ہونے کا اعلان کر دے۔ عبدالعزیز نے چار و ناچار یہ تجویز مان لی۔ اپریل ۱۶۴۵ء میں اس کے نام سے "اور تپاہیں" خطبہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد وہ سمرقند چلا آیا۔

نظر محمد کا زوال ان حالات کی اطلاع نظر محمد کو قرشی میں ملی۔ چونکہ عبدالعزیز اور اس کے جنگ جو

ساتھیوں نے پہلے ہی بخارا لوٹ لیا تھا اس لیے پناہ لینے کے لیے وہ بلخ گیا۔ عبدالعزیز بخارا و سمرقند کی خانیت سے آسودہ نہ ہوا۔ اس نے چاہا کہ اپنے باپ سے جتنا علاقہ وہ چھین جھپٹ کر لے سکے لے لے۔ چنانچہ اس نے حصار اور ... چار جو ... کی تسخیر کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ نذر محمد نے ان متعلقات کو بچانے کے لیے سبحان قلی اور عبدالرحیم کو بھیجا لیکن ... درمیان میں کاہ مرد پر مغلوں کے قبضہ کر لینے سے اس کے سامنے ایک نیا خطرہ آ گیا۔ اس نے سبحان قلی ... عبدالرحیم دونوں کو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے واپس بلا لیا۔

...جہاں کی پیش قدمی

ماوراء النہر کے تنازعات پر مغلیہ شہنشاہ معاندانہ مسرت سے نظریں ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنے آباؤ اجداد کے ملک لینے کا منصوبہ اس طرح تیار کیا کہ پہلے وہ بدخشاں ... ے۔ اس ارادہ کے تحت ۲۸ مارچ ۱۶۴۵ء کو اس نے اصالت خان کو کابل بھیجا تاکہ وہ امیرالامراء ... خان کے مشورے سے مناسب انتظام کرے۔ دوسرے افسروں کا ایک حصہ بھی ساتھ ہی روانہ کیا۔ ان ... افسروں کے نام یہ ہیں۔ مثلاً بہادر خان، رستم خان، قلیچ خان۔ نجابت خان نظر بہادر، رائے سنگھ ... کے بھیجنے کا منشاء یہ تھا کہ وہ امیرالامراء کی مدد کریں، کیونکہ اسی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ... لحاظ سے موقع و محل و انتظام مرتب کر لے۔

... کی فتح اور شکست

جون ۱۶۴۵ء کی ابتدا میں غوربند کے تھانیدار خلیل بیگ نے کابل آ کر اصالت خان کو بتایا کہ کاہ مرد کی تسخیر اس وقت آسان ہے کیونکہ اس کا سپہ سالار تردی ... عبدالعزیز خان سے حصار بچانے کی مہم پر سبحان قلی کے امداد کے لیے گیا ہے۔ محافظ دستہ کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ امیرالامراء کے مشورہ سے اصالت خان نے ایک ہزار فوج خلیل بیگ کے زیر قیادت دی۔ وہ کاہ مرد پہنچا اور بغیر زیادہ کاوش کے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اپنی ناتجربہ کاری و غرور سے اس نے قلعہ پوری فوجی حفاظت سے محفوظ نہ کیا۔ صرف پچاس سوار اور چند بندوقچی چھوڑ کر ضحاک واپس چلا گیا۔ اس درمیان ... جب نذر محمد نے مغلیہ جارحانہ اقدام کی خبر سنی تو اپنے افسروں کو مدافعت کے لیے روانہ کیا۔ عبدالرحمان اور ... دی علی نے مختصر سے محافظ دستہ کو بھگا کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے پسپا ہونے والوں پر حملہ کر کے اکثر سپاہیوں کو مجروح کر دیا۔

...صالت علی کی ناکام کوشش

آنے والے واقعات کی نوعیت سے بے خبری میں اصالت علی کاہ مرد کی فوری تسخیر سے پُر ہمت ہو کر ۲ اگست ۱۶۴۵ء کو بدخشاں کی مہم کے لیے کابل سے چل پڑا۔ ... ہفتہ بعد علی مردان اپنی فوج لے کر اس کی امداد کو گیا۔ اس نے ہندوستان سے مزید کمک آنے کا بھی انتظار نہ ... کیونکہ اس نے سوچا کہ ... راستہ میں ان کو کاہ مرد نکل جانے کی خبر ملی لیکن وہ لوگ

وہ لوگ غوربند کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ اس مقام پر خلیل بیگ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مہم جاری رکھنے کی نا ممکنات پر زور دیا کیونکہ بدخشاں کی سڑکیں تنگ اور غذا اور چارہ حاصل کرنے کی صورتیں ناپید ہیں۔ شاہی فوج موسم سرما کی آمد سے خوفزدہ تھی اس لیے سرحد کے بعض علاقوں پر لوٹ مار کر کے وہ لوگ کابل واپس چلے گئے۔

جگت سنگھ کی تگ و دو

اس کے بعد راجہ جگت سنگھ نے مغل عظمت کی بحالی کے لیے ایک مردانہ وار کوشش کی۔ امیر الامرا کی اجازت سے ۱۵؍اکتوبر ۱۶۴۵ء کو کابل روانہ ہوا اور دل کی تنگ گھاٹی سے خوست میں داخل ہوا۔ اس کے بعد وہ سراب کی طرف چل پڑا۔ یہاں زبردست برفباری نے اسے تین دن روک رکھا۔ مقامی باشندوں کی تجویز سے "سراب" اور "اندرآب" کے درمیان اس نے ایک جگہ منتخب کی ایک لکڑی کا قلعہ اور پتھر کی فصیل بنائی، دو کنویں بنائے تاکہ پانی کی رسد پوری طرح رہے۔ ابھی مشکل سے تیاریاں مکمل ہوئی تھیں کہ کفش قلماق ایک زبردست فوج لے کر راجہ کو بھگانے کے لیے آگیا۔ لیکن راجہ بڑی بہادری سے لڑا۔ اس نے قلعہ بچا لیا دشمنوں کو بھگا کر پنج شیر واپس آیا۔

اپنے مقبوضات بچانے کی نذر محمد کی کوشش

اس زمانے میں نذر محمد بڑی دشواریوں میں تھا۔ اس کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ در اصل امن و چین ماوراء النہر میں مفقود ہو گیا تھا۔ خانت گردوں کا جتھا ملک بھر میں اپنا کام کر رہا تھا۔ اپنی ستم گری میں وہ لوگ نہ عمر کا خیال کرتے تھے نہ مذہب کا۔ ایمان دار اور بے ایمان میں فرق بھی نہ کرتے تھے۔ حصار میں انھوں نے سید ابراہیم ایک گوشہ نشین درویش کو معہ چار سو طلبا کے قتل کر دیا۔ بے حیائی سے قرآن مجید بھی جلاتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چنگیز خان کا دَور پھر آگیا۔ با ایں ہمہ حصار واپس لینے کی ایک آخری کوشش نذر محمد نے کی۔ اپنی ساری فوج وہاں بھیج دی۔ اس کے لڑکے عبد العزیز نے بھی مقبوضات کے لیے ایسا ہی کیا۔

مخالف فوجیں حصار قلعہ سے چند میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہوئیں۔ ایک غیر فیصلہ کن لڑائی۔ دونوں طرف کی فوجوں میں بددلی کی ایک نمایاں لہر پیدا ہوئی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ماوراء النہر کی "خانیت" معلق رہی۔ دونوں جانبوں نے اپنے افسروں سے درخواست کی کہ وہ جلد سے جلد اس محاذ پر آجائیں کیونکہ یہ طے تھا کہ اس دوڑ میں جیتنے والا ہی تاج و تخت کا مالک ہوگا۔ عبد العزیز بڑی تیزی سے حصار کی طرف روانہ ہوا اس کی فوج کی اکثریت نے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ نذر محمد اپنے دوستوں کی احتیاطی رائے پر عمل کر کے بلخ میں رکا رہا۔ اس نے موقع کھو دیا! عبد العزیز نے اپنے تازہ دم سپاہیوں کی مدد سے ترمذ کا محاصرہ کیا۔ اسی مقام پر بلخ کے بعض سربرآوردہ خواجگان نذر محمد کی طرف سے پیغام صلح لے کر آئے۔ عبد العزیز اس پر راضی ہو گیا کہ بلخ اس کے باپ کے قبضے میں رہے۔ وہ بخارا کی طرف واپس گیا۔ لیکن یہ وقتی صلح تھی نذر محمد نے اپنی سلامتی کو خطرے میں دیکھ کر شاہ جہاں سے امداد کی

درخواست کی۔[۴۹]

نذر محمد کا سفیر

۸ جنوری ۱۶۴۶ء کو اُس کا سفیر نظر بی حضور شہنشاہ پیش کیا گیا اس نے اپنے آقا کا خط اور ساتھ ہی ساتھ وہ تحفے جو شہنشاہ کی خدمت میں بھیجے گئے پیش کیے۔ شاہ جہاں خط پڑھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا تھا کیونکہ ایک ایسا موقعہ آگیا تھا کہ وہ دنیا پر یہ ظاہر کر سکے کہ طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کی مدد کرنی چاہیے لیکن دراصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے خاندان کی ایک دیرینہ تمنا کا تصور کر رہا تھا۔ یہ تمنا اس کا نامور جد امجد اکبر بھی پوری نہ کر سکا تھا۔ موقع آگیا تھا کہ اس کی شہنشاہیت نیک ارادوں کے سائے میں بڑھے اور کامیابی کی اس کو ساری امیدیں تھیں لیکن بدقسمتی سے ان مشکلات کا اندازہ اس نے بالکل غلط کیا جو تیمور کے ملک واپس لینے کی راہ میں حائل تھے۔ بمین ایشیا کی شان و شوکت نے اس کی آنکھوں کو چوندھیا دیا۔

شاہ جہان کا جواب

اس نے فوراً نذر محمد کو جواب بھیجا جس میں اس کے خط پانے کی رسید تھی۔ لیکن عبارت کے مبہم ہونے اور ماوراءالنہر کی صحیح سیاسی حالت پر اس کی خاموشی کی شکایت بھی تھی۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ نذر محمد کے پاس بجز بلخ کے اب کچھ نہیں اور اس ملک میں بغاوت کے شدید آثار پیدا ہو گئے۔ ہیں شہنشاہ نے اپنا فرض سمجھا کہ بہ لحاظ دیرینہ دوستانہ تعلقات اور مذہبی یگانگت کے اس کی امداد کو چل پڑے۔ چنانچہ اس خیال سے اس نے لاہور چھوڑا کابل پہنچا۔ جہاں سے اس نے شہزادے مراد کو ایک زبردست فوج کے ساتھ بدخشان بھیجا۔ تاکہ غارت گروں سے ملک کو نجات دلائے اور اس کی (نذر محمد کی) ہدایات کا انتظار کرے۔ اس طرح امید سے بھی زیادہ امداد کی درخواست پر شہنشاہ نے تیز رفتاری سے جواب دیا۔

مراد کی مہم

حقیقتاً شاہ جہان کو فی الحال اپنی فتح میں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ قاصد کے آتے ہی اس نے بڑے ایما نے پر تیاریوں کا حکم دیا۔ خوش قسمتی سے سلطنت میں اس وقت کامل سکون تھا۔ شہزادہ مراد اس مہم کا سپہ سالار تھا۔ اس کے ساتھ پچاس ہزار سوار دس ہزار پیدل مع بندوق اور توپ چلانے والوں کے تھے۔ قریب قریب حکومت کے سارے مشہور فوجی افسران اس کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے۔ فوج حسب دستور سات حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ قلب فوج کا سپہ سالار شہزادہ تھا۔ اس کی نیابت میں علی مراد خان اور نجابت خان وغیرہ تھے۔ اور قلیج خان شاہ بیگ خان، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ وغیرہ کے زیر قیادت میمنہ تھا اور میسرہ کی لگام رستم خان، دولت خان وغیرہ کے ہاتھ میں تھی۔ دائیں فوجی دستہ اصالت خان، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ وغیرہ کے سپرد تھا اور بائیں پہلو پر ایک دستہ خلیل اللہ خان، راجہ پہاڑ سنگھ کی ماتحتی میں تھا ہراول دستہ بہادر خان، وبیٹھل داس راؤ ستر سال ہاڑا کی زیر نگرانی تھا اور قلب کا اگلا حصہ مرزا نوروز اور لہراسپ خان وغیرہ کے ہاتھ میں تھا۔ قلب کے اگلے دستے کو چھوڑ کر تخمیناً ۲۲۰ افسر ساری فوج میں تھے۔ یہ رعب دار

فوج ۱۱ فروری ۱۶۴۶ء کو کابل روانہ کی گئی۔

فوج کو ہدایات

حسب معمول شہنشاہ نے جنگ کرنے کی تفصیلات بتائیں۔ فوج کو گکھڑوں کے علاقے سے گزرنا ہے اور اٹک اور حسن ابدال ہو کر جانا ہے۔ کیونکہ ان اضلاع میں غذا اور چارہ کافی ذخیرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ موسم بہار کی ابتدا میں جب کابل کی سڑک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتی ہے اس وقت شہزادہ اور اس کی فوج کا ایک حصہ پشاور کے راستے سے جائیں اور دوسرا حصہ زیرین بنگش ہو کر گزرے۔ کابل میں دونوں حصوں کے یکجا ہونے پر قلیچ خان، خلیل اللہ اور مرزا نوزاد، کاہ مرد اور غوری پر حملہ کریں۔ وہاں سے پوری فوج بدخشان میں داخل ہو۔ اس پار اور بلخ پر قبضہ کرے۔

اس فوجی ہدایات سے شاہ جہاں کا اصل مقصد نمایاں ہوتا ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر سارا ماوراءالنہر قبضے میں آئے تو کم سے کم بدخشان ضرور فتح ہو جائے۔ غالباً وہ اس پر رضامند تھا کہ بلخ نذر محمد کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔ آخرالذکر سے اُمید کی جاتی ہے کہ مغل شہنشاہ کی برتری تسلیم کرے گا لیکن اس کے افسروں کی بد دلی اور شہزادے کی ناعاقبت اندیشی نے سارا منصوبہ تباہ کر دیا۔

بدقسمتی سے شہزادہ مراد ابتدا ہی سے اپنے باپ کی طرح مہم کا دلدادہ نہ تھا۔ وہ سست رفتاری کے ساتھ روانہ ہوا جس پر بادشاہ نے تیز رفتاری سے چلنے کی تنبیہ کی وہ ۱۵ مئی ۱۶۴۶ء کو کابل پہنچا اور ۹ دن بعد بہادر خان اور اصالت خان کی قیادت میں ایک دستہ اس لیے روانہ کیا کہ تل سے برف ہٹا دے۔ خود وہ ۲۲ مئی کو کابل سے روانہ ہوا تین منزلیں طے کرنے کے بعد وہ چاری کراں پہنچا اس مقام سے قلیچ خان اور دوسرے لوگ بھیجے گئے کہ غوری اور کاہ مرد پر قبضہ کریں۔ شاہزادہ خود بدخشان کے لیے روانہ ہو گیا۔

قلیچ خان کی کامیابی

قلیچ خان اور اس کے فوجی ایک بڑے تنگ راستہ سے چلے یہ ممکن نہ تھا کہ پوری فوج ساتھ چل سکے اس لیے کئی حصوں میں تقسیم کر دی گئی وہ غوربند پہنچا۔ پنج شیر کی نشیبی زمین سے داخل ہوئے اور کابل کی سرحد ۱۳ جون کو پار کیا۔ سرحد پر قلیچ خان کو بلخ سے آتے ہوئے سرداروں سے معلوم ہوا کہ کاہ مرد کے محافظ دستے کو شاہی فوج کی نقل و حرکت کی کوئی خبر نہیں ان کے ڈرانے کے لیے۔ قلیچ خان نے خلیل بیگ کو احدیوں اور بندوقچیوں کا ایک دستہ دے کر محافظ دستہ پر اچانک حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ خلیل بیگ کے قلعہ تک آنے کا علم کسی کو نہ ہوا۔ محافظ دستہ نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیے۔ قلیچ خان ۱۶ جون کو یہاں پہنچا۔ دو روز کے قیام کے بعد غوری کی طرف بڑھا یہ مقام بھی کسی سخت لڑائی کے بغیر فتح ہو گیا۔

اس اثنا میں شہزادہ مراد درۂ تل کی طرف بڑھا اور اصالت خان کی ماتحتی میں ایک دستہ فوجی دیکھ

بحال کے لیے بھیجا۔ آخرالذکر نے پہاڑی پر چڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ راہ نشیب ڈیڑھ گز برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ علی مراد خان کے آدمیوں کو سڑک صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ سڑک اتنی چوڑی ضرور ہے کہ ایک بار برداری کا اونٹ اس پر سے گذر جائے۔ یہ کام آہستہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵ رجون سے پہلے شاہ پرست پہاڑی پار کر کے سراب داخل نہ ہو سکے۔ یہاں خسرو بیاہ لینے کے لیے شہزادہ کے پاس آیا۔ پہلے اصالت خان نے اس کا خیر مقدم کیا۔ شہزادہ مراد نے اس کو دربار بھیج دیا۔

قندوز پر قبضہ

اب ساری فوج یکجا ہو کر چل پڑی۔ سراب اور ڈیہہ تاجیکان سے گزرتے ہوئے نارن پہنچی۔ یہاں سے ایک فوجی دستہ اصالت خان کی قیادت میں آگے روانہ کیا گیا کہ وہ دشمنوں سے قلعہ قندوز چھین لے۔ شاہ محمد قطغان نے جی بھر کر ضلع کو لوٹا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے مغلوں کی پیش قدمی کے خوف سے قلعہ خالی کر گیا۔ اصالت خان کا راستہ بالکل صاف تھا۔ اس نے ۲۲ رجون کو قندوز پر قبضہ کر لیا۔ شہنشاہ نے راجا راج روپ کو وہاں کا سپہ سالار بنا دیا۔ باشندوں کی ہمت افزائی اور قبائل کی غارت گری کی تلافی کے لیے پچاس ہزار روپیہ ان لوگوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

شاہ جہان کی ہدایات مراد کو

اس طرح بدخشان شاہ پرستوں کے قبضہ میں آگیا اور وہ بلخ کی مشرقی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں شہزادہ مراد کو شہنشاہ کا خط ملا۔ اس میں حکم تھا کہ نذر محمد سے اچھا سلوک کیا جائے۔ اگر وہ معقول و فرمانبردار رہے تو اس کو بلخ دے دیا جائے۔ مزید یہ کہ اگر نذر محمد کا ارادہ سمرقند و بخارا کے لیے جنگ کرنے کا ہو تو شہزادہ کو اجازت ہے کہ وہ ہر طرح کی امداد کرے۔ اس طرح شہنشاہ نے اپنے بیٹے کو ایک پوشیدہ اشارہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو بلخ پر قبضہ کیا جائے اور اگر قابل عمل ہو، تو آموں کے اس پار بھی شمشیر زنی کی جائے۔ اس خط کے ساتھ ایک دوسرا خط نذر محمد کے نام تھا اور حکم تھا کہ اس کو پہنچا دیا جائے۔

جب شہزادہ مراد اور علی مراد خان خلم پہنچے تو انھوں نے اسحاق بیگ کو شہنشاہ کے خط کے ساتھ نذر محمد کے پاس روانہ کیا۔ آخرالذکر نے بظاہر بڑی خندہ پیشانی سے نامہ بر کا خیر مقدم کیا مگر خط کا مضمون پڑھ کر در اصل وہ بہت پریشان ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی مایوسی حق بجانب تھی۔ اس نے مغلوں کو اپنی مدد کے لیے دعوت دی تھی لیکن اب اس کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ آخرالذکر اس کی تکلیفات کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ بدخشان کے تسلط نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور شہزادہ مراد کا اتنی زبردست فوج کے ساتھ بڑھنے سے یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی دوستانہ پہلو نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک حد تک اس کی گھبراہٹ بلا وجہ تھی۔ اس کے مشیر کار جو مغلوں کے دشمن تھے انھوں نے اس خطرہ کا احساس بڑھانے

اگر وہ بلخ میں قیام کرتا تو ممکن ہے اس کی گھبراہٹ اور بے چارگی میں کچھ کمی آجاتی جو بعد میں اس کے فرار ہونے پر آئی۔

نذر محمد کی سراسیمگی

اسحاق بیگ نے نذر محمد کے دربار کی سراسیمگی دیکھی، بلکہ اس کے بعض ساتھیوں کی مغلوں کے خلاف حقارت آمیز باتیں بھی سنیں۔ اس نے شہزادے سے استدعا کی کہ وہ فوراً بلخ آجائے۔ راستے میں نذر محمد کے فرستادہ چوچک بیگ وغیرہ شہزادے کو ملے۔ اپنے آقا کا ایک خط اُسے دیا۔ اس میں درخواست تھی کہ تین دن کا وقت دیا جائے کہ میں مکّہ جانے کی تیاری کروں۔ لیکن شہزادے اور علی مردان خان نے اس کو نذر محمد کی چالبازی سمجھی اس لیے وہ لوگ سیدھے بلخ چل پڑے شہر سے چار میل کے فاصلہ پر قیام کیا۔ اسحاق بیگ نے واپس ہوکر اپنی اس خبر کی تصدیق کی جو اس نے بھیجی تھی۔ اس کے بعد ہی بہرام اور سبحان قلی معہ بلخ کے امراء کی ایک جماعت کے شہزادے مراد کی خدمت میں آئے۔ آخرالذکر بڑے تپاک سے ملا۔

نذر محمد کا فرار ہونا

۲۰ر جولائی بروز جمعرات شہزادہ نے بلخ کے لیے کوچ کیا۔ اس نے توپ خانے رستم خاں اور میر قاسم کی معیت میں آگے روانہ کیا۔ حکم دیا کہ بلخ کے قلعہ میں داخل ہوجائیں شہزادہ نے چار طاق کے جلکا شتر خاور چہانمک کے سامنے اپنا خیمہ نصب کیا اپنی فوج کو ہوشیار رہنے کا حکم دیا۔ ایک بار پھر اسحاق بیگ کو نذر محمد کے پاس بھیجا گیا کہ سمجھا بجھا کر اسے شہزادے سے ملنے پر تیار کرے۔ لیکن مغل فوج کے رویہ نے اسے خوفزدہ کردیا اور اس نے خفیہ طور پر قلعہ سے بچ کر نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنی نقل و حرکت کو راز رکھنے اور شبہ دور کرنے کے لیے اس نے ظاہر کیا کہ جتنا بھی ممکن ہے میں اپنا بیش قیمت خزانہ لیے جا رہا ہوں۔ اگرچہ بعد میں اپنے لڑکوں سبحان قلی اور قتلق محمد کے ساتھ موقع پر جاکر جتنا ممکن تھا اپنا بیش قیمت خزانہ لے گیا۔ اگرچہ رستم خان قلعہ میں داخل ہوچکا تھا لیکن اس نے آہنوں چہانمک پر پہرہ نہیں لگایا۔ نذر محمد ایک ایسے دروازے سے نکل گیا جو اس کے آدمیوں کی نگرانی میں تھا۔

بلخ پر قبضہ

اس کے فرار کی خبر تیزی سے شہر میں پھیلی۔ لوگوں میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی۔ بدکار جماعت نے آزاد ہوکر لوٹ مار شروع کردی۔ بہت کچھ نذر محمد کا خزانہ اس کے ہاتھ آگیا لیکن دوسرے دن جب خلیل اللہ خان اور ملتفت خاں کو پھر امن قائم کرنے کا موقعہ ملا تو انھوں نے ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ کے جواہرات، پوشاک، پچیس ہزار گھوڑے اور تین ہزار نر و مادہ اونٹ جو کہ نذر محمد ازبکوں کی دستبرد سے بچالیا۔ نذر محمد کے دو لڑکے بہرام اور عبدالرحیم معہ اہل و عیال لہراسپ کے سپرد کیے گئے۔ سنگر اللہ عرب کو شہر کو توال مقرر کیا گیا۔ ۷ر جولائی ۱۶۴۶ء کو شہزادہ شہر میں داخل ہوا۔ ترندکا

قلعہ بھی قبضہ میں آ گیا۔ بلخ کی تسخیر مکمل ہوگئی ہو

نذر محمد کا تعاقب

نذر محمد کے فرار ہونے کی خبر ملتے ہی شہزادے مراد نے بہادر خان اور اصالت خان کو پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے شبرغان میں اُسے جا لیا۔ ایک تیز جھڑپ کے بعد اسے شکست ہوئی۔ وہ اندخد کی طرف بھاگا۔ سبحان قلی کے ہمراہ اس کے ملنے والے کچھ لوگ اس کا ساتھ چھوڑ کر بخارا چلے گئے۔ اندخد پر اس کو تین سو کا ایک فوجی دستہ مل گیا۔ اس کے ساتھ وہ مرو کی طرف بڑھا۔ خراسان میں داخل ہوا اور مشہد پہنچا۔ وہاں کے ناظم مرتضیٰ قلی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ۱۵ دن کے بعد جب معلوم ہوا کہ نذر محمد میمنہ جانا چاہتا ہے تو مرتضیٰ قلی خان نے اس کے گھر پر پہرہ لگا دیا۔ نذر محمد کو بڑا رنج ہوا بادشاہ کے مروجہ خط کا انتظار کیے بغیر وہ اصفہان روانہ ہوگیا۔

شاہجہان کی مسرت

جب شاہجہان کو بلخ فتح ہونے کی خبر ملی تو وہ بے حد مسرور ہوا۔ آٹھ دن جشن منائے جانے کا حکم صادر ہوا۔ سمرقند اور بخارا کی تسخیر اس کو قریب قریب یقینی معلوم ہوئی۔ درباریوں نے مبارک بادیں پیش کیں۔ شعرا نے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مناسب تاریخی مصرعے نظم کیے۔ سب میں زیادہ بہتر ناصرائے شیرازی کی نظم تھی۔ شہنشاہ نے کافی تعریف کی۔ احکام صادر ہوئے، کہ جن افسروں نے اپنے فرائض ہمت و استقلال سے ادا کیے ان کو انعامات دیے جائیں۔ بہادر خان، اصالت خان جیش داس راٹھور، روپ سنگھ، رام سنگھ راٹھور پر شہنشاہ کی خاص نظر عنایت ہوئی ان لوگوں کو اعلیٰ منصب پر مامور کیا گیا۔[۲۲]

مراد واپس آنے کی درخواست کرتا ہے

ابھی مشکل سے جشن ختم ہوا تھا اور نئے مفتوحہ علاقات کا بندوبست بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ شہزادہ مراد کے واپس آنے کی تکلیف دہ درخواست پر شاہجہان کو تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا۔ شہزادہ نے باپ سے درخواست کی تھی کہ اس کو اجازت دی جائے کہ یہاں کا انتظام کسی افسر کے سپرد کر کے وہ بلخ سے واپس ہو جائے۔ شہنشاہ نے شہزادے کو اس بے تکی درخواست پر بہت ڈانٹا۔ حکم دیا کہ وہ جہاں ہے وہیں رہے اور ملک کے انتظام کی دیکھ بھال کرے۔ علاوہ بریں شاہ جہاں نے شہزادہ مراد کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا کہ اس کا ارادہ سمرقند اور بخارا کی فتح کے بعد اسے ماوراالنہر میں نائب بادشاہ بنانے کا ہے لیکن یہ دلکش موقعہ اس کو متاثر نہ کر سکا وہ جوان اور زود رنج تھا۔ اس میں مستقل مصائب برداشت کرنے بلکہ ان کے امید افزا نتائج سے فائدہ اٹھانے کی بھی صلاحیت اس میں نہ تھی۔

وہ بار بار درخواست کرتا رہا اور اپنے باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ بغیر ایک بار اس کو دیکھے وہ بلخ

میں نہیں رہ سکتا۔ بغیر جواب کا انتظار کیے اس نے شاہ برخان سے بہادر خان، اصالت خان اور خلیل اللہ کو بھی بلا لیا۔ جوان لوگوں کی امداد کے لیے وہاں گیا تھا۔ شہزادہ نے طے کر لیا تھا کہ ان دونوں کو بلخ کی سرکار سپرد کر کے اپنے باپ کے پاس چلا آئے۔ اس معاملہ میں اور بہت سے افسران بھی اس کی ہمت افزائی کر رہے تھے جو اس غیر جاں نواز سرزمین پر سرکاری خدمات انجام دینے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے کہ جتنا غارتگروں کی لوٹ مار تکلیف دہ تھی اتنا ہی موسم کی بے رحمی دل آزار تھی۔ علاوہ بریں ان میں سے بہتوں کو شروع میں یہ خیال تھا کہ یہ مہم اپنی نوعیت کے لحاظ سے عارضی ہے اور جب ان کو محسوس ہوا کہ شہنشاہ چاہتا ہے کہ مستقل طور پر یہ لوگ یہیں رہیں تو ان کو بے اطمینانی ہوئی، شکایتیں کرنے لگے۔

سعد اللہ خان کا مقصد شاہجہان نے سعد اللہ کو بھیجا کہ وہ شہزادے کو اس احمقانہ خواہش سے باز رکھے اور افسروں میں نظم و ضبط قائم کرے۔ لیکن شہزادہ مراد اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے وزیر اعظم کی رائے کی کوئی وقعت نہ کی۔ اس کو سپہ سالاری کے عہدہ سے الگ کر دیا گیا۔ بلخ کی گورنمنٹ کے لیے نئے انتظامات کیے گئے۔ بہادر خان اور اصالت خان کو بلخ کا بندوبست لامحدود اختیارات کے ساتھ سپرد کر دیا گیا۔ نجابت خان نے بدخشان کے انتظامات کی ذمہ داری لینے سے انکار کیا تو قلیچ خان کو اس کی جگہ تعینات کیا گیا اور رستم خان کو اندخود، کا انتظام سپرد کیا گیا۔ بلخ کے مروجہ نخاس اور رجوع نے سکوں کے بجائے نئے اور خالص سکے رائج کیے گئے۔ ہر وہ بات کی گئی جس سے وہاں کے باشندوں کو یقین آجائے کہ نو وارد یہاں رہنے کے لیے آئے ہیں۔ ۲۲ دن میں سعد اللہ اپنا کام کر کے ۷ ستمبر کو کابل واپس آیا۔

تبصرہ مغل شہنشاہ کی پُر پیچ حکمت عملی پر یہاں اختصار کے ساتھ کچھ کہنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جو کہ شاہ جہان نے بدخشان پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور یہ معلوم تھا کہ نظر محمد اور شاہ ایران میں دوستانہ مراسم ہیں اس لیے اس نے جان نثار خان کو شاہ ایران کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ اس کی غیر جانب داری حاصل ہو جائے۔ بڑی دور اندیشی سے اس نے یہ موقعہ شاہ عباس ثانی کی تخت نشینی کی تہنیت کا نکالا۔ ہنوز سفیر اصفہان راستہ ہی میں تھا کہ واقعات مذکورہ بالا بلخ میں ظہور پذیر ہوئے۔ نظر محمد اپنا وطن مغلوں کے لیے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لیکن بات بنانے یا ظاہر داری کے لیے شاہ جہاں نے ایک خط لکھ کر میر عزیز کو نظر محمد کے پاس ایران بھیجا۔

اس خط کا مضمون قابل توجہ ہے۔ اس کی ابتدا اس حوالہ سے ہوتی ہے۔ جب شہزادہ مراد بلخ کے قریب پہنچا تو نظر محمد نے سبحان قلی اور بہرام سلطان اور دیگر عائدین کو شہزادہ مراد سے ملاقات کے لیے

بھیجا تھا۔ دوسرا اقتباس طرزِ معذرت کا بہت دلچسپ نمونہ ہے۔ لکھتا ہے کہ "جب شہزادہ بلخ کے سامنے خیمہ زن ہوا تو اپنی نوجوانی و ناتجربہ کاری اور ہمراہی بزرگوں کی کاہلی و غفلت کے زیرِ اثر بعض نامناسب باتیں بھی کیں۔ مثلاً رستم خان کا قلعہ میں آپ (نذر محمد) کی موجودگی میں داخل ہونا اس قسم کی باتیں آپ کے لیے سراسیمگی و تکلیف کا باعث ہوئی ہوں گی۔ مجھے یہ باتیں سن کر بڑا رنج ہوا۔ لیکن میں امید کرتا تھا کہ آپ ہمارے یہاں آئینگے۔ کہیں اور نہ جائینگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر رضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا تھا کہ دل آزار و تکلیف دہ لوگوں سے بلخ کو پاک کر کے آپ کے سپرد کر دوں بلکہ ایک فوج بھی آپ کی مرضی پر وہاں رکھ دوں تاکہ آپ کو ماوراء النہر واپس لینے میں مدد مل جائے" شاہجہاں کے ایک دوستانہ انداز پر یہ خط ختم ہوتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ آپ جہاں کہیں آپ کے اہل و عیال کو روانہ کر دوں گا"۔

لیکن یہ پُرخلوص دوستی کا اظہار اور گہرا لگاؤ، بالکل رسمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہ واقعات کی بدلتی ہوئی کروٹ سے خوش تھا اور خط مذکورہ بالا کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نذر محمد کا مفرور ہو کر ایران جانا اس کے نزدیک نذر محمد کے ملک پر قبضہ کرنے کا اچھا خاصا جواز تھا۔ ماضی کے پاکیزہ ارادوں کا ذکر ۔ ۔ ہے مگر مستقبل کے لیے امید افزا بات نہیں۔ بالفاظِ دیگر اگر شاہ جہاں کے دل میں کوئی جذبۂ فیض تھا ۔ ۔ ۔ صاف نذر محمد کو لکھا ہوتا کہ تمھارا ملک تم کو واپس مل جائے گا۔ اگر تم اپنے وطن واپس چلے آؤ۔ لیکن ۔ ۔ کوئی بات نہیں لکھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ لکھا کہ تمھارے اہل و عیال کو واپس کر دیا جائے گا۔ خط جو شاہ جہاں نے شاہ عباس ثانی کو ارسلان بیگ سے بھجوایا تھا اس کی دو طرفی حکمتِ عملی کا غماز ہے۔

بلخ میں مشکلات

بلخ و بدخشاں کا فتح کرنا کافی آسان تھا لیکن ان علاقوں پر حکمرانی مغلیہ افسروں کو دعوتِ آزمائش تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک پوری قوم ان سے برسرِ پیکار ہے۔ باوجود کثرتِ تعداد بہتر تنظیم و تربیت کے دغاباز ازبکوں کو قابو میں لانا ناممکن تھا۔ سرحدی چوکیاں ازبکوں کے تاخت و تاراج کے لیے کھلی تھیں۔ اکثر شاہ پرست جیسے محاصرہ کے عالم میں زندگی بسر کرتے دشمنوں سے اکثر لڑائیاں ہوتیں۔ مگر بغیر کسی فیصلہ کے ان منتشر لڑائیوں کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری ہے مگر صورتِ حال پر پوری گرفت رکھنے کے لیے ایک مختصر ساخاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

مغلیہ صوبہ کابل شمال میں ہندوکش پہاڑ کی طرف پھیلا تھا اس کی سرحدی چوکی بامیان پہاڑ کے اس پار تھی۔ بلخ اور بدخشاں کی فتوحات سے مغلیہ سرحدیں ہامون کے جنوبی ساحل سے سلسلہ بہ سلسلہ الی بنجہ تک پھیل گئی۔ بلخ کا صوبہ میدان اور ہموار زمین پر مشتمل تھا لیکن بدخشاں میں جا بجا پہاڑیاں اور ڈھال کی طرف جانے والے تیز رفتار چشمے رواں دواں تھے۔ ان دونوں صوبوں کی مدافعت کا انتظام شاہی فوجوں نے جس انداز سے

کیا وہ جنگ کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ انھوں نے تین چوکیاں ایسی دو قطاروں میں قائم کیں جو متوازی تھیں۔ ایک حضرت امام سے بدخشاں کی مغربی سرحد ہوتی ہوئی ہندوکش میں خان جان اور اندراب تک پہونچتی تھی اور دوسری جو پہلی سے لمبائی میں کم تھی اندخو سے شابرغان ہوتی ہوئی بوندی ترکستان کی شاخوں میں سارپل پر ختم ہوتی تھی۔ آخرالذکر قطار کے پار مغربی چوکی میمنہ میں تھی۔ اس طرح ان دو قطاروں کے درمیان بلخ بالکل محفوظ تھا۔

اس نظم ونسق میں یہ کمی تھی کہ اگرچہ مغربی سرحد کے تحفظ کے لیے کافی احتیاطی تدبیریں کی گئیں تھیں اور اندرونی امن کے لیے بھی لیکن جانب شمال جو مقامات دریائے آموں میں دشمنوں کے حملے کیلئے زیادہ کھلے ہوئے تھے۔ ان کی محافظت پر توجہ نہ گئی۔ مشکل ہی سے کوئی مضبوط چوکی وہاں رہی ہوگی۔ آقچہ، خلم اور قندوز بہت دور جنوب میں تھے۔ اس طرح ازبکوں کی آوارہ گرد جماعت اور دوسرے قبائل کے لیے بلخ میں داخل ہو کر مغل افسروں کو پریشان کرنے کے لیے راستہ کھلا تھا۔ علاوہ بریں مفتوحہ علاقوں کے باشندے بذاتِ خود قواعد وضوابط کے پابند شہری نہ تھے۔ بہ نسبت نوواردوں کے وہ اپنے شمالی بھائیوں سے زیادہ ہمخیال وہم مذاق تھے۔

قبائل کا خروج

شاہ پرستوں کی مشکلات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ تسخیر مکمل ہونے سے پہلے قندوز پر ازبکوں کے ایک جتھا نے حملہ بھی کیا جس کو راجہ راج روپ نے پسپا کر دیا تھا۔ بعدازاں اندخود کی باری آئی جس پر اس طرح کے ایک گروہ نے حملہ کیا۔ رستم خان نے پسپا کر دیا۔ اس طرح دونوں قطاروں کی ہر چوکی ازبکوں کے خوف یا غارت گری کے لیے کھلی تھی۔ مغرب میں ان کی لوٹ مار کا سلسلہ شابرغان اور مشرق میں خان جان تک تھا۔ وہ بلخ کی سرحد تک دھاوا کرکے بدخشاں کے شمالی اضلاع سے اکثر مویشی پکڑ لے جاتے تھے۔ مثلاً رستخ، قندوز اور خان آباد سے۔ شاہی فوجوں کی تکلیف میں موسم سرما نے اپنی فطری لوازمات سے اضافہ کر دیا تھا۔ علاوہ بریں یہ لوگ اپنے دشمنوں کی سی نقل وحرکت میں تیزی نہ کر سکتے تھے۔ اکثر اوقات تو بہت تھوڑے سے دشمنوں کو ہلاک کر سکے۔

کوئی اعلیٰ سپہ سالار نہ تھا

مغلوں کے انتظام میں ایک اور کمی تھی جس نے ان کے انتظام کو کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی غیر معمولی سپہ سالار نہ تھا۔ بہادر خان، اصالت خان، قلیج خان عمل اعتبار سے ایک ہی قماش کے عہدہ دار تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انفرادی طور پر ان میں سے ہر ایک بہادر، قابل اور جفاکش تھا لیکن وہ سب مل کر ایک مشترکہ منصوبہ نہ بنا سکے۔ شاہ جہان کو اس کا احساس تھا اسی لیے وہ اس پر مُصر تھا کہ مراد وہیں رہے۔ وہ علی مردان خان کو نائب بادشاہ بنا سکتا تھا۔

لیکن اندیشہ یہ تھا کہ وہ بلخ کے باشندوں میں ہر دل عزیز نہ ہو سکے گا۔ بالآخر ملک کو مختلف افسروں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اچھا تھا کہ شاہ جہاں بلخ سے اپنی فوجیں ہٹا لیتا اور اس علاقہ کو اس کی قسمت کے سپرد کر دیتا۔ لیکن عبدالعزیز نے اس کو دور اندیشی اور چوکسی سے معذور رکھا۔ شہرت و سطوت کے ایک غلط تصور نے اس کو مائل کیا کہ وہ بھرپور کوشش کر کے اپنے آباد اجداد کے ملک میں اپنا پرچم لہراتا رہے۔

اس لحاظ سے اس نے شہزادہ اورنگ زیب کا تقرر کیا کہ بلخ میں نظم و نسق قائم کرنے کی مہم کا انتظام کرے۔ شہنشاہ نے وسیع پیمانے پر تیاری کی۔ کثیر رقم کابل منتقل کی اور پشاور سے کابل تک مناسب مقامات پر فوجیں اس کے لیے اکٹھا کر دیں کہ اس طرح تیار رہیں کہ جب کوچ کا حکم دیا جائے وہ فوراً متحرک ہو جائیں۔ ۷ اپریل ۱۶۴۶ء کو شہزادہ کابل سے کاہ مرد روانہ ہوا۔ دائرہ غازی پر قتلق محمد کی قیادت میں استراخانیوں نے راستہ روکا لیکن ایک مختصر جھڑپ کے بعد بھاگ گئے۔ وہ لوگ شاہی فوج کے اردگرد منڈلاتے رہے تاکہ اس کی رفتار سست کر دیں۔ لیکن شہزادہ اورنگ زیب اور علی مردان خان ان کو پسپا کر کے اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ لوگ ۲۵ مئی کو بلخ پہنچے۔

عبدالعزیز پوری طرح ماوراالنہر میں جم گیا تھا اور جب اس نے سنا کہ جنوب سے ایک زبردست فوج آ رہی ہے تو اس نے طے کیا کہ ایک پُر زور کوشش کر کے مغلوں کو بلخ سے باہر کر دیا جائے۔ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار فوج اکٹھا کی اور رہا مون پر چڑھائی ڈالی۔ قتلق محمد کی سپردگی میں ایک فوجی دستہ اس نے مغلوں کو روکنے کے لیے بھیجا اور دوسرا دستہ کو بیگ اغلی کے سپرد کر کے حکم دیا کہ وہ دریا پار کر کے آقچہ جا کر اپنا محاذ بلخ اور اندخود چوکی کے درمیان قائم کرے۔ جب بہادر خان نے سنا کہ مخالف پر بیگ اغلی نے دریا پار کر لیا ہے تو وہ آگے بڑھا کہ مار بھگائے لیکن شہزادہ اورنگ زیب نے اس کو واپس بلا لیا۔

۱۱؍ مئی ۱۶۴۷ء کو شہزادہ ساری فوج لے کر دشمن کو شکست دینے کے لیے آگے بڑھا۔ شاہی فوج بہت احتیاط کے ساتھ بڑھی۔ بہادر خان ہراول دستہ کا سردار تھا اور اورنگ زیب ایک ہاتھی پر سوار قلب فوج سے حکم دے رہا تھا۔ اس کے اردگرد سامان اور پیش خدمت تھے علی مردان خان پچھلے حصے کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ پیدل بندوقچیوں کی مدد سے توپ خانے نے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کیا۔ منڈلاتے ہوئے ازبکوں سے مسلسل لڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انھوں نے قتلق محمد کا خیمہ لوٹ لیا۔ آخر الذکر دائرہ غازی میں شکست اٹھانے پر بیگ اغلی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ لیکن دشمن نے بائیں بازو پر حملہ کیا جو ایک بوڑھے اور ضعیف الارادہ افسر سعید خان بہادر ظفر جنگ کی زیر قیادت کام کر رہا تھا۔ شاہی فوج ازبکوں کے دباؤ سے ہار گئی لیکن اورنگ زیب

بروقت ان کی امداد کو پہنچا اور فوج کو استحصال کلی سے بچالیا۔

بیشمار پریشانیوں میں بھی مغل فوج صبر وسکون کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ علی مردان خان کی قابلیت اور فوجی شعور نے کئی مرتبہ ان کو مصیبت سے بچایا۔ بالآخر وہ پاشائی کے قریب پہنچے یہاں اورنگ زیب نے دشمنوں کے خیمہ پر قبضہ کرلیا اور ان کاشتکاروں کو رہا کیا جو اب تک قید میں پڑے تھے۔ اس درمیان میں سبحان قلی بلخ پر حملہ کرنے کے لیے زبردست فوج کے ساتھ بڑھا۔ اس لیے ۵ر جون کو اورنگ زیب پاشائی سے واپس آیا اور دو دن بعد بخارا کی کمک فوج سے اس نے مقابلہ کیا۔ عبدالعزیز، سبحان قلی بیگ اعلی اور دوسرے سربرآوردہ افسران موجود تھے۔ تین طرف سے شاہی فوج پر حملہ کیا گیا لیکن توپ اور بندوق بازی و برتر تنظیم نے مغلوں کو پھر فتحیاب بنایا۔ ۱۱ر جون کو اورنگ زیب خیریت سے بلخ واپس آیا۔

اورنگ زیب کی ہیبت ناک جگرداری نے دشمنوں کے دل ہلا دیئے۔ اور اب عبدالعزیز صلح کی تمنا کرنے لگا۔ اورنگ زیب کو شکست دینے کی توقع خام خیالی تھی۔ ٹھنڈے دل سے شہزادے کے جنگ کرنے کا ایک مجذوب توجہ ثبوت عبدالعزیز نے بچشم خود دیکھا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن عین لڑائی میں وقت نماز مغرب آگیا جنگ اپنے پورے شباب پر تھی اور اورنگ زیب نے میدان جنگ میں جا نماز بچھائی۔ بارگاہ رب العزت میں سرتسلیم خم کیا اور نہایت اطمینان سے نماز ادا کی۔ اس عالم میں بھی بغیر زرہ بکتر کے وہ ویسا ہی رہا جیسا کہ دوران جنگ میں تھا۔ بخارا کی فوج نے یہ منظر بچشم حیرت دیکھا۔ عبدالعزیز نے مردانہ وار داد شجاعت دی۔ لڑائی بند کرادی، بآواز بلند کہا ایسے آدمی سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

لیکن عبدالعزیز کی جنگ بندی میں صرف اورنگ زیب کی بہادری ہی کارفرما نہ تھی۔ اس کی اپنی فوج جو زیادہ تر آوارہ گرد قبائل پر مشتمل تھی مغلیہ جنگ سے ناکامیابی پر کم ہوتی چلی گئی۔ ترکان بالخصوص گھوڑے بیچ کر دریائے ہامون کے پار چلے گئے۔ اس سے بھی متاثر ہو کر اورنگ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ بخارا اس کے چھوٹے بھائی سبحان قلی کے سپرد کردیا جائے۔ جب اورنگ زیب نے یہ وعدہ کرلیا کہ وہ اس مسئلے کو شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرے گا تو عبدالعزیز اپنے وطن چلا گیا۔ اس درمیان میں بلخ کے سابق بادشاہ نے بھی شاہجہان سے ایسی ہی درخواست کی۔

شابرغان سے پسپا ہو کر نظر محمد اصفہان گیا۔ اس کا شاہانہ خیر مقدم شاہ ایران نے کیا شاہ عباس ثانی نے کئی دعوتیں اپنے مہمان کے اعزاز میں کیں تاکہ اس کا غم غلط ہو جائے لیکن آخر الذکر اپنے دغاباز آدمیوں سے انتقام کے لیے بے چین تھا۔ اس نے شاہ ایران سے امداد کی متعدد درخواستیں کیں۔ شاہ عباس ثانی نے اس کے ساتھ سارو خان طالش کو معہ خراسانی وعراقی فوجیں روانہ کیں اس درمیان میں نظر محمد کو

کو بعض ازبک سرداروں کے پیام ملے۔ اس لیے اس نے ایرانی سپہ سالار کو پیچھے چھوڑ کر مرو کی طرف کوچ کیا۔ وہاں کے ناظم علی قلی خان سے رنجش تھی اس لیے شہر میں داخل ہونے کے بجائے آٹھ میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا۔

یہاں کنفش قلماق اس کو ملا۔ اس نے بخارا پر جلدی حملہ کرنے سے روکا اور ازبک دوستوں کی دغابازی سے بھی آگاہ کیا۔ بتایا کہ وہ لوگ اسے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ نذر محمد نے اپنا ارادہ ترک کیا۔ کنفش قلماق کے ساتھ ماردچاق گیا۔ یہاں بہت سے قلماق قبیلے کے لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے۔ ان حلیفوں کی مدد سے اس نے پے در پے حملے مغلوں کو اُن کی سرحدی چوکی چلئے جا کتو اور میمنہ سے ہٹانے کے لیے کیے۔ لیکن ہر بار شرمناک شکست ہوئی۔ اس خبر نے کہ اورنگ زیب ایک زبردست فوج کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس کی ہمت پست کر دی اور نذر محمد بل چراغ بھاگ گیا۔ بایں ہمہ جب اس نے سنا کہ عبدالعزیز حملہ آوروں کو پسپا کرنے کے لیے بڑھ رہا ہے تو اس نے قتلق محمد کی قیادت میں بلخ پر حملہ کے لیے کچھ فوج بھیجی لیکن یہ فوج بھی عبدالعزیز کے سپاہیوں کے ساتھ ہو گئی۔

نذر محمد بجز اس کے کچھ نہ کر سکا کہ عبدالعزیز اور اورنگ زیب کی لڑائی کے فیصلے کا انتظار کرے۔ اپنے لڑکے کی ناکامی پر اس نے ملک کی بحالی کے لیے گفت و شنید شروع کی۔ شاہ جہاں کو اب بلخ پر قبضہ رکھنا محال نظر آیا۔ بہت غور و خوض کے بعد اس نے نذر محمد کو اس کے لڑکے سبحان قلی پر ترجیح دی۔ شہنشاہ نے اس کے لڑکے سے کہا کہ سب سے پہلے نذر محمد سے معافی اور عاجزانہ اطاعت طلب کرے۔ نذر محمد گفت و شنید بڑھاتا رہا۔ آخر میں اپنے پوتوں کو بھیجا اور علالت کی بنا پر اپنی معذرت پیش کی۔ اورنگ زیب کو اس پر قناعت کرنی پڑی۔ کیونکہ موسم سرما قریب تھا اور فوج کو فاقہ کا سامنا تھا۔ ۳ر اکتوبر ۱۶۴۷ء کو اس نے بلخ چھوڑ دیا۔

نذر محمد کے آخری ایام نذر محمد کی قسمت کا مختصر حال یہاں بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اپنی سلطنت واپس پانے کے بعد وہ اپنے لڑکے عبدالعزیز کے ہاتھوں امن چین سے نہ رہا۔ بلخ کے باشندے کچھ عرصہ تک اس کے وفادار رہے بالآخر مسلسل جھگڑوں سے تنگ آکر وہ لوگ اس کے بیٹے کے ساتھ ہو گئے۔ آخر کار نذر محمد نے جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اپنے آخری ایام کو سکون کے ساتھ گزارنے کے لیے اس نے مدینہ منورہ جانے کا ارادہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑکوں سے مصالحت کرے اور انھیں دعائے خیر دے لیکن سبحان قلی نے پدرانہ شفقت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دل شکستہ نذر محمد اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ دورانِ سفر بمقام سمنان ۱۶۵۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ لیکن جب تک وہ بلخ میں صاحب اختیار

ہا مغل بادشاہ سے اُس نے دوستانہ مراسم قائم رکھے۔ کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ برابر اس کے سفیر مغلیہ دربار میں آتے رہے۔

انجام اس کے بعد ہی مغل دربار اور سیاست سے ماوراء النہر کی تاریخ کی دلچسپی کم ہو گئی۔ بابر کی ہم پیمائی کے بعد یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی جو کسی مغل اعظم نے تیمور کے مقبوضات حاصل کرنے کے لیے کی۔ اس کوشش کی ناکامی کی پہلی وجہ ملک میں زندگی بسر کرنے اور صبر آزما موسم سے گریز تھا۔ باہر کے افسروں کے مزاج و مذاق کا یہ براہ راست برعکس تھے۔ وہ لوگ جفاکش تھے۔ جنگجو چمڑے کے لباس میں رہتے تھے۔ ہندوستان کے تپتے ہوئے میدانوں میں اپنی جسمانی قوت گنوانا پسند نہ کرتے۔ اسی لیے شاہ جہاں کے افسروں کے حلیہ کا بیان ان مناسب الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ "زرد رو اشخاص ململ کے لباس میں" بلخ پر مغلوں کا قبضہ قائم نہ رہنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مقامی باشندوں کی ہمدردی ان کو حاصل نہ تھی۔ ماوراء النہر کے باشندے اس وقت بھی قبائلی سطح کی تہذیب پر تھے اور وہ بری طرح اپنے سرداروں سے وابستہ تھے۔

یہی خیال تھا جس نے شاہ جہاں کو بدخشاں کا انتظام نجابت خاں کے سپرد کرنے پر مائل کیا کیونکہ ایک زمانے میں اس کے آباؤ اجداد یہاں حکمراں تھے۔ آخری وجہ یہ ہے کہ ازبکوں اور چغتائیوں میں ہمیشہ سے مخالفت رہی اس لیے شاہی فوج کو پوری قوم سے مقابلہ کرنا پڑا۔ فطرتاً وہ وہاں دیر تک نہ ٹھہر سکے، اس لیے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش مغل بادشاہ کے لیے گراں ثابت ہوئی۔

باب ۹
ایران سے تعلقات

جب ہم عظیم مغلوں کی خارجہ پالیسی کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب ان کے ماوراءالنہر اور ایران کے تعلقات سے ہوتا ہے۔ اول الذکر کا بیان گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ اب آخر الذکر کی باری ہے۔ ایران کے بارے میں اگرچہ چغتائی حکمران دوستی اور خیر سگالی کا اظہار کرتے رہے اور باوجود اس کے کہ صفوی حکمرانوں نے بھی اسی قسم کا رویہ رکھا لیکن پھر بھی کافی ایسی شہادتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے رشک بھی کرتے تھے اور کسی کو کسی پر اعتماد نہ تھا۔ دربار ایران ہر جگہ ہندوستانی حکمرانوں کے بلند بانگ القاب کو دل سے نہیں مانتا۔ ان کا رویہ سرپرستانہ تھا۔ عصری مراسلات میں اس احسان کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جو شاہ اسمٰعیل نے بابر کے ساتھ کیا تھا اور اس پناہ کا بھی جو شاہ طہماسپ نے ہمایوں کو دی تھی۔ برخلاف اس کے شاہان مغلیہ اپنے کو شاہ ایران سے بالا و برتر تصور کرتے رہے کیونکہ ان کی سلطنت بھی وسیع تھی اور نیک نامی کی وجہ دولت بھی زیادہ تھی۔ سفیروں کے مسلسل تبادلے کے پس پشت خفیہ اطلاعات حاصل کرنے کے علاوہ یہ خواہش تھی کہ ایک سلطنت دوسری سلطنت کو اپنی شان و شوکت سے مرعوب کرتی رہے۔

قندھار کا سوال صفوی اور چغتائی خاندان کے خوشگوار تعلقات میں کبھی کبھی قندھار پر قبضہ کے لیے مزاحمت کی وجہ سے بدمزگی پیدا ہوئی۔ شاہ اسمٰعیل قندھار لینے کا خواہشمند تھا لیکن اس پر بابر نے قبضہ کر لیا۔ ہمایوں کے بعد ہلچل کے زمانے میں طہماسپ نے قبضہ کر لیا لیکن اکبر نے خفیہ طور پر واپس لے لیا۔ آخر صفوی خاندان کا سب سے زبردست بادشاہ شاہ عباس اول جب تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا مقصد قندھار کا حکمت عملی سے واپس لے لینا قرار دیا۔ خوش بیانی اور قاصدوں کی فرستادگی سے جہانگیر کا شک و شبہ دور کرتا رہا اپنے خلوص اور خوش نیتی کا یقین دلاتا رہا۔ اور یہ بھی ہوا کہ اس کا سفیر زینل بیگ ہنوز مغلیہ دربار ہی

میں تھا کہ اس نے قندھار کی دفاعی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اچانک اس پر حملہ کر کے قبضہ بھی کر لیا۔ زخم پر نمک چھڑکنے کے لیے اس نے جہانگیر کو ایک خط میں لکھا جس میں اپنی اس کارگزاری کا جواز بھی پیش کیا۔ اور مختلف بہانے بھی کیے۔

شاہ عباس اول اور شاہجہان کے ذاتی تعلقات

اس کے بعد کچھ عرصہ تک دونوں دربار کے تعلقات کشیدہ رہے لیکن ذاتی وغیر سرکاری مراسلات کا سلسلہ شاہجہان اور شاہ عباس اول میں قائم رہا۔ اوّل الذکر کا آخری خط اپنے باپ کی اطاعت قبول کرنے کے بعد کا ہے۔ لیکن جب شاہ نے شہزادہ پرویز کے انتقال کی خبر سنی تو اس نے تعزیت کے لیے جہانگیر کے پاس ایک سفیر بھیجنے کا قصد کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بختہ بیگ کو منتخب کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ سفیر ایران سے روانہ ہو خبر پہنچی کہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔ بعدازاں جب مغل دربار کے انتشار کی خبر ملی تو شاہ عباس اول نے بحری بیگ کے ہاتھ شاہ جہاں کو خط بھیجا جس میں لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں امداد کے لیے تیار ہوں۔ اس نامہ بر کا استقبال آگرہ سے باہر معتقد خان نے کیا۔ اس کو دربار میں شرف حضوری ۵ رجولائی ۱۶۲۹ء کو نصیب ہوا۔

محمد علی بیگ اور میر بارکہ

ہنوز بحری بیگ ہندوستان پہونچا بھی نہ تھا سفر ہی میں تھا کہ شاہ عباس اول کا انتقال ۹ رجنوری ۱۶۲۹ء کو مازندران میں ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا پوتا سام مرزا بد نصیب صفی مرزا کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ نئے بادشاہ نے تخت نشینی کے بعد اپنے باپ کا لقب اختیار کیا تاریخ میں وہ شاہ صفی کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنے عہد کے رسم و رواج کے لحاظ سے شاہ نے اولین فرصت میں شاہجہاں کی تہنیت کے لیے ایک قاصد روانہ کیا۔ اس کام کے لیے اس نے محمد علی بیگ کا انتخاب کر کے آگرہ بھیجا جو خط یہ قاصد لایا اس کا انداز تحریر خوشامدانہ اور اسلوب بیان پُرتکلف تھا، ایک لحاظ سے بے مطلب تھا۔ اس اثنا میں شاہ جہاں کو شاہ عباس کے انتقال کی خبر مل چکی تھی اس لیے میر بارکہ کو بالکل ایسے ہی مقصد کے لیے ایران بھیجا دونوں قاصد غالباً ایک ہی وقت میں ایک راستہ سے گزرے۔

شاہ کے نام شاہجہان کا خط

اس خط میں شاہ جہاں نے بحری بیگ کے آنے کی رسید بھیجی۔ شاہ صفی کی تخت نشینی پر مبارک باد دی۔ مرحوم بادشاہ سے اپنے دوستانہ مراسم کا ذکر کیا اور حریفوں اور دشمنوں سے مہلت پانے اور تخت نشین ہونے کا ذکر کیا اور گویا اس امداد کے جواب میں جو مرحوم شاہ نے پیش کی تھی۔ شاہجہان نے لکھا کہ وہ استحکام سلطنت میں شاہ صفی کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ خط کا خاتمہ دوستانہ مشورے پر ہوا۔ شاہ کو نصیحت کی گئی کہ وہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتا رہے۔ میر بارکہ کو شاہ کے

شرف حضوری حاصل کرنے کے لیے اصفہان میں ٹھہرنا پڑا کیونکہ شاہ ترکوں سے معروف پیکار تھا۔ اس کی واپسی پر ہندوستانی قاصد نے وہ تحفے پیش کیے جو وہ اپنے آقا کی طرف سے لے گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اپنے خط میں درخواست کی تھی کہ قاصد کو جلد از جلد واپس ہونے کی اجازت دی جائے مگر باوجود اس طلب و تقاضا کے بھی میر بارکہ کو ایک سال سے زیادہ دربار اصفہان میں روکا گیا۔

محمد علی بیگ کا خیر مقدم

جس زمانے میں محمد علی بیگ آگرہ آیا اس زمانے میں شاہجہان، خان جہاں لودی کی بغاوت فرو کرنے کے سلسلے میں دکن گیا ہوا تھا۔ لیکن جیسے ہی شہنشاہ کو اس کے آنے کی خبر ملی اس نے قاصد کے دکن تک سفر کا فوراً انتظام کرا دیا کیونکہ وہ اس کو اپنی واپسی تک رکے رہنے کی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ کرمت خان برہان پور سے ایک خلعتِ اعزازی کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ جہاں کہیں وہ راہِ سفر میں ملے خلعت سے سرفراز کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہدایت کی گئی کہ محمد علی کو مانڈو لانے کی کوشش کرے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے معتقد خان ناظم مالوہ کو متعین کیا گیا۔

مانڈو میں کچھ آرام کرنے کے بعد محمد علی بیگ دکن روانہ ہوا۔ برہان پور کے قریب افضل خان اور صادق خان نے اس کا استقبال کیا۔ جب وہ مغل شہنشاہ کی حضوری میں پیش ہوا تو اس نے شاہ کا خط دیا۔ اسی دن شاہجہان نے اس کو بیس ہزار روپیہ کے تحائف بطور انعام عطا کیے۔ ۶ دن بعد محمد علی بیگ نے وہ تحفے شہنشاہ کی نذر کیے جو ایران سے لایا تھا ان کی قیمت تین لاکھ روپیہ تھی۔ ایرانی قاصد پر شاہجہان نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی تاکہ اپنی عظمت کا سکہ جما سکے۔ ۱۹ ستمبر ۱۶۳۱ء تک محمد علی بیگ برہان پور میں قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد اس سے آگرہ واپس جانے کو کہا گیا تاکہ سفر کی تیاری کر سکے۔ لیکن میر بارکہ کی واپسی (جون ۳۰، ۱۶۳۲ء) تک محمد علی بیگ کو واپس جانے کی رخصت نہ ملی۔

قوشانج کا زمیندار مغل دربار آتا ہے

اس اثنا میں قندھار میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو بظاہر تو نہیں لیکن بباطن مغل شہنشاہ اور شاہ کے خوشگوار رشتوں میں خلل انداز ہو سکتا تھا۔ شاہ عباس اول نے جب سے قندھار پر حملہ کیا تھا شیر خان ترین اسی وقت سے ناظم خوشانج رہا۔ شاہ عباس اس کا بہت خیال کرتا تھا۔ شاہ عباس اول کے مرنے کے بعد وہ منحرف ہو گیا۔ ہندوستان اور ایران کے درمیان آنے جانے والے سوداگروں پر دست درازی کرنے لگا۔ قندھار کے ناظم علی مردان خان ایسے موقعہ کی تاک میں تھا جس سے شیر خان کی سرکوبی کر سکے۔ جب ۱۶۳۰-۳۱ء میں اس نے اپنا شہر چھوڑ کر سیوی کو لوٹنے کا ارادہ کیا تو علی مردان خان ایک ہزار فوج لے کر گیا اور خوشانج پر قبضہ کر لیا۔ شیر خان نے

مقابلہ کیا۔ جنگ ہوئی وہ ہار کر" دوکی" بھاگ گیا۔ اس کے بعد وہ ملتان کے ناظم احمد بیگ خان سے ملا۔ جس نے اس کی درخواست دربار کو بھیجی۔ یہ درخواست منظور ہوئی شیر خان شہنشاہ سے ۱۳ مارچ ۱۶۳۳ء کو ملا۔ اس کو پنجاب میں ایک جاگیر عطا کی گئی۔

صفدر خان ایران بھیجا گیا

صفدر خان ایرانی دربار میں متبادل سفیر تھا۔ ۱۶ مئی ۱۶۳۳ء کو آگرہ سے وہ ایران کے لیے روانہ ہوا۔ اپنے ساتھ شاہ ایران کے لیے ۴ لاکھ روپے کے تحفے لے گیا۔ ایرانی دربار کی تمیز و تہذیب کی نزاکتوں کو نظر رکھتے ہوئے شاہ جہاں نے سفیر کو پوری احتیاط سے کام لینے کی ہدایت کی۔ شاہ کے خط کا مسودہ افضل خان نے تیار کیا۔ اس میں شاہ جہاں نے محمد علی بیگ کی سفارت تسلیم کی۔ شاہ کو خیر خواہ اور قابل اشخاص کی قدر کرنے کی رائے دی۔ بادشاہ کے فرائض بیان کیے خان جہاں کی بغاوت، قطب الملک کی اطاعت، عادل شاہ سے جنگ، ہگلی کی تسخیر، پرتگالیوں کے جڑ سے اکھاڑے جانے کے تذکرے پر خط ختم ہوا۔ حسب معمول سفیر کی جلد واپسی کی درخواست بھی اس خط میں تھی۔

ایران میں اس کا استقبال

جب صفدر خان اصفہان پہنچا تو اسی زمانے میں شاہ صفی اردوان کے خلاف ہم سر کرکے کامیاب ہوا تھا۔ سفیر کو شرف باریابی کاشان میں ہوئی۔ شاہ جہاں کی تجویز کے خلاف اس کو زیادہ روکا گیا۔ اس کا قیام کارآمد ثابت ہوا۔ وہ شاہ صفی کے پیچھے سایے کی طرح لگا رہا اور اس نے اپنے آقا کے لیے وہی کام کیا جو زنبل بیگ نے ہندوستان میں عہد جہانگیر میں کیا تھا۔ بالفاظ دیگر اس نے شاہ جہاں کو شاہ صفی کی سیاسی مصروفیات کی ساری خبریں بہم پہنچائیں۔

شاہ عباس اول کے انتقال کے بعد کے واقعات

شاہ عباس اول کے مرتے ہی ایران کی داخلی و خارجی سکون کا نظام ٹوٹ گیا۔ دشمنوں نے اپنی جارحانہ ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ مغرب میں مراد چہارم ترکی کا "جنگ جو سلطان" اور مشرق میں ازبک اور استراخان مستقل خطرہ میں تھے۔ آخر الذکر کو خراسان کے صوبہ داروں نے متعدد بار پسپا کر دیا تھا لیکن مراد چہارم زیادہ طاقت ور اور زیادہ ضدی تھا ۱۶۳۰ء میں وہ کردستان میں داخل ہوا ایران کی ایک فوج کو شکست دے کر ہمہ دان پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے ہی سال بغداد پر اس نے ایک ناکام حملہ کیا۔ ۴ سال بعد اردوان (۱۶۳۵ء) لے لیا حالانکہ شاہ نے آئندہ سال کے موسم بہار میں واپس بھی لے لیا۔

لیکن اردوان کی واپسی مغربی سرحد پر جنگ کا خاتمہ نہ ثابت ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کردستان کے ناظم احمد بیگ خان اردلان نے ترکوں کی امداد سے بڑا انتشار پیدا کر دیا لیکن باغی اور اس کے

حلیف کو ایران کی ایک فوج نے شکست دی ۔ احمد بیگ خان مارا گیا۔ اس کے بعد ہی خبر ملی کہ مراد چہارم بغداد پر اور خراسان پر ازبک حملہ کرنے والے ہیں ۔ اسی زمانے میں ترکوں نے اروان واپس لینے کے لیے اروان پر ایک ناکامیاب حملہ کیا۔ یہ سیاسی خلل اندازیاں شاہ صفی کی زبردست پریشانی کا سرچشمہ رہی ہوں گی اور ان ہی سے ان کے دربار کی بھی فضا پراگندہ رہی ہوگی۔ تمام بدلتے ہوئے حالات صفدر خان نے اپنے آقا کو بالتفصیل لکھے ۔

جس زمانے میں شاہ صفی دشمنوں سے برسرِپیکار تھا اسی زمانے میں ہندوستانی سفیر مرزا حسین اس کے دربار میں آیا جو خط وہ لایا تھا اس میں دولت آباد کی فتح جھجار سنگھ کی بغاوت کا انسداد، بیجاپور پر حملہ اور عادل شاہ کی اطاعت پذیری اور اس کا بیس لاکھ روپیہ ادا کرنے کا وعدہ اور قطب شاہ کا چالیس لاکھ روپے ادا کرنے کا مذکور شاہ سے کیا گیا تھا۔ خط کے اختتام پر شاہجہاں نے اورنگ زیب کو دکن کا نائب سلطان بنانے کا اور اس کے آگرہ واپس آنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ سیاق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حسین جو خط لایا تھا اس کا مقصد شاہ کو ہندوستانی شہنشاہ کی دوستی کا یقین دلانا تھا لیکن حقیقت میں اس کا مقصد اس خبر کی توثیق کرنا تھا جو صفدر خان سے ملی تھی ۔

علی مردان کا سراسیمہ ہونا

دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت چند ہندوستانی امیران بالخصوص قلیچ خان نے علی مردان خان سے قندھار سے دستبرداری کی گفت و شنید شروع کی تھی ۔ آخر اللہ کرنے وزیر سارو تقی کی انتظامی سخت گیری پر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ سارو تقی نے شاہ کو باخبر کیا کہ علی مردان کے ذمّہ مال گذاری کی کثیر رقم واجب الادا ہے ۔ علی مردان خان دربار میں حساب فہمی کے لیے طلب کیا گیا تھا لیکن وہ ٹال مٹول کرتا اور بہانے بناتا رہا[۲] ۔جب زیادہ دباؤ پڑا تو اس نے کھلم کھلا وزیر اعظم پر اس کی کم اعتمادی کا اعلان کر دیا لیکن یہ وعدہ کیا کہ بارہ ہزار تومان سالانہ ادا کیا کرے گا۔ بشرطیکہ وہ آزاد رکھا جائے ۔ اس نے اپنے بیٹے محمد علی بیگ کو حاضرِ دربار کر دیا لیکن شاہ کو اطمینان نہ ہوا ۔ حالانکہ جانی خان قرچی باسی کہتا ہی رہا کہ ناظم قندھار کے ساتھ سخت گیری نہ کی جائے لیکن اس نے سیاوش قلار، اقصی کو علی مردان کی جگہ کام کرنے کے لیے بھیجا تھا ۔ اس کو حکم دیا گیا کہ جس طرح ممکن ہو علی مردان خان کو حاضر کر دے ۔

مغل افسروں سے امداد کی اپیل

اتنے بڑے لشکر کے ساتھ سیاوش کی آمد نے مردان خان کو جان بازی پر مائل کر دیا۔ اس پریشانی میں ایک اضافہ یہ بھی ہوا کہ محافظ فوج بالاتفاق اس کی وفادار نہ رہی ۔ بعض قزلباش سپاہیوں سے علیحدہ ہو کر سیاوش سے جا ملے ۔ ان حالات

میں مقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہ رہ گیا۔ شام کے انتظام کے ڈر سے اس نے قندھار کے ایک سربرآور
رمیندہ ملک مقصود کی یہ تجویز گرہ د ے۔ اسی لحاظ سے اس نے مقصود کے بھائی کامران کو عوض
مان تو قتال سپاہ سالار غزنی اور سعید خان ناظم کابل کی خدمت میں روانہ کیا- تاکہ وہ ان لوگوں سے
بیے ـ وقت پر امداد طلب کرے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے شاہجہان کو بھی ایک خط لکھا کہ اگر وہ ایک
سرب ساتھ کوئی معقول لشکر ذمہ داری لینے کے لیے بھیج دے تو وہ اس کے سپرد قندھار کردے لیکن
بعد میں جب علی مردان خان کی حالت نازک ہوئی تو اس نے بڑے جوش کے ساتھ سعید خان اور قلی
... دوبارہ اپیل کی۔

قندھار کی سپردگی

۱۴ر فروری ۱۶۳۸ء کو عوض خان ایک ہزار فوج لے کر غزنی سے روانہ ہوا بارہ دن
میں قندھار پہنچا۔ علی مردان خان نے فوراً اس کو قلعہ میں داخل کرلیا۔ ۲۰ر فروری
شاہجہاں کے نام سے خطبہ پڑھا اور ۹ رمئی مسکوک مہریں ایک عجز نامہ کے ساتھ عوض خان کے پہنچ آنے
کے متعلق دربار روانہ کیا۔ اس درمیان میں سعید خان کابل سے چل کر قلات غلزائے پہنچ گیا۔ اس پر
جلد کرکے قندھار کی طرف بڑھا، جہاں عوض خان کے آنے کے ۴ روز بعد وہ پہنچا۔

فوج میں انتشار

اس درمیان میں محافظ فوج برگشتہ ہوگئی۔ ان میں سے بعضوں نے علی مردان خان
کے رویہ پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ یہ لوگ سیاوش سے خفیہ طور پر خط و کتابت
جو ... تھے۔ اس مخالف جماعت کا سرگروہ قندھار کا قاضی محمد امین تھا۔ اس نے علی مردان خان
دی کہ مکاری و دغابازی سے وہ عوض خان کو قتل کردے۔ اس کا سر شاہ کے پاس بھیجدے
معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں سے علی مردان بہت متاثر ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا افسر شہد
... علی مردان کے پاس آگیا جس سے اس نے اپنی دماغی کشمکش کا ذکر کیا۔ اس افسر نے رائے بدلنے
کی مخالفت کی۔ اس نے سمجھایا کہ معاملات اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ آپ کا اب رویہ تبدیل کرنا
بیکار ہے۔ اس رات علی مردان آرام کی نیند سویا اور صبح کو قندھار شاہی فوج کو باقاعدہ سپرد کر دیا۔
بایں ہمہ سیاوش کی موجودگی علی مردان خان کے لیے بھیانک خواب بن گئی تھی۔ وہ متفکرانہ انداز میں
کابل اور ملتان سے آنے والی کمک کا انتظار کرتا رہا۔

شاہجہان کی ہیجان خیز مسرت

جب قلیج خان اور سعید خان کے مراسلات اور علی مردان کے خطوط
شاہ جہاں کو ملے تو وہ بہت خوش ہوا۔ دکن کی شاندار فتوحات کے
بعد قندھار پر قبضہ کو اس نے اپنی فتوحات کا سرتاج سمجھا۔ اس نے سعید خان کو فوری حکم بھیجا کہ علی مردان

خان کی امداد کے لیے روانہ ہو جائے۔ ۵ لاکھ روپیہ کابل کے خزانے سے لے لے۔ ایک لاکھ علی مردان خان کو دے دو لاکھ اپنے پاس رکھے اور بقیہ دو لاکھ ملازموں میں تقسیم کر دے۔ مزید برآں اسے حکم دیا کہ ملک مقصود اور اس کے بھائی اور علی مردان کے دوسرے ماننے والوں کو بھرپور انعامات دیے جائیں۔

قندھار کی مدافعت کے انتظامات قندھار کی مدافعت کے انتظامات مکمل کرنے کے لیے شہنشاہ نے قلیج خان کو ۵ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔ اسی کو قلعہ کی مدافعت بھی سپرد کر دی۔ یوسف محمد خان تاشقندی، ناظم بھکر اور جان نثار ناظم، ناظم سیستان قندھار کو محافظ دستہ کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا کہ اگر ایرانی سپاہ قندھار واپس لینے کی کوشش کرے تو محافظ دستہ کی لوگ مدد کریں۔ مزید احتیاطی اقدام کے سلسلے میں شاہزادہ شجاع کو ۱۲ ہزار ذات اور سات ہزار سوار کا منصب دار بنا کر کابل بھیجا گیا اس کو حکم دیا کہ اگر شاہ صفی قندھار پر حملہ کرے تو وہ قندھار پہنچ جائے ورنہ وہ خان دوران، راجہ جے سنگھ، امر سنگھ، بٹھل داس، مادھو سنگھ، پہار سنگھ وغیرہ کو بھیج دے۔ پنجاب کے ناظم وزیر خان کی رسد مہیا کرنے کے احکام صادر کیے گئے۔

ایرانی پسپائی قندھار کے واقعات پر پھر سے نظر کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہاں پہنچنے پر سعید خان نے موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا۔ محافظ فوج پر شبہ اور دشمن کا غلبہ سیاہ پوش کی موجودگی سے اس کی توجہ کا مرکز بنا اس نے باہری دشمنوں کو اکھاڑ پھینکنے اور امن قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے لڑکے اور علی مردان خان کو قلعہ میں چھوڑ کر وہ یکم اپریل کو باہر کوچ کر گیا۔ دشمن سے مقابلہ کے لیے پوری فوجی تیاری سے باہر نکلا۔ ہراول دستہ کی جھڑپ سے لڑائی کا آغاز ہوا راجہ جگت سنگھ شاہی فوج کا سرغنہ تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ہر طرف لڑائی کا بازار گرم ہوا۔ مغلوں کے داہنے بازو کی قیادت علی مردان کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھی اس کو شکست ہوئی لیکن سعید خان کی بروقت کمک نے صورت حال بدل دی۔ فوج نے دھاوا کیا اور حملہ رد کر دیا۔ لڑائی ختم ہو گئی سیاہ پوش جالندر کے اس پار بھاگا۔ شاہی فوج نے پیچھا کیا۔ اس کے سارے خیمہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ سعید خان قندھار واپس آیا۔ شہنشاہ کو اطلاع بھیجی۔ شہنشاہ نے بست اور زمین داور[۲۴] کے استیصال کا حکم دیا۔

قندھار کے قبضہ کے بعد ہنوز جابجا جھڑپیں ہو رہی تھیں کہ یادگار بیگ، سفیر شاہ صفی، صفدر خان کے ساتھ مغلیہ دربار آیا۔ جو خط وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس میں شاہ صفی کا ترکی کے طاقتور سلطان کو شکست دے کر اردان واپس لینے کا بیان بڑی شان و شوکت سے کیا گیا تھا۔ حسب معمول سفیر کا

استقبال مناسب تعظیم کے ساتھ آگرہ میں کیا گیا لیکن درباری مؤرخ، صفدر خان کے ہمراہ ہونے کا ذکر نہیں کرتے۔

صفدر خان کی واپسی

معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایران میں ابھی تک اس لیے رکا رہا کہ شاہ صفی کی تیاریوں اور رجحانات کی واقفیت حاصل کرے۔ جب وہ قندھار پہنچا تو سعید خان سے بتایا کہ اس نقصان کو شاہ نے بُری طرح محسوس کیا ہے۔ اکثر اس نے کہا کہ میں اروان یا بغداد تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن قندھار نہیں، اس کے واپس لینے کے لیے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کروں گا۔ صفدر خان نے سعید خان کو یہ بھی اطلاع دی کہ شاہ ایک زبردست فوج بھیجنے کو سوچ رہا ہے۔ لیکن مغلوں کی خوش قسمتی تھی کہ مراد چہارم کی تسخیر بغداد نے مغربی سرحد پر شاہ صفی کو پوری طرح مصروف کر رکھا تھا۔ اور جب ترکی سے صلح کرنے کے بعد اس نے قندھار کا رُخ کیا تو بڑی دیر ہو چکی تھی کیونکہ شاہ پرستوں کا اقتدار اب وہاں پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ پھر بھی شاہ نے رستم خان کو خراسان کی طرف بڑھنے اور اس مہم کے لیے فوج جمع کرنے کا حکم دیا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس منصوبہ پر عمل ہو شاہ کا انتقال ۲ر مئی ۱۶۴۲ء کو ہو گیا۔

مرزا حسین کے ایران جانے کا مقصد

مرزا حسین کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ہے۔ ایرانی دربار میں اس کا اچھا خاصا استقبال ہوا۔ شاہ صفی نے شاہ جہاں کے خط کا جواب بھی جلد ہی دیا۔ مغل شہنشاہ کو اس نے عم کے لقب سے یاد کیا۔ اس کی فتح پر اظہارِ مسرت کیا۔ لیکن دکن کے حکمرانوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ یہ فروگذاشت معنی خیز تھی چونکہ شاہ کے تعلقات بیجاپور اور گولکنڈہ سے خوشگوار تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ مغل بادشاہ نے ان کے ساتھ زیادتی کی۔ اس کے اس سیاسی احساس اور ناپسندیدگی کے اظہار کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ اس موضوع کا سارا ذکر ترک کر دیا گیا۔ ہندوستان سے ایرانی سفیر یعنی یادگار بیگ اپنے وطن ۱۶۳۹ء میں واپس آ گیا۔ جو خط وہ اپنے آقا کے لیے لے گیا اس میں شاہ جہاں نے قندھار کے حادثہ کا حق بجانب ہونا اور اپنی معذرت کا ذکر کرتے ہوئے سب کچھ فراموش کر دینے کی خواہش کی تھی۔ لیکن اس کے بعد سے ایران و مغل دربار کے تعلقات جیسے بھی رہے ہوں خوشگوار نہ تھے۔

عباس ثانی

شاہ صفی کا جانشین شاہ عباس ثانی تخت نشینی کے وقت صرف ۱۱ سال کا لڑکا تھا۔ اس کی نابالغی میں سارو تقی، بحیثیت وزیر سارے انتظامات انجام دیتا تھا۔ ایران کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کے بیرونی دشمن اس وقت سرگرم نہ تھے۔ سلطان مراد کا انتقال ہو چکا تھا اس کا جانشین ابراہیم اپنے پیش رو کی طرح حوصلہ مند نہ تھا اور ازبک قوم اپنے داخلی مصائب میں مبتلا تھی۔ فطری طور پر

ساروتقی نے موقع کو غنیمت سمجھ کر قندھار پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے رستم خان کو حکم دیا کہ پھر اس فوج کو مرتب کرے جو شاہ صفی کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ جب اس کی تیاری کی خبر شاہ جہاں کو ملی تو اس نے شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ ایک زبردست فوج لے جا کر مقابلہ کرے۔ یہ سن کر ساروتقی نے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔[۲۹]

جان نثار خان ایران روانہ کیا گیا

کشمیر سے واپس ہو کر جس وقت شاہجہان لاہور میں اس غرض سے قیام پذیر ہوا کہ یہاں سے کابل جائے اور بلخ کی مہم کی نگرانی کرے۔ ۲۶ مارچ ۱۶۴۲ء کو اس نے جان نثار خان کو بحیثیت سفیر ایران[۳۰] بھیجا۔ شاہ صفی کے انتقال کے بعد یہ پہلا مشن تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں پھر وہ دوستانہ تعلقات شاہ سے قائم کرنا چاہتا تھا جو قندھار پر قبضہ کرنے کے بعد شکست ہو گئے تھے۔ علاوہ بریں یہ ضروری تھا کہ استرا خان کی طرف سے شاہ عباس ثانی کی غیر جانب داری کا یقین حاصل کر لیا جائے کیونکہ مغل شہنشاہ اپنے حوصلہ کی تکمیل ماوراءالنہر میں کرنا چاہتا تھا۔ سفیر بھیجنے کا بہانہ شاہ عباس ثانی کی تخت نشینی پر مبارکباد دینے کو بنایا گیا۔ جو بظاہر ناموزوں تھا۔

خط کا مضمون

جان نثار خان جو خط شاہجہان کی طرف سے لے گیا وہ کافی طولانی تھا۔ عصری سیاسی حکمت عملی کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ اس میں تعزیت و تہنیت، نصیحت و معذرت کا بڑا دلچسپ امتزاج ہے۔ رنگین عبارت میں خود غرضی کی ایک لہر بھی رواں دواں ہے۔ اپنے زمانے کے حسب مذاق خط کے شروع میں حمد و نعت رسول ہے اس کے بعد چند کلمات شاہ صفی کی موت پر بطور اظہار غم ہیں۔ شاہجہاں کا کہنا ہے کہ شاہ کی موت اس وجہ سے ہوئی کہ میری تجویزوں پر عمل نہ کیا گیا۔ یہ تجویزیں اس خط میں لکھی گئی تھیں جو شاہ جہاں نے صفدر خان کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ اس کے بعد کی عبارت میں تخت نشینی پر مبارکباد ہے۔ ان سب باتوں کے بعد اصل مقصد یعنی قندھار کا ذکر آتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "ہر خاص و عام کو علم ہے کہ علی مردان کا قلعہ ہماری سرکار کے سپرد کرنا ضرورت کا تقاضا پورا کرنا تھا یہ دست برداری رضاکارانہ تھی اس کا فعل اس لیے جائز ہے کہ شاہ مرحوم نے زیادتیاں بھی کی تھیں۔ اس کے بعد شاہ جہاں درخواست کرتا ہے کہ علی مردان خان کا وہ لڑکا جو اب تک ایران میں تھا براہ کرم ہندوستان واپس بھیج دیا جائے۔ دوستانہ امداد کی پیشکش پر خط ختم ہو جاتا ہے۔ جان نثار خان کا یہ مشن خاطر خواہ کامیاب ہوا۔

لیکن ایران کے بادشاہ کی خاموشی شاہ جہاں کے دوستانہ اظہار کا نتیجہ نہ تھی۔ اس بے عملی کی اصل وجہ خود ملک کی سیاسی حالت تھی۔ شاہ عباس ثانی ہنوز نابالغ تھا، کم سن کے انتظامیہ کی خرابیوں نے کسی خارجی حکمت عملی کا نفاذ پائداری کے ساتھ نہ ہونے دیا تھا۔ وزیر ساروتقی بنیادی طاقت اپنے ہاتھوں

میں سمیٹ رہا تھا، ایک ایک کر کے اپنے مخالفین کو ہٹا رہا تھا۔ رستم خان اور اس کے بھائی اور میر فتح اللہ سردار توپ خانہ کو تہِ تیغ کر چکا تھا۔ اس کے اشارے پر بہت سے افسروں کو صرف اس لیے برخاست کیا گیا کہ وہ اس کی رائے سے متفق نہ تھے۔ بالآخر اس کے خلاف جذبۂ بیزاری اتنا بڑھا کہ یکم اکتوبر ۱۶۴۵ء کو اسے قتل کر دیا گیا۔[۲۲]

بلخ کی جنگ کے بعد شاہجہاں کا خط عباس ثانی کے نام

ان حالات میں شاہجہاں کو موقع ملا کہ وہ ماوراءالنہر میں اپنا جنگی منصوبہ بغیر کسی خلل کے پورا کر سکے اور اس نے بلخ پر حملہ کر دیا۔ وہاں کا حکمران نذر محمد ایران بھاگ گیا۔ شاہِ ایران سے پناہ کی درخواست کی۔ فتوحات کے بعد شاہ جہاں نے ارسلان بیگ[۲۳] کے ہاتھ عباس ثانی کو ایک خط بھیجا جس میں ماوراءالنہر کا تذکرہ کرتے ہوئے جواز کا پہلو پیش کیا۔ اس نے لکھا اس ملک میں مسلمانوں پر ستم ہو رہا تھا ان کی جان و عزت بچانے کے لیے وہ لاہور سے کابل آیا اور شہزادہ مراد کو بلخ فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ خط کی آخری عبارت قابلِ توجہ ہے لکھتا ہے "خدا کا شکر ہے کہ بلخ و بدخشاں پر قبضہ ہو گیا دعا ہے کہ اس فتح کو وہ ہمارے لیے باعث بنا دے ہم اس کے دروازے پر سائل کی طرح کھڑے ہیں کہ سمرقند و بخارا کو بھی ہمارے قبضۂ قدرت میں عطا فرمائے۔" ماوراءالنہر کی فتح و شکست دونوں جلدی ہی ہوئیں۔ پہلی اکتوبر ۱۶۴۷ء کو اس بے فیض علاقہ کو مغلوں نے خیرباد کہا۔

مغل فوجوں کی عظمت مجروح

مغلوں کی بلخ میں ناکامی نے ان کی فوجی عظمت کو ماوراءالنہر میں سخت صدمہ پہنچایا۔ یکے بعد دیگرے دونوں مہموں کی فوری فتوحات نے فوج کے سپاہیوں کو تھکا دیا اور وہاں کے صبر آزما موسم نے ان کی روح کو سرد کر دیا۔ علاوہ اس کے ۱۶۴۸ء تک شاہ عباس ثانی بالغ ہوا حکومت کی باگ ڈور اس نے اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ بہادر اور حوصلہ مند تھا۔ چاہتا تھا کہ اپنے عہدِ حکومت کو کسی نمایاں فتح سے منفرد کرے۔ اس سلسلہ میں اس کی نظر میں اس سے بڑا کوئی شاندار موقعہ نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے شہنشاہ سے تیغ آزمائی کرے۔ اس کی عظمت کا تقاضا تھا کہ قندھار واپس لے، مغلیہ فوج کی تھکاوٹ اس کے لیے ایک بڑی نعمت ثابت ہوئی۔

قندھار واپس لینے کی شاہ کی تیاریاں

شاہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں تیاریاں شروع کیں، ہندوستان تک خبر رسانی کے ہر سلسلے کو روک دیا۔ دو مغل سفیر جو اس کے دربار میں قیام پذیر تھے ان کو چلتا کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے مغربی اور شمالی سرحد کی مدافعت کے انتظام سے اطمینان حاصل کیا۔ نذر محمد کے یہاں سے عبدالغازی خان ساکن ارگنج اور سلطان

ابراہیم کی آمد سے اسے اطمینان ہوا کہ وہ ان کے صلح جویانہ ارادوں پر بھروسہ اور اطمینان بغیر کسی خلل کے پورا کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے سارے ذرائع مقابلہ کے فراہم کر سکا۔

اپنے عظیم جدِ امجد شاہ عباس ثانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے شاہ جہان کے پاس شاہ قلی بیگ کی معرفت خط بھیجا جس میں مغل بادشاہ کے اس عمل کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے نذر محمد کو بلخ واپس کر دیا۔ اور بڑی عاجزانہ درخواست کی کہ وہ قندھار چھوڑ دے۔ اس خط کا کیا جواب ہوگا شاہ کو پوری طرح معلوم تھا۔ اپنی پیش بینی کے لحاظ سے اس نے پوری فوجی تیاریوں کا حکم دیا ہر جنگی محاذ کے لیے اس نے رسد اور غلّہ فراہم کیا۔ متعدد بڑی توپوں کا انتظام کیا اور ایک بڑی فوج تیار کر کے حکم دیا کہ وہ کسی وقت بھی کوچ کے لیے تیار رہے۔ چونکہ یہ اس کے عہد کی پہلی فوجی مہم تھی اس لیے ناکامی کے خطروں کا بڑی حفاظت سے انتظام کیا گیا۔ حسب توقع مغل بادشاہ نے شاہ کا مطالبہ رد کر دیا۔ شاہ کی فوجیں قندھار کی طرف بڑھیں وہ خود بھی ۱۲ر دسمبر ۱۶۴۸ء کو قندھار پہنچا اور قلعہ پر تصرف حاصل کرنے کا فوراً حکم دیا۔

شاہ جہان کی دفاعی کوشش

شاہ عباس ثانی کے قندھار واپس لینے کی خبر نے مغلیہ دربار میں بڑی ہلچل پیدا کر دی شاہجہان مدافعت کے لیے فوراً کابل جانا چاہتا تھا لیکن اس کے وزراء جاڑے کی شدت کے مقابلہ سے خوفزدہ تھے۔ ان لوگوں نے اس کی تجویز کی مخالفت کی اس لیے شاہجہان دہلی چھوڑ کر لاہور میں رُکا تاکہ قندھار کے حالات معلوم ہوتے رہیں۔ اس ہونے والے حملہ کے پیش نظر علی مردان خان ناظم کابل نے ۵ ہزار فوج اور ۵ لاکھ روپیہ قلعہ کی مدافعت کے لیے فوراً بھیجا مگر یہ کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی۔ اس طرح شاہ جہاں کے مشیر کاروں کی بزدلی اور خود اس کی بیدار مغزی کی کمی سے شمال مغربی سرحد کے دو کلیدی قلعوں میں سے ایک قلعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

شاہ عباس ثانی کی نقل وحرکت

قندھار میں ایران کی نقل وحرکت کی تفصیل کا بیان غیر ضروری ہے۔ شاہ عباس ثانی نے تینوں قلعوں کا محاصرہ بیک وقت کیا۔ لیکن قندھار کے قلعہ پر سب سے زیادہ دباؤ ڈالا۔ بست کے ناظم پردل خان نے ایک مختصر جنگ کے بعد ہتھیار ڈال دیا اور زمین داور کے محافظ دستہ کو قندھار کے فتح ہو جانے تک مہلت دی گئی۔ دولت خان سپہ سالار کو پیچیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھی اس کی وفاداری میں متفق نہ تھے۔ شادی خان کی سرکردگی میں ایک جماعت مصر تھی کہ قلعہ فوراً دے دیا جائے۔ دولت خان کے رویّہ سے بے اطمینان ہو کر اس نے دغابازی سے قلعہ کا راز حملہ آوروں کو بتانا شروع کیا۔ ایک بار تو اس نے یہ بھی کیا کہ محافظ دستہ کی بے اطمینانی ایک پرزہ پر لکھ کر ایک تیر میں نتھی کر کے ایرانیوں کی طرف پھینک دیا۔ اس بات کی

خبر پاکر شاہ عباس ثانی نے دولت خان کو ایک ایسا خط لکھا جو دھمکیوں اور ساتھ ساتھ مصالحت سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے اپنی فوج کی طاقت کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلایا کہ وہی لشکر ہے جس نے ترکوں سے اوران چھین لیا تھا۔ اس نے دولت خان کو ایک ذی وقار عہدہ پر مامور کرنے کی اُمید دلائی بشرطیکہ وہ قلعہ سے دستبردار ہو جائے۔ شادی خان نے نامہ بر کو قلعہ میں داخل کر لیا۔ دولت خان کو اس کے آنے کی اطلاع دی۔ بجائے اس کے کہ وہ شادی خان سے سختی کے ساتھ پیش آئے اس کو کوئی عبرتناک سزا فوراً دے اس نے صرف شادی خان کو بلایا اور جواب طلب کیا۔ بعدازاں نامہ بر سے ملاقات کرنے پر وہ رضامند ہو گیا بادشاہ کا خط پڑھا، جواب میں پانچ دن کی مہلت مانگی۔ درخواست منظور ہوئی۔

قندھار کا زوال

پانچویں دن ایک ایرانی افسر علی قلی شادی خان کے حصار میں یہ پتہ لگانے آیا کہ دولت خان نے کیا فیصلہ کیا۔ اس دفعہ میں آخر الذکر نے پوری کوشش کی کہ محافظ دستہ مدافعت کے لیے تیار ہو جائے لیکن جہاں زر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں زبان کام نہیں دیتی۔ بالآخر شادی خان نے ولیس قرن بھاٹک ایرانیوں کے حوالہ کر دیا۔ اب دولت خان کی حالت ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ فوج نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ چارو ناچار دولت خان کو شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دینا پڑا۔ ۱۱ر فروری ۱۶۴۹ء میں قلعہ پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ شاہ نے یہاں کا سپہ سالار محراب خان کو بنایا اور شاہ قلی خان کو ایک معذرت نامہ کے ساتھ شاہ جہاں کے پاس بھیجا۔

تبصرہ

یہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے کہ ایران اور مغل حکمرانوں کے متضاد دعوؤں کی روشنی میں بتایا جائے کہ دراصل قندھار کس کی ملکیت تھا۔ اگر قدرتی سرحدوں کا خیال اور فضیلت وراثت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ یقیناً مغلوں کی ملکیت تھا کیونکہ دریائے ہامون ایران کی سرحدی لکیر ہے اور بابر نے بہت پہلے اس کے ابتدائی مالکوں سے لڑ کر یہ علاقہ چھین لیا تھا۔ ایرانیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ شاہ حسین ارغون نے شاہ اسمٰعیل کو اس پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی اور ہمایوں نے طہماسپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ دے گا اگر وہ اس کے ملک واپس لینے کی مہم میں مدد کرے۔ پہلی نظر میں ایرانیوں کا دعویٰ زیادہ پُر زور معلوم ہوتا ہے لیکن ہم اس امداد کی نوعیت پر غور کریں جو طہماسپ نے ہمایوں کو دی تھی اور اس رویہ کا بھی خیال کریں جو ایرانی فوجوں کا آخر الذکر کے ساتھ تھا تو شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر شاہ طہماسپ نے دو عملی کا وہ کھیل شروع کیا جس کی وجہ قندھار پر حملہ کرنے کی جنگ حریفوں کی عزت کا سوال بن گئی۔

اورنگ زیب کی پہلی مہم

جب شاہ جہاں نے دولت خان کے اس مراسلے کو دیکھا جس میں شاہ کے

قندھار پر قبضہ کرنے کی کوشش کا ذکر تھا اس نے شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ پچاس ہزار فوج لے کر قلعہ کی رہائی کے لیے فوراً چلے جائیں۔ دونوں سپہ سالار "بھیرا" میں ملے اور پشاور کی طرف بڑھے وہاں سے کوہاٹ جمرود اور جلال آباد ہوتے ہوئے ۲۵ر مارچ ۱۶۴۹ء کو کابل پہنچے۔ اس درمیان میں قندھار فتح ہو چکا تھا۔ شہنشاہ نے شہزادے کو حکم دیا کہ قبل اس کے کہ ایرانی اپنا قدم مضبوطی سے جما سکیں وہ تیز رفتاری سے وہاں پہنچ جائے۔

باوجود رسد کی قلت اور راستے میں فراہمی کی دقت کے شہزادہ اور سعد اللہ خان نے شہنشاہ کے حکم پر سختی سے عمل کیا۔ کابل میں رکے بغیر وہ غزنی روانہ ہو گئے یہاں انھوں نے ۱۵ دن قیام اس لیے کیا کہ جو کچھ غلہ مل سکے حاصل کر لیں۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر قلات غلزائی میں ۹ر مئی کو پہنچے شہنشاہ خود کابل آ گیا تھا اس کی ہدایت کے بموجب سعد اللہ خان فوج کے ۵ دستے لے کر قندھار کے محافظ لشکر کو موسم بہار کی فصل کاٹنے سے روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ ۱۴ر مئی کو یہاں پہنچا۔ شہزادہ دو دن بعد اس سے ملا۔ اسی دن قندھار کا محاصرہ شروع ہو گیا۔

بدقسمتی سے شاہی فوج کو ابتدا ہی سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ راجہ مان گوالیاری اور بہادر دل جگت سنگھ نے جوشِ جوانی میں چہل زینہ پہاڑی پر دھاوا بول دیا۔ ان لوگوں کے خیال میں اس مقام کی مدافعت بہت کمزور تھی۔ لیکن محراب خان نے خفیہ طور پر بندوقچیوں کا ایک دستہ یہاں بھیج دیا تھا جیسے ہی شاہی فوج ان کے حدود نشانہ میں آئی۔ دشمنوں نے گولی برسانا شروع کر دیا۔ قلیل سپاہ کے ساتھ راجپوت واپس آئے انھوں نے پہاڑ کے درمیانی حصہ میں لکڑی کا ایک حصار بنا لیا اور کچھ عرصہ تک اس پر قابض رہے۔

شہزادہ ہنوز قندھار کے محاصرہ میں مصروف تھا کہ اس نے قلیچ خان کو آس پاس کے اضلاع میں لوٹ مار کے لیے بھیجا۔ آخر الذکر نے کامیابی سے بست کے چاروں طرف کی فصل پر قبضہ کر لیا۔ سیستان میں خونشی پر حملہ کیا۔ اس کے بعد قباد خان اور اللہ قلی خان کو زمین داور کی غارت گری کے لیے بھیجا گیا جب یہ لوگ مال غنیمت لے کر لوٹ رہے تھے تو ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ نجف قلی میر آخور اور حاجی منوچہر کی قیادت میں ان کو دریائے ہلمند کے پار بھگا دیا۔ اس شکست پر قلیچ خان کو ناخود تک پسپا ہونا پڑا۔ وہاں سے ۲۴ میل قندھار کے جنوب مشرق میں سنگ بالا حصار پر اس نے دم لیا۔

ایرانی فوجوں کی پہلی آمد کی اطلاع اس وقت ملی جب دو ہزار آدمیوں نے اورنگ زیب کے خیمے سے چار میل کے فاصلے پر پہنچ کر بہت سے جانوروں کو قبضہ میں کر لیا۔ لیکن ان کا پیچھا کیا گیا۔

اور وہ مال غنیمت چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سعد اللہ کے مشورے سے قلیچ خان کی امداد کے لیے رستم خان کو بھیجا گیا۔ ۲۵ اگست کو بالاحصار میں وہ قلیچ خان سے ملا۔ یہاں سے جاسوس بھیجے گئے کہ ایرانیوں کی فوج کی نقل و حرکت کا پتہ لگائیں۔ اب مغلیہ فوج نے بالاحصار اور شاہ میر کے درمیانی راستے پر پڑاؤ ڈالا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایرانی سپہ سالار مرتضیٰ قلی حملہ کی زد میں آگیا۔

شاہ میر کی لڑائی

طرفین کے جاسوسی سپاہیوں کی ناتمام جھڑپ سے لڑائی کا آغاز ہوا۔ مغل پیچھے ہٹے اور شاہ میر کو اپنا مرکز بنایا، یہ مقام اوغان داب پر تھا۔ جب انھوں نے ایرانی فوج کو دیکھا تو رستم خان نے اپنے آدمیوں کو فوجی ترتیب سے کھڑا کیا۔ اس کے توپ خانے کی لمبی قطار کے پیچھے نظر بہادر اور راؤ ستر سال ہراول دستہ کے سرغنہ تھے۔ داہنا حصہ رستم خان اور بایاں حصہ قلیچ خان کی قیادت میں دوسری قطار بن گئے۔ دونوں کناروں پر سردار خان کا داہنا بازو اور شاد خان کا بایاں بازو محافظت کر رہا تھا۔ دشمنوں نے بھی اسی طریقے پر اپنی فوج مرتب کی اسی صبح مرتضیٰ قلی سپہ سالار پہنچا اور اس نے قسم کھائی کہ جب تک ہندوستانی فوج کو ہرا نہ دے گا روزہ افطار نہ کرے گا۔

شاہ میر کی لڑائی کا آغاز طرفین کی زبردست آتش باری سے ہوا۔ لڑائی اگلی صف میں ہو رہی تھی کہ ایرانیوں نے چکر کے ساتھ مغلیہ فوج کی پشت اور بازو پر دباؤ ڈالا۔ قلیچ خان اور شاد خان غیر مفتوح انداز میں مقابلہ کرتے رہے۔ سردار خان نے ہتھیار ڈال دیا، اس کی مدد کو رستم خان بر وقت پہنچا۔ ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد حملہ آور دشمنوں کو پسپا کر دیا ایرانیوں کا جارحانہ حملہ شکست ہو ادارات کے پس پردہ وہ پسپا ہوئے، کچھ توپیں اور توڑے دار بندوقیں مغلوں کے ہاتھ لگیں۔

قندھار کی پہلی جنگ میں یہ فتح صرف ایک نجات دہانی تھی اس سے قطعی فتح کے امکانات میں کسی طرح اضافہ نہیں ہوا۔ محاصرہ چلتا رہا۔ شہزادہ اورنگ زیب کی عقل کام نہ دیتی تھی۔ بالآخر سعد اللہ خان کی تجویز پر ایک زمین دوز نہر اس لیے بنائی گئی کہ خندق سے پانی کھینچ لیا جائے لیکن محافظ دستہ نے محاصرین کی یہ کوشش قلعہ سے زبردست گولہ باری کر کے بے کار کر دی۔ موسم سرما کی آمد، محاصرہ کرنے والی توپوں کی قلت نے شہنشاہ کو یہ حکم دینے پر مجبور کیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ حسب الحکم اورنگ زیب نے ۲ ستمبر ۱۶۴۹ء کو قندھار سے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔

شاہ جہان سفیر ایران کے خیر مقدم سے گریز کرتا ہے

قندھار کے محاصرہ شروع ہونے کے ایک مہینہ

بعد ایرانی سفیر کابل آیا۔ شہنشاہ ایسا برافروختہ تھا کہ شرف حضوری کی اجازت نہ دی۔ البتہ جعفر خان کو اس کے آرام پہنچانے کا حکم دیا۔ ایک مہینہ بعد شاہ کے خط کا بغیر کسی تحریری جواب کے قاصد کو رخصت کر دیا۔ شہزادہ اورنگ زیب کو حکم دیا کہ اسے ایران جانے دیا جائے جعفر خان سے شہنشاہ نے زبانی جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اپنے آقا سے کہہ دو کہ دو خاندانوں کے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات باقی رکھے لیکن صاحب اقتدار دوستوں کی قدر و قیمت کا وہ لوگ اندازہ کرتے ہیں جن کو قدرت نے ذہانت عطا کی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال جب قندھار پر اس (شاہ) کے حملہ کی خبر ہمارے علم میں آئی تو شہزادے کو زبردست فوج کے ساتھ اس پر قبضہ رکھنے کے لیے مقابلہ کے واسطے بھیجا۔ اب ہمارا قیام کابل میں ہے۔ چونکہ ہماری فوجوں کی خبر سے شاہ ہرات چلا گیا ہے شہزادے کو اس سے نبرد آزمائی کا شوق تھا۔ اس لیے قندھار کے محاصرہ کی ابتدا کی گئی۔ بفضلہ میں نے وہ سب کچھ کر دیا جو ممکن تھا اور اس کے آگے بھی جو کچھ ممکن ہو گا وہ خود دیکھے گا اور دنیا بھی"۔

مغل ناکامی کے اسباب

اس پیام میں تکبر اس شرم کا مترادف ہے جس سے مغلیہ فوج کو قندھار میں دوچار ہونا پڑا۔ اپنی طاقت کے لامحدود زعم میں شاہجہان نے نہ تو ایرانیوں کے ذرائع کا خیال کیا اور نہ اُن کی قوت مدافعت کا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس سے پہلے بھی قندھار ایسے مستحکم شہر کو کبھی طوفانی انداز یا اچانک حملے سے فتح نہیں کیا گیا۔ لیکن اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لیے وہ جلد سے جلد جنگ کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو فوج اس نے بھیجی وہ نہ اسلحہ سے اور نہ سامان خورد و نوش سے پوری طرح آسودہ تھی اور پھر قندھار ایسا زرخیز ملک بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی فوج کو کھلا پلا سکے۔

مغل شہنشاہ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے ایرانیوں کی ترقی یافتہ توپ خانہ کو نظرانداز کیا۔ آخرالذکر چونکہ ترکوں سے برابر لڑتے رہے اس لیے اُن کو آتش بار اسلحہ سے بہ نسبت مغلوں کے زیادہ واقفیت تھی توپ خانہ کے سلسلے میں مغلوں کا دارومدار مخلوط النسل مغربی باشندوں پر تھا۔ علاوہ دیگر توپوں کے دو توپیں قندھار میں ایسی نمایاں صلاحیت کی تھیں کہ مغلوں کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مغلوں کے سپاہیوں اور افسروں میں ذاتی بہادری کی کمی نہ تھی۔ لیکن ہلاکت انگیز آگ کے سامنے بہادر اور بزدل میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں ایرانی سپہ سالار محراب خان ان تھک سرگرمی اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا تھا۔ مغلوں کی شرمناک شکست دینے میں جتنا برتر توپوں کا حصہ تھا اس سے کم اس

سپہ سالار کی صلاحیت کا حصہ نہ تھا۔ جس کے حکم[1] پر توپ خانہ کام کر رہا تھا۔

دوسری کوشش

قندھار پر حملہ کرنے کی کوشش ۱۶۴۹ء میں ختم کی گئی۔ ۱۶۵۲ء میں پھر دہرائی گئی۔ گذشتہ سال کے ابتدائی اگست ہی میں کشمیر سے لوٹتے ہوئے شہنشاہ نے اپنے افسروں کو مجوزہ لڑائی کی تیاری کا حکم دیا۔ شاہ شجاع کو بنگال سے بلایا گیا، راجہ جے سنگھ، راجہ جسونت سنگھ، رستم خان، اللہ وردی خان، راجہ دٹھل داس وغیرہ کو اگلے سال یعنی ۲۰ جنوری ۱۶۵۲ء کو دربار پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ رستم خان دو لاکھ روپیہ لے کر لاہور میں حاضر ہوا۔ چتے تولے جلنے کی رسم ادا کرنے کے بعد لاہور سے شاہ جہاں چلا اور ۲۴ اپریل ۱۶۵۲ء کو کابل پہنچا۔

پہلے مواقع کی طرح اس بار بھی فوجوں کی قیادت شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان کے سپرد تھی۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ ۲ مئی ۱۶۵۲ء کو محاصرہ کا آغاز کریں۔ فوجوں کی تعداد پچاس ہزار اور ساٹھ ہزار کے درمیان تھی۔ ان میں ۱/۲ بندوقچی اور توپ خانے والے تھے۔ افسروں کی تعداد ۱/۴ تھی فوج میں دو بڑی توپیں تھیں جن میں سے بعض ستر پونڈ کا گولہ پھینک دیتی تھیں ۲۰ چھوٹی توپیں تھیں جن میں ۴ یا ۵ پونڈ وزن کے گولے پھینکنے کی طاقت تھی ۲۰ چول چلا ہاتھیوں پر رکھی تھیں اور ایک سو ایسی توپیں اونٹوں پر تھیں محکمہ نقل و حمل کے سپرد شہنشاہ کے ذاتی فیل خانے سے منتخب ہاتھیوں کے علاوہ بہت سے اور ہاتھی فوجوں افسروں کی ملکیت میں سے سپرد کیے گئے۔ مزید برآں تین ہزار اونٹ بھی اس فوج کے استعمال میں تھے۔

پہلے محاصرہ کے حادثات دہرائے گئے۔ چہل زینہ پہاڑی اور فیصل کی ماہی پشت چوٹی پر راجہ رجب اور مہابت خان نے طوفانی انداز میں دھاوے کیے مگر نتیجہ تباہ کن ثابت ہوا۔ شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان کی خندقیں آگے نہ بڑھ سکیں۔ فتح کے امکانات ہمیشہ کی طرح نظروں سے اوجھل رہے۔ توپ خانہ جس پر مغلوں کو بڑا ناز تھا وہ بڑے بڑے وقت ناکام ہوا۔ اورنگ زیب کی خندق میں اٹھی توپیں اسی لیے پھٹ گئیں کہ ان میں ضرورت سے زیادہ وزنی گولے لگا کر نشانہ مارنے کی کوشش کی گئی۔ قاسم خان کی دو توپوں نے کام نہیں کیا اور جو توپیں سعد اللہ کے خندق میں تھیں ان کا صحیح استعمال نہ ہوا۔ تجربہ کار کام کرنے والوں کی کمی تھی برخلاف اس کے ایرانی توپچی تھے جن کی نشانہ بازی سے مغلیہ فوجوں میں موت کی بارش ہو رہی تھی انھوں نے خاموشی سے اس موقع کا

---

[1] گھومنے والا چھلا جس سے دو چیزوں کو جوڑتے ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر گھوم سکے۔

انتظار کیا کہ دشمن ان کی زد میں آجائے۔

دوران محاصرہ شہزادہ اورنگ زیب نے اس ایرانی سپہ سالار اوتار خان کو بہکانے کی کوشش کی جو قندھار میں محراب خان کی جگہ متعین کیا گیا تھا۔ اس کے پاس شہزادہ نے حاجی بہادر کو اس پیام کے ساتھ بھیجا کہ تم کو مغل حکومت میں بڑی ممتاز جگہ پر سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اوتار خان نے شہزادہ کی پہلی ناکامی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ اگر اورنگ زیب ہندوستان واپس ہونے میں شرم محسوس کرتا ہے تو وہ ایران چلا جائے اور اپنے جدِ امجد ہمایوں کی طرح شاہ سے ملازمت کی درخواست کرے۔ اس جواب کے ساتھ حاجی بہادر کو مغل پڑاؤ میں بھیجا گیا۔

ناکامیابی اس طرح باوجود شان و شوکت کی تیاریوں کے مغلوں کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شاہ جہاں نے حکم دے دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اورنگ زیب نے بہت کوشش کی کہ وہ اُسے کچھ وقت دے۔ لیکن بادشاہ نے زیادہ دانش مندی سے کام لیا۔ فوج تھک گئی تھی۔ سپاہی اس دیر طلب اور ناکام مہم کے بعد اپنے گھر جانا چاہتے تھے۔ حسب الحکم شہزادہ ۹ر جولائی کو قندھار سے کابل روانہ ہوا۔ ۷ راگست کو باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

تیسری کوشش کی تیاریاں اورنگ زیب کی پے در پے دو ناکامیاں اور جان و مال کا سخت نقصان بھی شاہجہاں کے غرور کو کلیتاً ختم کرنے کے لیے کافی نہ ہوا۔ اس کو اب بھی کچھ کامیابی کی امید تھی۔ اس امید کو دارا کی باتوں نے اور ہوا دی۔ اس نے کہا میں وہ سب کچھ حاصل کروں گا جو اب تک نہیں ہوا۔ صوبجات کابل اور ملتان اس کے سپرد کر دیے گئے۔ ۲۰ ہزار ذات اور ۲۰ ہزار سوار کا منصب بھی عطا کیا گیا اس کو ایک موقع قندھار فتح کرنے کو دیا گیا۔ شہزادہ اپنے باپ کے ساتھ لاہور آیا۔ وسیع تیاریوں کا اس نے حکم دیا۔ توپ خانہ کی ترقی و طاقت پر خاص توجہ کی گئی۔ قاسم خان میر آتش اور محمد صالح مشرف شاہی توپ خانے کی نگرانی میں دو توپیں ایسی بھی تیار کرائی گئیں جن میں ایک من سولہ سیر کا گولہ استعمال کیا جا سکے۔ ایک تیسری توپ جعفر خان شہزادہ کے میر آتش نے بنوائی۔ تیس ہزار گولے، پانسو من بارود، پانسو من سیسہ، چودہ ہزار ہوائی بان سے محاصرہ کرنے کی تنظیم مکمل کی گئی۔

آدمیوں کے لحاظ سے شہزادہ کے ساتھ ۷۰ منصب دار، ۱۵۰۰ احادی، جن میں آدھی تعداد سوار بندوقچیوں کی اور آدھی سوار کمانداروں کی تھی، ۲۰۰۰ ہزار پیدل جن میں فیتلہ کو آگ دینے والے، توپچی اور ہوائی بان چلانے والے، ۶۰۰ سرنگ اڑانے والے اور ۵۰۰ سرنگ کھودنے

والے سپاہی اور ۵۰۰۰ بہشتی تھے۔ سربرآوردہ افسروں میں جے سنگھ، قولیج خان، رستم خان، ستر سال اور علی مردان خان تھے۔ آٹھ سو ہاتھی، تین ہزار اونٹ بار برداری کے لیے تھے۔ شہزادہ کی مرضی پر دو کروڑ روپیہ صرف کے لیے تھا۔ اس طرح یہ مہم شاہ جہان کے عہد کی ہر لحاظ سے سب سے زبردست معرکہ آرائی تھی، لیکن نمایاں ناکامیاب ثابت ہوئی۔

دارا لاہور سے جاتا ہے

۱۱ر فروری ۱۶۵۳ء کو دارا لاہور سے روانہ ہوا۔ بیس دن میں ملتان پہنچا۔ یہاں کچھ دن اس لیے قیام کیا کہ افسران اسکے ہمراہ ہو سکیں۔ ۲۲ر مارچ کو اس نے دریائے نربدا پار کیا اور اپنے آدمیوں کو سخت حکم دیا کہ باشندوں سے کوئی راستے میں چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ حالانکہ ابھی پوری فوج نہ پہنچی تھی مگر محاصرہ کی نیک ساعت قریب آ رہی تھی اس لیے شہزادہ نے رستم خان کو قندھار بھیج دیا کہ وہ اپنے پڑاؤ کی جگہ منتخب کرے۔

قندھار پہنچتا ہے

۲۳ر اپریل ۱۶۵۳ء کو دارا قندھار پہنچا۔ قلعہ کا باضابطہ محاصرہ خندقوں کے سلسلہ سے شروع ہوا۔ رستم خان کو اس نے حکم دیا کہ بست کی سڑک پر نظر رکھے۔ کوئی کمک، محافظ دستے کی آمد کو نہ آ سکے۔ شاہی فوجوں کی ترتیب وہی تھی جو گزشتہ دو موقعوں پر ہوئی تھی۔ شہزادہ نے اپنا خیمہ لکّہ پہاڑی کے قریب کے پیچھے ایک تالاب پر کامران کے باغ میں نصب کیا یہ جگہ قلعہ سے ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ راجہ جے سنگھ کو پچھلے پھاٹک کے سامنے قولیج خان، اویس قرن پھاٹک پر اور مہابت خان کو بابا ولی دروازہ کے سامنے، اخلاص خان کو چہل زینہ پہاڑی کے سامنے تعینات کیا گیا۔ خندقوں کے درمیان جا بجا توپ خانہ مرتب کیا گیا۔

جب محافظ دستہ کو ہندوستانی افواج کے بڑھنے کی خبر ملی تو اوتار خان نے ایک تیز رفتار قاصد فرمان قسلی کو، شاہ کے پاس امداد کے لیے بھیجا۔ شاہ نے حاجی منوچہر اور داقلان بیگ کو قندھار کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ اس کے علاوہ علی قلی خان سپہ سالار کو حکم ہوا کہ اپنے آدمیوں کا اجتماع بُسطام میں کرے لیکن امدادی افواج کے پہنچنے سے پہلے ہی مغل قندھار پہنچ گئے۔ کثرت تعداد کے ہراس سے بے نیاز ہو کر اوتار خاں نے حملہ آوروں کا استقبال قلعہ سے سخت آتشبازی سے کیا، اس نے اپنے نشانے کے لیے شہزادہ کی قیام گاہ کا خاص طور سے انتخاب کیا۔ اپنی توپوں کا دہانہ اسی طرف بڑی کامیابی کے ساتھ رکھا۔

شہنشاہ کی حسب ہدایت دارا نے دریائے ہامون کے ساحل پر ایرانیوں کے روکنے کے لیے رستم خان کو بھیجا۔ وہ ۱۲ر مئی ۱۶۵۳ء کو بست پہنچا، اور دس دن کے محاصرہ کے بعد کا نذر

مہدی قلی کو شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ہی گرشک کا قلعہ قبضے میں آگیا۔

بست کی تسخیر کے بعد دارا نے ایک نظم لکھ کر محافظ دستے کو بھیجا جس میں اس بات کی دھمکی تھی کہ اگر وہ خاموشی سے قلعہ نہ سپرد کر دے گا تو قتل عام کے لیے تیار رہے، لیکن وہاں سے یہ جواب ملا۔ چاہے ساری دنیا کی تلواریں حرکت میں آجائیں، مگر خدا کی مرضی نہیں تو وہ ہمیں نہیں کاٹ سکینگی' دھمکی کے بعد پھسلانے کی کوشش کی گئی۔ شہزادہ نے دلفریب انعامات اور معزز جگہیں فوج سے الگ ہونے والوں کیلئے پیش کیں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لالچ میں قلعہ چھوڑ کر چلے آئے لیکن اکثریت نے آخر تک مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔

ہنوز یہ جذبات فروشانہ ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا کہ راجا اجرد سنگھ نے ۱۴ر جولائی کو چہل زینہ پہاڑی پر دھاوا کر دیا۔ اس نے لکڑی کے لٹھوں اور تختوں سے ایک سرکوش راستہ تعمیر کیا اور اس کے زیر سایہ بلندی پر چڑھنے لگا اس نے توپوں سے حصار کو بھی مسمار کرنے کی کوشش جو پہاڑی کے لیے محافظ کا کام کرتا تھا مگر توپوں کا نشانہ اتنی دور نہ جا سکا۔ صورت حال کو اور ابتر بنانے کے لیے محافظ دستے نے حملہ آوروں پر حصار کے پیچھے سے گولیوں کی بوچھار کر دی۔ بہت سے لوگ مر گئے۔

رستم خان کو بھی ایک ایسی ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بست کی تسخیر کے بعد اس کو زمین داور فتح کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں پہونچ کر اس نے قرب وجوار کے اضلاع غارت کر دیے۔ ایک بار تو درلیئے ہامون عبور بھی کر گیا۔ وہاں کے جمع شدہ ایرانیوں کو منتشر بھی کر دیا۔ لیکن جلد ہی فضا بدل گئی۔ محافظ دستے کی روک تھام اور بڑھتی ہوئی ایرانی فوجوں کی یورش نے اس کو اپنی جگہ برقرار نہ رہنے دیا۔ زمین داور چھوڑ کر وہ "بست" پسپا ہوا یہاں بھی ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ قندھار واپس آگیا۔ اس پر شہنشاہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔

دارا جب ملتان سے آرہا تھا تو راستے میں ایک میر کاروان نے بتایا کہ قندھار کے محافظ دستے کو غلہ کی بڑی کمی ہے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ جنگ کو طول دے کر وہ قلعہ فتح کرے گا۔ مغل فوجوں میں یہ افواہ عام تھی اسی سے لوگوں کی سرگرمی میں کمی آگئی تھی۔ اس افواہ کی تردید میں اوتار خان نے غیرت خان کی خندق پر ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ قلعہ میں دو سال تک کے لیے کافی غلہ ہے۔ اس کے علاوہ اس نے طنز بھی کیا کہ اب تک شاہی فوج کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ ساتھ ہی ایک حربی دعوت حملہ کرنے کی دی۔ دارا نے جواب دیا کہ وہ اپنی دو بڑی توپوں کا انتظار کر رہا ہے وہ کسی لمحہ آسکتی ہیں۔ وہ آجائیں تو مدافعت کرنے والوں کو تباہ کر دیا جائے۔ اوتار خان نے اس دھمکی کا مذاق اڑاتے

ہونے جواب لکھا کہ جب تک میرا سر میرے کندھوں پر ہے قندھار کی سپردگی ناممکن ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ تسخیر کا خیال ترک کر کے ہندوستان واپس چلے جاؤ۔

اوتار خان کا یہ طنز آمیز چیلنج باثر ثابت ہوا۔ دارا نے قلعہ فتح کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔ ساری بڑی توپیں ایک جگہ جمع کی گئیں تاکہ ان کے زیر سایہ شاہی فوجیں خندق تک پہنچ سکیں اور راہ میں مٹی سے بھرے ہوئے بورے ڈال دیں، لیکن یہ تدبیر ناکام ہوئی۔ اس کے بعد کوشش کی گئی کہ بند توڑ کر خندق کا پانی بہا دیا جائے، لیکن محافظ دستہ نے اپنے لیے پانی فراہم کرنے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کر لیے۔ بالآخر جن توپوں کا دیر سے انتظار تھا وہ اگست کی ابتدا میں آگئیں اور شاہی فوجوں نے آتشباری شروع کر دی۔ تین سو گز کی دفاعی تعمیرات کو بھی مسمار کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ مٹی کے باہری دمدمے بھی برباد ہو گئے لیکن قلعہ میں داخل ہونا ممکن نہ ہوا اس کی بنیاد پر مٹی کا انبار تھا۔

دارا کی واپسی

محاصرہ کی ابتدا سے اب تک چار مہینے گزر چکے تھے پھر بھی کامیابی کی امید اتنی ہی دور رہی جتنی کبھی تھی۔ شاہی فوجوں کی اسلحہ کی رسد ختم ہو گئی تھی۔ ان کی گولہ باری بند تھی اس سے فائدہ اٹھا کر اہل قلعہ نے دفاعی تعمیرات کی مرمت شروع کر دی۔ دارا نے ایک بار پھر کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ جب اصل فوج کسی ایک جگہ قلعہ پر حملہ کر کے سارے محافظ دستہ کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس وقت راجہ بےسنگھ دوسرے محاذ سے قلعہ پر چڑھ جائے۔ لیکن فوج کی مختلف جماعتوں میں اتحاد عمل نہ ہو سکا اس لیے منصوبہ کامیاب ہوا اور شاہی فوجوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ بالآخر محاصرہ کو طول دینے کی بے اثری کا یقین شاہجہان کو آگیا یہ بھی وہ مان گیا کہ قندھار ناقابل تسخیر ہے۔ اس پر چڑھائی کرنا پاگل پن ہے۔ اس لیے اس نے دارا کو واپس بلا لیا۔ دارا ۲۷ ستمبر کو قندھار سے روانہ ہو کر اکتوبر میں ملتان پہنچا۔ اس کے ایک ماہ کے بعد لاہور آگیا۔

تبصرہ

قندھار میں مغلوں کی ناکامیابی کے اسباب پر غور کرنے میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شکست کی سب سے بڑی وجہ توپوں کی کمتری اور آتش بار اسلحہ سے ناواقفیت تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایرانی ہمیشہ مدافعانہ لڑائی لڑتے رہے۔ قلعہ کی مخصوص جائے وقوع اور پائداری سے ان کو فائدہ ہوا۔ علی مردان خان کی توجہ نے اس کو بہت بہتر بنا دیا تھا۔ علاوہ بریں دو ایرانی سپہ سالار محراب خان اور اس کا جانشین اوتار خان خاص خصوصیات کے مالک تھے یہ لوگ ہمیشہ خطروں کا مذاق اڑاتے رہے۔ ان میں قوت برداشت بھی تھی اور ماننے والوں کو ان پر اعتماد بھی تھا۔ آخری وجہ یہ کہ سرزمین قندھار کی غیر مہمان نوازی سے غلہ کی فراہمی مغلوں کے لیے ہمیشہ عذاب جان رہی۔ سب سے بڑی غلطی

یہ تھی کہ مغل شہنشاہ زبردست فوج محاذ پر بھیجتا رہا جس کی وجہ سے اتنا بڑا کیمپ ہوگیا تھا کہ بجائے سنجیدگی سے آگے بڑھنے کے مغلوں کی راہ میں وہ حائل ہوتا رہا۔

ایران اور مغل درباروں کے سرکاری تعلقات اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت تک کے لیے ختم ہوگئے۔ جنگ وراثت کی ابتدا میں ہم دیکھتے ہیں کہ شہزادہ مراد، شاہ عباس ثانی سے پُرزور خط وکتابت کررہا تھا اس لیے کہ اس کی امداد سے وہ اپنے حصول تخت وتاج کا مدعا پورا کرنا چاہتا تھا۔ واقعہ ہے کہ اس کی مدد کے لیے شاہ ایران نے قندھار میں کچھ فوجیں اکٹھا بھی کی تھیں کہ اگر وہ طلب کرے تو روانہ ہو جائیں لیکن اس امداد سے فائدہ اٹھانے کا کبھی موقعہ نہ آیا۔ اورنگ زیب سے شکست پانے کے بعد دارا نے بھی شاہ ایران سے امداد کی درخواست کی تھی۔ لیکن شاہ جہاں عمر بھر اس ذلّت کو بھلا نہ سکا۔ جس کا سامنا اس کی سپاہ کو قندھار میں کرنا پڑا۔

باب ۱۰
ثقافتی ادارت

دربار شاہجہاں کا دربار شاہانہ شان وشوکت کے عروج کا نمونہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں مغلیہ سلطنت دولت وخوش اقبالی کے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ہندوستان کی دولت و ثروت کا شہرہ سن کر بیرونی ممالک سے متعدد سیاح یہاں آتے رہے، شہنشاہ کے عظیم الشان جاہ و جلال اور ماحول دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ اس کے دربار کا ٹھاٹ باٹ ان کے طائرِ خیال سے بالاتر تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک بے دریغ تحسین وآفرین کرتا۔ برنیر، ٹوورنیر اور منوچی نے اپنے تاثرات کا بڑا دلکش بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن اطلاعات کا وافر ذخیرہ جو وہ لوگ فراہم کر گئے ہیں اس سے مغل دربار کی آب وتاب وحیرت انگیزی کا اچھا خاصا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔

شہنشاہ اس عظمت وشوکت کی آرائش وترتیب کا مرکز خود شہنشاہ تھا۔ اس کا میانہ قد تھا اور رنگ گندمی تھا، اس کی پیشانی کشادہ، بھویں ابھری ہوئی، ناک کسی قدر جھکی ہوئی لیکن سیدھی، آنکھیں چمکدار اور بھورے رنگ کی لیکن پتلیاں سیاہ تھیں، ناک کے داہنے طرف ایک مسا تھا۔ دہانہ تنگ تھا۔ دانت بہت خوبصورت وصاف تھے، اس کی آواز شیریں تھی فصاحت کے ساتھ فارسی زبان بولنے پر اس کو قدرت حاصل تھی۔ باپ دادا کے برعکس اس کی داڑھی متشرع مسلمانوں کی داڑھی کی طرح دراز تھی۔ اس کے ہاتھ تو بہت دراز تھے نہ بہت چھوٹے دست راست کی چار انگلیوں پر تل تھے جو فال نیک کی علامت سمجھے جاتے تھے اس لحاظ سے اس کا جثہ شاہانہ اقتدار کے لیے بہت موزوں تھا۔

اس کا مزاج

مزاج کے لحاظ سے وہ محنتی وسخت گیر تھا۔ صفائی کا اس کو حد سے زیادہ خیال رہتا۔ اس کی پنجگانہ نماز شاذ و نادر ہی قضا ہوئی ہو۔ جب وہ دارالسلطنت میں ہوتا تو ماہ رمضان کا روزہ بھی شاید ہی قضا ہوا ہو۔ مقدس راتوں میں اپنا نصف وقت عبادت و خیرات میں صرف کرتا۔ عطر کا اس کو غیر معمولی شوق تھا اس کا لباس معطر ہوتا۔ بات چیت میں خوش گفتار و اخلاق میں نرم مزاج تھا، اس نے کبھی لفظ "تو" نہیں استعمال کیا چاہے اس نے کتنے ہی گرے اور سفلہ آدمی سے خطاب کیا ہو۔

عام خیال کی تردید

سرکار نے بڑی سمجھ بوجھ کر یہ بات کہی ہے کہ اس زمانہ میں تخت شاہی تختہ گل نہ تھا۔ بادشاہ کو اپنے فرائض ادا کرنے پڑتے۔ تقسیم اوقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس ذمہ داری سے وہ واقف بھی ہوتا۔ یہ عام خیال کہ مغل بادشاہ کی زندگی شاہانہ عیاشی، لہو لعب، ہوس رانی کا ایک مسلسل دائرہ تھی بالکل غلط ثابت ہوتا ہے جب ہم اس کی مصروفیات کی باریک سے باریک تفصیل پر نظر ڈالتے ہیں جو فارسی کے عصری مؤرخوں کی تحریر میں ملتی ہے، اور اس کو روزمرہ کے پروگرام پر سختی سے عمل کرنا تھا خواہ بادشاہ دارالسلطنت میں ہو یا میدان جنگ میں، اس بات کا کثرت سے ثبوت ملتا ہے کہ شاہ جہاں محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ سرکاری کاموں اور تفریحات میں برابر برابر اپنے اوقات کا حصہ وہ صرف کرتا۔

معمولات

طلوع آفتاب سے دو گھڑی پہلے وضو کر کے اپنی ذاتی مسجد میں جاتا۔ جانماز پر بیٹھ کر نماز کے وقت کا انتظار کرتا، بعد نماز فجر طلوع آفتاب تک تسبیح پڑھتا اگر سفر میں ہوتا تو یہ عبادت اپنے خاص کمرے میں ادا کرتا۔

جھروکہ

مسجد سے وہ جھروکہ درشن جاتا، یہاں ہر صبح اپنی رعایا کو درشن دیتا۔ یہ دانشمندی کا عمل اکبر نے شروع کیا تھا، اس کے جانشینوں نے اس سلسلے کو قائم رکھا۔ اس عمل کے پس پشت اقتدار کی نمائش اتنی زیادہ نہ تھی جتنی اپنی رعایا سے قریب تر ہونے کی حکمران کی خواہش کارفرما تھی۔ علاوہ بریں اس زمانے میں جب سلطنت کا ڈھانچہ بادشاہ کی شخصیت پر مبنی تھا تو رعایا کو اس بات کا یقین دلانا ضروری ہو گیا تھا کہ وہ بیدار مغز بھی ہے اور جسمانی لحاظ سے بالکل صحیح و سالم بھی ہے۔ یہاں عوام کو اجازت تھی کہ وہ بلا تکلف بادشاہ سے مل سکتے ہیں اور بغیر کسی درمیانی شخص کے براہ راست بڑے سے بڑے سرکاری حکام کی بھی شکایت کر سکتے ہیں۔ یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کیا عام آدمی کو اتنی ہمت ہو سکتی تھی کہ وہ براہ راست شہنشاہ سے

باتیں کر سکے، شاہانہ شان و شوکت اس کو مرعوب کر سکتی تھی اور اس سے بھی زیادہ یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ کیا وہ ایسے حکام بالادست کی دشمنی مول لے سکتا ہے جو بذاتِ انتقام جو، بدکار اور انتظامات میں دخیل بھی تھے۔ لیکن جہاں تک شاہ جہاں کا سوال ہے تو یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ وہ کمزور سے کمزور رعایا کی شکایات سنتا تھا اور خطاکار کو، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ افسر کیوں نہ ہو سزا دینے میں کوتاہی نہ کرتا۔ مغل بادشاہوں کی خوبیوں میں یہ ایک اضافہ ہے کہ انھوں نے اپنی رعایا کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جو ازروئے انصاف ان کا فیصلہ کرتا۔ اگر لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو ساری غلطی شہنشاہ کی نہ تھی۔

جھروکہ درشن میں علاوہ فریاد سننے اور عوام کی سلامی لینے کے کئی امور اس کی توجہ کا مرکز تھے۔ یہیں وہ نو گرفتار ہاتھی بھی شہنشاہ کے ملاحظے کے لیے لائے جاتے جو دربارِ عام کے میدان میں نہ پیش کیے جا سکتے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے شاہجہاں اپنے محبوب مشغلہ ہاتھیوں کی لڑائی سے لطف اندوز ہوتا۔ بعض دن پانچ پانچ جوڑ ہاتھیوں کی شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے اسی جگہ لڑائی جاتی۔ یہیں منصب دار بھی اپنے فوجی دستے جائزہ کے لیے حاضر کرتے۔

دیوانِ عام جھروکہ درشن میں تخمیناً ایک گھنٹہ صرف کرنے کے بعد شہنشاہ دیوانِ عام میں چلا جاتا۔ یہ رعب دار عمارت سنگِ سرخ سے بنائی گئی ہے، اس میں چالیس کھمبے ہیں۔ اس کے تین طرف متصل صحن ہے اور چوتھی طرف پردے کی دیوار ہے جس کے بیچ میں ایک قبہ ہے جو دیوان کی سطح سے بلند ہے۔ محراب خالص ترین سنگِ سفید کا ہے جس کو پچی کاری اور سطح سے متعلق اُبھار چڑھاؤ کے کام سے پوری طرح آراستہ کیا گیا ہے۔ آگرہ کا ایوان عام وضع قطع کے لحاظ سے سادہ ہے۔ دہلی قلعہ کے ہال کی فنی آرایش جو اس کی نمایاں خصوصیت ہے وہ آگرہ کے قلعہ میں نہیں ہے۔ ایسا ہی ایک ہال مگر تناسب میں چھوٹا اسی غرض سے لاہور کے قلعہ میں بنایا گیا تھا۔ جب کبھی شہنشاہ خیمہ زن ہوتا تو وہاں بھی وقتی طور پر بڑے بڑے خیموں کا ایک دربار عام موجودہ ساز و سامان سے تیار کر دیا جاتا۔

ترتیب بہ لحاظ عہدہ دیوان عام کے اندر، باہر افسر درباری سپاہی سب کے سب ایک خاص ترتیب کے ساتھ شہنشاہ کے نزول اجلال کے انتظار میں قبہ پر نظریں جمائے کھڑے رہتے۔ دیوان عام کا کنارہ نقرئی سلاخوں سے بند رہتا۔ صرف دو سو گھوڑوں، یا زیادہ کے منصب داروں کو اندر لے جانے کی اجازت ہوتی۔ حسبِ مرتبہ درجہ بدرجہ تختِ شاہی کی طرف منھ کرکے سب کھڑے ہوتے، ستون کے قریب صرف خاص منصب داروں کو جگہ دی جاتی

قبہ کے بائیں جانب قورچی شاہی علم لیے دیوار کی طرف پشت کیے ہوئے کھڑے رہتے دوسری طرف قبہ کے زیرِ سایہ سلطنت کے خاص و عام حکام معہ ضروری کاغذات حضورِ شہنشاہ پیش کرنے کے لیے حاضر رہتے۔

نقرئی سلاخوں کے باہر دوسری کشادہ جگہ ایسی لکڑی کی سلاخوں سے گھری تھی جو سُرخ لاکھ کے رنگ سے رنگی ہوئی تھیں، اس جگہ دو سو سوار کے منصب سے کم رتبہ فوجی افسر، احادی، کمانداز تبکچی اور بعض بلند ترین منصب داروں کے چند مصاحبوں کو قیام کی اجازت دی جاتی۔ لکڑی کی سلاخوں کے باہر امراء کے ادنیٰ خادم اور پیدل سپاہی کھڑے رہتے، ان سلاخوں کے درمیان داخلہ کی اجازت تین پھاٹکوں سے دی جاتی جن کی سخت حفاظت ہوشیار افسروں اور عصابرداروں کے سپرد ہوتی۔

کاروبار ظہورِ شہنشاہ سات بج کر چالیس منٹ پر ہوتا اسی وقت سے کاروبار کا سلسلہ آغاز ہو جاتا۔ سب سے پہلے میر بخشی منصب داروں کی عرضیاں پیش کرتا اور بعدہ حضورِ شاہ ان لوگوں کو حاضر کرتا جو ترقی کے مستحق ہوتے۔ جو لوگ بیرونِ ہند بھیجے جانے کے لیے تعینات کیے جاتے ان کو خلعت اعزاز عطا کیا جاتا۔ اس کے بعد صدر شہنشاہ کے سامنے غربا و مساکین کی درخواستیں اور حضوری میں علما و مقدس اشخاص کو پیش کرتا۔ اس کے بعد میر سامان و دیوان بیوتات اپنے شعبہ جات کے کاغذات شہنشاہ کے سامنے رکھتا۔ پھر بخشی احادیان، میر آتش اور مصرف، توپ خانہ اپنے اپنے محکمہ کے نئے رنگروٹ حاضر کرتے۔ اس کے بعد با اثر منصبدار شہنشاہ کی خدمت میں وہ عرضداشت یا تحفہ جات پیش کرتے جو صوبجات کے ناظموں دیوانوں یا بخشیوں نے بھیجے تھے۔ اکثر اوقات شہنشاہ بذاتِ خود کاغذات ملاحظہ فرماتا اور ان پر احکام لکھاتا۔ سب کے آخر میں عرض مکرر شہنشاہ کی خدمت میں منصب، جاگیر، اور نقدی کے کاغذات پیش کرتا۔ ضروری کام ختم کر کے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا معہ مقررہ مقدار کے معائنہ ہوتا۔

دیوان خاص دیوان عام سے شہنشاہ دیوان خاص یا دولت خانہ خاص میں جاتا آگرہ اور دہلی دونوں جگہ کے دیوان شاہ جہان کے عہدِ حکومت میں تعمیر ہوئے تھے۔ بیورنیر نے پہلے کا بیان کیا ہے اور میر وارث نے دوسرے کی بڑی خوبصورت تشریح کی ہے۔ یہاں بادشاہ دو گھنٹے تک ان معاملات کے فیصلے کرتا جو انتظامی یا سیاسی وجوہات سے علانیہ نہیں ہو سکتے تھے سلطنت کے وزراء اعلیٰ اپنی معروضات شہنشاہ کے روبرو پیش کرتے شہنشاہ کبھی خود فیصلہ

قلم بند کرتا کبھی لکھوا دیتا۔ خاص خاص حاجتمندوں کے معاملات کی اطلاع صدر دیتا جس پر شہنشاہ مدد معاش منظور کرتا۔ یہاں شہنشاہ فنون کے نمونوں کا مثلاً کشیدہ کاری، مصوری وغیرہ کا معائنہ کرتا۔ داروغہ عمارات ہمیشہ اس لیے حاضر رہتا کہ شاہی عمارتوں کے منصوبہ پر منظوری حاصل کرے منصوبوں پر یہاں پوری بحث ہوتی۔ اولین عہدِ حکومت میں آصف خاں تعمیرات کے سلسلے میں پیش خاص تھا۔ دیوانِ خاص میں شکرے، باز اور تربیت یافتہ چیتے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیے جاتے۔

شاہ برج

دیوانِ خاص سے اٹھ کر شہنشاہ، شاہ برج جاتا یہاں نہایت راز کی گفت و شنید ہوتی۔ بجز شہزادوں اور تین چار افسروں کے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ کوئی افسر امور متعلقہ کے بعد وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ شاہ برج میں خفیہ فیصلے ہوتے، احکام مرتب ہوتے اور صوبہ جات کے افسروں کو بھیجے جاتے۔ اس کے علاوہ خالصہ (شاہی زمینیں) طالاب یا تنخواہ کے ایسے معاملات جو دیوانِ خاص میں طے نہ ہو سکتے وہ یہاں فیصل ہوتے۔

ایبانی قزوینی لکھتا ہے کہ یہیں لگا ہے لاہے شہنشاہ اس کو اس کے کام کی درستی کے لیے طلب کرتا تخمیناً دو ساعت شاہ برج میں صرف ہوتے یہاں دوپہر گزر جاتی، تب شہنشاہ حرم میں جاتا۔ یہاں بھی کچھ نہ کچھ کام اُسے کرنا پڑتا خاصہ تناول فرمانے کے بعد وہ قیلولہ کرتا جب بیدار ہوتا تو ممتاز محل وہ فہرست پیش کرتی، جو اسکی خاص خادمہ جہانگیر کے درباری شاعر کی بہن ستی النساء خانم قابلِ امداد فریاد کی تیار کرتی تھی۔ شہنشاہ ہر عرضی کو فرداً فرداً دیکھتا اور احکام صادر فرماتا۔ غریب و محتاج لڑکیوں کے لیے جہیز کا سامان فراہم کیا جاتا اور کبھی کبھی ان کی شادیاں بھی طے کر دی جاتیں، یتیموں اور بیواؤں کو گزر اوقات کے لیے روپیہ بھی دیا جاتا۔ شاذ و نادر ہی محل سے کوئی سائل خالی ہاتھ واپس جاتا اس طرح کثیر رقم روزانہ کارِ خیر امداد میں صرف ہوتی۔

رفاہِ عام

شہنشاہ محل سے ۳ بجے سہ پہر کو نکل کر کبھی کبھی دیوانِ عام میں آجاتا، محل کے پہرہ داروں کا معائنہ کرتا، لیکن عموماً نمازِ عصر کی جماعت میں شرکت کرتا۔ اس کے بعد شام کو دیوان میں انتظامی معاملات انجام دیتا۔ پھر گانا سنتا یا ہرنوں کی لڑائی دیکھتا اب بڑے بڑے جھاڑ و فانوس روشن ہو جاتے اور ان کی روشنی مرصع پردوں اور مسندوں پر غیر معمولی دلکش ہو جاتی۔ ہم اس روشنی کے حسنِ دلفریب منظر کا تصور بھی آسانی سے نہیں کر سکتے جو دہلی کے دیوانِ خاص میں شام کو ہوتی تھی باوجود شاہانہ ساز و سامان سے یکقلم محروم ہونے کے بھی امیر خسرو کے وہ اشعار جو اس کی دیواروں میں ایک طرف نقش ہیں۔ اب بھی احساس دلاتے ہیں کہ یقیناً اس دَور میں "دہلی زمین پر بہشت تھی۔"

سونے کا وقت آٹھ بجے شب میں آدھ گھنٹہ کی انجمن آرائی شاہ برج میں کرنے کے بعد شہنشاہ حرم واپس آ جاتا یہاں رات کا خاصہ تناول کرنے کے بعد مستورات کی نغمہ سرائی سے لطف اندوز ہوتا۔ قریب دس بجے شب کو وہ بستر پر جاتا آرام خاص کے کمرے اور خوش الحان قاریوں کے درمیان ایک پردہ پڑا رہتا تاکہ اس کو وہ لوگ دیکھ نہ سکیں جو دوسری طرف مختلف موضوعات باآواز بلند پڑھتے، موضوعات کی نوعیت میں سفر، بزرگوں کی سوانح عمری، تاریخ وغیرہ ہوتی۔ بابر کی خود نوشت سوانح حیات سے شہنشاہ کو خاص دلچسپی تھی۔

دربارِ عدالت اس روزمرہ کے معمول میں صرف جمعہ کو تبدیلی آتی۔ اس لیے کہ یہ مسلمانوں کا مقدس دن ہے اس دن کوئی دربار نہ ہوتا اور چہار شنبہ کو بھی۔ جب شہنشاہ جھروکہ درشن سے سیدھا دیوان خاص جاتا۔ وہاں حق و انصاف کی رو سے مقدمات کا فیصلہ کرتا۔ تختِ فیروز پر بیٹھ جاتا، روداد مقدمہ، منصف افسروں قاضیوں، مفتیوں کے سامنے شروع ہوتی داروغۂ عدالت ہر مقدمہ کو الگ الگ پیش کرتا۔ شہنشاہ دعویداروں سے باتیں کرتا اور حسبِ شرع فیصلہ کرتا۔

ضبط و تنظیم مغلیہ دربار ضبط و تنظیم کا مرعوب کن منظر پیش کرتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اخلاق و آداب پر سختی سے توجہ کی جاتی۔ سلسلۂ ترتیب و ترجیح منصب داروں کے عہدہ کے اعتبار سے قائم ہوتا۔ سب کو کھڑا رہنا پڑتا۔ صرف شہزادے بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن اجازت لینے کے بعد جہانگیر نے اپنے دربار میں شاہ جہاں کی نشست کے لیے ایک طلائی کرسی رکھوا دی تھی۔ شاہ جہان نے بھی اپنے بڑے لڑکے دارا شکوہ کے لیے یہ رعایت خاص برقرار رکھی۔ صرف وزیر اور میر بخشی اجازت تھی کہ زینے پر قدم رکھ کر تخت کے قریب آسکیں۔ دوسرے لوگوں کو زینہ کے سرے پر رک جانے کا حکم تھا۔

سلام کا طریقہ شاہجہان بغیر شک و شبہ اپنے جملہ پیشرو سے زیادہ مذہبی تھا۔ خلاف شرع کوئی طریقہ وہ برداشت نہ کر سکتا۔ اس فہرست میں اکبر کی جاری کردہ رسم سجدہ تھی۔ اسلامی شرع کے لحاظ سے کسی مخلوق کے لیے نہیں صرف خالق کے لیے سجدہ روا ہے۔ اس لیے شاہ جہان کا سب سے پہلا حکم اسی رسم قبیح کو ختم کرنے کا تھا۔ اس کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ عام رسم سلام پر اکتفا کرے لیکن مہابت خان نے از راہ خوشامد یہ عرض کیا کہ بادشاہوں اور شاہی خاندان کے لیے اس سلسلے میں بھی کوئی نہ کوئی طرۂ امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے کیونکہ خداوند عالم نے

ان کو برتر مرتبہ سرفراز فرمایا ہے[۱]۔ اس لیے سجدہ کے بجائے زمین بوسی کی رسم قائم کی گئی۔ سجدہ میں اور نماز بوسی میں یہ فرق ہے کہ سجدہ میں آدمی کو گھٹنے کے بل زمین پر جھک کر جبین سائی کرنی پڑتی ہے لیکن زمین بوسی میں یہ بات نہیں۔ زمین بوس اپنے دونوں ہاتھ زمین تک لے جاتا ہے تب اُٹھا کر پیشانی تک لے جانا پڑتا ہے۔ لیکن بعد میں جب شاہ جہاں کو خیال آیا کہ رسم سلام اور رسم سجدہ میں کوئی قابلِ امتیاز فرق نہیں تو اس نے زمین بوسی کی بھی رسم ختم کر دی۔ اس کے بجائے چار تسلیم رائج کی[۲]۔ علماء و بزرگانِ دین دونوں زمین بوسی و چار تسلیم کے رسوم سے آزاد تھے کیونکہ شہنشاہ ان بزرگوں کا خاص احترام کرتا تھا۔ یہ طبقہ مروجہ اسلامی طریقہ پر عمل کرتا تھا یعنی ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دینا۔

جب بھی شہنشاہ برآمد ہوتا خواہ جھروکے میں یا دربار میں ہر بار اس کا استقبال "شاہ زندہ باد" کے باآوازِ بلند نعروں سے کیا جاتا۔ اس کے بعد خاموشی طاری ہو جاتی۔ معمولی کاروبار چپ چپاتے انجام پاتے۔ اگر شہنشاہ کسی شخص سے مخاطب ہونا چاہتا تو وہ اس کی طرف اشارہ کرتا اور عصا بردار اس شخص کو تخت کے قریب لاتے۔ وہ شخص مروجہ سلامی کے بعد ہمہ تن انکسار بن کر شہنشاہ کی گفتگو سنتا۔ اگر وہ خلعت اعزاز سے سرفراز کیا جاتا تو انعام پانے والا دوبارہ سر تسلیم خم کرتا ہوا پچھلے قدم اپنی جگہ واپس جاتا۔ اس وقفہ میں اس کا منہ تخت کی طرف رہتا، کیونکہ[۱] تخت کی طرف پشت کرنا انتہائی توہین کا مترادف تھا۔

دیارِ غیر کے سفراء

غیر ملکی سفیروں کا شہنشاہ کے حضور، دیوانِ عام میں پیش کرنا امراء کے ذمہ تھا۔ ایرانی سفیروں کا احترام تمام ایشیائی ممالک کے سفراء سے زیادہ کیا جاتا۔ ان کو اجازت تھی کہ اپنے مراسم کے لحاظ سے اپنی طرح سر جھکائیں۔ ان کو غیر معمولی انعامات، مراعات سے سرفراز کیا جاتا۔ لیکن جب ایران سے تعلقات کشیدہ ہوئے تو چشمِ عنایت بھی بدل گئی۔ جو سلوک ایرانی سفراء سے ہوتا تھا وہ ترکی کی طرف منتقل ہو گیا، بخارا سمرقند اور کاشغر کے سفیروں کا دربار میں تکلفات کے ساتھ خیر مقدم ہوتا۔ لیکن بایں ہمہ آخر الذکر سفراء کو کبھی بھی ان مراعات سے سرفراز نہ کیا جاتا جو کبھی ایرانیوں کو نصیب تھا۔ یورپ سے آنے والے سفیروں کو بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا۔ بجز سر ٹامس رو کے سترہویں صدی کے نصف اول میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ جس میں کسی سفیر کو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے اعزاز بخشا گیا ہو، اوروں کا ذکر کیا سر ٹامس رو کو بھی اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

شاہ جہان کے عہد حکومت میں ڈچ اور انگریزوں کو معمولی تاجر سمجھا گیا۔ ان کو کسی سیاسی حیثیت کا مالک خیال نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مقامی مؤرخ نے ان لوگوں کے بارے میں کوئی توجہ نہ کی۔

ایامِ جشن دیوان عام اور دیوان خاص کی عمارات بجائے خود کافی نفیس و شان دار تھیں۔ لیکن ایام جشن میں کافی شان دار و خوش سلیقہ آراستگی اور وسیع پیمانے کے چراغاں سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ نوروز، یوم تخت نشینی، عیدین، شب برات، شمسی و قمری ایام وزن شہنشاہ کے مواقع پر دیوان مرقع جشن نظر آتے۔ زربفت و کمخواب کے دل بادل شامیانے طلائی حاشیوں سے مرصع ہوتے۔ ان میں امرا کا زریں لباس میں گلگشت کرنا عجب دلکش منظر ہوتا۔ اس عالم میں شہنشاہ بے شمار زمرد، موتی اور دوسرے جواہرات سے آراستہ تخت زرنگار پر جلوہ افروز ہوتا نذریں قبول کرتا۔ انعامات تقسیم کرتا۔

دربار کے عجائبات دربارِ شاہ جہاں کی سب سے حیرت انگیز چیز تختِ طاؤس تھا۔ اپنی تخت نشینی کے موقعہ پر اس نے یہ تخت تیار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ سات سال میں مکمل ہوا۔ اس کی انتہائی نازک کاریگری کا بیان ٹیورنیر نے پوری وضاحت سے کیا ہے۔ اس تخت کے ۔۔ دوسرا کوہ نور، ہیرا کا تھا جو میر جملہ نے شاہ جہاں کی نذر کیا تھا۔

دربار کی اہمیت لیکن دربار کے وجود کا اولین مقصد شان و شوکت کی نمائش نہ تھا۔ یہ اس کی حیات کا صرف ایک پہلو تھا، دوسرا اور زیادہ کارآمد پہلو اس کی سرگرمی کا عوام میں ثقافت کی تبلیغ وارتقا تھا۔

ملک کے مروجہ سکون اور حکمران کی دلچسپی، دونوں کی آمیزش نے فن و ادب کی اشاعت کو پرزور سہارا دیا۔ شعرا، فلسفی، دانش ور، فن کار سب ہی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے دربار میں جمع ہو گئے یہاں کبھی کوئی صاحب ذوق محروم نہ گیا۔ نہ علم و ہنر کے جوہر پرکھنے میں انعام و اکرام سے سرفراز کرنے میں بادشاہ کو دیر لگتی۔ اس کی تقلید درباری بھی کرتے بلکہ اپنی سرپرستی کی اشاعت میں ایک دوسرے میں مسابقت بھی ہو جاتی لیکن یہ طرز عمل صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو واقعی صاحب علم و فن تھے۔

دانش وران دربار علاوہ بریں خود درباریوں میں بعض بذاتِ خود بلند پایہ صاحب علم تھے مثلاً علی مردان خان، سعد اللہ خان، سعید خان، ظفر خان، خانہ زاد خان میر جملہ

افضل خان، راجہ جے سنگھ وغیرہ رزم و بزم دونوں میں یگانہ روزگار تھے۔ یہ حضرات اپنے ساتھ درباری روایات لے جاتے اور سلطنت کے مختلف صوبہ جات میں ان کی اشاعت کرتے۔ بدقسمتی سے کوئی باقاعدہ تاریخ ان کے ثقافتی جدوجہد کی ہم تک نہ پہنچ سکی۔ لیکن اس وقت کے سیاسی ادب میں جابجا ایسے حوالہ جات ملتے ہیں جن سے ہم کو کچھ اندازہ ان کی قابلیت کا ہو جاتا ہے۔

تعلیمی ادارے دربار کے علاوہ بعض اور بھی ایسے ادارے تھے جو عوام میں علم و ہنر کی اشاعت کرتے رہتے۔ ایسے دو ادارے تھے جن کو ہم گورنمنٹ اسکول کہہ سکتے ہیں۔ ایک آگرے میں اور دوسرا دہلی میں تھا۔ ان درس گاہوں کے اساتذہ کا تقرر براہِ راست شہنشاہ کرتا۔ لیکن یہ بھی عرض کرنے کی بات ہے کہ اس وقت کی حکومت کو براہِ راست عوامی تعلیم سے واسطہ نہ تھا۔ البتہ اس کی نظر مسجدوں کی امداد پر تھی جو اکثر مرکزِ علم بھی ہو جاتیں۔ اگرچہ موجودہ دور میں حکومت کی فرض شناسی کے لحاظ سے اس زمانہ کی حکومت بھی تعلیم سے دلچسپی نہ لینے کے سلسلے میں سزاوار ملامت ہے لیکن یہ غیر مخلوط برائی نہ تھی۔

غیر سرکاری ادارے حکومت کی اس عدم توجہی نے انفرادی و شخصی کوششوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ ایک اہلِ قلم لکھتا ہے کہ عہدِ جہانگیر میں ہر شہر اور گاؤں میں مدرسے تھے۔ یقیناً یہ مدرسے سرکاری امداد کے پروردہ نہ تھے۔ ضرور ہے کہ ان کا وجود مقامی و ذاتی کاوشوں کا رہینِ منت ہوگا۔ علاوہ بریں اس دور میں تعلیم دنیوی جدوجہد کے دائرہ سے بالکل باہر سمجھی جاتی تھی۔ یہ کام گوشہ نشین عابدوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بزرگانِ دین تعلیم مفت دیتے تھے یا نام نہاد اجرت لے لیتے تھے۔ مذہبی رہنماؤں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے لاہور، احمد آباد، برہان پور اور جون پور میں پائے جاتے تھے۔ شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں سرہند، تھانیسور اور انبالہ میں ایسے مشہور و معروف قابل و عالم حضرات رہتے تھے جن سے اکتسابِ علم کے لیے دور دراز سے طالبِ علم آیا کرتے۔

کشمیر ایک مرکزِ علم اس عہد میں ایک دوسرا اہم مرکزِ علم، کشمیر تھا۔ اس کی فرحت بخش آب و ہوا، پُرسکون فضا اور دلفریب منظر نے تشنگانِ علم کو اپنے دامن میں جگہ دینے کی دعوت دی۔ سیکڑوں طلبگار یہاں بس گئے۔ تاکہ اپنے کارناموں کی تشکیل کر سکیں اور آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ ملا حسن فرخی اور ملا محسن فانی تو اسی سرزمین کے رہنے والے تھے، خواجہ خداوند محمود نے بھی اس کو اپنا وطن بنا لیا۔ ملا شاہ اکثر آیا کرتے تھے۔ کلیم اور قدسی بادشاہ تک

قلم کرنے کے لیے سکونت پذیر ہو گئے۔

موضوعات برائے تعلیم

ان تعلیمی درسگاہوں کے نصاب میں مختلف مضامین تھے۔ ان کو پڑھانے کے لیے ہمہ گیر اور خداداد قابلیت کے اساتذہ تھے۔ کسی طرح کسی موضوع کو مخصوص نہ کیا۔ اتا ہر مفید سائنس سے بقدر ضرورت آگہی حاصل کرنا پیش نظر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ دینیات و مابعد الطبیعات پر زیادہ توجہ کی جاتی لیکن تاریخ، ریاضیات، عروض اور خوش خطی بھی محبوب مشغلے تھے۔ امتحانات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ کسی ممتاز پروفیسر سے تعلیم حاصل کرنا ہی کافی قابلیت کا ثبوت تھا۔

زبردست ادبی تحریک

اس ہمہ گیر طرز تعلیم کا ایک فطری نتیجہ یہ تھا علمی محرکات[۲۱] تیز رفتار ہو گئیں۔ فارسی چونکہ سرکاری زبان تھی اس لیے اس کو سب سے زیادہ[۲۲] فروغ دیا جاتا۔ ادب کا زبردست ذخیرہ اس زبان میں فراہم ہو گیا۔ اس وقت تک دو مکتب فکر نمایاں طور پر وجود میں آ گئے تھے۔ ایک ہند، دایرانی طرز و اسلوب بیان کا نمایندہ تھا اور دوسرا خالص فارسی کا۔ اول الذکر اسکول کا پہلا ممتاز نمایندہ ابوالفضل تھا جس نے زبان و طرز بیان کو معیاری بنا[یا]۔ اس نے ادق زبان اور پُر پیچ اسلوب کا ایک ایسا نمونہ تیار کیا جس میں ترنم و لفظیات کی ضرورت پر بلند خیالی کو اکثر قربان کر دیا جاتا۔ اس عہد حکومت میں ادیبوں کی کثیر تعداد نے اس استاد کی تقلید میں جان فشانی کی، لیکن چند مستثنیات کے علاوہ بہت کم اہل قلم کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ ایسے اہل قلم میں عبدالحمید لاہوری، محمد وارث، چندر بھان، اور محمد صالح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کا طرز بیان

اس زمانے میں جو ہندستانی فارسی ادب ظہور میں آیا یقیناً وہ خالص فارسی نہیں ہے۔ اس کی توقع کرنا بھی تحصیل حاصل ہے۔ فارسی زبان ہندوستان میں بسنے کے لیے آئی تھی۔ ایسی صورت میں جدید و مؤثر ماحول سے زیادہ دنوں تک علاحدہ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ہندستانی اثرات قبول کیے ہندوستانی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اس میں ایک امتیازی خصوصیت کا آ جانا لازمی تھا۔ اس طرز بیان و زبان پر بغیر ان عوامل پر غور کیے ہوئے یہ اعتراض کرنا کہ یہ غیر فارسی ہے اہل ہند کی صلاحیت و ذہانت کی توہین کرنا ہے۔ کوئی زبان اپنی خالص عصمت اجنبی اشخاص میں برقرار نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر مقامی لوگ ذہنی لحاظ سے ناقابل اعتنا ہوں تو دوسری بات ہے، اس لحاظ سے کوئی وجہ نہیں کہ فارسی زبان اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوتی۔

ہندفارسی طرزِ تحریر اس لیے ترقی کرتی رہی کہ اس کو غیر معمولی درباری سرپرستی حاصل تھی، ابوالفضل کے کارنامے، اسلوب مرصّع و مسجع ہونے کی وجہ سے شاہ جہاں کو وجدانی طور پر مرغوب تھا۔ اس لیے اُسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے عہدِ حکومت کی تاریخ اسی انداز بیان میں قلم بند کر سکے۔ دراصل اس طرز میں ایک ناقابلِ بیان کشش ہے جو ایک ہندستانی کے دل کو پسندیدگی پر مشتعل کرتی ہے لیکن ایک غیر ملکی کے لیے بلاشک و شبہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے اس لیے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ اکبر و شاہ جہاں کے عہدِ حکومت کی عظمتیں اس سے کم پُر شکوہ زبان میں رقم نہیں ہو سکتی تھیں۔

فارسی مکتبہ

دوسرا مکتبۂ خیال یعنی خالص ایرانی اسکول کو ان افسروں کی حمایت حاصل تھی۔ جو یا تو بلحاظِ نسل ایرانی تھے یا اپنے کو ایرانی خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ اوّلین عہدِ حکومت میں علامی شکر اللہ، ملقب بہ افضل خان نے بہت سے ایرانی اہلِ قلم کو نوازا۔ ایسے لوگوں میں امینائی قزوینی اور جلال الدین طباطبائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا ادبی کارنامہ فارسی ادیبوں کی طرزِ تحریر سے بالکل مختلف ہے۔ موازنہ کرنے سے دونوں کا فرق نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

ایرانی شعرا

اس عہدِ حکومت کا بلکہ سترھویں صدی کے نصف حصّے کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ ایران سے شعرا کا ایک ہجوم ہندستان آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیضی کے بعد کوئی ہندستانی درباری شاعر کے عہدے پر مامور نہ ہو سکا۔ وجہ بہت نمایاں ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ ہند فارسی طرزِ تحریر نثر میں درجۂ امتیاز تک پہنچ گیا تھا لیکن ایرانی شاعری اب تک مقبول و ممتاز تھی۔ جب شاہجہان نے کلیم کو درباری شاعر منتخب کیا تو اس نے گویا اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔

شاعری

طرز اسلوب کے بیان سے الگ ہو کر ہم کو اس پر نظر کرنی ہے کہ اُس دور میں ادب کی نوعیت کیا تھی، تاریخ کے ابعد ضخامت کے لحاظ سے شاعری کا نمبر آتا ہے جیسے مذکورۂ بالا بہترین شعرا وہی تھے جو ایران سے وارد ہوئے تھے لیکن علاوہ ایک یا دُو کے ان میں زیادہ تر اوسط درجہ کے فنکار تھے وہ کوئی چیز تخلیقی یا نئی پیش کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ ان کا ادبی کارنامہ بے مزہ بھی ہے اس سے شعور اور وسیع النظری کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ شعرا الفاظ کی الٹ پھیر میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں نئے خیالات پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زیادہ تر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اشعار وجدان سے زیادہ ضرورت کے آورد ہیں۔

طرزِ تخیل و اسلوبِ بیان

ان کی غزلیات نام کے لیے صوفیانہ اندازِ فکر کا نمونہ ہیں۔ ان میں عموماً گھسی پٹی طرزِ تخیل اور پامال موضوعات کی بھرمار ہے۔ ان کے استعارات و تشبیہات زیادہ تر گل و بلبل، شیریں و فرہاد، لیلیٰ مجنوں کی داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ ان کی پرواز عام سطح سے بہت کم بلند ہوتی ہے۔ ان کی طرزِ فکر شاذ و نادر ہی توجہ طلب ہوتی ہے۔ غزل سے ہٹ کر اس دور میں قصیدہ نگاری پر زیادہ توجہ کی گئی کیونکہ ابتداء میں اس صنفِ شاعری پر انعام و اکرام ملتا تھا۔ شہنشاہ اپنی مدح سن کر بہت محظوظ ہوتا تھا۔ ایک بار مدحیہ قصیدہ پر خوش ہو کر اس نے ایک شاعر کو سونے چاندی میں تولا کر سب کچھ اسی شاعر کو انعام میں دیا تھا۔

رسمی مواقع

بعض ایسے مقررہ رسمی مواقع تھے جب شعراء اپنی فکر و فن کا مظاہرہ کرتے۔ مثلاً شمسی یا قمری تاریخوں کے لحاظ سے جشنِ ولادت، تخت نشینی کی تقریب، شاہی خاندان میں کسی بچہ کی پیدائش کی خوشی وغیرہ میں وہ مادہ تاریخ نظم کرتے یا قصائد کہتے اور حسبِ استعداد انعام سے سرفراز ہوتے۔ اس کے علاوہ مشاعرے بھی ہوتے جس میں شعراء ایک دوسرے سے تقابل کرتے ہوئے شہنشاہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے۔

شعراء

شاید خالص فارسی کا سب سے معتبر شاعر شاہجہان کے دربار میں سعیدائی گیلانی تھا جو عہدِ جہانگیر سے داروغہ زرگر خانہ تھا۔ وہ قدیم و جدید مذاق کا مجموعہ تھا۔[۲۳] اس کے بعض قطعات مادۂ تاریخ بڑے حسین و دلکش ہیں۔

کلیم

ابوطالب کلیم شاہ جہان کا درباری شاعر تھا، وہ کاشان میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کی تربیت و نشو و نما ہمدان میں ہوئی۔ وہ جہانگیر کے زمانے میں ہندستان آیا اور میر جملہ کی سرپرستی میں رہا۔ اس کو روح الامین بھی کہا جاتا تھا۔ شاہ جہان کی تخت نشینی کے بعد اسے شاہی ملازمت نصیب ہوئی۔ شاہ جہان نے اس کی قابلیت کے اعتراف میں سب سے بڑی عزت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے دیوان میں قصائد زیادہ تر شاہ جہان کی مدح میں ہیں۔ مثنوی میں اس کی تعمیرات کا بیان ہے۔ ایک ساقی نامہ بھی ہے جس میں ظفر خان ناظم کشمیر کی مدح ہے۔ اس نے پادشاہ نامہ بھی منظوم کیا۔[۲۴]

قدسی

حاجی جان محمد متخلص بہ قدسی کا اظہارِ بیان نہایت خوش اسلوب و ہر دل عزیز تھا۔ جلد ہی اس نے شاہ جہان کی توجہ حاصل کر لی۔ اس کو پادشاہ نامہ منظوم کرنے پر مامور کیا گیا۔ باغاتِ کشمیر پر بھی اس نے طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ شاہ جہاں کی مختلف تعمیر کردہ عمارات پر ایک نظم کہی جس میں ۱۶۳۰ء سے ۱۶۳۸ء تک کی تعمیرات پر مادۂ تاریخ بھی کہے۔ وہ کلیم سے زیادہ

قابل سمجھا جاتا تھا۔[۲۵]

کاشی میر محمد یحییٰ معروف بہ کاشی اپنی اصل، شیراز سے منسوب کرتا ہے۔ وہ ہندستان آیا تو شہنشاہ اور داراشکوہ کی سرپرستی سے نوازا گیا۔ اس کو بھی پادشاہ نامہ منظوم کرنے کی خدمت سپرد کی گئی لیکن جلد ہی معتوب ہو گیا اور اس کا کام نامکمل رہ گیا۔

صائب لیکن اس دور کا سب سے عظیم شاعر اور ایک جدید طرز کا موجد مرزا محمد علی متخلص بہ صائبؔ تھا۔ عرصۂ دراز تک وہ کابل میں رہا وہاں اس کو ظفر خان کی سرپرستی حاصل رہی۔ شاہ جہان نے بھی اسے خوش آمدید کہا اور اس کو مستعد خان کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ مگر وہ دربار میں نہ ٹھہرا بلکہ اپنے ابتدائی مربی ظفر خان کے ناظمِ کشمیر ہونے پر اس کے ساتھ چلا گیا۔ بعد میں وہ ایران واپس ہو گیا۔ شاہ عباس ثانی نے اسے اپنا درباری شاعر بنا دیا۔

سلیم سلیم، طہران کا باشندہ تھا اوروں کی طرح یہ بھی وطن کو خیرباد کہہ کر سرپرستی کی تلاش میں ہندستان آ گیا۔[۲۸] وہ زود گو بھی تھا اور فی البدیہہ اشعار کہنے پر بھی قادر تھا لیکن اس کی شاعری قبولِ عام کا شرف حاصل کر سکی نہ اس کی قابلیت کا اعتراف ہوا۔ وہ اسلام خان کی ملازمت میں تھا۔ اس کی کوچ بہار اور آسام کی مہم سے متاثر ہو کر سلیم نے ایک مختصر سی مثنوی بھی نظم کی تھی۔

مسیح حکیم رکن الدین عرف مسیح کاشان کا باشندہ تھا۔ پہلے وہ شاہ عباس اوّل کی ملازمت میں داخل ہوا لیکن اس سے کبیدہ خاطر ہو کر ہندستان چلا آیا۔ یہاں جہانگیر بھی التفات سے پیش آیا اور شاہ جہاں نے بھی دل جوئی کی۔ وہ ایران واپس گیا اور ۱۶۵۶ء میں وہاں اس کا انتقال ہوا۔[۲۹]

رفیع حسن بیگ کا تخلص رفیع تھا۔ وہ مشہد سے بخارا گیا۔ وہاں نذر محمد خان نے اس کو فرمان نویس کا عہدہ دیا۔ تخمیناً ۱۶۴۵ء میں وہ ہندستان چلا آیا۔ شاہ جہان نے نظرِ التفات کی، وہ پیشہ ور شاعر تو نہ تھا لیکن پھر بھی اسلوب بیان نہایت جان دار اور رواں تھا جب بھی اس نے اپنی نظمیں حضورِ شاہ حاضر کیں اس کو دل کھول کر داد ملی۔[۳۰]

فاروق محمد فاروق ابن خواجہ محمد صدیق نہایت بیدار مغز شخص تھا۔ وہ امیروں اور درباریوں میں بڑا ہر دل عزیز تھا، دلچسپ نظمیں لکھتا تھا۔ پہلے اسے افضل خان کی اور پھر سعید خان کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ آخر الذکر کے ہمراہ وہ کابل چلا گیا۔

منیر ہند فارسی مکتبۂ خیال کے شعرا میں مولانا ابوالبرکات کا نام سرفہرست ہے ان کی عزیت منیر تھی۔ وہ مورخ محمد صالح کا قریبی دوست تھا۔ وہ عمدہ نثر نگار بھی تھا۔ ہمہ گیری کے لحاظ سے اس کا نمبر صرف فیضی کے بعد آتا ہے۔ اس کی بعض تنقیں بڑی دلچسپ ہیں۔

شیدا ملا شیدا کی پرورش و پرداخت فتح پور میں ہوئی۔ لیکن بعد میں وہ دہلی چلا گیا۔ قدرت نے اسے ہجویہ اندازِ بیان، حاضر جوابی اور قدرے جدت پسندی کی خصوصیات سے سرفراز کیا تھا۔ ایک گھنٹہ میں ایک قصیدہ کہنے پر قادر تھا۔ قدسی کی بُری طرح نکتہ چینی کیا کرتا اپنے معصر میر الہی کا حلفیہ دشمن تھا کبھی عبدالرحیم خان خاناں کبھی شہر یار اور کبھی شاہ جہان نے اس کی سرپرستی کی۔ مخزن گنجور کے نمونہ پر اس نے بھی ایک نصیحت آمیز مثنوی نظم کی اور اس کا نام دولت بیدار رکھا۔ آخری عمر میں وہ کشمیر چلا گیا وہیں اس کا انتقال ہوا۔

برہمن چندربھان متخلص بہ برہمن دورِ مغلیہ میں پہلا ایسا ہندو شاعر تھا جو خداداد قابلیت سے متصف تھا۔ وہ لاہور کا باشندہ تھا بُردبار اور وسیع النظر آدمی تھا نثر و نظم دونوں اصناف پر خوش اسلوبی سے یکساں طبع آزمائی کا ملکہ رکھتا تھا۔ اگر چشمِ حقیقت کو یہ تلاش ہو کہ ابو الفضل کی طرزِ تحریر کو کس فنکار نے مکمل طور پر جذب کر کے اس کو بار دگر پیش کیا تو بلا شک و شبہہ چندربھان ہی کو اس کا اہل پائے گی۔ اس کا دیوان چہار چمن، مرصع و مسجع نثر نگاری کا نمایاں نمونہ ہے[۱۲]

حاذق حکیم حاذق۔ حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھتیجا تھا۔ وہ ہندستان میں پیدا ہوا اور اس کی پرورش و پرداخت ہندستان ہی میں ہوئی لیکن ایرانی ہندستانی ثقافت کا ہما ہنگ سنگم کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کا اسلوب بیان قدیم روایات کا نئے خیالات کے ساتھ پیش کرنے کا امتزاج تھا اور اپنا کلام پُر اثر آواز میں پڑھتا تھا۔ حالانکہ وہ بسیار گو تھا لیکن بہت ہزلعز گو بھی تھا[۱۳]

خیالی طبقات شاہجہانی کے مصنف نے خیالی کو انوری کا ہم پایہ تصور کیا ہے۔ خیالی نے امرا کے دامن دولت سے وابستہ رہنا کبھی پسند نہ کیا، نہ کبھی ان لوگوں کی خوشنودی کے لیے اشعار کہے۔ قدرت نے اسے ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بھی ماہر بنایا تھا۔

دلیری دلیری ایک نوجوان مگر مفلوک الحال شاعر تھا۔ کبھی کبھی کئی دن تک اس نے مسلسل

فاقہ کیا۔ وہ عرفی کا زبردست مداح تھا اور اس کی طرزِ فکر کی تقلید بھی کرتا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکوں پر جان چھڑکتا تھا عورتوں سے اُسے نفرت تھی۔[۲]

ماہر

محمد علی ماہر ایرانی النسل ہے لیکن اس کی پیدائش و پرورش و پرداخت ہندستان ہی میں ہوئی۔ آوارہ گردی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہمیشہ یہاں سے وہاں گھوما کرتا۔ عمدہ موسیقی اور حسین پیکر سے اسے عشق تھا۔ اس کا طرز آسان و خوبصورت تھا۔[۳]

نثر

خیالات کی ترجمانی کے لیے نثر ایک محبوب میدان ثابت ہوئی ادیبوں نے لفظیات ترنم کو ہم آہنگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ صنائع و بدائع کا کثرت سے استعمال ہوا۔ اچھے لکھنے والوں نے شاعرانہ جلا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ اس ترقی یافتہ رنگین طرزِ تحریر کے نمونے، باوجود متضاد مکتبہ کی نمایندگی کے شاہ فتح کانگڑا[۴] اور چہار چمن ہیں۔ ایک خالص ایرانی فارسی کا دوسرا ہندستانی فارسی کا نمونہ ہے۔ خیال کی مصوری اور زبان کی زرخیزی کے لحاظ سے آخرالذکر کو اول الذکر پر ترجیح حاصل ہے۔

نثر کی اقسام

نثر نگاروں کی ایک بڑی جماعت نے تاریخی مواد کی ترتیب و تدوین پر اپنا وقت صرف کیا۔ ان کی طرز تحریر و خصوصیات کا ذکر کہیں اور کیا گیا ہے۔ نثر کی دوسری شاخ جس کو بارآور کرنے میں مستقل مزاجی سے کام لیا گیا وہ خالص ادب کا فن تھا۔ ان میں سے بعض عصری و ذاتی اور سرکاری مراسلات پر مبنی تالیفات ہم تک پہنچی ہیں اور ہم ان کے خوش آئند و پرتکلف اسلوب اور خیالی باتوں پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ منیر، برہمن، بجے سنگھ، افضل خان[۲۱]، سعداللہ خان[۲۲]، فاضل[۲۳]، عنایت اللہ[۲۴]، ملا محمود جونپوری[۲۵]۔ حکیم حاذق[۲۶]، شیدا، ملا طغرائی[۲۷] کے خطوط اب تک بطور نمونہ دیکھے جاتے ہیں۔

طغرائی

ملائے طغرائی جہانگیر کے عہد حکومت کے اختتام کے قریب ہندستان آیا اور دکن سے شاہ جہان کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اسے شہزادہ مراد کا منشی مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ وہ بلخ بھی گیا۔ اس نے مراۃ الفتوح کے نام سے اس جنگ کا بیان پیش کیا۔ اس کے دوسرے نثری کارنامے فردوسیہ، کشمیر کی تعریف میں اور کنز المعانی شاہ شجاع کی تعریف میں اور تاج المدیح شہزادے مراد کی تعریف سے متعلق ہیں۔

دوسرے نثری کارنامے

ملفوظات تیموری کا نظر ثانی کردہ ایڈیشن شاہ جہان کی خواہش پر محمد افضل بخاری نے ۱۰۴۷ھ میں پیش کیا۔ اسی سال منیر نے جونپور میں ہرمز کے شہزادہ

والا اختر کے محاربات وخطر پسندیوں کی داستان مرتب کی۔ یہ بھی اپنے عہد کی مرصع و مسجع طرز تحریر کا نمونہ ہے۔

لغات

چار جامع و مانع لغات بھی لکھے گئے اور شاہ جہان کے نام پر معنون کیے گئے۔ لغات شاہ جہانی از عبدالرشید الطاطوی چہار انصار دانش از امان اللہ ملقب بہ خانہ زاد خاں شاہد صادق از محمد صادق وجود میں آگئے۔ آخرالذکر مختلف سائنسوں کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں خاص طور پر دینیات، فلسفہ، سیاست، اخلاقیات اور سرگزشت عالم سے متعلق مواد ہے۔

تراجم

نثری ادب کا دوسرا نمونہ جس کی تجدید اکبر کے عہد کے بعد دارا شکوہ نے کی وہ سنسکرت کی کتابوں کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندو ہمہ اوست، اپنشد۔ بھاگوت گیتا، اور یوگ بشسشٹ کے اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ خود اس نے کیا۔ اس کے منشی بنوالی داس نے پربودھ چندرادوے کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس کا نام گلزار حال رکھا۔ اور کسی ابن ہرکرن نے رامائن کا ترجمہ کیا۔

مذہبی تصانیف

جگہ کی قلت سد راہ ہے اس لیے ہم مختصر تبصرہ بھی اس دور کی مذہبی تصانیف کا نہیں کر سکتے، لیکن دو ایسے لکھنے والے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ دارا شکوہ نے مسلم بزرگان دین کی ایک سوانحمری لکھی اس کا نام سفینۃ الاولیاء رکھا، لیکن مذہبی تقابل کا زیادہ عظیم یادگاری و تخلیقی کارنامہ دبستان المذاہب ہے جس کو مشہور و معروف مصنف محسن فانی نے قلمبند کیا ہے۔ محسن فانی شاعر اور نثر نگار تھا۔

طب

منجملہ اور مضامین کے علم طب کا بھی مطالعہ مرغوب تھا۔ اس دور کے بعض حکما غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ یہ لوگ اپنے علم کے علاوہ دوسرے علوم کے بھی ماہر تھے۔

وزیر خاں

حکیم علیم الدین وزیر خاں درباری طبیب تھا۔ اس کی ولادت و تربیت لاہور میں ہوئی تھی۔ فن طب اس نے حکیم دوائی سے حاصل کیا تھا۔ وہ نبض سے تشخیص کرنے کا ماہر تھا۔ شاہجہاں اور اس کے لڑکوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ وہ مختلف عہدوں پر مامور رہا کبھی دیوان بیوتات رہا، کبھی خانِ سامان رہا، کبھی میر عرض، غرض کہ مسلسل شاہی ملازمت میں رہا۔ بالآخرہ ہزار سواروں کا افسر بھی ہوا اور پنجاب کا ناظم بھی۔

ایک دوسرا طبیب حکیم داود تھا۔ وہ شاہ عباس اول کا محبوب تھا۔ اپنے سرپرست کی وفات کے بعد وہ مکہ معظمہ گیا، وہاں سے اس نے ہندوستان کا سفر کیا۔ شاہجہاں نے اسے پنجہزاری منصب عطا کیا اور تقرب خاں کا خطاب بھی۔

مومنائے شیرازی حکیم مومنائے شیرازی جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان وارد ہوا اور مہابت خاں کی ملازمت میں داخل ہوا۔ بعدازاں وہ دربار شاہی سے متوسل ہوا اور شاہجہاں نے اسے دو ہزاری منصب دار بنادیا۔ وہ ہوشیار وہر دلعزیز طبیب تھا۔

اطباء دوسرے اطبا جو قابل ذکر ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ حکیم فتح اللہ شیرازی ماہر علم الامراض وقرابہ دین حکیم سدرا خاندانی حکیم۔ حکیم ابوالقاسم اور حکیم رکنائے کاشی۔ اس زمانے کے مشہور جراحوں میں جگ جیوں اور شیخ قاسم تھے۔

علم نجوم وریاضیات علم نجوم وریاضیات کا مطالعہ وسیع پیمانہ پر جاری تھا۔ ملا فرید منجم اس عہد کا سب سے نامی گرامی جوتشی تھا۔ اس نے ستاروں کا ایک نقشہ بنایا اور اس کا نام زیچ شاہجہانی[۲۳] رکھا۔ عطا اللہ نے ایک مقالہ علم ہندسہ، علم مساحت اور الجبرا پر تصنیف کر کے شاہجہاں اور دارا کے نام پر معنون کیا۔ عبدالرشید نے زیچ گنت، کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا۔ دوسرے مشہور ریاضی دان حضرات کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمود جونپوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری اور شمس الدین خلجی ائی[۲۴]

دینیات فلسفہ قانون، دینیات، اخلاقیات، فلسفہ، عمرانیات وغیرہ بزرگان دین و مقدس حضرات کے محبوب مضامین تھے۔ ایسے بزرگوں کی تعداد بے شمار تھی۔ قریب قریب ہر شہر وقریہ میں ایک ملا ہوتا تھا جو اپنا وقت یا تو مسجد میں گذارتے یا مذکورہ بالا موضوعات میں کسی کے مطالعہ میں منہمک ہوتے۔ اس زمانے کے مشہور علماء کے نام حسب ذیل ہیں:۔

ابوالمکارمؒ، برادر ابوالفضل، ملا وحید کشمیریؒ، مولانا عبدالسلام لاہوریؒ، مولانا حسن دہلویؒ

بزرگانِ دین جو حضرات اپنے زہد و تقوی کے لیے مشہور تھے ان میں ملا شاہ لاہوریؒ، سید احمد قادریؒ، سید جلال گجراتیؒ، شاہ میر لاہوریؒ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندی شاہجہاں کے دور حکومت کا ایک جزو وہی تھا جو ہندی ادب و زبان کے ارتقا کا شاندار عہد سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کا بھی اس کے اثر سے دور رہنا مشکل تھا۔ وہ ہندی بولتا تھا، ہندی موسیقی کا دلدادہ تھا، ہندی شعرا کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس زمانے میں ہندی کے جو شعرا دربار سے منسلک تھے ان کے نام یہ ہیں۔ سندر داس۔ چنتامنی اور کاوندر آچاریہ۔

سندر داس سندر داس برہمن گوالیار کا باشندہ تھا۔ اس کا سرپرست شاہجہاں تھا۔ چنانچہ پہلے تو اسے کوی رائے کا خطاب عطا کیا اور بعد میں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر

سابقہ کا اضافہ کرکے اس کو مہا کوی رائے بنادیا۔ کبھی کبھی اسے سیاسی ذمہ داریاں بھی سپرد کی جاتیں چنانچہ جبمار سنگھ کی بغاوت سے پہلے مہا کوی رائے کو بطور ایلچی گفت وشنید کے لیے اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کی تصنیف سندر سرنگار ہندی عروض سے متعلق ہے۔ اس کی دوسری کتابوں کے نام سنگھاسن بتیسی اور بلا ما ہیں۔

چنتامنی ضلع کانپور کا باشندہ تھا۔ وہ اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ یوں تو ہر بھائی شاعرانہ صلاحیتوں کا مالک تھا مگر چنتامنی کو اس لحاظ سے بھی فوقیت حاصل تھی۔ سچ پوچھیے تو اس نے فن شاعری کے لیے ایک نئی راہ ایجاد کی۔ اس پر سب متفق ہیں کہ وہ اپنے عہد کا عظیم ترین شاعر تھا اس کو بھی شاہجہاں کی سرپرستی حاصل تھی اس نے حسب ذیل تصنیفات قلم بند کیں۔

چند وچار۔ کاوے ویوک، کوی کل کلپت۔ د اور کوی پرکاش۔ اصلیتاً وہ برج بھاشا بولی کا شاعر تھا۔ اس کا اسلوب خوش آیند وافضل ہے۔ اس کی رامائن اپنے پراثر کویتا اور چھند کے لیے مشہور ہے۔

کویندر اچاریہ بنارس کا باشندہ تھا۔ اس نے شاہجہاں اور اس کے لڑکوں کی تعریف میں "کویندر کلپ لتا" تصنیف کی۔ اس کی تصانیف اودھی اور برج بھاشا بولیوں کا حسین امتزاج ہیں۔ وہ سنسکرت کا بھی اچھا شاعر تھا۔ اس نے یوگ وششٹ کی ایک تفسیر بھی لکھی۔

اردو کا مقدر جب ہندی زبان شمال میں سرسبز ہو رہی تھی۔ تکمیل، لطافت اور اسلوب حاصل کر رہی تھی، اس کی مستقبل کی حریف اردو خلاف امید زور وشور کے ساتھ دکن میں پروان چڑھ رہی تھی۔ حالانکہ اس کی ابتدا مشرقی پنجاب مغربی صوبجات ممالک متحدہ سے ہوئی تھی۔ وہ شمال سے منتقل ہوگئی تھی اور اپنے اصل وطن اس وقت واپس ہوئی جب اٹھارویں صدی اپنی بہت سی منزلیں طے کر چکی۔ شاہجہاں کو اردو کی ترقی سے وابستہ کرنا غلط ہے۔ تاریخی شواہد اس کی تائید نہیں کرتے۔ نہ شاہجہاں نے اس کی سرپرستی کی نہ ہم کو اس دور میں کوئی اردو کا نمایاں ادیب شمالی ہند میں ملتا ہے۔

دکن میں اردو کیوں پھولی پھلی مغلیہ دربار کی ہمدردی سے اردو کیوں محروم رہی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ فارسی کا اثر اب بھی غالب تھا۔ اس کا دور دورہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں تیز تر ہوتا گیا تھا کیونکہ دربار ایران سے اس کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ یہ سلسلہ ارتباط اورنگ زیب کے زمانے میں ختم ہوا اور اس کے بعد شمالی ہند میں اردو تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ برخلاف اس کے جنوب میں فارسی کا اثر بہت کچھ ختم ہو چکا تھا۔ بیجاپور اور گول کنڈہ دونوں جگہ پورا انتظامیہ ہندوانہ ہو گیا تھا۔ ان حالات میں یہ سوچنا بیجا نہ ہوگا کہ شمالی ہند کی اردو سے جداگانہ دکنی اردو کی نشو ونما فارسی کے اس اثر سے ہوئی جو مرہٹی پر پڑا تھا۔ یہ فارسی اور برج بھاشا کی مصالحت کا نتیجہ نہ تھی۔

تعمیرات

ظاہر پسند ذہن کو شاہجہانی حکومت کی عظمتیں اس وقت کے ادب سے کہیں زیادہ نمایاں فن میں نظر آئیں گی۔ شہنشاہ کی ساری توجہ فن تعمیر کی ترقی سے وابستہ تھی۔ اس کے زمانے کی تعمیر کردہ عمارات فن انجینیری کی عدیم المثال زندہ یادگار کھڑی ہیں۔ انھوں نے اپنی دل کشی، اور تازگی پوری آب وتاب کے ساتھ برقرار رکھی ہے اب بھی وہ دنیا کے کسی گوشہ سے آنے والے کو خاطر خواہ دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ شان و شوکت، سکون و نفاست، جاہ وجلال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگرچہ بعض عمارات میں ضرورت سے زیادہ فنی خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ماہر فن کو بھدا پن کا احساس ہوتا ہے لیکن ایک غیر تربیت یافتہ آنکھ اس کے ارد گرد حسن کے سوا کچھ نہیں پاتی۔ وہ مسحور ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر جملہ تاریخی مواد کا ذخیرہ تلف ہو جاتا اور صرف یہی عمارتیں شاہجہاں کے عہد حکومت کی داستان بیان کرنے کو باقی رہ جائیں، تو بھی ہم کو شبہ نہیں رہ جاتا کہ تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور تھا۔

اسٹائل

اس عہد کی عمارتوں کی شکل و صورت، وضع قطع پر ماہرین فن کی متضاد رائیں ملتی ہیں۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو ہندستان کو کسی ایسی فہم و فراست کا اہل سمجھنے میں تکلف کرتا ہے کہ وہ کوئی نئی چیز پیدا کر سکتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس دور کی عمارتوں کی تشکیل میں زبردست بیرونی اثرات کارفرما ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے۔ ن کی رائے اس نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان عمارتوں کی ساخت کا نظریہ ہندستانی روایات کے ارتقا کا فطری نتیجہ ہے۔ ایسے نازک و پیچیدہ مسئلہ پر قطعی فیصلہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ حقیقت دونوں نظریات کے انتہائی حدود کے درمیان ہے۔ احتیاط سے سوچتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ طرز تشکیل دو ثقافتوں کے امتزاج و اثر کا ماحصل ہے۔ یہ رویہ استقلال کے ساتھ نشو و نما حاصل کرتا رہا یہاں تک کہ اس دور حکومت میں پائے تکمیل کو پہنچا کیونکہ اس ذوق کو کو اب زور و سرپرستی حاصل ہوئی۔

اس طرز کو کیسے ترقی ہوئی؟

اکبر کے عہد اور اس کے پوتے کی زمانے کی عمارتوں کی ساخت میں جو نمایاں فرق پہلی نظر میں سامنے آتا ہے وہ ارتقار کے امکان کو ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھتا ہے کیونکہ ایسے لوگ دونوں ثقافتوں میں کوئی رشتہ یا سلسلہ ارتباط تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو ایسے وسوسے دور ہو جاتے ہیں۔ اگر دونوں عہد کی عمارتوں کی ساخت پر بہ یک وقت غور کریں تو یقیناً ایک رشتہ اور سلسلہ پا جاتے ہیں اور ارتقار کی زنجیر ہاتھ آجاتی ہے۔ ایک اور نکتہ اس فوری تبدیلی کا ہے جو شاہجہانی عہد کی کثرت تعمیر میں مضمر ہے۔ علاوہ بریں شاہنشاہ کو ذاتی طور پہ متاثر کرنے والی عمارتوں اور بعدی تعمیرات کے امتیاز کا اچھا شعور

تھا۔ وہ فن تعمیر کی سائنس سے کما حقہٗ واقف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تعمیرات کا ہر نقشہ بہ نظر غور دیکھتا اور ماہرین فن سے بغیر تنقید و مباحثہ کے آخری منصوبہ پر حکم نہ دیتا۔ ان حالات میں کیا تعجب ہے اگر ایک بہتر اور پراثر جدید اسلوب ترقی کرتے کرتے اس طرح صورت پذیر ہوا

شاہجہاں کا مذاقِ تعمیر

شاہجہاں کا ذوق تعمیر اس کے بالکل ابتدائی ودرجیات سے شروع ہوتا ہے شہزادگی کے زمانے میں بھی جو عمارتیں اس کو دی جاتی تھیں ان کی ترمیم وآراستگی سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ جب بادشاہ ہوا تو اپنے اس محبوب مشغلہ کو اس نے پورے زور سے آسودہ کرنا چاہا۔ علاوہ بریں اس کے کردار کی بعض خصوصیات اس کے اِس انہماک کی تشریح کرتی ہیں۔ وہ خودبین واولوالعزم تھا۔ خودبینی ہمیشہ عوامی ستایش کی خواہشمند رہتی ہے۔ اس کو خیال ہوا ہوگا کہ یہ خواہش شاندار عمارات کی تعمیر سے دائمی حیثیت حاصل کرسکتی ہے۔ اس کا حوصلہ ہمیشہ عدیم المثالی کی طرف اس کو مائل کرتا۔ مصوری میں اضافہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے فطری طور پر اس نے تعمیرات کی طرف توجہ کی کیونکہ اس میدان میں ترقی کے وسیع امکانات تھے۔ اس کے عہد کی تعمیر کردہ عمارتوں نے اس کے ذوق خودبینی وحوصلہ مندی کو پوری آسودگی عطا کی ہوگی۔

ہر جگہ عمارت تعمیر کرانا

اپنے عہد میں جہاں کہیں شاہجہاں سیر و سیاحت کے لیے گیا وہ سرزمین کوئی نہ کوئی یادگار لیے ہوئے اس کے جذبہ تعمیر کی ناآسودگی کی شہادت دیتی ہے۔ ان تعمیرات کی تفصیل پیش کرنے کا تو ذکر ہی کیا ان کی فہرست بھی قلمبند کرنا ممکن نہیں۔ اجمیر کی مسجد، مقبرہ شیخ معین الدین چشتی کے احاطے میں اور اناساگر کی بارہ دری اس کے ذوق تعمیر کی پراثر شواہد ہیں۔ بعض مورخوں نے کشمیر، لاہور، انبالہ، باری، فیض آباد، گرایار اور کابل وغیرہ میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں کا بیان کیا ہے لیکن ان سب میں بہترین نمایندہ ومحفوظ آگرہ اور دہلی کی عمارتیں ہیں۔

آگرہ

آگرہ کا قلعہ ایک مجموعہ ہے ان بیشمار عمارتوں کا جو عہد اکبر سے لے کر عہد شاہجہاں میں نمودار ہوئیں۔ شاہجہاں نے وہاں بھی دیوان عام و دیوان خاص اور شاہی مستورات کی قیام گاہیں تیار کرائیں، اس کے حجرے، غلام گردش، شہ نشیں خالص سفید سنگ مرمر کے ہیں۔ سب سے سب پر کار نقش کاری اور نفیس گل کاری سے آراستہ ہیں۔ ثمن برج بھی نہایت خوبصورت عمارت ہے، کبھی قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاہجہاں نے چھری ہوئی پتلیوں سے اپنی محبوبہ ملکہ کے دائمی جائے آرام پر نظر کر کے آخری سانس لی۔

موتی مسجد

قلعہ میں سب سے زیادہ غیر نمائشی اور خوش نما عمارت موتی مسجد ہے۔ اس کی تعمیر

میں سات سال لگے (١٦٤٥-١٦٥٣)؛ ٣ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ عمارت فن کی تکمیل اور سادگی کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر میں ایسے سفید سنگ مرمر کا استعمال ہوا ہے جو نمائشی نقوش آرائشی عنصر سے بے نیاز ہے تاکہ خانہ خدا کا تقدس مجروح نہ ہو۔

جامع مسجد

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی سب سے بڑی لڑکی کی بنوائی ہوئی جامع مسجد قلعہ کے باہر شمال و مغرب کی سمت ہے۔ ٥ سال کی محنت میں ٥ لاکھ روپیہ کی لاگت سے یہ مسجد ١٦٤٨ء میں تیار ہوئی۔ ابھرے ہوئے نقوش کی یہ بڑی عمدہ تعمیر ہے۔ اس کی بے نظیر تکمیل و شان و شوکت میں بڑا حسین تناسب ہے۔

تاج

لیکن آگرہ کا تاج حسن، تاج محل ہے جس کا شمار دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں ہے۔ ہاول تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ یہ ہندستان کی مثالی بلندی تخیل کا نمونہ ہے جس میں عمارت سازی سے زیادہ سنگ سازی کا ہاتھ ہے۔ اس کی انتہائی نزاکت، تعمیری حسن اور معماروں کی کامل خوش مذاقی، دانش وری کا ذہن نشیں کرانا، ناممکن ہے۔ اس کے خالص سفید سنگ مرمر، پیاز نما گنبد، حسین منقش پردے، پاکیزہ مرصع کام، کسی بیان کو ضبط تحریر میں آنے کی اجازت نہیں دیتے دراصل یہ حسن کا مجسمہ اور دائمی مسرت کا سامان ہے۔ ہندستان کی تعمیری تاریخ میں نہ ایسی عمارت کبھی بنی ہے نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ منفرد ہے، اس سے زیادہ بھاری اور ٹھوس عمارتیں ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن میں اس سے زیادہ مرصع کاری ہے لیکن کہیں بھی عظمت و سادگی اس مکمل تناسب اور موزونیت سے ہم آہنگ نہ ملے گی۔ یہ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور بخشتی ہے یہ وہ یادگار ہے جو خود بینی کے احساس سے پیدا ہوئی مگر نزاکت و نفاست سے بھرپور ہے

اس کے طرزِ تعمیر پر تنقید

اگرچہ حسنِ تاج کے جائزہ میں اہل قلم کی اکثریت ہمخیال ہے لیکن اس کی اصل تخلیق و طرزِ تعمیر پر بڑا اختلاف ہے سلی مان اپنی کتاب[b] میں ایک وہمی تصور پیش کرتا ہے کہ ایک فرانسیسی انجینیر اسٹن دی بورڈ[c] نے اس کا نقشہ بنایا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک مضحک خیال آرائی سے اسے استاد عیسیٰ سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن اس خام خیالی کی تائید تاریخ نہیں کرتی۔ وی، اسمتھ، مینریک کی شہادت کا سہارا لے کر اس کے ابتدائی نقشہ تیار کرنے کا سہرا جرمینو ورونو کے سر باندھتا ہے اس نظریہ کی تردید سر جان مارشل اور آئی۔ بی ہاول تادیخی نقص

(a) Havell کے الفاظ یہ ہیں: Indias Venus De Milo

(b) Ramble and Recollection by Sleeman (c) Manrique.

کی بناپر بھی کرتے ہیں اور نیز اس اندرونی طرزِ تعمیر کی بناپر کرتے ہیں جو خود عمارت زبانِ حال سے بیان کرتی ہے۔[۹۳]

دلّی دلّی محل ایک متوازن ساخت کی بنا پر بیک وقت اور ایک منصوبہ کے تحت بنایا گیا۔[۹۴] خوبصورتی، شان و شوکت کے لحاظ سے سارے مشرق میں عدیم المثال ہے۔ اور شاید دنیا میں کوئی عمارت اس پر سبقت نہیں لے جاسکی۔ فتح پور سیکری کے اکبری محل کی ساخت سے بالکل مختلف ہے۔ ایک مردانہ کس بل کا نمونہ ہے اور دوسرا نسوانی کثرتِ آرائش کا۔ لیکن اپنی اپنی جگہ دونوں میں کشش ہے۔ دلّی محل اپنی نوعیت کا سارے ہندستان میں ایک ہی ایسا محل ہے جس کو دیکھ کر ان انتظامات سے واقفیت ہوتی ہے جو کسی قصد و متوازن منصوبہ کے زیرِ اثر وجود میں آتے تھے۔

داخل ہونے کا خاص راستہ یا لاہوری پھاٹک کا رُخ مغرب کی طرف، چاندنی چوک کی نمایاں وسیع سڑک کی طرف ہے۔ اس پھاٹک کو ایک ایسے محرابی ہال سے متحد کیا گیا ہے جو اندر ایک صحن میں کھلتا ہے۔ اس کے اُس طرف دیوانِ عام کے سامنے نوبت خانہ ہے یہ عمارت اپنی آگرہ کی ہمشیر عمارت سے زیادہ آراستہ ہے۔ محل کے شمالی حصہ میں مشہور دیوانِ خاص ہے۔ عہدِ شاہجہاں میں جتنی عمارتیں بنائی گئیں یہ ان میں سب سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ فنی لحاظ سے اس کا طرزِ تعمیر مکمل نہ سہی لیکن یہ غیر معمولی شان و شوکت کی مظہر ہے۔ تاج کی سادگی یہاں مفقود ہے لیکن اس کے بنانے میں وہ روحِ تعمیر کارفرما تھی۔ اس کا مقصد شاہجہاں کے اقتدار کے نقطۂ عروج کی تصویر کشی تھی اس لحاظ سے پوری کامیاب عمارت ہے۔ امیر خسرو[۹۵] کا حسبِ حال شعر اس عمارت کی شاہانہ تعمیر کا ترجمان ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

دلّی قلعہ کے باہر ایک بلند کرسی پر جامع مسجد کھڑی ہے جو تشکیل اور ساخت کے لحاظ سے موتی مسجد سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کی تعمیر میں وہی جوش و خروش نظر آتا ہے جو اس محل کی تعمیر میں تھا۔ جس کے مقابل وہ کھڑی ہے اس کے وجود کے پس پشت ایک شاہی مسجد بنانے کا جذبہ تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسی ہی نظر بھی آتی ہے۔ یہ سنگِ سرخ کی ریت سے بنائی گئی ہے اس لیے قلعہ کی باہری دیوار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس پر سنگِ مرمر کی دو بُرجیاں ہیں۔[۹۶]

مصوری اگرچہ شاہجہاں کی خاص دلچسپی فنِ تعمیر کی نسبت سے تھی لیکن مصوری سے دلچسپی لینے میں بھی اس نے اپنے باپ کی روایت برقرار رکھی۔ اب اس شعبہ کا نگراں فقیر اللہ خاں[۹۷] تھا اور اس کا نائب میر ہاشم لاجواب شبیہ ساز تھا۔ علاوہ شہنشاہ کے دوسرے بلند پایہ اہلِ دربار جو فنِ مصوری کے سرپرست تھے ان میں آصف خاں، شہزادہ دارا شکوہ بھی شامل ہیں۔ دارا شکوہ کا

ہم مختصر قلمی تصویروں کا منقش و مطلا مرقع جو ہنوز باقی ہے اس کو دیکھ کر اس وقت کے فن کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔ فنی طریق کار میں کئی تبدیلیاں نمایاں ہیں پہلی تو یہ کہ تخلیقی سرگرمی اور آمد کی کمی۔ اگرچہ بظاہر جسمانی ریاض برقرار ہے لیکن وضع یا تصویر میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش بہت کم ہے۔ بہ الفاظ دیگر جدت کے بجائے نقالی زیادہ ہے۔ دوسری یہ کہ بے بنیاد و خیالی باتوں کی ایک حیرتناک آرزو نمایاں ہے۔ غالباً یہ طرز فکر قلتِ تخلیق پر پردہ ڈالنے کے لیے ہے۔ تیسرے ایک لداؤ حاشیہ کا تعارف ہے جس کے بغیر اس زمانے میں کوئی تصویر مکمل نہ سمجھی جاتی۔ کبھی کبھی ان حاشیوں کی وضع پر پھول پتی کی کثرت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری جگہ چھوٹی چڑیوں یا جانوروں کی تصویریں ہوتی ہیں، چوتھی بات یہ کہ کثرت آرائی کا نمایاں رجحان تفصیلات و رنگ آمیزی میں نمایاں ہے۔ ان نقوش پر سونا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اپنی آب و تاب کی نمائش میں تصویریں بھی اپنے دور کے فن تعمیر کی آوازِ بازگشت ہیں۔

خوشخطی فن مصوری سے متحد فن کاری خوش نویسی کی ترویج بڑی محنت و استقلال سے کی گئی۔ ایک خوش نویس کی بھی اتنی ہی عزت ہوتی تھی جتنی ایک مصوّر کی، اس وقت کے بعض حسین نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن کس قدر صناعی طلب کرتا تھا۔ مسودے کی آرائش کے لیے خوش نویس کی دانائی کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی ایک مصور کی۔

محمد مراد شیریں قلم، ممتاز خوش نویس تھا۔ آقا رشید انے شاگرد میر امام حروف کے دائرے بنانے کا ماہر تھا۔ دوسرے خداداد قابلیت کے لوگ، میر صالح اور محمد مومن پسران میر عبداللہ مشکیں قلم تھے۔ یہ دونوں شاعر بھی تھے۔ صالح فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتا، مومن صرف فارسی میں طبع آزمائی کرتا۔ کفایت خان و جلال الدین شاگردان محمد حسین خلف، سربرآوردہ شکست نویس تھے۔

موسیقی شاہجہاں کی دلچسپیوں کی فہرست میں بہ لحاظ ترتیب فن موسیقی کا ذکر سب کے آخر میں آگیا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے دل میں بھی اس کی وقعت جملہ فنون سے کم تھی۔ اس کی بھی سرپرستی اس نے بڑی فیاضی سے کی۔ اس نے تخلیقِ نو کے اضافہ میں خاص دلچسپی کا ثبوت دیا حقیقت یہ ہے کہ طرزِ اظہار میں پہلے ہی سے تنوع کی کمی تھی کیونکہ کوئی ایسا شخص خداداد قابلیت کا نہ پیدا ہوا جو ترقی دیتا یا اکبر کے مشہور و معروف فنکار تان سین کے مروجہ انداز سے علیحدہ ہو کر کوئی اضافہ کرتا۔ شاہجہاں کی پسندیدہ راگ دھرپد تھی، اور جو موسیقار اس کو انتہائی خوش اسلوبی سے پیش کرتا تھا وہ تان سین کا داماد اور اس کے شاگرد کا شاگرد لال خاں، "گن سمندر" تھا۔ ہندوؤں میں سب سے اچھا گویا جگن ناتھ تھا۔

شاہجہاں کی اس پر غیر معمولی نظر عنایت تھی۔ اس کو مہاکوی راے کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ اکثر شہنشاہ کی مدح میں نظمیں بھی وہ کہا کرتا اور کثیر انعامات سے سرفراز بھی ہوتا رہتا۔

اس زمانے کے مختلف سازوں کی فہرست یہاں پیش کرنا ممکن نہیں لیکن دو سازندوں کا تذکرہ مستحق ذکر ہے۔ سکھ سین، رباب بجانے کا استاد تھا۔ اور سور سین بین بجانے میں لاجواب تھا۔

باب ۱۱

انتظامیہ کے بعض پہلو

مغل بادشاہ کا مرتبہ

شاہ جہاں کی سلطنت، حکومت کی ایک مکمل تنظیم پر مبنی تھی۔ ساخت کی تفصیل میں اکبر کی مرتب کردہ طرز سے بہت کم مختلف تھی۔ انتظام کی پوری مشین کی قوت کا مخرج شہنشاہ ہوتا۔ علاوہ ازیں بلند ترین و بنیادی اختیارات کا وہ منصب دار تھا اس کے اقتدار کو مذہبی جواز بھی حاصل تھا، وہ زمین پر خدا کا سایہؔ (ظل اللہ) سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس کے فرمان واجب الاذعان تھے۔ یوں تو وہ سارے انتظامی امور کا سرچشمہ تھا ہی، مذہبی معاملات میں بھی اس کا فیصلہ حرف آخر ہوتا۔ بشرطیکہ شریعت سے تصادم نہ ہو اس طرح نظریاتی اعتبار سے اس کے اختیارات لامحدود ہو جاتے۔

مطلق العنانیت پر مروجہ دستور کی پابندیاں

لیکن عملی لحاظ سے یہ مطلق العنانیت بھی بہت سے قابل غور و قابل لحاظ امور سے محدود تھی۔ یہ صحیح ہے کہ شہنشاہ فوج کی امداد سے اپنی رعایا پر احکام کی پابندی عائد کر سکتا تھا۔ لیکن ہر وقت اور ہر موقع پر یہ ممکن نہ تھا۔ ابوالفضل کا یہ کہنا کہ اس کا حکمران اپنے عہد کی روح سے باخبر رہتا ہے اس کے اختیارات کی حدبندی کی طرف ہلکا سا اشارہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں باوجود لامحدود اختیارات کے بادشاہ کو اس مروجہ دستور کا احترام کرنا پڑتا جو عہد متوسط میں بغیر کسی تحریر کے بھی پر زور تھا جتنا آج کا تحریری قانون۔

تحریری قانون کی عدم موجودگی

مغلیہ عہد میں تحریری قانون کی عدم موجودگی نہ صرف حیرت کا باعث ہے بلکہ سوچنے پر بھی مائل کرتی ہے کہ بادشاہ

نے من مانے انداز میں اپنی مرضی سے کام کیا ہوگا۔ اس گمان کو مغرب کے عصری سیاحوں کی رائے نے تقویت بخشی۔ لیکن ان کی رائے تسلیم کرنے سے قبل ہم کو دو اہم باتوں پر غور کرنا ضروری ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر بادشاہ کی مرضی ہمیشہ مطلق العنانی سے کام میں لائی گئی ہوتی تو مغل حکومت اتنے دن تک برقرار نہ رہتی۔ روک تھام کرنے میں اس دور کی عوامی قوت آج کی قوت سے کہیں زیادہ تھی - اور عملی لحاظ سے سرکاری فوج اور عام لوگوں میں بہت کم فرق تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مغربی سیاح بے بنیاد افواہوں کو اپنے خیالات کا سرچشمہ بنا کر بے حقیقت باتوں کو تعمیم عطا کرنے پر مائل تھے۔ بعض وقت تو واقعات کے لاپتہ اجزا کو اپنی قیاس آرائی سے پورا کر لیتے ہیں - اس لئے یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ اظہار بیان کے درمیان وہ اپنی تردید خود کرتے ہیں اس لئے ان کے بیانات بڑی احتیاط سے قبول کرنا چاہیے۔

مغل سرکار کاغذات کی سرکار تھی

مغلیہ سرکار لازمی طور پر کاغذات کی سرکار تھی۔ ایک ایک انتظامی تفصیل بڑی دیانت داری و باریک بینی سے قلم بند کی جاتی تھی۔ صرف ایک ہی جگہ اندراج نہیں ہوتا تھا بلکہ متعدد مقامات پر۔ یہ خیال کرنا حق بجانب ہوگا کہ یہ کاغذات اتنے ہاتھوں سے گذرتے تھے اور کافی حد تک صحیح ہوتے تھے۔ کہ یہی کاغذات تحریری قواعد و ضوابط کی تلافی کرتے تھے۔ اگرچہ یہ مندرجات کسی عام نظریہ یا اصول کے تحت نہ تھے پھر بھی ان سے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔ ایک لحاظ سے تحریری قوانین کی عدم موجودگی باعث برکت تھی۔ مقدمہ دائر کرنے والوں کو ضمیر فروش قانون دانوں کے استعمال سے نجات حاصل تھی اور مقدمات بھی جلد از جلد فیصل ہو جاتے تھے[۳] فیصلہ کرنے والے حکام بھی قواعد کی سخت پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی فہم و فراست سے کام لیتے تھے۔

مغلیہ مطلق العنانی کی تعریف

مغلیہ مطلق العنانی کی طرف پھر واپس ہوتے ہوئے اس کی نوعیت پر بحث کرنے میں ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خصوصیات میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ حکمراں اپنی رعایا کی بہبود پر پوری نظر رکھتے تھے۔ اس طرح یہ طرز عمل خلجی اور تغلق حکومتوں پر ایک ترقی یافتہ اقدام تھا۔ آخر الذکر شاہان مطلق العنان کے یہاں رعایا کی بہبود کا کم خیال تھا۔ ان کی یہی بیگانگی منجملہ اور اسباب کے ایک سبب ان کی سلطنتوں کے جلد تر زوال کا تھا۔ علاوہ اس کے مغل حکمراں اپنے اختیارات کے لئے ہندوستان سے باہر کی کسی طاقت کی توثیق کے انتظار میں نہ رہتے۔ اور ملکی قانون کی ہمہ دانیاں ان کی دسترس سے باہر تھیں۔ یہ

ایک خاص سبب ہے جس سے سرزمین ہند میں ان کی جڑیں اتنی گہری ہوئیں۔

مغلیہ حکومت کا منشا

مغل حکومت کے منشا کردار پر اختلاف رائے ہے۔ سرکار کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد بنیادی اور قریب قریب تنگ دلی تھا۔ مورلینڈ کا تبصرہ ہے کہ اس کا منشا حصول مال و دولت اور متناسب فوجوں کا قیام تھا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد کی رائے ہے کہ مغلیہ حکومت بنیادی طور پر ثقافتی تھی اور اس کو معمولی آدمیوں یا عوامی جذبات کا احساس بھی تھا۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغلیہ حکومت نے ایسے حالات فرور پیدا کر دیئے کہ امن و چین کی زندگی بسر کرنا ممکن ہوا۔ اس حیثیت سے اسے روشن خیال شہنشاہیت کہا جا سکتا ہے۔ یہی بنیادی پہلو تھا جس کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹیورنیر نے یہ کہا کہ شاہ جہاں اپنی رعایا پر حکمرانی بادشاہ کی حیثیت کے بجائے باپ کی حیثیت سے کرتا تھا۔

ایک عام غلطی

بعض موجودہ اہل قلم ایک غلطی یہ کرتے ہیں کہ مغلیہ طرز حکومت جو کلیتاً عہد متوسط کی آوردہ تھی۔ اس کا موازنہ دور حاضر کے نظم ونسق سے کرتے ہیں۔ اس لئے لازمی وہ ایسے نتائج پر پہنچتے ہیں جو موافقت سے دور ہیں۔ لیکن ایسے نتائج غلط ہیں کیونکہ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ متعدد ادارے جو آج ہماری معاشرتی زندگی کا جز بن گئے ہیں وہ عہد متوسط میں نہ تھے۔ مگر ان کی عدم موجودگی کی ذمہ داری بادشاہ پر نہیں آتی۔ یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ رعایا سے متعلق حکومت کے فرائض و کارکردگی کے سیاسی نظریات سترھویں صدی سے اب تک بہت بدل گئے ہیں۔

بادشاہ اور اس کے مشیر کار

سلطنت کا طول و عرض، ان وسائل کی کمی جن کو ہم آج ذرائع رسل ورسائل کہتے ہیں، اور متعدد و مختلف سرکاری مسائل مغلیہ مطلق العنانی کے نظریاتی کردار پر اثر انداز تھے۔ اگرچہ حکومت کی پالیسی کی باگ ڈور بادشاہ وقت کے ہاتھ میں ہوتی لیکن تفصیلات کی تکمیل ان افسران شاہی کے سپرد ہوتی جو ہر طرح سے جواب دہ ہوتے۔ نظریاتی اعتبار سے وہ بادشاہ کے ملازم ہوتے لیکن عملی لحاظ سے وہ مشیر کار تھے۔ یہ سچ ہے کہ بادشاہ کو مشیر کاروں کی رائے منظور نامنظور کرنے کا حق تھا لیکن عموماً ان لوگوں کی رائیں منظور کر لی جاتیں۔ بشرطیکہ پالیسی کے اصل مقصد پر اُن سے کوئی بُرا اثر نہ پڑتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ افسروں کو اپنے شعبہ جات میں کافی آزادی رہتی۔

مغل حکومت کے انتظامیہ کا الگ الگ تین عنوانات کے تحت جائزہ لیا جا سکتا

ہے (الف) مرکزی (ب) صوبہ جاتی (ج) مقامی۔ ابتداء ہی میں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اوّل الذکر دُو بمقابلہ تیسرے کے زیادہ مکمل و مفصل انداز سے منظم تھے۔

وکیل مرکزی حکومت بلکہ حقیقتاً ساری سلطنت میں اعلیٰ ترین افسر وکیل ہوتا تھا۔ علاوہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔ وہ کسی افسر کو مقرر یا برخاست کر سکتا تھا بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا شاہ جہاں نے اس عہدہ جلیلہ پر آصف خان کا تقرر کیا اور ملکہ کی سفارش پر مہر ازاک[1] یا مہر اعظم بھی اس کے سپرد کر دی تھی۔

وکیل کی حد اختیار امور خانہ داری سے لے کر شعبۂ انتظامیہ تک وکیل کے دائرۂ اختیار میں تھے۔ حسب ذیل افسران براہ راست اس کے تحت تھے۔

میر مال[12] : باستثنائے زمین، بادشاہ کی ساری نجی ملکیت کا نگران تھا۔

میر عرض[13] : مختلف افسروں یا درخواست دہندوں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔

قور بیگی[14] : شاہی پرچم کا نگران تھا۔

میر توزک[15] : دربار ی رسوم کی دیکھ بھال کرنا۔ شاہ جہاں نے ان افسروں کی تعداد چار تک بڑھا دی تھی کیونکہ ایک اس افسر سے متعلق اتنے زیادہ فرائض تھے کہ ایک آدمی انجام نہ دے سکتا۔

میر بار[16] : شاہی جنگلات کا نگراں تھا۔

میر بحر[17] : دریائی راستوں اور گھاٹ کے انتظام کے علاوہ اُن کشتیوں کا بھی نگران تھا جو شاہی تصرف سے متعلق ہوتیں۔

میر منزل[18] : شاہی خیمہ جات کا انتظام کار تھا۔

خوان سالار[19] : شاہی باورچی خانہ کا افسر اعلیٰ تھا۔

میر منشی[22] : بادشاہ کا معتمد اعلیٰ تھا۔ عموماً وہ اعلیٰ علمی صلاحیتوں کا مالک ہوتا۔ شاہی مراسلات کا مسودہ تیار کرتا اور کبھی کبھی بادشاہ کے زبانی احکام بھی قلم بند کرتا۔ شاہ جہاں کے عہد کے اختتام پر چند ر بھان[23] فرمان نویس کے عہدہ پر مامور تھا۔

اختہ بیگی[24] : شاہی اصطبل کا سربراہ تھا۔

خوش بیگی[25] : کھیل کود شکار وغیرہ کا افسر اعلیٰ تھا۔

وزیر : وکیل کے بعد سب سے زیادہ صاحب اختیار افسر دیوان تھا جو وزیر یا

دیوان کل بھی کہلاتا تھا وہ شعبۂ مالیات کا مستقل صدر ہوتا تھا۔ وہ جملہ انتظامی شعبہ جات کی باقاعدہ کارکردگی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہر اہم دفتری کاغذ پر دستخط کرتا تھا۔اس کی نیابت میں دو نائب دیوان ہوتے تھے ایک دیوان "تان" کہلاتا تھا جو جاگیرات کا انتظام کرتا تھا اور دوسرا دیوان خالصہ کہلاتا تھا جو شاہی املاک کا ذمہ دار ہوتا۔حسب ذیل عہدہ دار براہ راست وزیر سے متعلق تھے۔

مصطوفی یا محاسب اعلیٰ ؛ یہ سلطنت کی آمدنی و خرچ کی دیکھ بھال کے لئے مامور تھا۔اس کو اختیار تھا کہ اخراجات کی مد کم کر دے۔شعبہ جات مال گذاری کے جملہ کاغذات پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔

صاحب توجیہہ ؛ صاحب توجیہہ یا تنخواہ تقسیم کرنے والا۔اس کی ذمہ داری صرف دارالسلطنت کے ملازمین کی تنخواہ بانٹنا تھا۔معماروں اور دستکاروں کی فرد حساب پر پہلے وہ دستخط کرتا تھا تب مصطوفی کے پاس کاغذات جاتے تھے۔

اوارجہ نویس[۲۳] ؛ روزمرہ کی آمدنی و خرچ کا حساب و کتاب رکھتا تھا۔

میر سامان[۲۴] ؛ سرکاری فرنیچر کا نگران تھا۔یہ عہدہ بڑی ذمہ داری کا تھا صرف ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جو لائق و قابل اعتماد ہوں۔چنانچہ افضل خان، اسعداللہ خان، فاضل خان جو اس عہدہ پر رہ چکے تھے بعد میں وزیر سلطنت مقرر کئے گئے۔[۲۴]

مشرف[۲۵] ؛ یہ محکمہ مال کا افسر اعلیٰ ہوتا اور ایک خزانچی بھی اس محکمہ سے متعلق ہوتا۔

وقائع نویس ؛ اہم واقعات و احکام کا اندراج اور سرکاری کاغذات کی دیکھ بھال کرتا۔

صدر ؛ مرکزی حکومت میں اور بہت سے افسر ہوتے۔منجملہ ان میں صدرالصدور یا مذہبی امور سے متعلق افسر اعلیٰ کا عہدہ بڑا اہم ہوتا۔وہ محکمۂ خیرات کا سربراہ ہوتا اور شہنشاہ سے بزرگان دین و دانشوروں کا تعارف کراتا۔شاہجہاں کے ابتدائی عہد میں موسوی خان ۱۵ برس تک اس عہدہ پر مامور تھا۔۱۶۴۲ء میں بادشاہ نے اس کے غیر اطمینان بخش کردار کی بنا پر برخاست کر کے اس کی جگہ سید جلال الدین گجراتی کا تقرر کر دیا تھا۔

میر بخشی ؛ صدر سے کہیں زیادہ اہم عہدہ میر بخشی کا تھا۔[۲۶] اثر و اختیار کے لحاظ سے اس کا مرتبہ دیوان یا وکیل کے بعد تھا۔وہ فوجی محکمہ کا افسر اعلیٰ تھا۔سپاہیوں کی

سبرتی کا جائزہ اور دوسرے عسکری معاملات کا نگران بھی تھا۔ اس کی مدد کے لئے ایک نائب بخشی بھی رہتا جس کو بخشی دویم[۲۸] کہا جاتا۔ جب فوجیں مہم جنگ میں بھیجی جاتیں تو ہر دستہ فوج[۲۹] کے ساتھ ایک علیحدہ بخشی کا تقرر ہوتا۔ غالباً وہ سب انفرادی حیثیت سے میر بخشی کے ماتحت ہوتے۔

داروغہ غسل خانہ: یہ عہدہ صرف ذمہ دار و قابل اعتماد اشخاص کو تفویض کیا جاتا۔ اس پر کام کرنے والے میں ہمت، فیصلہ کرنے کی صلاحیت، مستعدی و ہوشیاری کا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ کوئی نامناسب یا غیر طلبیدہ شخص دیوانِ خاص میں داخل نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ یہاں اہم ترین معاملات اور انتہائی رازداری کے امور پر بحث ہوتی۔

قاضی القضاۃ[۳۰]: شعبہ عدل کا افسر اعلیٰ ہوتا۔ صوبہ جات کی عدالتوں کی وہ اپیل سنتا اور شہنشاہ کو بھی عدل و انصاف کرنے میں مشورہ دیتا۔ محمد اسلم[۳۱] عرصہ دراز تک اس عہدہ پر مامور رہا۔ اس کے بعد شاہ جہاں کے ۲۳ ویں سال حکومت میں اس کی جگہ قاضی خوش حال[۳۲] کو مقرر کیا گیا۔

داروغہ کتاب خانہ: کتب خانہ کا سب سے بڑا عہدہ دار ہوتا تھا۔ منڈیل سلو لکھتا ہے کہ ۲۴ ہزار دیدہ زیب مجلد مخطوطات شاہی کتب[۳۳] خانہ میں تھے۔

داروغہ زرگر خانہ[۳۴]: محکمہ جواہرات کا افسر اعلیٰ تھا۔ جہانگیر[۳۵] کے عہد حکومت سے اس عہدہ پر سعید ائی گیلانی مامور رہا۔ اس کے جانشینوں میں میر صالح اور محمد شریف[۳۶] تھے۔

میر عدل[۳۷] و داروغہ داغ و تصحیح: کیمپ کے میر عدل اور داروغہ داغ و تصحیح بھی اہم عہدے[۳۸] دار تھے۔

کوتوال[۳۹]: اس شخص پر اکثر مغربی سیاحوں کی نظریں پڑی ہیں۔ وہ دارالسلطنت کے علاوہ اور اہم بستیوں میں بھی ہوتا تھا۔ منڈیل سلو کا بیان ہے کہ وہ شہنشاہ کے خاص الخاص انجمن[۴۰] میں بھی شامل ہوتا تھا۔ اس کے فرائض مختلف النوع تھے۔ موجودہ دور کے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مجسٹریٹ کا وہ مجموعہ ہوتا۔ وہ بدکرداروں پر کڑی نظر رکھتا اور شہر میں امن و سکون برقرار رکھنے کا بھی ذمہ دار ہوتا۔ منوچی کہتا ہے کہ وہ رازہائے سربستہ حاصل کرنے کے لئے حلال خوروں یا خاکروبوں کو بھی نوکر رکھ لیتا۔

صوبہ جات

کل سلطنت بائیسؔ صوبوں میں تقسیم تھی۔ ہر ایک میں ایک صوبہ دار یا سپہ سالار ہوتا تھا۔ ان میں سے آگرہ اور دہلی میں صوبہ دار یا سپہ سالار صرف بادشاہ کی عدم موجودگی میں مقرر کیا جاتا۔ قندھار ایرانیوں نے واپس لے لیا تھا۔ بلخ و بخارا قلیل مدت کے لئے شاہی مقبوضات میں رہے اور دکن کے چار صوبہ جات کبھی کبھی ایک ہی افسر[59] کے تحت میں رہتے۔ باقی صوبوں میں صوبہ داروں کا انتظام ہوتا۔ صوبۂ اودھ کے علاوہ ہم کو صوبہ داروں کے مسلسل تقرر کا علم کاغذات سے ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں سپہ داروں اور صوبہ داروں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ شاہجہاں کی عہد حکومت کے صرف بائیسویں سال مرزا خان کی جگہ اعتقاد خان کا بہ حیثیت صوبہ دار اودھ تقرر ہوا۔

صوبہ جاتی صوبہ داران

صوبہ جاتی صوبہ[61] داران کا انتخاب ان فوجی افسروں میں سے ہوتا جن میں انتظامی امور کی بھی خداداد قابلیت ہوتی۔ امید کی جاتی تھی کہ وہ صاحب کردار و ایمان ہونگے۔ شاہجہاں صوبہ داروں کی نااہلی یا صوبہ جات کی بدنظمی گوارا نہ کرتا تھا۔ چاہے اس کا کیسا ہی منظور نظر رہا ہو لیکن اگر وہ عملی کارگزاریوں میں ناقابل اطمینان پایا جاتا یا بادشاہ تک اس کی شکایت پہنچتی تو اس کو برطرف کرنے میں وہ کبھی دریغ نہ کرتا۔ مثال کے لئے اعظم خان اور شائستہ[62] خان کو دیکھیے ان دونوں کو گجرات کی صوبہ داری سے برطرف کر دیا اس لئے کہ وہ لوگ نااہل تھے اور تربیت خان کو کشمیر کی صوبہ[63] داری سے اس لئے برخاست کیا کہ لوگوں نے اس کی شکایت کی تھی۔ برخلاف اس کے ظفر خان کو کشمیر کا صوبہ دار اس لئے بنایا گیا کہ لوگ اس کو چاہتے[64] تھے۔ صوبہ دار کی برطرفی کی ایک اور مثال وزیر خان کی ہے وہ پنجاب کی صوبہ داری سے اس لئے نکالا گیا کہ ظلم کرتا[65] تھا۔

صوبہ دار کی مدت ملازمت

صوبہ دار کی مدت ملازمت کا دار و مدار شہنشاہ کی مرضی[66] پر تھا۔ اس تبادلہ کے اصول تعین کا پتہ چلانا دشوار ہے لیکن اتنی بات ضرور واضح ہے کہ ہر آرزومند و موزوں شخص کو اس گراں بہا عہدہ پر مستفیض ہونے کا موقع دیا جاتا تھا۔

صوبہ داروں کے اختیارات

صوبہ داروں کے اختیارات تین شعبہ جات پر مبنی تھے۔ شہری، عدالتی، فوجی۔ بہ حیثیت شہری افسر کے وہ سارے انتظامیہ کے عمل و انتظام کا سربراہ تھا۔ بہ حیثیت حاکم عدل و انصاف وہ قاضی و میر عدل

ے فیصلوں کی اپیل سنتا تھا اور بہ لحاظ فوجی افسر اپنے صوبہ کے مخصوص عسکری حصہ پر حکمرانی کرتا اور اس کی داشت کا ذمہ دار ہوتا۔ وہ اپنے سارے ماتحت افسروں کو برطرف کرسکتا تھا بجز ان لوگوں کے جو براہ راست شہنشاہ کے آوردہ ہوتے۔ وہ کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جن کی سزائے موت کی اجازت مرکز سے حاصل کرلیتا۔ وہ لوگوں کے شہری حقوق کا نگراں ہوتا۔ اس سے امید کی جاتی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے مشورے سے انتظامی امور فیصل کرے گا۔

دیوان ـــــ ہر صوبہ میں دیوان، مالیات کا افسر خاص ہوتا۔ نظریاتی اعتبار سے وہ صوبہ دار کا ماتحت ہوتا مگر عملی اعتبار سے مرتبہ میں اس کا ہم پایہ ہوتا۔ اس کا تقرر براہ راست بادشاہ کرتا اور اس سے امید کی جاتی کہ صوبہ دار پر بھی نظر رکھے گا۔ اس عہد میں صوبہ جاتی دیوان بیک وقت متعدد عہدوں پر مامور ہوتا۔ محمد وارث نے شیخ موسیٰ گیلانی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ اکیس برس سال عہد حکومت میں دیوان، امین اور فوج دار کے مختلف عہدوں پر ملتان میں بیک وقت کام کرتا رہا۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔

عامل ـــــ عامل یا مال گذاری وصول کرنے والے سے امید کی جاتی کہ وہ زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں متعدد فرائض انجام دے گا۔ مالیات و انتظامات کے سلسلے میں اس کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ جہاں کہیں کوتوال کا تقرر نہ ہوتا وہاں عامل ہی کو اس کے بھی فرائض انجام دینے پڑتے۔

بتکچی ـــــ عامل کی امداد کے لئے بتکچی یا محافظ دفتر اور پوتا دار یا خزانچی بھی ہوتے۔

پوتا دار ـــــ ایک صوبہ جاتی وقائع نویس بھی ہوتا جو اپنی روداد دیوان کے توسط سے دربار کو بھیجا کرتا۔ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ایک صوبائی بخشی کے عہدے کے بھی حوالے ملتے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ دونوں عہدے متحد کر دیئے جاتے۔

سرکار

صوبہ جات کے بعد ایک انتظامی واحدہ سرکار کہلاتا۔ اس میں کئی ایک پرگنے شامل ہوتے۔ اس کا انتظام کار ایک فوج دار ہوتا۔ اپنی تخت نشینی کے دن شاہ جہاں نے متعدد سرکاروں کے لئے افسر مقرر کئے۔ عصری تاریخوں میں فوجداری سرکار کا فقرہ اکثر نظر آتا ہے۔

پرگنہ اور گاؤں کا انتظام اس کے عہد میں کیسے ہوتا تھا اس کا کوئی واضح تصور نہیں۔

غالباً قانون گو پرگنہ کا اور پٹواری گاؤں کا افسر ہوتا تھا۔

عدالتی انتظام ــــ مذکورہ بالا اندراجات کی بنا پر عدالتی انتظام کا ایک تصور ذہن میں قائم کر لینا مشکل کام نہیں۔ عدالتی نظم و نسق کا صدر اعلیٰ شہنشاہ تھا۔ وہ ابتدائی مقدمات اور صوبہ جات کی اپیل کی بھی سماعت کرتا۔ دارالسلطنت میں قاضی القضاۃ اس کا قانونی مشیر اعلیٰ تھا اور صوبہ جات میں یہ فرض قاضی اور میر عدل[۱] ادا کرتے۔ اس عہد حکومت میں یہ دونوں عہدے متحد کر دیئے گئے تھے۔

محکمۂ خبر رسانی ــــ مغلیہ عہد حکومت کے اس پُر کار محکمہ کی تعریف بہت سے مغربی سیاحوں نے بھی کی ہے۔ دارالسلطنت میں اس محکمۂ خبر رسانی کا سر دفتر وقائع نویس ہوتا تھا۔ جس کی نمائندگی صوبہ جات میں وقائع نویس اور اضلاع میں کوتوال کرتے تھے۔

سڑکیں ــــ دارالسلطنت اور صوبہ جات کو مختلف سڑکوں سے متحد کیا گیا[۲] تھا۔ ایک سڑک شرق کی طرف بنگال اور مغرب کی طرف پشاور جاتی تھی۔ دوسری راجپوتانہ ہوتے ہوئے احمد آباد اور پھر وہاں سے دکن جاتی تھی تیسری مالوہ سے بُرہان پور پہنچتی تھی۔ ان پر دو رویہ سایہ دار درخت تھے اور مقررہ منزلوں پر آرام دہ کارواں سرائے تھیں۔ جو مان ریکو کے الفاظ میں بیماری یا تکان یا بارش میں مسافروں کو پناہ و سایہ دیتی تھیں۔ پاس پڑوس کے گاؤں یا شہزادے یا ایسے امرا صاحبانِ اقتدار جو اپنی یاد قائم رکھنے کی آرزو کرتے وہ ان راستوں کی تعمیر و تشکیل کے اخراجات میں حصہ لیتے۔

راستوں کی محافظت ــــ مسافروں اور[۳] تاجروں کی حفاظت کے لئے حکومت ان سڑکوں کی مناسب نگرانی کرتی۔ فوجدار کا فرض تھا کہ دن دھاڑے ڈکیتی کی روک تھام کرے۔ اس کے علاوہ دوسرے مقامی افسروں سے بھی امید کی جاتی تھی کہ سڑکوں پر امن و اطمینان رکھنے میں مدد کریں گے۔ بایں ہمہ بدمعاشی اور رہزنی کی وارداتیں اکثر ہوتی رہتیں۔ لیکن جب ایسی واردات سرزد ہوتی اور مقامی افسران ملزم کے پتہ لگانے میں ناکامیاب رہتے تو ان کو مجبور کیا جاتا کہ خسارہ کی تلافی کریں یا وہ ملازمت سے نکال دیئے جاتے[۴]۔

سزا کی نوعیت | آج جس انداز کو ہم بہیمانہ سزا سمجھتے ہیں اس زمانے میں رائج تھا۔ سزا کا

مقصد اصلاح یا انسانیت نہ تھا۔ بلکہ انتقامی تھا۔ جرم کے تناسب کا بھی سزا میں خیال نہ رہتا۔ عضو کی قطع برید، شکنجے میں کسا جانا، درے مارنے کا عمل (اگرچہ منوچی کا بیان صحیح مان لیا جائے) سانپ اور بچھو سے کٹوانے کی سزا عام تھی[۵۳]۔

قید خانے

گوالیار، رنتھمبور اور غالباً رہتاس کے قلعے سیاسی مجرموں کے لئے شاہی قید خانے تھے۔ لیکن عام ملزموں کے لئے مقامی قیدی خانے تھے۔ ان میں سے ایک بندی خانہ کا بیان کرتے ہوئے 'مان ریکو' لکھتا ہے کہ قیدیوں کو چارپائی یا بستر کی اجازت نہ تھی۔ لیکن بیماری کی حالت میں وہ اپنے طور پر طبی امداد حاصل کر سکتے تھے[۵۴]۔

چوکی

صوبہ جات سے شاہی دربار تک خبر رسانی کے لئے تیز رفتار قاصدوں کی ڈاک مناسب مقامات پر تعینات رہتی۔ اس محکمہ کا نام ڈاک چوکی تھا[۵۵]۔

حکومت مغلیہ کا کردار فوجی کیوں تھا؟

مغلیہ نظام کی انفرادیت اس کا عسکری کردار تھا۔ اس کی پہلی وجہ تو آبادی کی نوعیت تھی۔ دوسری وجہ انتظامی تخصیص کے تصور کی عدم موجودگی تھی۔ عہد متوسط میں عوام، آج کے مقابلہ میں زیادہ جنگ جو تھے۔ اطاعت و سپردگی سے ان کو نسبتاً زیادہ تنفر تھا۔ سرکشی کے اس رجحان کا ثبوت ان بے شمار مہمات میں ملتا ہے جو مقامی بغاوت دارالسلطنت کے اتنے قریبی علاقہ جات جیسے دوآبہ میں فتنہ فرو کرنے کے لئے بھیجی گئیں۔ علاوہ بریں صوبہ جات کے اہم مرکزوں پر مال گذاری وصول کرنے کے سلسلہ میں عامل کی امداد کے لئے فوجوں کا اجتماع بھی رہتا۔

تخصیص کا فقدان

فنِ حکمرانی ہنوز عالم طفولیت میں تھا۔ افسروں کے ایک خاص طبقہ کو کسی خاص انتظامی فن سے واقف کار بنانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ برخلاف اس کے ہر افسر کو فوجی و انتظامی مسائل کے لئے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ اور چونکہ سرکاری ملازمت بنیادی طور پر فوجی تھی اس لئے سارا انتظامیہ فوجی کردار کا مرقع نظر آتا۔ اس زمانے میں صدر بھی فوجی افسر تھا۔ چنانچہ اپنی تنخواہ بھی وہ فوجی حفظ مراتب کے لحاظ سے پاتا۔

منصب داری نظام

حکومت کے سارے فوجی اجزائے ترکیبی کا دار و مدار منصب داری نظام پر تھا۔ منصب کی تشریح کرتے ہوئے 'اردن' کہتا ہے کہ اس کا مقصد حق تفوق و ترجیح بہ سلسلہ ملازمت طے کر کے تنخواہ کا درجہ وار مقرر کرنا تھا۔ لازمی طور پر کسی عہدہ کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ تنخواہ پانے

والا سرکاری ملازم ہے اور اس کا پابند ہے کہ حسب طلب اس کے معاوضہ میں چند خدمات ادا کرے"۔ اس تنظیم و ترتیب کے پس پشت یہی مقصد کارفرما تھا۔ نظریاتی لحاظ سے یہ کافی بہتر تھا۔ ولے لیکن عملی اعتبار سے ایسی پیچیدگیوں کا مجموعہ ہے، جو آج تک بیان میں نہ آسکیں۔

اس نظام کا منشاء

یہ منصب داری نظام اکبر نے اس لئے اختیار کیا تھا کہ فوجی افسروں کی دغا و غبن سے محفوظ رہے اور فوجی نظم و نسق بھی پائیدار ہو سکے۔ اس کے عہد میں قواعد[91] داغ و تصحیح پر سختی سے عمل کرنے میں منصب دار کے عہدہ اور جتنی فوج اس کو رکھنی چاہیے اس کی اصل تعداد میں بڑی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے جانشینوں کے دور میں بعض جدید عسکری امتیاز کی وجہ سے نظریہ اور عمل میں وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

سوار کا مرتبہ

اس امتیاز میں سب سے پہلے سوار کا مرتبہ آتا ہے۔ اصل میں اس کا وجود اکبر کے آخری عہد حکومت میں ہوا اور بخیلانہ انداز میں افسروں کو عطا کیا گیا۔ لیکن اس کے جانشینوں کے زمانے میں یہ مرتبہ[92] عام طور پر دیا جانے لگا۔ اس طریق کار کا راز یہ تھا کہ ماتحت سپاہیوں کی تعداد میں بغیر اضافہ کئے ہوئے افسر کو ایک اور اعزاز سے ممتاز کر دیا جائے۔ جب کبھی کوئی افسر یہ اعزاز حاصل کرتا تھا تو اس کا بنیادی مرتبہ ذات، اور اضافہ کردہ امتیاز سوار سمجھا جاتا۔

ذات اور سوار کی اہمیت

ذات اور سوار کی اصطلاحی اہمیت پر کافی اختلاف رائے ہے۔ بلاچ مین (Blochmann) کا کہنا ہے کہ ذات سے مراد سپاہیوں کی وہ تعداد تھی جس کے فراہم رکھنے کی توقع منصب دار سے کی جاتی تھی اور سوار سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ منصب دار کے زیر اثر اتنے آدمی واقعی موجود ہوں۔ وہ اپنی تنخواہیں اول الذکر[93] سے حاصل کرتے ہوں۔ لیکن یہ رائے دو وجہوں سے ناقابل قبول ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے سوار کے منصب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ بعض افسران ایسے بھی تھے جن کو صرف ذات کا منصب دیا گیا تھا۔ اگر ہم بلاچ مین (Blochmann) کی رائے تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو دونوں اعزاز یعنی ذات و سوار کے اعزاز سے مشرف تھے ان کی بہ نسبت اس ایک اعزاز والے کو زیادہ ملازم رکھنا پڑتا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی حیثیت کم ہو جائے گی۔

اروِن

اروِن کا خیال ہے کہ مرتبہ سوار ایک اضافی اعزاز تھا۔ دہ ان سواروں کی تعداد کی نشاندہی کرتا جو 'ذات' کے لحاظ کے علاوہ ملازم رکھے[94] جاتے۔ یہ رائے تین وجہوں سے قابل قبول نہیں، اول تو یہ کہ اس نظریے کے تحت مغل فوج کی تعداد حد شمار سے زیادہ ہو جاتی

ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر منصب یافتہ افسر سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ فالتو آدمی نوکر رکھے تو یہ اعزاز رحمت کے بجائے باعث زحمت ہو جائے گا اور تیسرے یہ کہ بعض حالات میں منصب دار کے پاس اتنے سوار ہو جائیں گے کہ شہزادوں کے پاس بھی نہ ہوں گے اور یہ بات بعید از قیاس ہے۔

ڈاکٹر ترپاٹھی

ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی نے اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرتبہ سوار ایک ایسا اعزاز تھا جس سے اس کے سواروں کی معینہ تعداد نظرانداز کر کے اس کو ایک زائد وظیفہ دیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرتبہ سوار کو اصل تعداد سے کچھ مطلب نہ تھا۔ اس کی پابندی صرف "ذات" سے ہوتی تھی۔ ہر سوار کی ملازمت پر افسر کو کتنا روپیہ ملتا تھا یہ بات اب تک طے نہیں ہو سکی۔

دو اسپہ وسہ اسپہ

مرتبہ سوار سے بالاتر جہاں گیر کے عہد حکومت میں ایک اور بھی امتیاز دو اسپہ وسہ اسپہ وجود میں آیا جو منصب دار کے حصہ کا جزو یا کل پر اثر انداز ہوا۔ بادشاہ نامہ میں اس کا واضح بیان ہے کہ ایک دو اسپہ منصب دار دوگنا سوار فراہم رکھے بمقابلہ اُس ہم رتبہ افسر کے جس کو محض سوار کا اعزاز حاصل ہو۔ اس طرح ۵ ہزار ذات اور ۵ ہزار سوار کے منصب دار سے امید کی جاتی تھی وہ تین سو سہ اسپہ فوجی، چھ سو دو اسپہ فوجی اور ایک اسپہ تئو فوجی ملازم رکھے گا۔ لیکن اگر اس کا مرتبہ ۵ ہزار ذات اور ۵ ہزار سوار (سب کے سب دو اسپہ وسہ اسپہ) کے منصب دار تک پہنچتا ہے تو اس سے امید کی جاتی تھی کہ وہ ۷ سو سہ اسپہ، ۱۲ سو دو اسپہ اور دو سو یک اسپہ، فوجیوں کو ملازم رکھے گا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بہت کم ایسے مواقع تھے کہ جہاں کسی منصب دار کی پوری سپاہ کے واسطے دو اسپہ وسہ اسپہ کی صفت استعمال کی گئی ہو۔

اس امتیازی صورت حال سے بڑے انتشار پیدا ہوتے

مذکورہ بالا بحث سے اس فوج کی واقعی اور غیر واقعی تعداد میں بڑا فرق آگیا جو منصب داروں کے قبضہ میں رکھی گئی تھیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے شاہجہاں نے اپنے عہد کے ۲۰ ویں سال میں بہت سے احکام جاری کئے۔ نئے ضابطے سے اس منصب دار کو جو ہندوستان میں صاحب جاگیر ہو صرف ایک تہائی فوجیوں کی تعداد رکھنے کی اجازت دی گئی مثلاً ایک افسر جو تین ہزار ذات اور تین ہزار سوار کا منصب رکھتا تھا اس کو داغ کے لئے صرف ایک ہزار فوج حاضر کرنا تھا۔ لیکن اگر ہندوستان کے باہر کسی صوبہ میں اس کا تقرر ہو تو اپنے نامزد حصہ کا صرف ایک چوتھائی فوجی سپاہی رکھے۔ اس تعداد میں اس وقت اور کمی کر دی گئی جب بلخ پر

حملہ ہوا تھا اب اس کا تناسب پانچویں حصہ تک معین کر دیا گیا تھا۔

شاہ جہاں کے آخری دورِ حکومت میں سب سے بڑا منصب دار شہزادہ دارا تھا جو کہ ناظر تھا چالیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کا، اور سب دو اسپہ و سہ اسپہ تھے۔ شاہی خاندان کے باہر سب سے بڑا اعزاز جو کسی افسر کو نصیب ہوا وہ ۷ ہزار ذات اور ۷ ہزار سوار کا تھا۔ آصف خان ۹ ہزار ذات، ۹ ہزار سوار کا منصب دار ضرور تھا مگر اس کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے، وہ شہنشاہ کا خسر بھی تھا اور اس کو تخت دلانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ عہدِ حکومت کے تیسویں سال کے اختتام پر ۷ ہزار ذات اور ۷ ہزار سوار کے منصب دار صرف تین افسر تھے۔ علی مردان خان، سعید خان اور اسلام خان۔[۵۹]

منصب کی درجہ بندی

ذات و سوار کی بنا پر منصب دار (علاوہ ۵ ہزار سے اوپر کے افسران[۶۰] جو اس درجہ بندی سے مستثنیٰ تھے) ۱۰۰ اور بھی تین درجوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔ ۵ ہزار سے نیچے اگر ذات و سوار کے منصب برابر تھے تو افسر درجہ اوّل کا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ اگر سوار منصب کا بقدر نصف یا نصف سے زائد ہو تو ایسا افسر درجہ دوم کا عہدہ دار تصور کیا جاتا۔ لیکن اگر سوار منصب نصف سے کم ہو تو وہ تیسرے درجہ کا عہدہ دار سمجھا جاتا۔[۶۱]

عہدہ کے مدارج

۳ ہزار ذات سے لے کر ۷ ہزار ذات تک کے مراتب میں ایک ہزار کا فرق ہوتا۔ صرف ایک افسر ایسا تھا جو ۲۵۰۰ سو کا منصب دار تھا۔ ایک ہزار سے دو ہزار پانچ سو کے درجہ میں ۵۰۰ کا فرق تھا۔ اور ایک ہزار کے نیچے سے پانچ سو میں ایک سو کا فرق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۰ سب سے کم تر اعزاز تھا۔ یہ بڑا عام اعزاز تھا اور اس کے عہدِ حکومت میں ایسے منصبداروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔[۶۲]

تنخواہیں

بہت کم ایسے منصب دار تھے جو سال کے بارہ مہینوں تک تنخواہ پاتے رہے ہوں۔ شاہجہاں کے عہدِ حکومت کے اواخر میں میعاد کی مدت دس مہینے تھی۔ غالباً یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب علی مردان خان ۷ ہزار ذات اور ۷ ہزار سوار جس میں سے ۵ ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب دار بنایا گیا تھا تو اس کی تنخواہ بیس[۶۳] لاکھ روپیہ سالانہ تھی اور سال بارہ مہینہ کا تھا۔[۶۴] بعض اوقات لطف و کرم کی علامت کے طور پر تنخواہ کے علاوہ وظیفہ بھی مستحق افسروں کو دیا جاتا۔ چنانچہ آصف خان اور علی مردان خان دونوں اس ضمنی وظیفے سے سرفراز ہوئے۔[۶۵]

امتیازات

ذات اور سوار کے علاوہ دوسرے امتیازات بھی تھے جو مستحق افسروں کو دیے جاتے۔ طومان و طوغ جو عام طور پر شہزادوں کے لئے مخصوص تھا وہ بھی ایسے

منصب دار کو عطا کیا جا سکتا تھا جو سات ہزار ذات و سوار سے کم کا نہ ہو۔ طبل و علم بھی اعلیٰ پایہ افسروں کو مل سکتے تھے۔ ماہی و مراتب صرف دکنی افسروں کے لیے مخصوص تھے۔

جائزہ منصب داروں کو اپنا فوجی دستہ جائزہ کے لئے معینہ وقفہ پر پیش کرنا پڑتا۔ جن کو جاگیریں ملی ہوئی تھیں وہ سال میں ایک بار لاتے تھے۔ اور ۶ مہینے غور و مہلت دے دیئے جاتے۔ لیکن جو لوگ نقد تنخواہ پاتے، ہر چھ مہینے پر اپنا دستہ ملاحظہ کے لئے لے آتے۔ ان کو صرف دو ماہ مہلت کے لئے دیئے جاتے۔

منصب دار بر سر ملازمت اور دربار شاہی میں منصب دار ایک جگہ قیام پذیر نہ ہوتے۔ ان کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ حاضر دربار رہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ان کو غیر فوجی فرائض بھی انجام دینے پڑتے جو اعلیٰ مرتبے کے ہوتے ان کو صوبہ جات کا صوبہ دار بنایا جاتا یا شمالی و مغربی سرحدی مہم کے وقت فوج کے کوچ کرنے کی دیکھ بھال سپرد کر دی جاتی۔ جب یہ لوگ فرض گزاری کے لئے دربار سے دور ہوتے تو ان کو تعینات کہا جاتا۔ جو لوگ دار السلطنت میں رہتے ان کو حاضر رکاب کے نام سے یاد کیا جاتا۔ وہ پہرہ چوکی یا دوسرے فرائض حسب الحکم شہنشاہ انجام دیتے۔

احادیان منصب داری نظام کا انحصار بالواسطہ سپاہیوں کو بھرتی کرنے پر تھا۔ شہنشاہ افسر کا درجہ متعین کرتا اور اس کا فرض ہو جاتا کہ اپنے اعزاز کے لحاظ سے حسب تناسب سپاہی بھرتی کرے۔ لیکن شاہی فوج میں سپاہی براہ راست بھی بھرتی کئے جاتے ایسے سپاہی احدی کہلاتے۔ اور ان کو عرف عام میں خانگی سپاہ کہا جاتا۔ عام سپاہیوں سے ان کی تنخواہیں بہتر ہوتیں۔

بے قاعدہ فوج کی ایک شاخ ایسی بھی تھی جس کو بے قاعدہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کے بنانے والے راجپوتانہ کے باج گزار اور دوسرے زمیندار تھے۔ لیکن جو لوگ باقاعدہ منصبداری کے اعزاز پر پہنچ جاتے ان کو اپنے نسلی درباریوں کے علاوہ منصب کے تناسب سے بھی فوجی حصہ پورا کرنا پڑتا۔

ملازمت کی شاخیں یہ زبردست فوجی نظم و نسق، بہ لحاظ ملازمت چار شاخوں پر مشتمل تھا۔ پیدل، سوار، توپ خانہ، بحریہ،

پیدل جنگ جوئی کے اعتبار سے ان کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ اب یہ ایک مخلوط اجتماع تھا۔

جس میں لڑنے والے اور غیر لڑنے والے یا سپہ سب شامل تھے۔ آخر الذکر کی فہرست میں خندقی، دربان، قلی، کہار یا پالکی بردار، پہلوان، میور اس یا جاسوس سب تھے۔ جنگ کرنے والوں میں شمشیر باز[۵۸] برق انداز شامل تھے۔

ملازمت کی سب سے اہم شاخ رسالہ تھا۔ یہ منصب داری نظام کا خاص سہلہ تھا۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا کہ فوجی سپاہی اچھے گھوڑے اور پوری مقدار تعداد مہیا کریں۔ اوسطاً ہر سپاہی کو دو گھوڑے رکھنے پڑتے، ایک تو محاذ جنگ کے دوسرا وقت ضرورت کے لئے محفوظ رکھا جاتا۔ اس طرح شعبۂ رسالہ بحیثیت مجموعی پُرکار و خوبی تھا۔ برنیر نے بھی اس کی بجا تعریف کی[۵۹] ہے۔

توپ خانہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں توپ خانہ کی داشت و پرداخت زیادہ تر اہلِ مغرب یعنی ڈچ، انگریز، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے سپرد تھی۔ نوعیت کے لحاظ سے دو طرح کا تھا۔ ایک بھاری توپ خانہ اور دوسرا ہلکا توپ خانہ۔ برنیر کے خیال میں آخر الذکر بہ منظم تھا[۶۰]۔ لیکن بھاری توپ خانہ بے اثر بھی تھا اور ایرانی عصری توپ خانہ کے مقابلہ میں کمتر بھی تھا۔

بحریہ شعبۂ بحریہ قابلِ[۶۱] ذکر نہ تھا، لیکن بار برداری کے لیے کشتیوں کے بیڑے کا کام نواڑا تھا۔ بہر حال دو موقعوں پر یہ نواڑا فوجی کام میں بھی استعمال کیا گیا، ایک[۶۲] مرتبہ ہگلی کے پرتگالیوں کے خلاف اور دوسری مرتبہ آسام کی جنگ میں[۶۳]۔

مالیات کی کارگزاری فوجی شعبہ جات کے بعد لیکن مساوی اہمیت کا ادارہ محکمۂ مالیات تھا۔ عصری تاریخی کتابوں میں منتشر رائے زنی سے اندازہ ہوتا ہے شاہ جہاں کو کاشتکاروں کی بہبود کا بڑا خیال تھا۔ مال گزاری وصول کرنے والوں کی سخت گیری سے کاشتکاروں کو بچانے کے لئے اس نے غیر قانونی چنگی کو کشمیر میں بند کرا دیا اور اس کا دور آبپاشی کے لیے متعدد نہروں کی ساخت کا نمایاں کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

نظام ضبطی محکمۂ مالیات کی اکبری تشکیل و تکمیل اور اس دور کے انتظام میں بیّن فرق ہے۔ اکبر کے نظام ضبطی کا منشا جاگیری نظام کو ختم کر کے کاشتکاروں سے براہ راست رابطہ قائم کرنا تھا۔ اس کی نمایاں خصوصیت پیمائش و تخمینہ تھی۔ ساری وصولی نقد ہوتی تھی اور حکومت کا مطالبہ مجموعی پیداوار کی ایک تہائی معین تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نظام ضبطی کا رواج سلطنت

کے صرف منظم صوبجات میں تھا۔ بنگال، سندھ، کابل، خاندیش اور کشمیر اس کے دائرہ عمل سے باہر تھے۔ ان مقامات میں مال گزاری کی وصولی غلہ بخش[۳۳] اصول پر ہوتی تھی یا تقسیم فصل یا نسق[۳۴] کے لحاظ سے یعنی بطور چک بندی ہوتی۔ پہلے طریق کار میں کاشتکاروں سے براہ راست رابطہ قائم کرنا ممکن تھا۔ لیکن آخر الذکر میں اس کی گنجائش نہ تھی۔

شاہ جہاں کی رائج کردہ تبدیلیاں

شاہ جہاں کے زمانے میں جاگیری نظام کی تجدید نظام منبلی کی بیخ کنی تھی۔ ساری سلطنت کی زمین زیر کاشت تھی۔[۳۵] نتیجہ یہ تھا کہ خالصہ کی زمین (زمین جو براہ راست انتظام میں تھی۔) کافی گھٹ گئی۔ عمومی پیمائش بجائے استثنار کے قانون بن گئی[۳۶] اور سرکاری مطالبہ ایک تہائی سے بڑھ کر تقریباً نصف تک آگیا۔ کاشتکار کا بوجھ اور بڑھ گیا کیونکہ اس کو نہ صرف اس زمین کا لگان ادا کرنا پڑتا جو واقعی زیر کاشت تھی بلکہ اس زمین کا بھی محصول دینا پڑتا جو اس کے قبضہ میں تھی۔[۳۷] اس طرح زمین کی مال گزاری چالیس کروڑ روپیہ ہو گئی۔[۳۸]

دکن میں قحط

اس عہد حکومت میں ایک بڑا سخت قحط دکن میں پڑا۔ پنجاب اور کشمیر میں بھی غلہ کی کمی ہوئی۔ ۳۱-۱۶۳۰ء کے قحط کا رد عمل دور تک پڑا۔ گولکنڈہ۔ احمد نگر۔ گجرات اور مالوہ کے بعض حصے متاثر ہوئے۔ عصری مورخوں نے دکن میں جان تلفی اور لوگوں کے شدید مصائب کا بڑا دل سوز بیان قلم بند کیا ہے۔ "لوگ ایک لقمہ پر جان بیچنے کو تیار تھے مگر کوئی خریدار نہ تھا۔ ایک روٹی پر منصب فروخت ہوتا تھا مگر کوئی توجہ نہ کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ عرصہ تک کتے کا گوشت بکری کے گوشت کے بجائے بکتا رہا۔ مردوں کی ہڈیاں کوٹ کر آٹا میں ملائی اور بیچی جاتی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو کھائے جاتے تھے۔ بیٹے کا گوشت اس کی محبت سے زیادہ قیمتی ہو گیا تھا۔" شہنشاہ نے غریبوں اور لاچاروں کے لئے خیرات خانے اور لنگر خانے کھلوا دیئے۔ برہان پور میں ہر دوشنبہ کو ۵ ہزار روپیہ غرباء و مساکین میں تقسیم کیا جاتا، احمد آباد میں محصولات کی معافی بڑے پیمانے پر کر دی گئی تھی۔[۳۹]

کشمیر

۱۶۴۱ء میں بے پناہ بارش نے کشمیر کی فصل خریف کو شدید نقصانات پہنچائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ کم یاب ہو گیا۔ کوئی پچاس ہزار باشندے وطن چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ اس وقت وہاں شہنشاہ بھی موجود تھے۔ سب لوگ ایک ساتھ جمع ہو کر درشن پہنچے اپنی مصیبتیں بیان کیں۔ شاہ جہاں نے حکم دیا کہ ان لوگوں میں ایک لاکھ روپیہ تقسیم کیا جائے اور دو سو روپیہ روزانہ

کا کھانا ان سب کو کھلایا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے تیس ہزار روپیہ تربیت خان کے پاس بھیجا کہ کشمیر کی قحط سالی کے سلسلے میں خرچ کئے جائیں۔ نیز یہ بھی حکم دیا کہ پانچ باورچی خانے قائم کر کے گوشت اور روٹی غریبوں کو فراہم کی جائے۔ لیکن تربیت خان انتظام نہ کر سکا۔ اس کی جگہ ظفر خان کو تعینات کیا گیا۔ شہنشاہ نے آخر الذکر کو مزید بیس ہزار روپیہ قحط زدہ لوگوں پر خرچ کرنے کو بھیجا[۱۳۵]

پنجاب

۱۶۴۶ء میں بارش کی قلت سے پنجاب میں بھی قحط پڑا۔ شہنشاہ کے حکم سے اس صوبہ میں دس باورچی خانے اس لئے قائم کئے گئے کہ لوگوں کو کھانا دیا جائے۔ سید جلال کو حکم ہوا کہ دس ہزار روپیہ غریبوں اور لاچاروں میں تقسیم کیا جائے۔ جو لڑکے بیچے جا چکے تھے ان کو حکومت نے آزادی دلا کر ان کے وارثوں کو دلا دیا۔ فروری ۱۶۴۷ء میں شاہ جہاں نے مزید تیس ہزار روپیہ پنجاب میں قحط سے لوگوں کو بچانے کے لئے منظور کیا۔[۱۳۶]

انتظامیہ کی رُوح

شاہ جہانی حکومت کے انتظامیہ کی مشین کا عام جائزہ لینے کے بعد آئیے اب اس بات پر غور کریں کہ اس کے پس پشت کون سا جذبہ کام کر رہا تھا۔ پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ حکومت کے مذہبی رویہ میں تبدیلی آئی۔ بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ بدل کر ادھر سے اُدھر ہو گیا تھا۔ مورخین بڑی فیاضی سے شاہ جہاں کے اسلامی روایات کی تجدید پر مرحبا و آفریں کہتے ہیں۔ بادشاہ کو سلام کرتے وقت سجدہ کرنے کی رسم کی تنسیخ اور بادشاہ کی تصویر کا پگڑیوں میں رکھنے کی ممانعت یہ سب باتیں اس کے مذہبی رجحانات کی مثالیں سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ان باتوں سے بھی زیادہ اہم اس کا وہ رجحان ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔ اس فہرست میں ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں۔

مندروں کی بے حرمتی

ہندوؤں کے مندروں کی بے حرمتی و بربادی کے دستور کی تجدید اگرچہ جہاں گیر کے زمانے میں ہوئی مگر شاہ جہاں کے عہد حکومت میں منظم ہو گئی۔ ساری سلطنت بالخصوص بنارس کے نئے بنائے ہوئے مندروں کو گرا دیئے کا پہلا حکم شاہ جہاں نے ۱۶۳۳ء میں نافذ کیا۔ اس حکم کے بعد ہی (ستمبر۔ اکتوبر میں) ایک قطعی ممانعت نئے مندر تعمیر کرنے اور پرانے مندروں کی مرمت کرنے کی ہوئی۔[۱۳۷] ہندوؤں کو مسلمانوں کی وضع قطع کے لحاظ سے رہنے سے فروشی یا جلوت دخلوت میں مے نوشی اور مسلمانوں کے قبرستان سے متصل مردوں کے یا ستی کے جلانے اور جنگ کے مسلمان غلاموں کے خریدنے کی ممانعت ہو گئی۔[۱۳۸]

بدعتی عملیات کی تنسیخ

سلطنت کے بعض حصوں مثلاً پنجاب، کشمیر اور گجرات (پنجاب۔[۱۳۹]

ہندو و مسلمان آزادی سے ملتے جلتے تھے۔ بلکہ آپس میں شادی بھی کر لیتے مثلاً بھمبار میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی ہندو اپنی لڑکی کی شادی کسی مسلمان کے ساتھ کر دیتا تھا تو مرنے پر اس کی لاش دفن کی جاتی لیکن اگر کوئی مسلمان کسی ہندو کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کرتا تھا تو لڑکی کے مرنے پر لاش جلائی جاتی تھی۔ ۱۶۳۴ء میں شاہ جہاں نے یہ رواج منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے واپس لے لی جائیں۔ لیکن اگر کوئی ہندو مسلمان ہو جاتا تو اسے اجازت ہو جاتی تھی کہ لڑکی اپنے ساتھ رکھ سکے بشرطیکہ شادی دوبارہ مسلمان کی طرح کرے۔[۱۳۰]

مذہب کی تبدیلی

ہندوؤں کو مذہب تبدیل کرنے کی منظم کوشش خواہ بذریعہ ترغیب خواہ بجبر[۱۳۱] بادشاہ کے اشاروں پر ہوتی رہی۔ ترغیب کے سلسلے میں دلفریب ملازمتوں اور انعاموں کا لالچ دیا جاتا۔ اس تبلیغ[۱۳۲] کا کام شاہ میر لاہوری اور محب علی سندھی کے سپرد تھا۔ یہ نومسلموں کو شہنشاہ کے حضور میں پیش کرتا اور وہ ان کو خطاب و اعزاز سے سرفراز کرتا یا خاص وظائف دیتا۔ ہندوؤں کو سختی سے منع کیا جاتا کہ وہ اپنے اعزا کو کسی طرح بذریعہ اثرات یا رکاوٹ مسلمان ہونے سے نہ روکیں۔[۱۳۳] تبدیلیِ مذہب کے سلسلے میں امرا کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ راجہ بختاور سنگھ ولد راج سنگھ کچھواہا کو تبدیل مذہب کرنے پر ایک خلعتِ اعزاز اور دو ہزار روپیہ ملے، اور اس کے لڑکے پرشوتم سنگھ کو مذہب بدلنے پر سعادتمند کا خطاب ملا۔

دو مثالیں کاغذات میں ایسی بھی ملتی ہیں کہ سرکاری ملازموں کو مذہبی معتقدات کی بنا پر تبدیل یا برخاست کیا گیا۔ لشکر خان کابل سے اس لئے ہٹایا گیا کہ اس کے ڈھیلے ڈھالے اعتقادات[۱۳۴] وہاں کے لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھے اور جلال الدین طباطبائی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رائے مایا داس کو (Tatta) ٹھٹھہ کی دفترداری سے اس لئے ہٹایا گیا کہ وہ ہندو تھا۔ اس کی جگہ ملا عبداللطیف گجراتی کو مقرر کیا گیا۔[۱۳۵]

اس پالیسی کی حد

یہ مذہبی ناروا داری صرف ان صوبہ جات میں قابل عمل تھی جو دارالسلطنت سے قریب تر تھے۔ یکساں جوش و خروش کے ساتھ ساری سلطنت میں اس پر عمل نہ ہو سکا۔ بلکہ بعض جگہوں پر ہندوؤں سے مصالحت کر لی گئی۔ ڈیلاویل بیان کرتا ہے کہ کمبے میں گاؤکشی ممنوع تھی لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ غیر خدا پرست کو اس رعایت کے لئے کثیر رقم ادا کرنی پڑتی۔[۱۳۶] مان ریکو بھی لکھتا ہے کہ ہندو اضلاع میں جانوروں کا مارنا منع تھا۔ چنانچہ ایک

بار جب وہ اڑیسہ میں سفر کر رہا تھا تو اس کے ایک ساتھی نے ایک مور مار ڈالا۔ اس جرم میں اس کے عضو یا ہاتھ دیئے جانے کا حکم ہوا۔ مگر بہت کہنے سننے پر یہ سخت سزا دُرّہ[۱۰۹] زنی میں بدل گئی۔ اس نے زائرین پر محصول لگنے کا بھی ذکر کیا ہے[۱۱۰]

نظم و نسق پر عام تبصرہ

شاہ جہاں کے انتظامی طریق کار نے اپنی گرمی و قوت حیات کے ظاہری صورت میں برقرار رکھا۔ بلخ و قندھار اور دکن کی مہمات سلطنت میں امن وچین کا غلبہ اس دعوے کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ اس کی حکومت پائدار تھی۔ برنیر اور منوچی کا یہ کہنا کہ دیہات کی ترقی سست و بتدریج تھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کارگزاری کی قابلیت کا اب بھی لحاظ کیا جاتا تھا۔[۱۱۱] شاہ جہاں کی سخت منصف مزاجی کی بہت سی مثالیں منوچی کے یہاں ملتی ہیں اور ٹیورنیر کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شاہ جہاں کے دور حکومت میں اس پر اس سختی سے عمل ہوتا تھا کہ کبھی کسی شخص کو چوری کے الزام پر سزا دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی[۱۱۲]۔ راستوں کے تحفظ کے سلسلے میں انصاف پسندی کی سخت گیری اور بھی نمایاں تھی۔ بیجا نہ ہوگا اگر ان شہادتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اب تک مغلیہ حکومت کی خصوصیات میں شعور انصاف اور عوام کی بہبود کا جذبہ کارفرما رہتا بشرطیکہ اغراض و مقاصد سے کسی خاص تصادم کا اندیشہ نہ ہوتا۔

لیکن شاہ جہاں کا دور حکومت اضداد کا ایک نمونہ ہے۔ ایک طرف تو غیر معمولی شان و شوکت و عظمت کا مظاہرہ تھا دوسری طرف زوال پذیری کے بھی آثار کم نہ تھے۔ اب تک ہم نے اوّل الذکر کا بیان کیا۔ آیئے اب دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے۔ بہت معمولی غور و فکر سے زوال کا سرچشمہ نظر آئے گا۔ جن خرابیوں نے نظم و نسق کا محاصرہ کر لیا تھا ان ہی میں یہ پوشیدہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظم و نسق میں بعض خرابیاں خلقی تھیں لیکن بہت سی خرابیوں کا وجود احتیاط و دور اندیشی کی کمی کا نتیجہ ہیں۔ ان کمزوریوں نے آہستہ آہستہ مگر یکسانیت کے ساتھ اپنا کام کیا اور مغلیہ سلطنت کو زوال سے ہمکنار کر دیا۔

فوجی انتظام کے معائب

فوجی انتظام جو حکومت کا خاص پشت پناہ تھا ڈھیلا ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کی جبلی خرابیوں کے جو نظم و ضبط[۱۱۳] کی عدم موجودگی سے پیدا ہو گئی تھیں، متفقہ عسکری تحرکات[۱۱۴] اور ہاتھیوں[۱۱۵] پر غیر معمولی اعتماد پر ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نظم و نسق میں کافی سنگین خرابیاں داخل ہو گئی تھیں۔ جاگیری نظام کی توسیع اور بعدہٗ شبہہ

داغ و تصحیح میں بے پروائی نے منصب داری نظام پر ضرب کاری لگائی۔ امتیازی اعزازات کی مزید بھرمار نے افراتفری کو اور زیادہ پراگندہ کر دیا۔ مزید برآں نابالغوں کو منصب عطا کرنے کے مہلک اقدام کا بھی وجود اسی زمانہ میں ہوا[۱۴۸]۔ اس سلسلہ میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ متوفی افسروں کی خدمات کا خیال کرنا بھی ضروری تھا۔ لیکن ان کے نابالغ وارثوں کو منصب عطا کرنا انتظامیہ کی ترقی کے لئے کسی طرح مناسب نہ تھا۔

علاوہ بریں عسکری حجم بہت بڑھ گیا تھا، اگرچہ اندرون ملک کے لئے یہ کار آمد تھا لیکن ولایتوں خاص کر ایرانیوں کے سلسلہ میں کار آمد نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بہادر اور جانباز سپاہیوں کی کمی نہ تھی مگر ان کا فوجی ساز و سامان بارگراں ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ فوجیں آہستہ روی پر مجبور تھیں اور کوئی کرتب یا بہادری کا ایسا کارنامہ جو اکبر کی گجرات کی مہم میں ہوا اب ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ بھی تھا کہ فوجیں کھلے میدان میں اچھی طرح لڑ سکتی تھیں لیکن ناہموار اور شکستہ پہاڑیوں کے محاذ پر بے کار ہو جاتی تھیں۔ احمد نگر کو فتح کرنا افواج کی کثرتِ تعداد سے ممکن ہوا لیکن مدت کارگزاری بہت طویل ہو گئی اور بلخ میں تو فوج کی کثرت تعداد بھی کام نہ آئی۔

محکمہ مالیات کی لاپرواہی

فوجی نظام میں جو ڈھیلا پن آگیا تھا وہی مالیات کے شعبہ میں بھی آگیا۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کی آمدنی بڑھتے بڑھتے چار کروڑ روپیہ تک ہو گئی تھی لیکن وہ براہ راست رابطہ جو حکومت اور رعایا میں اکبر قائم کرنا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے ایک مدت تک کوشش کی تھی اب نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں جیسا اوپر عرض کیا گیا کاشتکاروں کا بوجھ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ برنیر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ زمین بغیر کاشت کے پڑی تھیں[۱۴۹]۔

رشوت

انتظامی نظام کا شر انگیز وہ ہمہ گیر دستور تھا جس میں بادشاہ اور بلند پایہ حکام کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ یہ دستور نورجہاں نے قائم کیا تھا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ لیکن شاہجہاں کے دور میں بدتر ہو گیا۔ ایک رضاکارانہ تحفہ کے بجائے اب وہ جبری ہو گیا تھا۔ ہر جشن کے موقع پر شہنشاہ اپنے درباریوں سے نذرانے کی توقع کرتا تھا اور اسی طرح ہر درباری اپنے موقع پر اپنے ماتحتوں سے نذر وصول کر لیتا تھا۔ یہ رشوت ستانی کا سنہرا روپ تھا۔ قریب قریب ہر مغربی سیاح نے اس کو قلم بند کیا اور سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے۔

دوسری ایشیائی سلطنتوں سے رابطہ

یہ بات مغل سرکار اور دوسری ایشیائی سلطنتوں اور ہندوستان میں آئے ہوئے مغربی تاجروں کے ساتھ تعلقات کے مختصر بیان کے بعد ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایران وماوراء النہر کے تعلقات کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب یہاں ہندوستانی مغلوں اور ترکی کے سلطان وشریف مکہ کے تعلقات پر روشنی ڈالیں گے اگرچہ آخر الذکر کے ساتھ رابطہ دنیاوی نہ تھا بلکہ مذہبی تھا۔

ترکی سے مراسلات کی ابتدا

ترکی اور مغلیہ سرکار سے رابطہ کچھ عجیب حالات میں شروع ہوا۔ ۱۶۳۷ء میں گھوڑوں کا ایک ہوشیار تاجر جس کا نام ظریف تھا شہنشاہ سے پروانہ لے کر شاہی اصطبل[۱۴] کے لئے عمدہ گھوڑے خرید نے عرب وترکی گیا۔[۱۵] شاہ جہاں نے افضل خان کو حکم دیا کہ باز نطان کے وزیر اعظم کو ظریف کے لئے ایک سفارشی خط لکھ دے۔ علاوہ اس کے شہنشاہ نے ظریف کو ایک خط اور چند تحائف مع ایک شمشیر کے سلطان مراد چہارم کو دیئے۔

ظریف ترکی میں

ظریف لاہری بندرگاہ سے روانہ ہو کر مکہ اور مصر کا چکر لگاتا ہوا موصل پہنچا۔ یہاں باز نطان کے حکمران نے شرف حضوری بخشا۔ شاہ جہاں کا خط پاکر مراد بیحد خوش ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی ایک مرصع تلوار پاکر ہوئی جو شاہ جہاں نے اس کے لئے بھیجی تھی۔ مراد اس وقت بغداد کے خلاف جنگ کرنے جا رہا تھا۔ اس تلوار کو اس نے فال نیک سمجھا۔ اس نے ظریف سے موصل میں اس وقت قیام کرنے کی فرمائش کی جب تک وہ اپنی مہم سے واپس نہ آجائے۔[۱۶]

ارسلان آقا ہندوستان بھیجا گیا

مہم سے واپس ہو کر مراد نے ارسلان آقا کو بہ حیثیت سفیر شاہی دربار میں بھیجا۔ ظریف اس کے ساتھ ہی تھا ان لوگوں نے بصرہ سے ٹھٹھہ تک ساتھ ہی بحری سفر کیا۔ شاہ جہاں نے ترکی سفیر کو اپریل ۱۶۴۰ء میں شرف حضوری کشمیر میں بخشا۔ ارسلان آقا آٹھ مہینے ہندوستان میں رہنے کے بعد اپنے وطن واپس گیا۔[۱۷]

سید محی الدین کا آنا

بعد کے دس برس تک ترکی و ہندوستان میں سفیروں کی آمدورفت نہ ہوئی۔ ۱۶۵۰ء میں سورت کے افسروں نے ترکی سفیر محی الدین کی آمد کی اطلاع دی۔ شاہ جہاں نے بڑے التزام سے شمال آنے کے لئے متعدد مقام پر سید کے

استقبال کا حکم دیا۔ سورت کے افسروں کو حکم ہوا کہ دس ہزار روپیہ کی تھیلی سفیر کو نذر کی جائے۔ ایسے ہی خزانے اجین اور دہلی میں بھی دیے گئے۔ بربان پور، سامانڈو میں اسے دو ہزار روپیہ کی تھیلیاں پیش کی گئیں۔ نومبر ۱۶۵۱ء میں اسے رخصت کیا گیا۔

احمد سعید ترکی بھیجا گیا

سید محی الدین کے ہمراہ یہاں سے حاجی احمد سعید مبادلہ میں سفیر بنا کر ترکی[۴۵] روانہ کیا گیا۔ شاہ جہاں نے اپنے خط میں بلخ و بدخشاں کی لڑائی کا حال مفصل تحریر کیا۔ اس نے اپنی کارگزاریوں کو مذہب کی بنا پر جائز قرار دیا[۴۶]۔ ۱۱ جون ۱۶۵۲ء کو ترکی سلطان کی حضوری میں حاجی پیش[۴۷] ہوا۔

ذوالفقار ہندوستان بھیجا گیا

سلطان محمد نے اس بار ذوالفقار آقا کو سفیر بنا کر ہندوستان روانہ کیا۔ حاجی احمد سعید بصرہ تک اس کا ہمسفر رہا۔ یہاں سے دونوں الگ ہو گئے۔ ترکی سفیر بصرہ سے بحری سفر کر کے دسمبر ۱۶۵۳ء میں سورت پہنچا۔ جیسا استقبال اس کے پیش رو کا کیا گیا تھا ویسا ہی اس سفیر کا بھی کیا گیا۔ بادشاہ نے مارچ ۱۶۵۴ء میں اسے شرف حضوری بخشا۔ سلطان محمد نے اپنے خط میں[۴۸] نذر محمد کی امداد طلب کرنے کے ذکر کے ساتھ ان تلخ شکایتوں کو بھی لکھا تھا جو شاہ جہاں سے نذر محمد کو پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن سلطان نے شاہ جہاں کی ان باتوں پر اپنے مطمئن ہونے کا اظہار کیا جو آخر الذکر نے اپنی کارگزاریوں کے جواز میں اس خط میں لکھا تھا جو حاجی احمد سعید لایا تھا۔

قائم بیگ کا مشن ترکی میں

سلطان محمد کے اس ہنگامہ طرز تحریر پر شاہ جہاں بہت ناراض ہوا۔ ۱۶۵۴ء میں اس نے اپنا جواب[۴۹] قائم بیگ کے ہاتھ روانہ کیا۔ اس نے بڑی طرح سلطان کے انداز بیان پر نکتہ چینی کی۔ اس کی کم عمری پر طنز کرتے ہوئے اسکے مشیر کاروں کی ناتجربہ کاری کی بھی مذمت کی۔ اس کے بعد سے شاہ جہاں کے عہد حکومت تک ترکی اور ہندوستان کے سفیروں کے مبادلہ کا کوئی اندراج نہیں ملتا۔

مکہ

شاہ جہاں کے دور حکومت میں متواتر زر کثیر شریف مکہ اور مکہ و مدینہ[۵۰] کے لوگوں کی امداد کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ محمد وارث لکھتا ہے کہ تخت نشینی کے وقت سے لیکر ۱۶۵۷ء تک شاہجہاں نے مکہ کے لئے تخمیناً دس لاکھ روپیہ روانہ کئے[۵۱]۔ روپیہ بھیجے جانے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ جب کوئی سربرآوردہ افسر حج کے لئے یہاں سے جاتا تو اس کے ساتھ ایسے تجارتی مال بھیجے جاتے جن کا منافع کم از کم سو فیصدی ہوتا۔ یہ منافع مع اصل کے شریف اور مکہ و مدینہ کے زہاد و مساکین میں تقسیم ہو جاتا۔

مغربی تاجر: پرتگالی

اس عہد میں پرتگالیوں کی طاقت کا ہندوستان میں تیزی سے زوال ہوا۔ ڈچ اور انگریزوں کے اقتدار کو عروج ہوا۔ عہد اکبر کی ایک قلیل مدت کے سوا مغلیہ حکومت سے پرتگالیوں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ بہ جبر مراعات حاصل کرتے رہے، کبھی کاروباری جہاز گرفتار کر لیا کبھی حاجیوں کے جہاز روک لئے۔ کسی ہندوستانی کشتی کی مجال نہ تھی کہ وہ بغیر پرتگالی پروانہ راہ داری حاصل کئے کھلے سمندر میں رواں ہو سکے۔ یہ پروانہ راہ داری کے لئے ڈیمن اور ڈیو کے افسران بھاری رقم وصول کر لیتے۔ اس لئے مغل بادشاہوں کی نظر میں ان کی حیثیت بدکار سے زیادہ نہ تھی اور بہ جبر اس لئے برداشت کرنا پڑتا تھا کہ چھٹکارا کی کوئی صورت نہ تھی۔

۱۶۳۰ء میں ان کے گوا کے گورنر کونٹے ڈی لن ہیرس[a] نے اپنا ایک نمائندہ سورت بھیجا۔ کہلایا کہ پرتگالی سورت میں آبادکاری کے لئے تیار ہیں۔ جتنی تجارت انگریز اور ڈچ مہیا کرتے ہیں وہ اہل پرتگال کر دیں گے بشرطیکہ ان دونوں کو نکال باہر کیا جائے۔ لیکن اس وقت سورت میں پرتگالیوں کی مخالفت شباب پر تھی۔ کیونکہ انھوں نے ایک ہندوستانی جہاز حال ہی میں پکڑ لیا تھا۔ صورت حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اس لئے کہ انھوں نے دوسرا ہندوستانی جہاز 'موسائی' گرفتار کر لیا تھا اور تیسرے جہاز 'شاہی' پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ لیکن سورت کے سوداگروں نے انگریزوں کو ملا لیا۔ انگلستان سے راسیل[b] بحری بیڑا لے کر آ رہا تھا اس نے ہندوستانی جہاز کو پرتگالیوں کی دست برد سے بچا لیا۔[۱۲۳]

اس اثنا میں شاہ جہاں پرتگالیوں سے بیزار ہو گیا ہو۔ اس کا قیام دکن میں تھا۔ اس نے عادل شاہ کو آمادہ کیا کہ گوا کا راستہ بند کر دے۔ اس تدبیر اور لنکا میں خسارہ اٹھانے کے خیال سے پرتگالیوں کے حواس درست ہوئے۔ انھوں نے سورت کے حکام سے مصالحت کر لی۔ موسائی جہاز واپس کر دیا، انگریزوں اور اہل ڈنمارک کے اخراج کے مطالبات بھی ہٹا لئے۔ اس کے عوض میں تسلیم کر لیا گیا کہ وہ سمندری سفر کے لئے پروانے جاری کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہوا کہ ان کی ضبط شدہ اراضی جائداد بحال کر دی گئی۔

اب پرتگالیوں کو صرف یہ خوف رہا کہ ایسا نہ ہو کہ شاہ جہاں بیجاپور کو زیر کر کے گوا[۱۲۴] میں ان

(a) Conde de Linhares. (مترجم)

(b) Rastell. (ایضاً)

کی محافظت ختم کر دے۔ اس لئے جب شاہ جہاں نے ۱۶۲۵ء میں دکن پر حملہ کیا تو شاہ اسپین نے اپنے والے کے افسروں کو حکم دیا کہ بیجاپور اور احمدنگر دونوں کی مدد کریں۔ ۱۶۲۸ء میں مغل حکام سے کھلم کھلا یک جھڑپ اس وقت ہوئی جب آخرالذکر نے ڈیمن اور ڈیو کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن صدر فرملن اسورٹ کے انگریزی کارخانے کے سربراہ نے صلح کرادی۔

ڈچ بحری اور تجارتی برتری دونوں میں پرتگالیوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اہل ڈنمارک نے لے لی۔ ان کا پہلا کارخانہ سورت میں پاٹرؤان ڈین بروک کے ہاتھوں قائم ہوا۔ اور دو سال بعد نیز پاٹر گیلس وان ڈیوسٹن نے اطمینان بخش تجارتی مراعات شہزادہ شاہ جہاں سے حاصل کر لیں جو اس زمانے میں گجرات کا ناظم تھا۔ یہ لوگ جہانگیر کے آخر عہد حکومت تک امن چین سے تجارت کرتے رہے۔ چنانچہ شاہ جہاں جب جنار سے آگرہ تاج پوشی کے لئے جا رہا تھا تو ڈچ کے لوگوں نے اسے تحائف پیش کئے اور اس نے بھی ان کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کیا۔ لیکن مارچ ۱۶۲۸ء میں اُنکے لماشتوں کو اس لئے گرفتار کر لیا گیا کہ وہ بغیر شہنشاہ کی اجازت کے شورہ خرید رہے تھے مگر مختصر سی معاملہ فہم رشوت دے کر رہا کرالئے گئے۔

اب تک اہل ڈنمارک اور انگریزوں کے تعلقات خوش گوار چلے آرہے تھے لیکن ۱۶۳۵ء میں کشیدگی پیدا ہوئی اس لئے کہ انگریزوں نے پرتگالیوں سے صلح کر لی۔ ڈچ کارخانہ کے سربراہ پاٹرس زون نے سورت کے ناظم کو ترغیب دی کہ وہ بادشاہ کے پاس انگریزوں کے خلاف کاروائی کرے۔ اس کے جواب میں اہل ڈنمارک کو مراعات کی امید دلائی گئی بشرطیکہ وہ پرتگالیوں کو ڈیمن اور دیو سے نکال باہر کریں اور اس پر رضامند ہو جائیں کہ سورت کی جملہ بحری تجارت جو سردست انگریزوں اور پرتگالیوں کے حصہ میں ہیں اس پر قبضہ کر لیں۔ پاٹرس زون شرائط منظور کرنے پر تیار تھا۔ لیکن اس کے افسران بالا جو بٹاویا میں تھے، راضی نہ ہوتے۔ ان کو ان شرائط کے منظور کرنے سے باز رکھا۔ بالآخر اس گفت وشنید میں مغلیہ حکام سے یہ طے ہوا کہ ڈچ کو بنگل کی آزاد تجارت کا اختیار دیا جاتا ہے اور اس مراعات خصوصی کے عوض وہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ

(a) President Fremlin. (مترجم) (b) Pieter Van den. (مترجم)
(c) Pieter Gilles Van. (") (d) Batavia . (")
(E) Jan Tack . (")

داخل نہ کریں گے۔ یہ بھی طے ہوا کہ وہ لوگ جنگی جہاز بنائیں گے نہ بجز سوالی کے کسی اور بندرگاہ پر اپنی کشتیاں ٹھہرائیں گے۔

ان خوشگوار حالات میں اہل ڈنمارک کی تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ انھوں نے انگریزوں اور پرتگالیوں کو بہت پیچھے کر دیا۔ ۱۶۴۲ء میں ان کا ایک وفد شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے اور بھی زیادہ کارآمد مراعات[۱۸۱] حاصل کیں۔ لیکن آگے چل کر چھ سال میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ جن سے اہل ڈنمارک اور مغل حکام دونوں ایک دوسرے سے بددل ہو گئے۔ اہل ڈنمارک نے ٹین کی تجارت کو اجارہ داری کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کی۔ اس اقدام پر گجرات کے سوداگر برہم ہوئے انھوں نے بادشاہ سے شکایت[۱۸۲] کی۔ دوسری طرف شائستہ خان نے استحصال بالجبر سے ڈنمارک والوں کو کافی نقصانات پہنچائے اور صوبجاتی افسروں نے بنگال میں بھی انکو پریشان کیا۔ جان ٹاک[☆] کو ۱۶۴۸ء میں ڈنمارک والوں نے دادرسی کے لئے شہنشاہ کے پاس بھیجا۔ شائستہ خان کو تنبیہہ کی گئی اور سورت کے افسروں کو حکم ملا کہ ڈچ سوداگروں کی جائیداد واپس کر دیں۔ لیکن بنگال میں تجارتی مراعات حاصل کرنے کی جان ٹاک کی درخواست نامنظور ہوئی۔

اس اثنا میں بٹاویا کے پرتگالی حکام نے سورت میں مغل ظلم وستم کی روداد سن کر ایک بحری بیڑا انگریزوں اور مغلوں سے انتقام لینے کے لئے روانہ کیا۔ اس بیڑا کے سپہ سالار نے شاہجہاں کا ایک جہاز گرفتار کر لیا۔ مطالبہ کیا کہ اس کے ہم وطنوں کے نقصانات کی پوری تلافی کی جائے۔ سورت کے حکام نے ڈچ لوگوں کے نقصانات کا پورا بدل دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ جن میں آزاد تجارت سے وہ دست بردار ہو جائیں گے۔ سامان رکھنے کے لئے ایک خاص گودام گھر بنانے کی اجازت دی جائے گی اور شہنشاہ سے درخواست کی جائے گی کہ اڑیسہ اور بنگال میں ان لوگوں کے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

جان ٹاک دوسری بار دہلی گیا۔ شاہ جہاں نے اس کا خیر مقدم پہلی بار سے زیادہ اعزاز کے ساتھ کیا۔ دوسرے سال ڈچ کے لوگوں کو سندھ[۱۸۳] میں تجارت کی اجازت حاصل ہوئی۔ لیکن ان کی بعض شکایتیں ہنوز باقی تھیں۔ مثلاً ان کے نمائندوں کے ساتھ بنگال میں جو سلوک ہوا تھا، اس کا کوئی معاوضہ نہ ملا تھا۔ اس لئے تیسرا وفد جان ٹاک اور جان برک ہارڈٹ کی قیادت میں

(☆) Jan Tack. (مترجم)

بھیجا گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ شہنشاہ دہلی میں نہیں اس لئے واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔

شاہ جہاں کی واپسی پر ڈچ کے قاصدوں نے کچھ خاص درباریوں کو اپنا ہمدرد بنا لیا۔ ان ہمدردوں میں جہاں آرا کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس کی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ سورت اس کی ملکیت تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۵۲ء کو یہ قاصد حضور شاہ پیش ہوا۔ چنگی سے مستثنیٰ کئے جانے کی درخواست نامنظور ہو گئی لیکن اس کی اجازت دی گئی کہ ۵۵ ہزار روپیہ بالمقطع ادا کر سکتے ہیں۔ نیز ان کی یہ درخواست بھی رد ہوئی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ کرایہ کے سامان پر محصول نہ لگائے جائیں اور ڈچ کے وہ پناہ گزین جو مسلمان کر لئے گئے تھے ان کو واپس کر دیا جائے۔ لیکن انکی موافقت میں ایک فرمان جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا کہ بنگال میں راستوں کی چنگی سے ان کو مستثنیٰ کیا گیا۔ یہ بھی اجازت مل گئی کہ وہ اپنی کشتیوں کی مرمت سورت میں کر سکتے ہیں اور سوالی میں ایک گودام گھر بنا سکتے ہیں۔ اس کے عوض میں ڈچ لوگ ہندوستانی کشتیوں کو آزادی سے آچین اور ڈچ کے دوسرے مقبوضات تک آنے جانے کا راستہ بغیر روک ٹوک کے دینے پر راضی ہو گئے۔

چونکہ دہلی میں قیام مہنگا تھا اس لئے ٹاک اور برگ ہاورٹ آگرہ واپس آئے۔ جب انھوں نے موعودہ فرمان دیکھا تو یہ محسوس ہوا کہ یہ اطمینان بخش نہیں۔ برک ہاوٹ پھر دہلی واپس آگیا چونکہ وہ کوئی تحفہ نہ لایا تھا اس لئے اس کو حضور میں نہ پیش کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈچ اور مغلوں کے تعلقات اس بنا پر شاہ جہاں کے دور حکومت تک ناخوشگوار رہے۔ بنگال میں جان ورپورٹن نے کوشش کی کہ شہزادہ شجاع سے کچھ تجارتی مراعات حاصل کرے لیکن چونکہ معاملات حضور شاہ در پیش تھے اس لئے اس نے دخل اندازی مناسب نہ سمجھی۔ ۱۶۵۶ء میں چوتھی بار جان ٹاک آگرہ سے دہلی گیا۔ گمان غالب ہے کہ اس کے جانے کا مدعا اپنے نمایاں نقصانات کی تلافی سے وابستہ تھا۔[۱۵۴]

تجارتی اور بحری برتری کے سلسلہ میں انگریز اہل ڈنمارک کے زبردست حریف تھے۔ وہ ہندوستان پہلے ہی آ گئے تھے۔ آہستہ روی مگر مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی تجارت کو ترقی دے رہے تھے۔ جہانگیر کے عہد حکومت کے اختتام تک ان کے فلاح و بہبود کے مسائل بنگھم اور کلیمنٹس پیش کرتے رہے۔ آخر الذکر آگرہ کے کارخانے میں نمبر ۲ کا افسر تھا۔ دسمبر ۱۶۲۷ء میں شاہجہاں گجرات آیا۔ یہاں سے آگرہ جاتے ہوئے سورت کے کارخانے کا صدر کیرج اسے بروچ میں تحفے پیش کرنے گیا۔[۱۵۵] نئے شہنشاہ کو خراج عقیدت بنگھم اور کلیمنٹس نے آگرہ میں پیش کیا۔ مارچ ۱۶۲۸ء میں ان لوگوں کو بھی اسی جرم پر قید کیا گیا جس کی سزا ڈچ لوگ بھگت چکے تھے لیکن جلد ہی خوشگوار تعلقات قائم

ہو گئے۔ اس کے ایک سال بعد انگریزوں کو سندھ میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔ ۱۶۳۰ء میں رسٹیل نے ایک مغلیہ جہاز پرتگالیوں کے ہاتھ سے بچایا۔[186]

۳۱-۱۶۳۰ء کے قحط نے انگریزوں کو شدید نقصانات پہنچائے۔ یہاں تک کہ بحر سورت کے کارخانہ کے ان کو اپنے جملہ دکنی کارخانے بند کرنے پڑے۔ اس حادثہ نے جو ان کو مالی نقصانات پہنچائے تھے۔ اس سر دبازاری میں ہندوستانی سوداگروں کی یہ کوشش کہ نیل کی تجارت کی اجارہ داری(۱) کو مل جائے، انگریزوں کے لئے اور بھی زیادہ مضر ثابت ہوئی۔ سورت میں نئے ناظم کی مخالفت نے ان کے حالات بد سے بدتر کر دیئے۔[187] انگریزی کارخانہ کے صدر متھولڈ نے ۱۶۳۵ء میں پرتگالیوں سے مصالحت کر لی۔ اس نے اپنا مرکز تجارت کمپے[188] منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے اس ارادہ نے ہندوستانی سوداگروں کو ہوشیار کر دیا۔ انھوں نے شہنشاہ سے شکایت کی۔ شاہجہاں نے نیل کی تجارت سے بندش ہٹادی لیکن یہ بھی حکم دیا کہ جو جہاز سورت آئیں وہ بجز سوالی کے کہیں اور نہ لنگر انداز ہوں۔ اور یہ بھی منع کر دیا کہ یہ لوگ جنگی جہاز ہندوستان میں نہ بنائیں۔ اہل ڈنمارک کی طرح انگریزوں کو بھی حکم دیا گیا کہ ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ داخل خزانہ کریں۔ لیکن متھولڈ ان شرائط کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا

اس درمیان میں خبر آئی کہ انگریز بحری ڈاکوؤں نے سورت کے جہاز توفیقی اور ڈیو کے محمدی، جہاز کو گرفتار کر لیا ہے۔[189] اس کا اثر یہ ہوا کہ متھولڈ سورت میں اور رابنس، احمد آباد میں قید کر دیئے گئے۔ آگرہ اور ٹھٹھ میں انگریزی مال و اسباب قرق ہو گیا۔ لیکن متھولڈ ۸ ہفتہ بعد رہا کر دیا گیا۔ مئی ۱۶۳۶ء میں اس نے جان ڈریک کو تلافی کے لئے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ ٹھٹھ اور دوسرے مقامات پر جو سامان قرق کیا گیا تھا وہ بحال کر دیا گیا لیکن سورت کے ناظم کو کوئی سزا نہ دی گئی۔ بلکہ زخم پر نمک چھڑکا گیا۔ انگریزوں کو اسلحہ رکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ مصالحت آسودگی سے کوسوں دور تھی۔ اس لئے ۱۶۳۷ء میں بارن فورٹ سورت[190] سے آگرہ بھیجا گیا۔ وہ ڈیڑھ سال تک وہاں ٹھہرا رہا۔ اس مدت میں اس نے بادشاہ کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ توفیقی اور محمدی کے سلسلہ میں اس کے ہم وطن بے قصور ہیں۔ اس کو اطمینان دلایا گیا کہ آئندہ ایسے حالات میں ان کے مطالبات کی حفاظت کی جائے گی، ساتھ ہی ساتھ بنگال میں انگریزوں کی تجارت کی توسیع کے لئے ایک فرمان بھی جاری کر دیا گیا۔

۱۶۴۴ء[191] میں جو حسب خواہش مراعات ڈچ کو ملی تھیں اسی نوعیت کی مراعات حاصل کرنے کے لالچ میں انگریزوں نے بھی بیش قیمت تحائف شہنشاہ کی خدمت میں پیش کئے۔ ان کی امید پوری

ہوئی۔ شہنشاہ نے ایک فرمان کے ذریعہ ان کے سارے مطالبات پورے کر دیئے۔ لیکن بعد کے سات برسوں میں مختلف خلفشار رونما ہوتے رہے۔ چنانچہ جولائی ۱۶۵۰ء میں رچرڈ ڈے وپچ اس لئے دہلی بھیجا گیا کہ شہنشاہ[۱۹۲] کی خدمت میں اپنی شکایتیں پیش کرے۔ چونکہ نذر گزارنے کے لئے وہ تحائف سے لیس تھا اس لئے شاہ جہاں آسانی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک فرمان عطا کیا گیا جس کے رُو سے انگریزوں کو راستے استعمال کرنے کے محصول سے آزادی دے دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ سورت اور سندھ کے حکام کو ہدایت کی گئی کہ انگریز تاجروں کو دق نہ کیا جائے۔ اس کے بعد سے انگریزوں کی تجارت بڑی تیزی سے بڑھتی گئی یہاں تک کہ شاہ جہاں کی حکومت کے اختتام تک ان کے کارخانوں کا حال بنائے اطمینان ہو گیا۔

باب ۱۲

آخری منزل

یہ صحیح کہا گیا ہے کہ چغتائی خاندان کے حکمرانوں کی زندگی زیادہ تر خیموں میں بسر ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خیمہ و خرگاہ کی یہ زندگی جس میں ہمیشہ مقام کی تبدیلی ہوتی رہتی تھی صرف تعیش کے لئے نہ تھی بلکہ اس کے علاوہ اور بھی ایسے متحرک عوامل تھے جو خیمہ کو گھر بنانے پر مجبور رکھتے۔ اس کا سب سے پہلا سبب نظام حکومت کی نوعیت تھی جسے فوجی آمریت بتایا گیا ہے۔ اس قسم کے نظام میں حکمراں کی ذات حکومت کی پوری مشین کی قوت تحریک کا محرک ہوتی ہے۔ اس کو رواں دواں رکھنے کے لئے اس کی موجودگی از بسکہ ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا وہ میدان عمل سے قریب رہے گا اتنی ہی مستعدی و بیداری اس کے افسران میں کارفرما ہوگی۔ دوسرا سبب حکمرانوں کے تسخیر مملکت کا جذبہ تھا ــــ بجز بد قسمت ہمایون کے بابر سے اورنگ زیب تک ہر بادشاہ توسیع سلطنت کی اس ناآسودہ تشنگی کا شکار تھا۔ تیسرا سبب اگر عوام سے قریب تر ہونے کا احساس نہ رہا ہو تو بھی صوبائی حکومتیں سے ذاتی قرب حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ ملک بھر میں گشت کرنے کے رویہ نے حکمرانوں سے ناظموں کی وفاداری کا سامان فراہم کیا اور بعض اوقات اسی میں انتظامیہ کی بداعمالی کی نشوونما کی بھی روک تھام کی ــــ بادشاہوں کو مروجہ بدکاری سے واقفیت بخشی۔ جن کا دور کرنا چغتائی حکمرانوں کی دائمی خصوصیت میں داخل تھا، اسی لئے مغلیہ خاندان کے اول چھ حکمرانوں کی زندگی سخت محنت و مشقت کی زندگی تھی۔

شاہ جہاں کا آگرہ میں غیر حاضر ہونا

اپنی تیئس سال کی حکومت میں تخمیناً نصف مدت تک شاہ جہاں دارالسلطنت سے باہر رہا۔ اس موقع پر اس کے نجی معاملات کا ایک مختصر بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اپنی تخت نشینی کے سال بھر کے اندر ہی آگرہ چھوڑ کر اسے گوالیا جانا پڑا۔ تاکہ وہ جھجار سنگھ کی سرکوبی کرسکے۔ لیکن آخرالذکر نے اطاعت قبول کر لی اور شہنشاہ ایک ماہ سے کچھ زیادہ مدت کی غیر حاضری کے بعد دارالسلطنت واپس آگیا۔ اسی سال کے ماہ دسمبر میں اس کو پھر آگرہ چھوڑنا پڑا اس لئے کہ خان جہان لودی کو دکن بھاگ جانے پر سزا دینی تھی۔ شاہ جہاں رانتھنبور کے راستہ سے چاندا اور مالوہ ہوتا ہوا، ارمارچ ۱۶۳۰ء کو برہان پور پہنچا، یہاں دو سال تک قیام رہا۔

حُسن آرا کی ولادت

برہان پور میں شہنشاہ کی دختر حسن آرا بیگم کی ولادت ہوئی۔ اس وقت شاہجہاں کی زندگی خوش حالی میں گزر رہی تھی۔ نظام شاہی قلعہ جات یکے بعد دیگرے قبضہ میں آرہے تھے۔ خاں جہاں کا تعاقب سرگرمی سے جابجا کیا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ سندھ میں گرفتار ہوا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کامیابی کا دربار میں جشن عام منایا گیا۔ دعوتیں ہوئیں، افسروں کے درجات میں اضافہ کیا گیا۔ لیکن ایک فوری حادثہ نے نہ صرف شاہ جہاں کی مسرت کم کر دی بلکہ ایک ایسا غم بن گیا جو عمر بھر اس کو یاد آتا رہا۔

ممتاز کی موت

بروز چہارشنبہ بتاریخ ۷ رجون ۱۶۳۱ء کو ممتاز محل کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ وضع حمل کی تکلیف برداشت نہ کر سکی۔ نڈھال ہونے لگی۔ جہاں آرا بیگم سے کہا کہ میرے بستر مرگ کے قریب شہنشاہ کو بلا دیا جائے۔ شہنشاہ قریب ہی کے دوسرے کمرے میں تھا۔ جلدی سے اس کمرہ میں آیا جہاں اس کی ملکہ تھی۔ ممتاز محل نے آنکھیں کھولیں بچوں کو شوہر کے حوالے کیا اور الوداع کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی یہ سارا حادثہ اتنے کم وقفہ میں ہوا کہ شاہ جہاں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور زار و قطار رونے لگا۔

شاہ جہاں کا غم

سارے دربار پر غم واندوہ کی فضا طاری ہوگئی۔ افسروں نے سفید ماتمی لباس پہنے، ایک ہفتہ تک شاہ جہاں جھروکہ نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب زندگی سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ شدت احساس سے اس کے بال سفید ہوگئے۔

دو سال تک وہ محفل رقص و سرود وغیرہ سے بیگانہ رہا۔ لباس فاخرہ کے استعمال سے بھی اس نے گریز کیا۔ عید اور دوسرے ایسے مواقع پر وہ زار و قطار اشک بار ہوتا۔ اپنی جملہ بیویوں میں سب سے زیادہ عزیز بیوی کا ماتم کرتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے بار بار کہا کہ اگر یہ مقدس فرض جو مجھ پر عائد کیا گیا ہے اگر خداوند کریم کا عطیہ نہ ہوتا تو سلطنت اپنے لڑکوں میں تقسیم کر کے میں دنیا سے دست بردار ہو جاتا۔

ممتاز کی لاش آگرہ لائی گئی

کچھ دنوں پیچھے ممتاز محل کی لاش دریائے تاپتی کے اس پار زین آباد باغ میں سپردِ خاک کردی گئی۔ شہزادہ شجاع، وزیر خان اور ستی النساء ملکہ کی دایہ خاص کی زیرِ نگرانی لاش ابتدا دسمبر ۱۶۳۱ء میں آگرہ لائی گئی۔ یہاں جمنا کے کنارے اس زمین پر دفن کی گئی جو کبھی راجہ مان سنگھ کی ملکیت تھی۔ اس کے پوتے جئے سنگھ سے شاہجہاں نے برائے نام قیمت دے کر خرید لی۔ ۱۷ سال کے اندر یہاں اس کی قبر پر ایک ایسا شاندار مقبرہ بنایا گیا جو ایک وفادار شوہر کی وفادار بیوی سے محبت کی دائمی یادگار ہے۔

شاہ جہاں آگرہ واپس آتا ہے

۶ مارچ ۱۶۳۲ء کو دربار برہان پور روانہ ہوکر اسی سال کے جون میں آگرہ واپس آگیا۔ اور شاہجہاں دو سال تک دارالسلطنت میں قیام پذیر رہا۔ واپسی کے پندرہ دن بعد شہنشاہ نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ مُراد کی رسمِ مکتب رسمی انداز میں ادا کی۔ ملا میراق اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔ لیکن اس موقع پر کوئی دعوت نہیں ہوئی اس لئے کہ شہنشاہ کا زخمِ دل ہنوز تازہ تھا۔

دارا کی شادی

تولے جانے کی اکتالیسویں شمسی رسم ادا کرنے کے بعد شاہ جہاں نے اپنی اولادِ اکبر، دارا شکوہؒ کی شادی رچانے کی تیاری کا حکم دیا۔ ممتاز محل کی زندگی ہی میں شہزادہ پرویز کی لڑکی سے اس کی نسبت طے ہوچکی تھی۔ جب دربار دکن میں تھا۔ اسی وقت شادی کے سلسلہ میں احکام جاری ہوگئے تھے کہ گجرات، بنارس، ست گاؤں، مالدہ، سونار گاؤں اور پٹن وغیرہ سے کمیاب و قیمتی اشیاء فراہم کی جائیں۔ آگرہ اور لاہور کے جن افسروں کے سپرد شاہی امورِ خانہ داری تھے ان کو ہدایت کی جاچکی تھی کہ جواہرات، نقرئی و طلائی اسباب اور اس قسم کی دوسری چیزیں جن کی شادی

میں ضرورت پڑنے والی ہو سب مہیا کریں۔ لیکن ملکہ کی اچانک موت نے اس تیاری کو کم کر دیا تھا۔
اب پھر جنوری ۱۶۳۳ء میں جشن شادی کی سرگرمی شروع ہوئی۔

شادی کے تحائف کی ایک نمائش ۲۵ر جنوری کو دربار عام میں ہوئی۔ اس کی نگرانی جہاں آرا بیگم اور ساتی النساء خانم کے سپرد کی گئی۔ سہ پہر کو شہنشاہ و مستورات حرم نمائش دیکھنے گئے اور شام کو شاہی افسروں کو اجازت ملی۔ سمدھن نے بھی اسی طرح اسی ایوان میں اپنے تحائف آراستہ کئے اور شاہ جہاں ان کو دیکھنے گیا۔ یکم فروری کو رسم حنا بندی ادا کی گئی اور شاہی سرود خانہ جواب تک خاموش تھا پھر نغمہ سنج ہوا، گویا اعلان ہوا کہ سوگ کا زمانہ ختم ہو گیا۔ پان، الائچی، خشک میوہ جات حاضرین دربار میں تقسیم ہوئے اور شام کو آتش بازی کے ایک دل کش مظاہرے نے، جمنا کے کنارے بلِ آگرہ کو سامان فرحت و نشاط فراہم کیا۔ دوسرے دن شہزادے شجاع، اورنگ زیب، مراد، معہ آصف خان و دیگر ممتاز امراء کے ساتھ دارا کے مکان پر مبارک باد و تحائف شادی پیش کرنے گئے۔ بعد ازاں ایک شاندار جلوس بنایا گیا۔ دارا ہاتھی پر سوار ہوا۔ درباری چمکدار پوشاک زیب تن کر کے پیچھے روانہ ہوئے، بعض گھوڑے پر تھے اور بعض پیدل۔ اس طرح نوشاہ دیوانِ عام تک پہنچایا گیا۔ یہاں شاہجہاں نے اپنے تحائف سے سرفراز کیا۔ ہندوستانی رسم کے لحاظ سے، موتیوں، زمرد اور لال کا سہرا سر پر باندھنے کی وہ رسم ادا کی گئی جو جہاں گیر نے شاہ جہاں کی شادی میں ادا کی تھی۔ شام کو ساحل جمنا پر شاندار چراغاں اور آتش بازی کے مظاہرے دعوت چشم و گوش کا سامان ثابت ہوئے۔

رقص و سرود و دیگر تفریحات کا سلسلہ رات کے ۲ بجے ۲ گھڑی تک چلتا رہا۔ یہ ساعت عقد کے لئے نیک تھی۔ وقت مقررہ پر شاہ جہاں نے قاضی محمد اسلم کو شاہ برج میں طلب کیا۔ اس نے حضور شاہ نکاح پڑھایا۔ پانچ لاکھ روپیہ مہر مقرر ہوا۔ عروس و نوشاہ پر سونے چاندی کے سکے نچھاور کئے گئے، لوٹنے کے لئے حاشیہ بردار اس طرح ٹوٹ پڑے کہ بعض بعض لوگ ٹکرا کے سر کے بل گر پڑے۔ دارا اور اس کی بیوی کی شادمانی کی دعاؤں سے فضا گونج اٹھی۔ شعرا نے قطعۂ تاریخ سنائے۔ یہ سلسلۂ جشن و نشاط اس وقت ختم ہوا جب شہنشاہ دارا کے گھر گیا۔ اس تقریب میں تیس لاکھ روپئے خرچ ہوئے۔ جس میں سے چھ لاکھ شاہی خزانے کا عطیہ تھا۔ ۱۶ لاکھ جہاں آرا بیگم اور بقیہ عروس کی ماں نے خرچ کئے۔

شجاع کی شادی

اس شادی کے فوراً بعد ہی شجاع کی بھی شادی اسی شان و

وشوکت سے رچائی گئی جس طرح اس کے بڑے بھائی دارا کی ہوئی تھی۔ اس کی شادی مرزا رستم صفوی کی لڑکی سے ۲۲ر فروری کو ہوئی۔ چار لاکھ روپئے مہر مقرر ہوا۔

اورنگ زیب کا ہاتھی سے لڑنا

دربار کی زندگی معمول پر آگئی۔ اگرچہ شاہجہاں کا زخم سوگ ابھی تک کافی تکلیف دہ تھا۔ لیکن غم غلط کرنے کے لئے اس نے زندگی کی دوسری دلچسپیوں میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ رقص و سرود اور کھیل کود اور اسی طرح کی دوسری تفریحات کی تجدید ہوئی۔ شہنشاہ نے ہر ایک میں دلچسپی سے حصّہ لیا۔ ۲۸ر مئی ۱۶۳۳ء کو اس نے دو ہاتھی لڑنے کے لئے جھروکہ درشن کے سامنے چھڑوائے۔ ایک ہاتھی کا نام سدھاکر اور دوسرے کا نام صورت سندر تھا۔ تھوڑی دیر دونوں گتھم گتھا ہو کر لڑتے رہے پھر الگ ہو گئے۔ جوش غیظ و غضب میں سدھاکر بے راہ ہو کر بجائے اپنے مقابل پر حملہ کرنے کے اورنگ زیب کی طرف بڑھا اس پر حملہ کر دیا۔ اورنگ زیب اس وقت مشکل سے ۱۴ سال کا تھا۔ مستقل مزاجی سے کھڑا رہا اپنے گھوڑے کو قابو رکھا۔ ہاتھی کے سر پر نیزہ مارا۔ ہاتھی واپس ہوا، پھر حملہ کیا اور اورنگ زیب کے گھوڑے کو گرا دیا۔ لیکن شہزادہ کود کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ تلوار کھینچ لی۔ غضبناک جانور کا مقابلہ کیا۔ دم کے دم میں شہزادہ شجاع اور راجہ جے سنگھ امداد کے لئے موقع پر پہنچ گئے۔ ہاتھی پر حملہ آور ہوتے۔ نیزوں کی بوچھار اور آتش بازی کے درمیان صورت سندر بھی دوبارہ مقابلہ کے لئے آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوفزدہ ہو کر سدھاکر بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہ جہاں نے گرم جوشی کے ساتھ شہزادہ کو گلے لگا لیا۔ دادِ شجاعت دی اور بہادر کے خطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ تین دن بعد اورنگ زیب کی پندرہویں[۱۲] سال گرہ کے موقع پر شہنشاہ نے اسے سونے میں تولایا۔ پانچ ہزار مہر اور ساتھ ہی ساتھ[۱۳] سدھاکر ہاتھی بھی انعام میں دیئے۔

اسی سال اگست میں شاہ جہاں علیل ہوا لیکن تین دن کے بعد اچھا ہو گیا۔[۱۴] دوسرے سال جنوری میں آگرہ سے کشمیر جنت ہند و[۱۵]ستان کی سیر کو روانہ ہوا۔ راستہ میں شہزادہ دارا سخت بیمار ہو گیا۔ خاندانی طبیب وزیر خان کو دار السلطنت سے علاج کے لئے طلب کیا گیا۔[۱۶] لاہور میں مختصر قیام کے بعد شہنشاہ نے سفر کشمیر پھر شروع کیا۔ منزل مقصود پر وہ ۵ر جون ۱۶۳۴ء کو پہنچا۔[۱۷] اس صوبہ کے حسن دلفریب نے شاہ جہاں کو مسحور کر لیا۔ اگرچہ اس کے پاس مصوروں کا کوئی عملہ نہ تھا کہ اس حسن خداداد کا مرقع تیار کرے لیکن اس کے دربار میں زبردست اہل قلم

موجودتھے انھوں نے کشمیر کی منظر کشی معتدلانہ زبان میں پیش کی۔ اگرچہ بلحاظ سیرت انداز بیان شاعرانہ ہے مگر صورت کے اعتبار سے نثر ہے[۱۵]۔

اس نے اوائل ستمبر میں[۱۶] کشمیر کو خیر باد کہا۔ نومبر ۱۶ ر کو لاہور پہنچا[۱۷]۔ یہاں دو مہینے تک قیام پذیر رہا۔ وہ دارالسلطنت کے لیے روانہ ہوا، شہزادہ مراد کے چیچک نکل آئی تھی اس لیے وزیر خان اور ساتی النسا[۱۸] خانم کی نگرانی میں اس کو چھوڑ کر ۱۶ ر جنوری ۱۶۳۵ء کو دارالسلطنت کے لیے چل پڑا۔ دہلی میں تھوڑے دن تک رک کر ۱۲ ر مارچ ۱۶۳۵ء کو آگرہ پہنچا[۱۹]۔

دکن کا سفر دوبارہ

آگرہ سے شہنشاہ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر جھجار سنگھ نے جاہ طلبی کا ارادہ کیا۔ دکن کی غیر اطمینانی صورت حال اور اس کی بغاوت سے مجبور ہو کر شاہ جہاں کو ستمبر کے اواخر میں آگرہ چھوڑنا پڑا۔ باری پہنچ کر اس نے راہ بدل دی اور بندیل کھنڈ چلا گیا[۲۰]۔ جنوری ۱۶۳۶ء کے اوائل میں اس نے نربدا پار کیا اور سیدھے دولت آباد کی طرف کوچ کر گیا۔ چھ ماہ کی شدید مشقت کے بعد صوبہ احمد نگر میں امن قائم کرنے اور بیجاپور و گول کنڈہ سے خاطر خواہ صلح کرنے میں وہ کامیاب ہوا[۲۱]۔ جولائی کے اوائل میں دکن سے روانہ ہوا۔ اجین اور مانڈو ہوتے ہوئے ۲۵ ر نومبر کو اجمیر پہنچا[۲۲]۔ یہاں ایک ہفتہ قیام رہا اس کے بعد آگرہ کا رخ کیا جہاں ۵ ر جنوری ۱۶۳۷ء کو پہنچا[۲۳]۔

اورنگ زیب کی شادی

مارچ میں شاہ جہاں بیمار ہوا لیکن ۱۹[۲۴] ر دن کے بعد اچھا ہو گیا۔ دوسرے مہینہ کے وسط میں اپنی شادی کے سلسلے میں شہزادہ اورنگ زیب دولت آباد سے آگرہ آیا۔ اس کی شادی دل آرا بیگم بنت شاہ نواز خان سے ہونے والی تھی۔ چنانچہ ۸ ر مئی ۱۶۳۷ء کو مروجہ شان و شوکت کے ساتھ شادی کے رسوم ادا کئے گئے[۲۵]۔

کابل کی پہلی سیاحت

فروری ۱۶۳۸ء میں علی مردان خان نے قندھار مغل افسران کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد سے ۱۵ سال تک شاہجہاں کی توجہ شمالی مغربی سرحد پر مرکوز رہی، پہلی بار وہ کابل[۲۶] کے لئے اگست ۱۶۳۸ء میں روانہ ہوا۔ یہاں جانے میں دو مقصد پیش نظر تھے ایک تو قندھار پر ایرانیوں کے مجوزہ حملوں کی روک تھام کرنا اور دوسرے ماوراء النہر کی صورت حال سے آگہی حاصل کرنا۔ ۱۸ ر مئی ۱۶۳۹ء کو شہنشاہ کابل پہنچا۔ تخمیناً چار مہینے قیام کے بعد ستمبر[۲۷] میں لاہور واپس آیا۔ یہاں سے کشمیر دوبارہ گیا۔

اب کی بار یہاں دو سال مسلسل قیام رہا۔ اسی زمانے میں آصف خان کا انتقال[35] ۱۱ر نومبر ۱۶۴۱ء کو ہوا۔ اور مراد کی شادی جولائی ۱۶۴۲ء میں رچائی گئی[36]، اوائل جنوری ۱۶۴۳ء میں دربار آگرہ[37] واپس آیا۔

جہاں آرا کا جلنا

چند دنوں کے لئے شاہ جہاں اجمیر[38] ضرور گیا لیکن بقیہ دو سال تک اس کا قیام لاہور ہی میں رہا، مارچ ۱۶۴۴ء میں جہاں آرا کے لباس میں آگ لگ گئی اور وہ بُری طرح جل گئی۔ اس حادثہ پر شاہ جہاں کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس کے علاج کے لئے بہترین اطبار کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ اس کے علاوہ اس نے حکم دیا کہ ایک ہزار روپیہ روزانہ بطور خیرات غربار و مساکین میں تقسیم کیا جائے۔ شہزادی چار ماہ تک بستر علالت پر رہی اس پوری مدت میں اس کی صحت یابی کی دعا مانگنے کا سلسلہ جاری رہا۔ شہزادگان اورنگ زیب اور مراد اپنے صوبہ جات سے بیمار بہن کی عیادت کو آئے۔ شفار کلی حاصل ہونے پر ۲۵ر نومبر کو ایک شاندار و گراں قدر دعوت دی گئی۔ شہزادہ اورنگ زیب سے شاہ جہاں ناراض تھا اس جشن کے اختتام پر اپنی بہن کی سفارش پر اورنگ زیب اپنے پہلے عہدہ اور[39] مراعات سے سرفراز ہوا۔

اسی زمانہ میں ایک دوسرا حادثہ میر بخشی صلابت[40] خان کا قتل کیا جانا ہے۔ اس کا قاتل راؤ امر سنگھ ولد راجہ گج سنگھ تھا، امر سنگھ علالت کی وجہ سے کچھ عرصہ تک دربار سے غیر حاضر تھا۔ ۲۶ر جولائی ۱۶۴۴ء کو وہ واپس آیا۔ صلابت خان اس کو دارا کے مکان پر لے گیا تاکہ شہنشاہ کے حضور میں اسے پیش کرے۔ جہاں آرا کی علالت کے سلسلے میں شاہ جہاں کا اس وقت قیام دارا کے یہاں تھا۔ امر سنگھ بائیں جانب کھڑا ہوا۔ شاہ جہاں، بعد نماز مغرب کسی افسر کو حکم لکھنے میں مشغول تھا۔ صلابت خان تخت کے داہنے طرف کی جگہ چھوڑ کر نیچے آگیا۔ کسی افسر سے باتیں کرنے لگا۔ یک بیک امر سنگھ خنجر نکال کر اس کی طرف دوڑا، صلابت خان کے بائیں جانب خنجر قبضہ تک اتار دیا۔ صلابت خان گرا اور اسی مقام پر مر گیا۔ اس ناجوانمردانہ اور بغیر اشتعال کے حملہ کو دیکھ کر خلیل اللہ خان اور ارجن ولد وٹھل داس نے امر سنگھ پر حملہ کیا۔ سید سالار اور چھ سات دوسرے منصبداروں اور عصابرداروں نے امر سنگھ کو گھیر کر قتل کر دیا۔ امر سنگھ کے دوست اور ماننے والوں نے ارجن سے انتقام لینے کی کوشش کی بعد میں محل کے قریب ہی ان لوگوں نے ایک لڑائی چھیڑ دی جس میں میر خان میر توزک اور ملوک چند مشرف مارے گئے۔ آخر میں سید خان جہاں اور رشید خان انصاری نے امر سنگھ

کے جتھے کے سرداروں پر حملہ کر کے ان کو تہ تیغ کر دیا۔

شاہ جہاں دیارِ مغرب میں

۱۶۴۵ء کے اوائل میں شاہ جہاں آگرہ[۴۱] سے روانہ ہوا۔ تین سال مغربی صوبہ جات میں صرف کئے۔ ۱۶۴۵ء کی گرمی[۴۲] میں کشمیر کی سیر کو گیا۔ بلخ اور بدخشاں کی مہمات کی نگرانی کے سلسلہ میں دو بار کابل گیا۔ بالآخر یہ محسوس ہوا کہ ہندوکش پہاڑ کے اُدھر قبضہ بحال رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے اس نے اپنی افواج واپس بلالیں۔ جون ۱۶۴۷ء کے آخری ہفتہ میں کابل سے[۴۳] روانہ ہوا۔ لاہور اور دلّی[۴۴] ہوتے ہوئے آگرہ پہنچا۔

نیا دار السلطنت

آگرہ آتے ہوئے اس نے دلّی کے افسروں کو حکم دیا کہ دلّی کی عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ تیزی سے مکمل کیا جائے[۴۵]۔ دو مہینے کے اندر ہی افسروں نے دہلی محل کو رہنے کے قابل بنا دیا اور شہنشاہ نے ۲۷ مارچ ۱۶۴۸ء[۴۶] کو آگرہ چھوڑ دیا۔ شاہجہاں کے تولے جانے کی قمری تاریخ ۸ اپریل کو تھی۔ اس کے پیشِ نظر نئے محل کی رسم افتتاح بھی اسی دن ادا کی گئی۔ اس رسم کو دلکش و پُر شوکت بنانے کی ہر امکانی کوشش کی گئی۔ سکندر لودی کے عہدِ حکومت سے مسلم سلطنت کا دار السلطنت آگرہ تھا۔ اب اس کی جگہ دہلی کو شاہ جہاں آباد سے موسوم کر کے دار السلطنت بنایا گیا۔ بظاہری شکل و صورت سے محسوس ہوتا تھا کہ ایک نیا عہد پیدا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دہلی کبھی کسی سلطنت کو راس نہیں آئی۔ توہم پرست کے نزدیک دار السلطنت کی تبدیلی مغلیہ سلطنت کے زوال کا پہلا قدم تھا۔

قندھار کا نکل جانا

مشکل سے چھ مہینے شاہ جہاں نئے دار السلطنت میں رہا ہوگا کہ نئے خطرے نے اسے مغرب آنے پر مجبور کر دیا۔ شاہ عباس ثانی نے قندھار پر حملہ کیا اور قبضہ بھی کر لیا۔ مغلیہ عسکری اعزاز کا مطالبہ تھا کہ اسے واپس لیا جائے۔ اسی لئے نومبر ۱۶۴۸ء کے اوائل میں شاہ جہاں کو دہلی چھوڑنا[۴۷] پڑی۔ ۱۸ ماہ تک باہر رہا۔ اضطراری انداز میں اس نے اپنے گمشدہ دنار کو واپس لانے کی کوشش کی۔ بہ نفس نفیس فوجوں کو رہنمائی کرتا رہا۔ لیکن کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ بالآخر اس نے کابل میں اپنا خیمہ منتقل کر لیا اور ۴ جنوری ۱۶۵۰ء کو نئے دار السلطنت[۴۸] واپس آیا۔

جشنِ عظیم

اپنی مایوسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے شاہ جہاں نے حکم دیا کہ شاہی دار السلطنت کے دہلی[۴۹] میں مکمل قیام کی خوشی میں عظیم الشان

جشن منایا جاتا ہے۔ ۱۶۴۸ء میں نئی عمارتیں اپنی آخری منزل تک نہ پہنچی تھیں۔ اب سلسلۂ تعمیر ختم ہو گیا تھا۔ تخت طاؤس آگرہ سے منگوایا گیا تھا۔ دیوان عام ان جشنِ عظیم پر شرکت کے لئے سجائے گئے تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے دہلی مسرت و شادمانی کا شہر ہو گیا۔ ہر قدم پر لوگ رقص و سرود کی مسرت حاصل کر رہے تھے۔ بادشاہ زندہ باد کی صداؤں سے آسمان گونج رہا تھا۔ ان ضیافتوں کا اختتام ۱۰ مارچ ۱۶۵۰ء کو ہوا۔

کشمیر کی آخری سیر

تقریباً ایک سال بعد فروری ۱۶۵۱ء میں شاہجہاں اپنی آخری سیر کشمیر کے لئے روانہ ہوا۔ آنے والا موسم گرما وہیں گزارا۔ ستمبر کے وسط میں لاہور واپس آیا۔ یہاں اس نے قندھار کی دوسری مہم کی تیاری کے سلسلے میں رہنمائی کی۔ ۱۴ فروری ۱۶۵۲ء کو لاہور[51] چھوڑ کر ۳۱ اپریل کو کابل[52] پہنچا اور ۲ دسمبر کو بڑی مایوسی کے ساتھ دہلی[53] واپس آگیا۔

شاہ جہاں دہلی میں رہتا ہے

آئندہ چار سال تک برابر شاہ جہاں دہلی میں قیام پذیر رہا۔ صرف دو بار مختصر وقفہ کے لئے باہر گیا۔ ایک بار آگرہ اور ایک بار اجمیر گیا۔ نومبر، دسمبر ۱۶۵۳ء میں موتی مسجد[54] دیکھنے گیا، اس کے بعد آنے والے سال کی جنوری میں ایک جس روپ مراٹھیا[55] نے شہنشاہ کی بھرے دربار میں جان لینے کی ناکام کوشش کی۔ تخت کے پہلے زینے تک وہ پہنچ گیا لیکن نوبت خان کوتوال نے قاتل کے سینے پر ایسا عصا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس نے دوسری بار اُٹھنے اور حملہ کرنے اور زینہ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن خواجہ رحمت اللہ نے تلوار سے اس پر حملہ کیا، کاٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ ان دونوں افسروں کی وفاداری و مستعدی پر انعام دیا گیا۔

سلیمان شکوہ کی شادی

اسی سال مارچ میں دارا کے خلف اکبر سلیمان شکوہ کی شادی راؤ امراؤ سنگھ کی لڑکی سے ہوئی۔ امراؤ سنگھ راجہ جے سنگھ کا بھانجا تھا۔ شہزادی ایک ماہ شادی سے پہلے دلی بلائی گئی۔ اس کو حرم میں غالباً اس لئے رکھا گیا کہ مغلیہ اداب و تہذیب سے آگاہ ہو جائے۔ اس کے بعد اسے مسلمان کر لیا گیا۔ تب شادی کی رسمیں ادا کی گئیں[56]۔

میواڑ کا جگت سنگھ

جب شاہ جہاں سلطنت کے دیگر امور میں مصروف تھا تو میواڑ کے رانا جگت سنگھ نے چتوڑ کے قلعے کی مرمت شروع کر دی۔ یہ

بات اس معاہدہ کے خلاف تھی جو جہانگیر اور رانا امر سنگھ کے مابین طے ہوا تھا۔ جگت سنگھ کا انتقال ۱۶۵۲ء میں ہوا۔ اس کی جگہ راج سنگھ مسند نشین ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو کے کام کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب یہ بات شہنشاہ کے گوش گزار کی گئی تو وہ رانا کی جسارت پر بڑا مشتعل ہوا۔ ۲۴ ستمبر ۱۶۵۴ء کو دہلی سے دو مقصد لے کر چلا۔ ایک تو اجمیر کی زیارت کا اور دوسرا راج سنگھ کو نیچا دکھانے کا۔ اجمیر سے اس نے سعد اللہ خان کو تیس ہزار فوج دے کر مرمت مسمار کرنے کے لئے روانہ کیا۔ شائستہ خان کو حکم ہوا کہ بشرط ضرورت میواڑ کے لئے مع اپنی فوج کے وہ تیار رہے۔ شہزادہ اورنگ زیب کو کہا گیا کہ وہ اپنے لڑکے سلطان محمد کو ایک ہزار فوج کے ساتھ مانڈسور بھیجدے۔ لیکن راج سنگھ نے اطاعت قبول کر لی اور چتوڑ مسمار کر دیا گیا۔[54]

شاہ جہاں اجمیر سے واپس آتا ہے

۱۴ نومبر ۱۶۵۴ء کو شہنشاہ اجمیر[55] سے رخصت ہو کر ایک مہینہ بعد فتح پور پہنچا۔ راہ سفر میں سلطان محمد کو حضوری کا شرف بخشا گیا۔[56] فتح پور میں تین دن قیام کرنے کے بعد شاہ جہاں آگرہ گیا جہاں صرف ایک دن ٹھہرا۔ اس موقع پر شہزادہ دارا و علی مراد خان نے پہلی بار موتی مسجد دیکھی۔ بادشاہ کشتی کے ذریعہ اپنی بیوی کا مقبرہ دیکھنے گیا۔ ۱۸ دسمبر کو وہ آگرہ سے روانہ ہو کر دس دن بعد دارالسلطنت پہنچا۔ ایک سال تک کوئی مخالف بات نہ ہوئی۔

دلی میں وبا

دسمبر ۱۶۵۶ء میں ایک وبا دلی میں نازل ہوئی۔ شاہ جہاں[57] اپنے دربار کے شکار کے لئے گنگا کنارے گڑھ مکتیسر گیا۔ وہاں سے ۳۱ جنوری ۱۶۵۷ء کو دارالسلطنت[58] واپس آیا۔ لیکن وبائی فضا برقرار تھی۔ وہ دہلی سے پھر ۶ فروری کو مخلص پور[59] چلا گیا۔ یہ مقام ساحل جمنا پر تخمیناً سو میل کے فاصلہ پر اتر کی طرف ہے۔ یہاں کی خنک آب وہوا کی وجہ سے شہنشاہ نے اسے گرمی کے لئے پناہ گاہ بنایا تھا۔ اپنے اور اپنے بڑے لڑکے کے لئے یہاں خوبصورت محلات بنوائے تھے۔ اس کا خوبصورت ام فیض آباد رکھ دیا تھا۔ یہاں اس نے اپنے عہد حکومت کے پہلے دور کے بخیر و خوبی ختم ہونے پر ایک عظیم دربار بھی کیا تھا۔

شاہ جہاں علیل

مخلص پور سے اپریل ۱۶۵۷ء کے خاتمہ پر شاہ جہاں دارالسلطنت واپس ہوا اور ۶ ستمبر کو دفعتاً بیمار ہو گیا۔ اس کو عسر البول و قبض کی شکایت ہو گئی۔ ایک ہفتہ تک شاہی طبیب علاج میں بیکار سر مارتے رہے۔ مرض بڑھتا ہی گیا۔ اس کے نیچے کے اعضا سوج گئے۔ تالو و زبان بہت خشک ہو گئے۔ اور کسی کسی وقت

بخار کی علامت ظاہر ہوتی۔ اس مدت علالت میں مریض نے نہ کوئی غذا کھائی نہ کوئی اور فرحت بخش چیز، دوا کا کوئی اثر نہ ہوا اس کی نقاہت وعلالت شدید ہوتی گئی۔ وہ مردانہ وار ان تکلیفوں کو برداشت کرتا رہا۔

وراثت کے سوال کی اہمیت

شہنشاہ کی شدت علالت کی خبر سے سلطنت میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی۔ افق پر سیاہ بادل جمع ہونے لگے۔ قدرتی طور پر جو سوال عام توجہ کا مرکز بنا وہ یہ تھا کہ اس کے بعد کون جانشین ہوگا؟ جب سے مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں شروع ہوئی اسی وقت سے اس مسئلہ کا فیصلہ زبان تیغ سے ہوا۔ اگرچہ بابر نے تخت وتاج کی وراثت کے مسئلہ کو خلف اکبری کے نظریہ سے حل کرنے کی کوشش کی لیکن مروجہ دستور کے تصادم نے اس کو زمین میں جڑ پکڑنے نہ دیا۔ خوب معلوم ہے کہ اس نے ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ لیکن کامران نے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور مرزا ہندال نے نو آگرہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہمایوں نے اپنے عہد میں اکبر کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ جب تک مرزا حکیم زندہ رہا اس نے برہمن کی شاہی نہ تسلیم کی۔ جب جہاں گیر تخت نشین ہوا تو اس کے لڑکے خسرو نے بادشاہ ہونے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ اس طرح مسلم ہندوستان میں حصول تاج وتخت کے لئے جنگ کا سوال بجائے استثنار ہونے کے ایک ضابطہ بن گیا۔

یہ لڑائی اتنی خوں ریز کیوں تھی؟

سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے کی کوئی جنگ وراثت اتنی خون ریز و زلزلہ خیز مغلیہ حکومت میں کیوں نہ ہوئی؟ وجہ کی تلاش میں دور نہیں جانا ہے۔ کسی اور زمانہ میں مدعیان وراثت کی طاقتیں اتنی متوازن نہ تھیں۔ کامران، ہندال، حکیم اور خسرو کسی کے پیچھے بڑی جماعت نہ تھی۔ لیکن شاہ جہاں کے چاروں لڑکوں میں ہر لڑکا بجائے خود حکمراں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیموریہ چنگیزی روایات کی سخت پابندی کے لحاظ سے ساری مغلیہ سلطنت مستقبل کے دعویٰ داروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

دارا

ولی عہد دارا الہ آباد، پنجاب اور ملتان ایسے زرخیز صوبہ جات پر بحیثیت نائب سلطان کارفرما تھا۔ اسی کو مفتخر خطاب شاہ بلند اقبال کا مل چکا تھا۔ اس کو عدیم المثال اعزاز چالیس ہزار سوار کا حاصل تھا۔ ایک طلائی کرسی پر تخت کے قریب

جلوہ افروز ہونے کا شرف بھی نصیب تھا۔ عہدہ و اعزاز کا ہر خواہشمند شہنشاہ کے لئے اس کے توسط کا حاجت مند ہوتا۔ مختصر یہ کہ ہر طرح لوگوں کو اس کا احساس دلایا گیا تھا کہ وہ مستقبل کا بادشاہ ہے اور شاہ جہاں کے بعد اس کو مالک تخت و تاج بنانے کی سہولت مہیا کی گئی تھی۔

اگرچہ دارا مذہبی امور میں وسیع الخیال تھا۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا وہ معتقد تھا لیکن متلون مزاج، مغرور، چڑچڑا اور بے عمل تھا۔ وہ خوشامد پسند تھا۔ اس کا دربار خوشامد خوروں کا اجتماع تھا۔ دربار کی زندگی اور شہنشاہ کی بے پناہ محبت نے اس کو برباد کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو انتظامی شعور اور حسبِ ضرورت تسخیر قلوب کے فن سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اس لئے مزاج و تربیت کے لحاظ سے وہ اس کا اہل نہ تھا کہ اس سخت آزمائش کا مقابلہ کر سکے، جو اب درپیش تھی۔[۵۵]

شجاع

دوسرا لڑکا شجاع بنگال کا ناظم تھا۔ وہ غیر معمولی ذہین، پاکیزہ مذاق اور دلکش مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن مستقل تعیش پسندی، بنگال کی سہل انتظامی اور اس کمزور کر دینے والے ملک کی سترہ سالہ سکونت نے اس کو کمزور، کاہل، لاپروا بنا دیا تھا۔ محنتِ شاقہ، صبر آزما جدوجہد، چوکس احتیاط۔ کے اہم امتزاج سے بے بہرہ کر دیا تھا۔ اس کا انتظام ڈھیلا ڈھالا تھا، اس کی فوج ناکارہ تھی، جملہ شعبہ جات کاہلی و آرام طلبی کے شکار تھے بنگال کی وبائی آب و ہوا نے اس کی صحت خراب کر دی تھی۔ یہاں تک کہ صرف ۴۱ سال کی عمر میں اپنے کو ضعیف و نحیف سمجھنے کا اسے احساس ہو گیا تھا حالانکہ اس کی ذہنی قوتیں اب بھی اتنا ہی پُرکار تھیں جتنی اس سے قبل تھیں۔ لیکن ان کو بروئے کار لانے کے لئے زبردست حادثات کی ضرورت تھی جو کبھی کبھی فوری و عارضی چمک کی طرح نمایاں ہوتے[۵۶]

اورنگ زیب

تیسرا لڑکا اورنگ زیب دکن میں نیابت سلطانی کر رہا تھا۔ وہ وہ اپنے تینوں بھائیوں سے مزاج و کردار کے لحاظ سے بالکل الگ تھا۔ وہ سنہری خوبیوں کا مالک تھا۔ سولہ سال کی عمر سے اس نے انتظامی مراحل و سرکاری مہمات کی دشوار گزار راہوں میں زندگی بسر کی۔ اس کی پر استقلال ہمت، غیر متزلزل عزم، اور غیر معمولی قوت برداشت، اعتقاد نہ سہی مگر خراج تحسین اپنے ہمعصروں سے حاصل کرتی رہیں۔ بلخ و قندھار میں، ملتان و گجرات میں، سندھ اور دکن میں ہر جگہ اس نے ثبوت دیا کہ وہ کتنی سخت دھات کا بنا ہوا ہے۔ وہ میدان جنگ میں اتنا ہی محتاط و ہوشیار جتنا پُرامن حکمرانی

ہیں۔ اگر چہ محبت سے زیادہ اس کا خوف دلوں میں تھا۔ مگر وہ انسان کے کردار کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ کر سکتا تھا۔ اس راز سے بخوبی واقف تھا کہ کیسے اور کہاں کس شخص کو استعمال کرے۔ ان ہی خصوصیات نے اس کو اس قابل بنایا کہ شکست کے پنجہ سے فتح چھین لے۔

مراد چوتھا لڑکا مراد، مالوہ اور گجرات میں نیابت سلطانی کر رہا تھا۔ اس کا کردار مجموعہ اضداد تھا۔ وہ بے باک دلیر تھا۔ لیکن عیش وعشرت کا بھی دلدادہ تھا۔ اس میں سپاہیانہ مستعدی اور حملہ آوری کی بھی صلاحیت تھی۔ لیکن کامیاب سپہ سالار کے جوہر نہ تھے۔ وہ پر جوش و غیر کاروباری ذہن کا مالک تھا لیکن خلیق بھی تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا خالی الذہن نوجوان تھا جو حصول تخت وتاج کے جذبے سے سرشار تھا۔ لیکن وہ جوڑ توڑ اور احتیاط کا ایسا آدمی نہ تھا جو غور وفکر سے سوچے سمجھے منصوبوں کی تخلیق وتکمیل کر سکے۔

دوسرے تین بھائیوں کا دارا کے خلاف اتحاد

تینوں بھائیوں جو اس قدر کردار میں الگ تھے ان کا ایک رشتہ اتحاد بھی تھا اور وہ دارا کی مخالفت کا مشترک جذبہ رشک وحسد تھا۔ محمد امین مصنف ظفر نامہ لکھتا ہے کہ قندھار کی دوسری مہم کی ناکامی کے بعد شجاع و اورنگ اپنے اپنے صوبجات جاتے ہوتے ایک ساتھ دہلی آئے۔ جہاں ۶ دن رک کر انھوں نے اپنا رشتہ ارتباط مضبوط کیا۔ شجاع اورنگ زیب کے گھر گیا تین دن تک وہاں رہا اور اسی طرح اورنگ زیب نے تین دن تک بڑے بھائی کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے علاوہ شجاع نے اپنی لڑکی سلطان محمد سے منسوب کی اور اورنگ زیب نے اپنی لڑکی کی نسبت زین العابدین[۲۳] سے کر دی۔

خط وکتابت شہنشاہ کی پُر خطر علالت کی اطلاع ملنے پر اورنگ زیب، شجاع اور مراد میں مراسلات کا باہمی سلسلہ تیزی سے شروع ہوا۔ جلدی جلدی خطوط کی آمد ورفت کے لئے مناسب مقامات پر گجرات اور بنگال کے درمیان دکن اور اڑیسہ[۲۴] کے راستوں پر چوکیاں بٹھادی گئیں۔ ان میں سے بعض خطوط جو تلف ہونے سے بچ کر ہم تک پہنچے ہیں ان میں ایسی چونکا دینے والی کہانیاں ہیں جن سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے دادا کا تختہ الٹنے کے لیے کیا کیا منصوبے تیار کئے تھے۔ یہ بات صاف ہے کہ شجاع کا بنگال سے قدم بڑھانا اور مراد اور اورنگ زیب کا دکن سے روانہ ہونا ایک باہمی پیش رفت مصالحت کے تحت تھا جس کی روشنی میں انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ سب آگرہ کے قریب ملیں[۲۵] گے۔

اورنگ زیب کی مصنوعی فکرمندی

ان مراسلات کے مطالعہ سے ایک دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اورنگ زیب التماس و احترام کے ساتھ اپنے دونوں بھائیوں کو مخاطب کرتا تھا۔ اورنگ زیب اور مراد دونوں شجاع کو القاب میں لکھتے ہیں کہ "بھائی جیو" اور اورنگ زیب، شجاع کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ تینوں بھائیوں کے دربار میں دوسرے دو بھائیوں کے نمائندے ہونے چاہئے تاکہ یکجہتی میں سہولت اور اتحاد میں پختگی ہوتی رہے[۹۹]۔ دوسرے خط میں اس نے شجاع کو لکھا کہ اگر دشمن ہم میں سے صرف ایک پر حملہ کرے تو دوسرے دو بھائی بچانے کی کوشش کریں۔ بالآخر مہم شروع ہونے سے پہلے ہی اورنگ زیب نے شجاع کو ہوشیار کیا کہ وہ دارا کے خوشامدانہ اور مصالحت پسندانہ ہدیہ سے دھوکا نہ کھائے۔

اورنگ زیب اور مراد کی خط و کتابت

دلچسپی کے لحاظ سے مراد اور اورنگ زیب کے باہمی خطوط بھی مذکورہ بالا مراسلات کے ہم پایہ ہیں۔ غالباً اس کے پہلے خطوط میں سے ایک ایسا خط ہے جس میں مراد نے اورنگ زیب سے شکایت کی ہے کہ آپ نے بیجاپور کی جنگ کے کامیاب خاتمہ کا حال مجھے نہیں لکھا۔ اس کوتاہی کی وجہ غالباً آپ کی معروفیت ہے۔ ورنہ آج کے حالات میں مراسلات کی تاخیر نامناسب ہے چونکہ ہمارے معاہدے کی ایک شرط باہمی خبر رسانی ہے۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ روحانی و دنیاوی ذرائع سے جو کچھ آپ کو علم ہوا ہو اس سے مجھے بھی آگاہی بخشئے۔ نیز یہ بھی میں عرض کردوں تاکہ "بھائی جیو" کو بنگالہ میں بھی کچھ لکھئے۔ اورنگ زیب نے مراد کو لکھا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ انتظام تبادلہ و تقرر میں دشمن کا اثر ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب وہ خزانہ فراہم کرنے اور ایک فوج تیار کرنے کی فکر میں ہے ...... اس وقت ہم کو بڑی احتیاط سے کام کرنا ہے اور اپنے خطوط میں کوئی نامناسب بات نہ لکھنی چاہئے۔" اس کے بعد فوراً ہی اورنگ زیب اور مراد میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ شرط تھی کہ دارا پر فتح حاصل ہونے کے بعد مراد کو سلطنت کا مغربی علاقہ دیا جائے گا۔

اورنگ زیب کا اصل مقصد

اورنگ زیب کا یہ کہنا کہ دارا سے جنگ کرنے کا اصل مقصد شہنشاہ کو اس کے پنجہ سے آزاد کرانا محض ایک فریب ایک بہانہ تھا۔ ابتدا ہی سے اپنے لئے تخت و تاج حاصل کرنے کی تدبیر وہ کر رہا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا باپ اب سلطنت کے انتظام کرنے کے قابل نہیں رہا۔

شجاع اور مراد بالخصوص آخر الذکر سے اس کے وعدے کہاں تک صداقت پر مبنی تھے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے لیکن بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ریاکاری و دورنگی سے کام لے رہا تھا۔ ہم کو اس کی دُور رسی کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر مغربی صوبہ جات مراد کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ایک دوست سے زیادہ حریف ثابت ہوگا۔ کیا یہ مان لینا ممکن ہے کہ اس کو ان مہلک نتائج کا علم نہ تھا جو اس طرح کے اقدام میں اس کے جدِ امجد ہمایوں کو بھگتنے پڑے ؟ مصلحت اندیشی نے مراد سے معاملہ کرنے پر مائل کیا تھا اور جب ایک بار طوفان ختم ہو گیا تو اورنگ زیب نے اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ یہ اقدام اخلاق و نیک نیتی کے نقطۂ نظر سے قابلِ ملامت ہو لیکن اورنگ زیب فلسفی کی حیثیت سے کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی نظر بادشاہت پر تھی۔

دارا اپنی جگہ مضبوطی کرتا ہے

ابھی علالت کے پہلے ہفتہ بعد شاہ جہاں نے دارا کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ افسروں کو حکم دیا کہ دارا کو اپنا بادشاہ سمجھ کر ہر وقت، ہر جگہ، ہر بات میں اطاعت کریں۔ فطری بات تھی کہ اب دارا اپنے استحکام کی فکر کرے۔ کبھی کبھی کوئی کوشش اس لیے ناتمام رہ جاتی تھی کہ اہم معاملات میں شاہجہاں کی رضامندی درکار ہوتی اور کبھی اپنی قوتِ فیصلہ کی غلطی سے بھی بات خراب ہو جاتی۔ اس کے غور و فکر کی پہلی علامت ان احکام میں ملتی ہے جو اس نے میر جملہ، مہابت خان اور دوسرے شاہی افسروں کو دیئے۔ اس نے ان لوگوں کو لکھا کہ جو افواج کمک کے لئے تم لوگ بیجاپور لے گئے تھے وہ سب لے کر دکن سے واپس آؤ۔ بعد میں اس کی خواہش کے پیشِ نظر شہنشاہ نے اس کے افسروں اور دوستوں کو بلند درجات پر ترقی دی۔ چنانچہ خلیل اللہ خان کو دہلی کی صوبہ داری اور قاسم خان کو گجرات[۱] کی نظامت کا لالچ دیا گیا۔

حریفوں میں بیداری

صوبہ جاتی انتظام کا مجوزہ ردّ و بدل دوسرے شہزادوں کی زبردست ہلچل کا سبب ہو گیا۔ دارا کو بہار کا دیا جانا اس تبدیلی کا پہلا قدم تھا۔ افواہ پھیل گئی کہ مراد سے مالوہ لے لیا جائے گا اور اورنگ زیب سے برار[۲]۔ ان باتوں کے پیشِ نظر اب وہ مناسب وقت آ گیا تھا کہ لڑائی شروع کر دی جائے۔

آج ایک ہلچل مچی ہے سارے ہندوستان میں
شاہجہاں کے چاروں بیٹے لڑ گئے میدان میں

بھائیوں میں جنگ ہے نظریں ہیں تخت و تاج پر
اور قسمت دیتی ہے آواز اس طوفان میں

کس میں دم ہے فتح کا پرچم اٹھانے کے لئے؟ — سورما ہے کون؟ شاہی کس کے ہے امکان میں

مراد آزادی کا اعلان کرتا ہے

اگرچہ وسط نومبر ۱۶۵۷ء تک شاہ جہاں بالکل صحت یاب ہو چکا تھا لیکن دکن اور بنگال میں دارا کی تیاری کی افواہوں نے ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچائے۔ مراد نے اپنے دیوان علی نقی کو (ابتدائے اکتوبر میں) قتل کر دیا۔ سورت لوٹ لیا (ابتدائے نومبر میں) بالآخر اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان[26] ۵ دسمبر کو کر دیا۔ دارا نے پہلے اسے ایک ایسا خط بھیجا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ شہنشاہ کا فیصلہ ہے۔ لکھا کہ تم کو گجرات سے برار منتقل کیا جاتا ہے۔ اس اقدام سے دارا کا یہ منشا تھا کہ اس کا ایک دشمن دوسرے دشمن کا مخالف ہو جائے گا۔ اس لئے کہ برار اورنگ زیب کے زیر تصرف تھا۔ مراد نے اس منصوبہ پر غور کیا۔ تحقیر آمیز ہنسی کے ساتھ اس حکم پر نظر ڈالی۔ نہ وہ گجرات سے منتقل ہوا نہ اورنگ زیب کے خلاف کچھ کیا۔[27] شجاع نے بھی اسی طرح بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

شاہ جہاں فوجیں بھیجتا ہے

جب دو شہزادوں کی نقل و حرکت کی اطلاع شاہ جہاں کو دی گئی تو وہ اس پر تیار ہوا کہ ان کی سرکوبی کے لئے فوجیں بھیجی جائیں۔ دو فوجیں مالوہ بھیجی گئیں ایک قاسم خان کی قیادت میں تاکہ مراد کو گجرات کی نظامت سے برخاست کیا جائے، اور دوسری فوج جسونت سنگھ کی قیادت میں جو اورنگ زیب کے بڑھتے قدم کو دکن میں روک دے۔ شائستہ خان پر بجا شبہ تھا کہ وہ اورنگ زیب کی ساز باز میں پوری طرح شریک تھا۔ اس لئے اس کو مالوہ سے واپس بلا لیا گیا۔ اس اثنا میں مراد اور اورنگ زیب نے شمال کی طرف بڑھنے کا منصوبہ طے کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اوقات و منازل کا بھی تصفیہ ہو گیا تھا کہ کب اور کہاں ملا جائے گا۔[28]

اورنگ زیب میر جملہ کو قید کرتا ہے

شاہی احکام کی تعمیل میں میر جملہ دربار آ رہا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے قید کر لیا۔ اس کو قید کرنے کے بعد اورنگ زیب ۲۰ مارچ ۱۶۵۸ء کو برہان پور سے روانہ ہوا۔ ۳ اپریل کو اس نے دریائے نربدا پار کیا، ۱۱ دن کے بعد مراد سے ملاقات ہوئی۔ اس درمیان میں جسونت سنگھ اور قاسم خان اجین پہنچے، دونوں شہزادوں کی نقل و حرکت کا پتہ نہ ملا تھا۔ اس لئے حالات کے مطالعہ کے لئے یہ لوگ یہاں رُکے رہے۔ یہاں ایک برہمن کوئی رائے اورنگ زیب کا خط لے کر جسونت سنگھ کے پاس آیا۔ اورنگ زیب نے لکھا کہ وہ مخالفت ترک کر کے خاموشی سے

جودھپور چلا جائے لیکن جسونت سنگھ نے شہنشاہ کے احکام بجالانے پر اصرار کیا۔ شہزادے کی تجویز رد کر کے جنگ کی تیاری کی۔ مخالف افواج میں ایک زبردست خونریز جنگ دھرمت میں ہوئی۔ یہاں راجپوتوں نے حسبِ معمول اپنی دلیری سے کام لیا۔ شکست کی ذلت کے مقابلہ میں جان دینا بہتر سمجھا۔ دورانِ جنگ ایک بار یہ محسوس ہوا کہ اورنگ زیب کو شمال کی طرف بڑھنے میں ندامت کا سامنا ہونے والا ہے۔ مگر اس نے اپنے آدمیوں کو یورش کے لئے آمادہ کر کے حملہ آور راجپوتوں پر ایسا دھاوا کیا کہ شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔ جسونت سنگھ زخم خوردہ جودھپور پہنچا۔ مسلمان آگرہ واپس[۸۹] آئے۔

دھرمت کی معنی خیزی

دھرمت کی لڑائی فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی۔ کئی جنگوں کے سورما نے دنیا کا سامنا صرف خسارہ کے ساتھ نہیں کیا بلکہ ہندوستان میں اپنی فوجی شہرت کے ناقابلِ مقابلہ ہونے کا بھی سکہ بٹھا دیا۔ پس و پیش کرنے والوں کو اب یکسو ہونے میں دیر نہ لگی۔ "بغیر ایک لمحہ کے تامل کے وہ سمجھ گئے کہ چاروں بھائیوں میں کون ظفر و فتح کا منتخب ہوتا ہے" میدانِ جنگ ہی میں اورنگ زیب کے لئے زمین و زماں سے مبارک باد کی صدائیں گونجیں"۔ یہ تحریر اس کے ملازم کی قابلِ عفو مبالغہ کے ساتھ قلم بند[۹۰] ہے۔

نومبر ۱۶۵۷ء سے شاہ جہاں آگرہ ہی میں قیام پذیر تھا۔ اس کی حالیہ علالت نے اسے کمزوری و گرمی سے تاثر پذیر بنا دیا تھا۔ اپنے اطباء کے مشورے پر وہ آگرہ سے ۱۱ر اپریل ۱۶۵۸ء کو روانہ ہو کر بلوچ پور پہنچا۔ یہاں اس نے دھرمت کی شکست کی خبر سنی۔ دارا نے باپ سے آگرہ واپس آنے کا اصرار کیا تاکہ باغی شہزادوں سے لڑنے کے لئے وہ ایک نئی فوج مرتب کر سکے۔ اس درمیان میں کچھ کمزور کوششیں مصالحت کے لئے ہوئیں۔ جہاں آرا نے اورنگ زیب کو خط لکھ کر یقین دلایا کہ دراصل سلطنت کے سارے معاملات شہنشاہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ نیز یہ کہ وہ بجز نماز کے اوقات کے سارا وقت رعایا کے فلاح و بہبود کی دیکھ بھال اور مذہب کی اشاعت میں صرف کرتے ہیں۔ اس نے اس کی غیر محتاط بے باکی سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اصول عقلی و دور اندیشی کے خلاف ہے کہ عمر میں سب سے بڑے شہزادے سے جنگ کی جائے۔ تم کو راہ وفاداری و فرمانبرداری پر قدم رکھنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ اسی مقام پر رک جاؤ جہاں پہنچ گئے ہو۔ دونوں طرف مسلمانوں کی جان بچانے کے خیال سے اپنی عرضداشت حضور شاہ[۹۱] پیش کرو۔ لیکن یہ مشورہ قابلِ سماعت نہ ہوا۔

اورنگ زیب شہنشاہ کو لکھتا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں نے بھی ایک ایسا ہی خط اورنگ زیب کو لکھا جس میں اس راہ سے الگ

ہونے کی تاکید کی جو اورنگ زیب نے اختیار کی تھی۔ لیکن اورنگ نے جواب دیا۔ آپ کا اب کوئی تعلق سیاسی یا مالی امور پر نہیں۔ یہ اختیار سب سے بڑے شہزادے نے غصب کر لیا ہے۔ اس نے ہمیشہ میری دل آزاری کی۔ میری منفعت کے سب دروازے اس نے بند کر دیئے۔ اس نے چاہا تھا کہ دکن کی مالیات کی آمدنی کم کر دے تاکہ میری فوج برباد ہو جائے۔ میں نے محنت شاقہ سے کام لے کر اہل بیجاپور کو اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ یا تو وہ خاطر خواہ محصول دیتے یا ان کا علاقہ تباہ ہو جاتا۔ لیکن بڑے شہزادے نے قاصدوں کو بھیج کر فوج کی واپسی کا حکم اس امید کے ساتھ جاری کر دیا کہ اہل بیجاپور معاملہ کر لیں گے لیکن یہ رویہ ان لوگوں کو بہت افزا محسوس ہوا چنانچہ انھوں نے بڑی شورش برپا کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اگر خدا نخواستہ شاہی فوج اس دیار غیر میں کسی مصیبت میں پڑ گئی ہوتی تو ہماری رسوائی تمام دنیا میں پھیل جاتی۔ اپنی عظمت و شہرت کا دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ لیکن بفضلہٖ میں اس دیار سے صحیح و سلامت واپس آیا۔ مزید برآں اتنے ہی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے آپ کو میرے خلاف کر دیا۔ یہ سمجھ کر کہ آپ مجھے خاطر میں نہیں لاتے۔ اس نے اکسایا کہ آپ میری جاگیر برار سے منتقل کر دیں اور جسونت سنگھ کو ایک زبردست فوج دے کر میرا محدود علاقہ مجھ سے لے لیں۔ میرے قبضہ میں ایک بالشت زمین بھی نہ رہنے دیں۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب سیاسی معاملات آپ کے قابو سے باہر ہیں اور اس کی تجویز پر آپ دوسرے لڑکوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسی پر فرمان جاری کر دیتے ہیں تو اپنی خودداری محفوظ رکھنے کے لئے میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بیان کرنے کا تصفیہ کیا۔ میری راہ میں جسونت سنگھ حائل ہو گیا میں نے اس کو شکست فاش دی۔ اب میں نے سنا ہے کہ شاہ بلند اقبال مجھ سے لڑنے دھول پور آئے ہیں چونکہ وہ میرے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کے حق میں بہتر ہو گا کہ اپنی جاگیر میں پنجاب چلے جائیں اور آپ کی خدمات میرے سپرد کر دیں۔

حلیفوں کا چنبل پار کرنا

یہ خط صاف صاف اورنگ زیب کی اس زہر آلود نفرت کے اسباب کی صاف صاف تشریح کرتا ہے جو اس کے دل میں دارا سے تھی۔ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ کس قدر وہ اس عصائے شاہی کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہشمند تھا جو اس کے باپ کے ہاتھوں سے گر رہا تھا۔ اورنگ زیب اور مراد اجین سے کوچ کر کے

تو الیا پیچھے دیکھا کہ دارا کے تعینات کردہ لوگوں نے چنبل کا راستہ بند کر دیا ہے۔ ایک بندیلا سردار چمپت رائے کی مدد سے اس نے ایک غیر معروف پایاب مقام بھداوار سے دریا پار کیا۔ اس کارروائی کے پیشِ نظر دارا پیچھے ہٹ آیا اس نے اپنی فوج ساموگڑھ میں کھڑی کی۔ صبح سے دوپہر تک۔ ایک ایسی سخت جنگ کے بعد دارا، ہار کر آگرہ بھاگ گیا۔ اس طرح اورنگ زیب کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ دہلی کا تاج اس کی گرفت میں آگیا۔

دارا کا فرار ہونا

ساموگڑھ سے بھاگنے کے بعد دارا کی ہمت آگرہ میں بھی رُکنے کی نہ ہوئی۔ وہ سیدھے دہلی گیا تاکہ ایک تازہ دم فوج جمع کر کے فتح یاب بھائیوں سے لڑے۔ اس اثنا میں مراد اور اورنگ زیب کچھ آرام کرنے کے خیال سے میدان جنگ میں رُکے رہے۔

مراد کا پچھتانا

دھرمت کی جنگ کے فوراً بعد مراد کو محسوس ہوا کہ شہنشاہ کے انتقال کے بارے میں اس کا خیال بے بنیاد تھا۔ اس احساس کے اس نے فوراً بعد ایک خط بڑے منفعل انداز میں لکھا کہ ”میرے دل میں بجز آپ کی اطاعت و عزت کے کوئی اور جذبہ نہیں لیکن غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ آپ کے متعلق بُری خبر سُن کر میں نے کچھ قصور بھی کئے اس کا مجھے بیحد ملال ہے۔ آپ کی علالت کے زمانے میں“ دادا بھائی جیو نے آپ کی مرضی کے خلاف ہمارے اور ہمارے دربار کے وکیل کے درمیان سلسلۂ خط و کتابت بند کرا دیا۔ بالخصوص میرے خطوط آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو روک دیا۔ ایسی حالت میں میں جواب کی کیا امید کر سکتا تھا؟ نظر ثانی میں اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے حاضر خدمت ہونا چاہتا تھا اس لئے حاضر دربار ہونے کے لئے روانہ ہوا۔ اجمیر کے راستے سے میں نے آنا اس لئے پسند نہ کیا کہ وہاں پانی کی قلت ہے۔ اس لئے میں مالوہ ہو کر آرہا تھا۔ یہاں اورنگ زیب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی سلام کرنے حاضر ہو رہے تھے۔ جسونت سنگھ نے ہمارا راستہ بند کر دیا۔ ہم نے اس کو شکست[۵۹] دی۔“ اس کے بعد کے ایک خط میں بھی مراد نے بڑی منت و عاجزی سے عفو و تقصیر کی باپ سے درخواست کی ہے۔

مراد کے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اسے تخت نشین ہونے کی ہوس تھی مگر باپ کی زندگی میں اس اقدام کے خلاف تھا۔ اس نے گجرات میں اپنی بادشاہی کا اعلان اس لئے کیا کہ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اسی لئے وہ اورنگ زیب و شجاع

کو یقین دلاتا رہا کہ وہ حق بجانب ہے۔ آخر الذکر کو ایک خط میں لکھتا ہے "ایک عرصہ تک مجھے یقین رہا کہ شہنشاہ کا انتقال ہو گیا ہے لیکن بھائی اورنگ زیب کو باور کرنے میں اب تک تکلف ہے مجھے اس کی رہنمائی پر اعتماد نہیں ہے" اس طرح مراد کردار کا سچا تھا۔ وراثت کی جنگ میں اس کا شریک ہونا اس کے اضطراری مزاج کی وجہ سے تھا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو اپنے باپ پر ندامت و ذلت کا اتنا انبار نہ کرتا جتنا اس کے بڑے بھائی نے کیا۔

شاہ جہاں کی آخری کوشش

جب آگرہ کے قرب وجوار میں مراد و اورنگ زیب داخل ہو گئے تو شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو خط لکھا کہ تمہارے دیکھنے کو بہت ہی جی چاہتا ہے تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔ اورنگ زیب نے نہایت مؤدبانہ جواب دیا کہ میں ساعت نیک کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد باپ اور بیٹے میں مزید خط و کتابت ہوئی۔ ایک بار تو جہاں آرا اورنگ زیب کے پاس باپ کا پیغام لے کر گئی۔ اس نے بتایا کہ شہنشاہ تم کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا چاہتے ہیں اور دارا کو پنجاب و مغربی سرحدی علاقہ میں مخصوص کر دینا چاہتے ہیں۔ دکن معظم کو، گجرات مراد کو اور بنگال شجاع کو دے دینے کا خیال ہے۔ لیکن اورنگ زیب نے جواب دیا کہ جب تک وہ پوری طرح دارا سے نپٹ نہ لے گا وہ شہنشاہ کے دیدار کے لئے نہ جائے گا۔ جہاں آرا مایوس ہو کر واپس چلی آئی۔[۸۸]

اورنگ زیب واقعی نہایت چالاک تھا۔ اس نے اس صورت حال کا پورا اندازہ کر لیا تھا جو اس کی راہ میں آسکتی ہے جب تک دارا کے قبضے میں ایک شمہ بھی حکومت کا باقی رہتا ہے کیسے وہ امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے؟ لیکن شہنشاہ سے اس کی سرد مہری نتیجہ تھی خلیل اللہ خان کے پیدا کردہ شبہات کا۔ اس نے اس کو باپ کے معاندانہ ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔[۸۹] بایں ہمہ اورنگ زیب کا دل پسیج گیا۔ باپ کی ملاقات کے لئے وہ "دہرآرا باغ" سے روانہ ہوا لیکن شائستہ خان اور شیخ میر نے روک لیا۔ اس کے فوراً بعد ہی دارا کے نام شاہ جہاں کا ایک فرمان لے کر "ناہردل" چلا گیا۔ اس فرمان میں دارا کو دہلی میں رُکے رہنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ وہ (شاہ جہاں) دشمنوں کو ایک قلیل مدت میں سزا دے۔ اس تحریر نے قطعی طور پر شاہ جہاں کی دو عملی کا راز فاش کر دیا۔ اورنگ زیب نے فیصلہ کیا کہ وہ ملاقات کے لئے نہ جائے گا۔ آگرہ کا قلعہ اس سے پہلے ہی اس کے قبضے میں آگیا تھا اس لئے اس کے بعد شاہ جہاں اس میں قیدی کی حیثیت سے رہا۔[۹۰]

دارا کی سرگرمی

آگرہ سے دارا کے فرار ہونے کے بعد سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ یہ ہے کہ اورنگ زیب سے اتنا ڈر گیا تھا کہ وہ دہلی میں بھی نہ رکا بلکہ لاہور چلا گیا۔ دریائے بیاس کو اپنے اور دشمنوں کی رفتار بندی کے لئے حدِ فاصل بنایا۔ اس درمیان میں اورنگ زیب آگرہ سے روانہ ہوا اور متھرا کے قریب عیاری سے مراد کو قید کر لیا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھا۔ دہلی پہنچا یہاں بھی زیادہ نہ رُکا۔ اس نے دارا کی فوج میں اختلاف کا بیج بویا۔ اس کے وفادار سپہ سالار داؤد خان سے اسے بدظن کر دیا۔ دارا لاہور سے بھاگ کر ملتان اور سندھ پہنچا۔ اورنگ کے افسر اس کا تعاقب بڑی بُری طرح کر رہے تھے۔ سندھ سے کچ ہوتا ہوا گجرات میں داخل ہوا۔ یہاں ناظم گجرات نے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں اس کو جسونت سنگھ کی گفتگوئے صلح کی مدد ملی۔ اس لئے وہ اجمیر کی طرف چل پڑا۔ لیکن جسونت سنگھ نے پہلو بدلا اور دارا کو دیورائی میں اورنگ زیب کے افسروں سے ایک زور دار جنگ لڑنی پڑی۔ وہ ہار گیا اور احمد آباد بھاگ گیا۔ جہاں کے صوبہ دار نے اس پر دروازہ بند کر دیا۔ وہ سندھ واپس آیا اس خیال سے کہ ایران میں پناہ لے۔ وہاں راستے میں اس کے میزبان ملک جیون زمیندار دادر نے فریب دے کر اسے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ دارا کو دہلی پہنچایا گیا۔ یہاں شہر میں تشہیر کرنے کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔

شجاع کی نقل و حرکت

اب تک شجاع کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے۔ مراد کی طرح اس نے بھی بنگال میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا تینوں بھائیوں کے پیش رفت منصوبہ کے تحت وہ پٹنہ کی طرف بڑھا۔ یہ شہر جلد ہی اس کے ہاتھ آگیا۔ جب اس کے آگے بڑھنے کی خبر شاہ جہاں کو ملی تو دارا کی اس تجویز سے وہ متفق ہوا کہ جے سنگھ اور سلیمان شکوہ کو اس کے مقابلہ میں بھیجا جائے۔ شجاع کو بہادر پور میں شکست ہوئی بہ مقام بنارس سے شمال و مشرق کی طرف ۵ میل کے فاصلہ پر تھا۔ ہارنے کے بعد وہ بنگال بھاگ گیا۔ فتح یاب سلیمان شکوہ اس کا پیچھا کرتا رہا۔ لیکن باپ کی ایک فوری طلب پر اپنے کو مجبور دیکھ کر اس نے شجاع سے صلح کر لی (ابتدائے مئی ۱۶۵۸ء) اس کے باپ نے اس لئے واپس بلایا تھا کہ مراد اور اورنگ زیب سے اس کو لڑنا تھا۔ لیکن اب تک اورنگ زیب لڑ کر کامیاب ہو چکا تھا۔ دہلی سے اس نے شجاع کو ایک محبت آمیز خط لکھا۔ لیکن پنجاب میں اورنگ زیب کی عدم موجودگی سے آگرہ پر قبضہ، شاہ جہاں کی حفاظت اور پرانی حکومت کو بحال کرنے کا حوصلہ

شجاع کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ مگر اس کی ریشہ دوانیاں خاک میں مل گئیں۔ اس نے اورنگ زیب کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔ اواخر اکتوبر ۱۶۵۸ء میں وہ ایک زبردست فوج لے کر چلا۔ بغیر کسی مخالفت کے روہتاس، چنار اور بنارس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن فوراً ہی اورنگ زیب اس سے لڑنے آ گیا۔ کھوا میں اس کو شکست دی۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ معظم خان اور شہزادہ سلطان محمد نے اس کا پیچھا کیا۔ اسے بنگال سے باہر نکال کر ارکان کے کسی غیر معروف مقام پر بیکسی کی موت مرنے پر مجبور کیا۔

سلیمان شکوہ کا حشر

جنگ وراثت کی داستان کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک مختصر حوالہ سلیمان شکوہ کے انجام کا بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اس کے باپ کی مصیبت سن کر جسونت سنگھ اور بعدہ دلیر خان نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ بھاگ کر ہردوار گیا۔ وہاں سے پار کر کے گڑھوال پہنچا۔ یہاں پرتھوی سنگھ راجا سری نگر، نے اسے پناہ دی۔ لیکن میزبان نے بعد میں اس کو اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ اورنگ زیب نے گوالیار کے قلعہ میں اس کو زہر دے کر ختم کر دیا۔ اسی قلعہ میں اس کا چچا مراد بھی رہتا تھا۔ علی نقی کے قتل کرنے کا الزام لگا کر مراد کو بھی تہ تیغ کرا دیا۔

شاہ جہاں سخت نگرانی میں ایک قیدی

آئندہ ساڑھے سات سال تک آگرہ کے قلعہ میں شاہ نے سخت نگرانی میں ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کی۔ ابتدا میں تو اس نے حالات سے سمجھوتہ نہ کیا۔ دارا کو برابر خط لکھتا رہا۔ اپنے لازوال محبت، امداد اور نصیحت سے سرفراز کرتا رہا بلکہ ایک بار اس نے آخری کوشش بھی اپنی رہائی کی کی۔ جب شجاع پٹنہ سے آگے بڑھ کر آگرہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تو بوڑھے شہنشاہ نے اس کو خط لکھے اس کی مہم کی کامیابی پر نزول برکت کی دعا کی۔ جملہ وفادار رعایا کو آواز دی کہ مجھکو رہا کرانے والے کے ارد گرد جمع ہو جاؤ۔ لیکن اس کی کوشش ناکامیاب ہوئی۔ نتیجہ بُرا ہوا۔ اس کی اسیری کی بندشیں اور بڑھا دی گئیں۔ اس سے بات چیت کرنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اور اجازت ملتی بھی تھی تو اس طرح کہ سلطان محمد، مار وغیرہ مجلس موجود رہیں اور پہلے ہی سے اورنگ زیب کی منظوری بھی حاصل ہو چکی ہو۔ ہر بات جو اس کے منہ سے نکلتی تھی فوراً اورنگ زیب تک پہنچا دی جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے موثر اقدام سے شاہ جہاں کی خطوط نویسی کا سلسلہ بند کر دیا تھا، جو خواجہ سرا چرا چھپا کر ایسے خطوط لے جاتے تھے ان کو ملازمت سے نکال دیا جاتا تھا۔ اور دوسروں کی ایسی حرکت سے باز رہنے کی سزا سے باخبر کر دیا جاتا۔ بالآخر یہ قیدی سامان تحریر سے بھی محروم کر دیا گیا[۹۱]

داروغۂ محبس کی ایذا دہی

قید کی سختی یہیں نہیں ختم ہوئی۔ اس کی ایذا رسانی کے لئے چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی تحقیر آمیز انداز میں کی جاتیں۔ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو سارے جواہرات، قیمتی پتھر اور دوسرے سامان سے محروم کر دیا حالانکہ وہ ان سب چیزوں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یہ سختی یہاں تک بڑھی کہ شاہی ملبوسات، سامان آرائش، ظروف وغیرہ رکھنے کے کمرے سر بہ مہر کر دیئے گئے۔ یہ کمرے اسی وقت کھولے جاتے جب کوئی ذمہ دار افسر اور معتمد خان اورنگ زیب کا با اعتماد خواجہ سرا موجود ہوتے۔ ہر موقع پر شاہ جہاں کی ذلت پہرہ دار کرتے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو عام قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آخر کار خدا نے اس کو ان مصیبتوں کے برداشت کرنے کی طاقت بھی عطا کر دی اور تسلیم و رضا کی کیفیت میں وہ مذہبی فرائض و مطالعہ میں اپنا وقت صرف کرتا رہا۔

اورنگ زیب کے برتاؤ پر اعتراضات

اورنگ زیب کا اپنے باپ سے سلوک اخلاقی لحاظ سے بدترین ملامت کا سزاوار ہے شروع سے آخر تک اس کا رویہ کسی گہری منافرت یا انتقام کا نتیجہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ قیدی بادشاہ زبردست خطرات کا سرچشمہ ہوتا ہے لیکن اورنگ زیب کا شاہ جہاں کو ان معمولی ضروریات سے بھی محروم رکھنے کا جو اس کے شایان شان تھیں کوئی جواز نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخت پر قبضہ کر لینے کے بعد اورنگ زیب فرائض پسری بھول گیا۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ شاہی خزانہ قانوناً معاشرہ کی ملکیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اورنگ زیب نے عوام کے مفاد کے لئے کیا کیا۔ اس نے اندوختہ سرمایہ دکن کی بے سود لڑائیوں میں صرف کر دیا۔ اگر اس کو شاندار لباس پہننے یا جواہرات استعمال کرنے کی خواہش نہ تھی تو اس نے باپ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے بھی کیوں محروم رکھا۔ اگر یہ بات شاہ جہاں کے لئے وجہ تسکین ہو سکتی تھی۔ کیا یہ اس کا فرض نہ تھا کہ قید کی سختیاں جتنی بھی ممکن ہوں کم کر دی جائیں؟ اورنگ زیب کے کردار کا جو بھی مذہبی جواز ہو لیکن تاریخ جس کا خاص تعلق انسانی فطرت کا مطالعہ ہے اس کا فیصلہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے باپ کے لئے ناقابل عفو ظالم تھا۔

شاہ جہاں کا کردار، ہندوستانی مورخین

شاہ جہاں کا کردار بڑا مباحثہ انگیز موضوع ہے۔ ہندوستان کے مورخ اسے ایک مسلمان حکمراں کا ایک مثالی نمونہ بتلاتے ہیں۔ اس کو ایوان شرع کا ستون قرار دیتے ہیں۔ اس کو محافظ

مذہب اور ہندوستان میں زوال امادہ اسلامی خوش حالی کا بحال کنندہ سمجھتے ہیں۔ اس کے زہد اور مذہبیت کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ لوگ اس کی خطائیں نظر انداز کرتے ہیں اور بعض نہایت سیاہ اعمال کو اس بنا پر مستحق جواز سمجھتے ہیں کہ یہ اعمال اس دور کے عوامی و سیاسی اخلاقیات کی بنا پر تھے۔ اس طرح ان کی پیش کردہ تصویر میں شاہ جہاں نیک سیرت و خوش خلق بادشاہ نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کے کردار میں کوئی ایسا داغ دھبہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔

مغربی سیاح

اس کے بالکل برخلاف مغرب کے عصری سیاحوں کے بیانات ہیں۔ برنیر اور منوچی متعدد ایسے شرمناک واقعات پیش کرتے ہیں جو اس کی نجی زندگی سے ہم رشتہ ہیں۔ اس کو ایسا ذلیل انسان سمجھتے ہیں جس کی زندگی کا واحد مقصد بہیمانہ نفس پرستی اور انسانیت سوز خواہشات کا آسودہ کرنا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک محل میں مینا بازار کی کثرت، سلطنت کا بڑی تعداد میں رقص کرنے والی لڑکیوں کی پرورش سینکڑوں کنیزوں کا حرم سرا میں رہنا یہ سب شاہجہاں کی نفسیاتی خواہشات کی آسودگی کے سامان تھے۔

منوچی کہتا ہے کہ ایسا معلوم ہوگا کہ شاہ جہاں کو صرف ایک فکر عورت کی تلاش کی رہتی جو اس کی خواہش پوری کر دے[۹۲]۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جعفر خان اور خلیل اللہ خان کی بیویوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ شرمناک بات اتنی مشہور ہوگئی تھی کہ جب وہ لوگ دربار چلے جاتے تو بھکاری جعفر خان کی بیوی کو بلند آواز میں پکار کر کہتے "اے شاہ جہاں کی ناشتہ ہم کو بھی یاد رکھو"۔ اور خلیل اللہ خان کی بیوی پاس سے گزرتی تو وہ چلا کر کہتے "اے شاہ جہاں کی خوراک ہماری مدد کر[۹۳]"۔ برنیر لکھتا ہے کہ شاہ جہاں کی کمزوری عورت تھی[۹۵]۔ مانؔ ریکو بتاتا ہے کہ شائستہ خان کی بیوی کی عصمت دری میں شاہ جہاں نے اس لڑکی کی مدد لی[۹۶]۔ پیٹر منڈے طراری سے بیان کرتا ہے کہ شاہ جہاں کا ناجائز تعلق اپنی لڑکی جہنی بیگم سے تھا[۹۷]۔ ٹیورنیر بھی ایسی ہی باتیں بیان کرتا ہے[۹۸]۔

ان الزامات کی تائید کی شہادت کا ہندوستانی مورخوں کے یہاں ملنا ممکن نہیں۔ یہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، حقیقت یہ ہے کہ مغل ایک بیوی پر اکتفا کرنے والے نہیں نہ تھے۔ خود شاہ جہاں نے تین شادیاں کیں۔ جہاں گیر کی تقریباً ۲۰ بیویاں تھیں۔ اکبر کی بہت سی بیویاں تھیں۔ وارث لکھتا ہے کہ دو کنیزیں شاہ جہاں کی محبوبہ تھیں۔ ایک کا نام اکبرآبادی محل اور دوسری کا نام فتح پوری محل تھا۔ ممکن ہے کچھ اور بھی رہی ہوں۔ بااین ہمہ مغربی سیاحوں کے

یہ بغیر غور و فکر کے بیانات اور بہت سی عام کردہ روایات کی طرح صداقت سے دور نہیں۔

شاہ جہاں رقص و سرود کا دلدادہ

شاہ جہاں ناچ گانے کا بڑا شوقین تھا۔ گوبندر، چنترا خان، لال خان اور سرسّی مان کے نام درباری موسیقاروں میں لکھے ہیں۔ دربار سے متعلق رقاصاؤں کا بڑا طائفہ تھا۔ برنیر ان کی لچک اور رعنائی کی تعریف کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شاہ جہاں تفریحات میں کبھی ان سے ملوث ہو گیا ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ اس کی زندگی مسلسل نفس پرستی کا نمونہ تھی۔

کیا وہ پینے کا عادی تھا

یہ بات بھی مشتبہ ہے کہ شاہ جہاں مے نوشی کا عادی تھا منوچی لکھتا ہے کہ شہنشاہ خود تو نہیں پیتا تھا۔ لیکن اس برائی کی روک تھام کی بھی اس نے پروا نہیں کی۔ لیکن صدر فرم لن اپنے خط بنام کمپنی (۲۹ دسمبر ۱۶۳۴ء) میں رقم طراز ہے کہ "یہ بادشاہ اب کام کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے تخمیناً دو تین مہینے قبل اپنے ناظم کو (بھی) خط میں لکھا کہ اس کو انگوری شراب (ان کی زبان میں اسی طرح استعمال ہوتا ہے) مہیا کرے، خواہ ہم سے حاصل کرے یا پرتگالیوں سے۔ تب ہم نے کناری، ایلیگانٹ شراب سے لب ریز دو بڑے صندوق بھیجے۔ (۲۰ سواران کی حفاظت کے لئے ساتھ تھے) جو آدمیوں کے کندھوں پر رکھ کر اس کے لئے کشمیر بھیجے گئے۔ امید ہے کہ ہم کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ شراب اس کو پسند آئی کہ نہیں ـــــــ اسی لحاظ سے اس کے مستقبل کے احکام کی تعمیل میں زحمت اٹھانے کی ضرورت ہے۔ شاہ جہاں کا اپنی چوبیسویں سال گرہ میں شراب نوشی اور بعد میں شراب چھوڑنے کا ذکر گذشتہ ابواب میں آ چکا ہے۔

جہاں آرا سے ناجائز تعلق

لیکن سترہویں صدی میں خفیف مے خواری یا نفس پرستی حکمران کے دامن کردار پر کوئی خاص دھبہ نہ سمجھی جاتی۔ موجودہ صدی میں بھی دولت مندوں کا ضابطہ اخلاق غریبوں کے ضابطہ سے مختلف ہے اور دور متوسط میں امیروں کے ضابطۂ اخلاق میں تو یقیناً آج سے زیادہ ڈھیلا پن تھا۔ لیکن اخلاق و تہذیب کے جملہ ارکان جس سے درپے بغاوت ہو جاتے ہیں وہ برنیر کا الزام ہے کہ شاہ جہاں کا ناجائز تعلق اپنی لڑکی جہاں آرا سے تھا۔ وہ کہتا ہے کہ بیگم صاحبہ شاہ جہاں کی بڑی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے اعضائے جسم نہایت دلکش تھے۔ اس کا باپ پُر جوش انداز میں محبت کرتا تھا۔ افواہ یہ ہے کہ اس کی انسیت بڑھتے بڑھتے اس درجہ پر پہنچی جس کا ذکر کرنا مشکل ہے۔

اس کا جواز ملاؤں کے فتوے پر تھا۔ یہ لوگ ماہرین قانون شریعت سمجھے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ نامناسب ہوتا کہ بادشاہ کو اس درخت سے پھل نہ حاصل کرنے دیا جائے جس کو اس نے خود لگایا ہو۔[۵۳]

وی۔اسمتھ کی رائے

ونسنٹ اسمتھ کا کہنا ہے کہ اس ناجائز تعلق کا سب سے قدیم ثبوت ڈی۔لایٹ کے یہاں ملتا ہے اور یہ کہ اس کی توثیق ٹامس ہربرٹ بھی کرتا ہے۔ ان لوگوں کی شہادت کے پیش نظر وی۔اسمتھ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ ناخوشگوار الزام جو شاہ جہاں اور اس کی بیٹی پر رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ قطعی طور پر ثابت نہ ہو تب بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ثابت نہیں ہوتا۔ اگرچہ منطقی طور پر بعید از قیاس کیا جاتا ہے لیکن سرسری فیصلہ کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ناقابل یقین[۵۴] ہے۔ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ اگرچہ یہ امر ناقابل انکار ہے کہ شاہ جہاں بے حد نفس پرستی کا دلدادہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ماننے کی وجہ بھی ہے کہ اس کی لڑکی مختلف ناجائز معاشقہ میں ملوث تھی۔ اس لئے پہلی نظر میں یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے کہ باپ بیٹی دونوں اتنے زیادہ بد اخلاق ہو سکتے ہیں جتنا وہ مورد الزام سمجھے گئے۔ لیکن چند سال گذرے ایسے ہی رسوم جنوبی افریقہ کے ہیورٹن بور میں رائج تھے یا نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اخلاق و مذہب کے لئے ضعیف دلائل پیش کرتے ہیں۔

وی۔اسمتھ جرم کا زمانہ معین کرتا ہے

اس طرح ڈی۔لایٹ اور ہربرٹ کے دلائل وی۔اسمتھ کو ایک ایسے قطعی فیصلے پر مائل کرتے ہیں جس کو برنیر اور ٹیورنیر کے بیانات کی تقویت حاصل ہے۔ ایک عجیب و غریب منطقی دلیل سے اسمتھ اس ارتکاب جرم کا وہ وقت بھی بتاتا ہے جب یہ عمل میں آیا ہوگا۔ اس نے دکن میں ممتاز محل کے انتقال کے فوراً بعد ہی اس واقعہ کا یقین کیا ہے۔ آگے چل کر رائے دیتا ہے کہ یہ مجرمانہ تعلق ۱۶۵۸ء میں ختم ہو گیا تھا۔

اس کی رائیں مستند شہادت پر مبنی نہیں

جرم کی سنگینی سے قطع نظر، اسمتھ جس شہادت پر اپنی دلیل قائم کرتا ہے وہ قطعی طور پر غیر مشتبہ نہیں۔ ڈی لایٹ زیادہ سے زیادہ ایک مؤلف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگرچہ برنیر[ش] کی رائے میں اس کی تالیف عالمانہ و پُر آورد[۵۵] ہیں۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے سورت کے

(ش) S. N Banerji. مترجم

کلکتہ کے ڈچ سربراہوں سے رابطہ رکھا ہوگا لیکن ان سربراہوں کی صداقت کی شہادت کون دے سکتا ہے! کیا یہ ممکن نہیں کہ ان لوگوں نے ایک عام افواہ کو حقیقت بنا کر پیش کیا ہو اور ڈی لایٹ بھی اس افواہ کی ظاہری قدر و قیمت سے متاثر ہو کر قلم بند کرنے پر مائل ہو گیا ہو۔ جہاں تک ہربرٹ کا سوال ہے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مضمون میں سرقہ کرتا تھا، وہ سورت اور سوالی سے آگے کبھی اور کہیں نہیں گیا، لیکن متعدد شہروں کا مفصل بیان پیش کرتا ہے۔ تیمور رو تیمور خان کے وقت سے سارے مغلیہ بادشاہوں کی تواریخ بھی بالتفصیل بیان کرتا ہے۔ غرض کہ اس کی اطلاع بھی ان ذرائع پر مبنی ہے جو اعتماد کامل کے مستحق نہیں۔

بہر حال تعجب ہے کہ اسمتھ کے ایسا دیدہ ور مشاہد منوچی کے اس قطعی دعوے کو آسانی سے تسلیم کرے۔ منوچی کا یہ بھی کہنا ہے کہ برنیر کے بیان کی بنیاد کلیتاً اسفل طبقہ کی باتوں پر ہے۔ علاوہ بریں برنیر کے دعوی پر اس کی رائیں دلچسپ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ برنیر بہت سی خود ساختہ باتیں مغل تاریخ میں شامل کر دیتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ وہ بہت سی ایسی باتیں بھی لکھ جاتا ہے جو ظہور میں نہیں آئیں ۔۔۔۔۔۔۔ وہ تمام امور سے زیادہ واقف بھی نہ تھا کیونکہ مغل دربار میں وہ آٹھ سال سے زیادہ نہیں رہا اور دربار اتنا وسیع ہے کہ لامحدود چیزیں مشاہدہ کے لائق ہیں اور وہ مشاہدہ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کو دربار میں آنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اس لئے اگر کوئی سچائی اس افواہ میں ہوتی تو یقیناً منوچی نے برنیر کی تردید اتنے پر زور الفاظ میں نہ کی ہوتی۔ جب شاہ جہاں اور جہاں آرا کی نجی زندگی سے متعلق دوسرے الزامات وہ پیش کر دیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر اس کو اس ناجائز تعلق کی صداقت کا یقین ہوتا تو اس کی نوشتق کرنے میں پس و پیش کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جہاں آرا کا مقرب تھا۔ اس کی بہت سی خاص عنایتوں سے سرفراز بھی ہوا۔ لیکن اس کی دوسری بہت سی کہانیوں کو قلم بند کرنے میں یہ حسن سلوک مانع نہ ہوا۔ علاوہ بریں برنیر، کو خود بھی اس کا یقین کامل نہیں ہے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے سب صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہ افواہ ہے" مگر اس کی صداقت کی تصدیق نہیں کرتا۔ جیسا کہ اس نے اور باتوں میں کی ہے۔

علاوہ اس کے، اپنی بیوی سے شاہ جہاں کی بے حد محبت، اسمتھ کے اس نامعقول قیاس آرائی کی تکذیب کرتی ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد ہی وہ ایسی حرام کاری کا مرتکب ہوا۔ بیوی کے مرنے کا اس کو اتنا شدید صدمہ ہوا کہ چند ہی روز میں اس کی ڈاڑھی قریب قریب سفید ہو گئی۔

صرف ایک گمراہ کن ذہن یہ تصور کر سکتا ہے کہ بیوی کے مرتے ہی وہ ایسی انسانیت سوز حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے بوئروں سے اس کا موازنہ انتہائی تنگ نظری کا مظاہرہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس گپ کی بنیاد شاہ جہاں کی وہ شدید محبت ہے جو اس کو اپنی لڑکی سے تھی۔ یہ لڑکی اس کی موجودہ اولاد میں سب سے بڑی تھی۔ باپ کی اس محبت کا جواب جہاں آرا بھی مساوی محبت سے دیتی۔ نہ صرف ہندوستانی مورخ حسن سلوک کی شہادت دیتے ہیں بلکہ مغربی سیاح بھی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ برنیر کا کہنا ہے کہ شاہ جہاں کو اپنی اس چہیتی بیٹی پر بے پایاں اعتماد تھا۔ وہ اس کی صحت کا خاص خیال رکھتی۔ اتنی محتاط تھی کہ باپ کے دسترخوان پر صرف وہی کھانے پیش کرنے دیتی جو اس کی نگرانی میں تیار ہوتے[۱۱]۔ منوچی کہتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی خدمت بڑی محنت و محبت سے انجام دیتی۔ اس موضوع پر سر رچرڈ ٹیمپل کی رائے مستحق ہے کہ پوری طرح بطور اقتباس پیش کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس بدنام کن افواہ کو میں اس کہانی کا ایک نمونہ سمجھتا ہوں جو اس وقت کے اہل اقتدار سے منسوب کر دی جاتی جو اکثر ہندوستانی تاریخ کی صورت میں پیش کر دی جاتی۔ جہاں آرا سے مشتاق و بدنام بے احتیاط باپ کی غیر معمولی محبت کی علانیہ بارش کی تہ میں یہ عام علم ہے کہ امور[۱۱۱] سلطنت کے پیش نظر شاہان مغلیہ لڑکیوں کو شادی کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس سلسلہ میں بیل[۴] کا وہ خراج تحسین بھی شامل کیا جا سکتا ہے جس کی جہاں آرا بخوبی مستحق تھی وہ کہتا ہے کہ "اس کی دخترانہ محبت اور رضاکارانہ خدمت گزاری احساس فرائض کے لئے صفحات تاریخ کی دائمی زینت رہے گی۔ ——————— یہی نہیں کہ بوڑھے باپ کی مصیبت میں سہارا تھی بلکہ اپنی آزادی ترک کر کے اس وقت بھی اس کے ساتھ رہی جب وہ آگرہ کے قلعہ میں قید[۱۱۱۱] تھا۔

شاہ جہاں کے کردار کی طرف دوبارہ نظر کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ اس پر نفس پرستی کا الزام اس کے کردار کا ایک خفیف پہلو تھا۔ کوئی عیش پسند بدکار اس بلندی پر نہیں پہنچ سکا جہاں وہ پہنچا۔ بحیثیت شہزادہ وہ ہم کو فرض شناس معلوم ہوتا ہے۔ بحیثیت حکمران اس نے دل و دماغ کے وہ جوہر دکھائے جو ایک بادشاہ کے شایان شان ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خون میں پیر کر تخت تک پہنچا۔ لیکن وہ مہربان اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ قدرت نے اس کو غیر معمولی گرمیِ عمل، زبردست نکتہ رسی، شجاعت، ہمت اور سب سے بڑھ کر عدیم المثال

---

(۴) Beale — مترجم

عرکانہ قوت عطا کی تھی۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح تسخیر مملکت کی اسے بھی شدید تشنگی تھی۔ یہ جذبہ بیرث کی طرح اپنے لڑکے کو بھی دے گیا۔ لیکن دکن میں احمد نگر کے الحاق کے بعد اس نے رُک جانے کی صدا دی۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کی اطاعت پذیری پر قانع ہو گیا۔ وہ شان و شوکت کا رسیا تھا۔ شان و شوکت و عظمت و جلالت سے اسے والہانہ محبت تھی۔ مرصع لباس، مرصع تخت، مرصع قالین و فرش، مرصع خیمہ جات سے اُسے فطری لگاؤ تھا۔ وہ قیمتی پتھروں کا زبردست پرکھنے والا تھا۔ ان کی قیمت کا اندازہ بالکل صحیح کرتا تھا۔ اس کے جواہرات کا ذخیرہ غالباً دنیا میں سب سے زیادہ شان دار تھا۔ وہ نمائش و نمود کا بیحد شوقین تھا۔ لاکھوں روپیہ اس پر صرف کرتا تھا تاکہ بیرون ممالک قاصد یا سفیر مرعوب ہو سکیں۔ ایسے ملکوں میں ایران، ماوراالنہر، اور ترکی خاص طور پر پیش نظر رہتے۔ خیرات کرنے میں وہ بے تحاشا خرچ کرتا تھا۔ شمسی و قمری حساب سے اپنے تولے جانے کی رسوم کے علاوہ مکہ و مدینہ بھی زرِ کثیر بھیجا کرتا۔

ساٹھ سال کی عمر کے بعد اس کی فطری توتیں کمزور ہونے لگیں۔ علماء نے ایک فتویٰ جاری کر کے اسے رمضان میں روزہ رکھنے سے مستثنیٰ کر دیا۔ اس کے عوض خیرات کرنے کی رائے دی گئی[۱۱۴] اسیری کی سختی نے اس کی صحت بالکل خراب کر دی[۱۱۵]۔ ایک طبی تیل کی مالش کرانے سے وہ جنوری ۱۶۶۶ء میں بیمار ہوا۔ بخار آنے لگا جس کو عسرالبول و احتباس معدہ نے پیچیدہ بنا دیا۔ برنداین جراح نے نوردن کے بعد خرابی دور کر دی۔ لیکن شہنشاہ میں اب فطرت سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔ وہ نڈھال ہونے لگا۔ ۲۲ر جنوری کو اس کی حالت مایوس کن ہو گئی۔ اس نے بڑے دردِ دل کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا، اپنے لڑکوں کے لئے عفو تقصیر کی دعا مانگی۔ اپنی داشتاؤں کے لئے وصیت کی۔ تاج کے پورے منظر کو دیکھتے ہوئے مستورات کی آہ و بکا اور ملازمین کی اشک باری کے درمیان اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کا شاہانہ کردار جو المیہ سے شروع ہوا تھا، اس کا خاتمہ بھی المیہ پر ہوا۔ خدا اس کی رُوح پر رحم کرے۔

تتمہ حاشیے

باب ا

۱۔ ا۔ ن، جلد ۳ ص ۹۲۱۔ جہانگیر کی تاریخ ولادت ۹۹۸ھ جیری[1] لکھتا ہے۔ جو صریحاً غلط ہے۔ اب جلد ا ص ۱۹: قزوینی ص ۱۱۷۔ لاہوری جلد ا ص ۱۶۔ معاصر جہانگیری ص ۴۲

۲۔ ا۔ ن۔ جلد ۳ ص ۷۴۹۔ بینی پرشاد ص ۱۳۰ ف ۵۔ بی ایل[1] اس نے اس کا نام غلط بنایا ہے ص ۳۹۳، کویراج شیام لال داس کہتا ہے کہ اس کا دوسرا نام جودھا بائی تھا لیکن شادی کی تاریخ ۱۵۸۸ لکھتا ہے۔ ج ا ص، ب ۱۸۸۸ ص ۷۱۔ مان ریکو بھی اس کا نام بال منتی بتاتا ہے۔ جلد ۲ ص ۲۰۱۔

۳۔ ا۔ ن۔ جلد ۳۔ ص ۹۲۱۔ دیکھو شاہجہاں کے زائچے قزوینی اور لاہوری۔

۴۔ یہ مشتبہ ہے کہ کوئی قطعۂ تاریخ ولادت کے وقت کہا گیا ہو۔ پادشاہ نامہ سے پہلے ان کا اندراج کسی اور کتاب میں نہیں۔ پہلے میں لفظ عالمگیر رعایت لفظی اور دوسرے میں لفظ شاہجہاں اس قیاس کی تائید کرتا ہے۔

۵۔ ر۔ ب۔ جلد ا، ص ۴۸۔ قزوینی ف ۱۸۔ گو بند کی پیشین گوئی کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس کا انتقال جہانگیر کے عہد حکومت کے بیسویں سال ہوا۔ اقبال نامہ ص ۲۵۱۔

۶۔ ابو الفضل شہزادہ سلیم کی رسم مکتب کا مفصل بیان پیش کرتا ہے اور اتفاقیہ خسرو کی اس رسم کا ذکر کرتا ہے ا۔ ن، جلد ۳، ص ۹۲۲ لیکن خرم کے مکتب کی رسم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ البتہ اس کے بعض اساتذہ کے نام بتاتا ہے۔ رسمی طور پر اس رسم کا ذکر بعد کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً قزوینی، صالح اور منظوم پادشاہ نامے

1 - Beale.

قزوینی ف ۳۴ ، صالح جلد ۱ صفحات ۳۰ - ۳۲ تک

۷۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ روحانی مراقبات کے لیے اس کو بہت تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور بہت سے دلچسپ صوفیانہ بیانات اس کے لب اظہار پر آئے ۔ ا ۔ ن جلد ۳ ۔ ص ۱۱۲۲ ، طبقات اکبری کا کہنا ہے کہ منطقی علوم کا ماہر تھا ۔ ص ۴۱ (۵) ، بلوچ میں بھی ملاحظہ ہو ص ۵۱۷ ، اور ص ۱۰۶ ۔

۸۔ قزوینی اور صالح دونوں خرم کے استاد کا نام حکیم دوانی لکھتے ہیں ۔ لیکن اکبری دور میں صرف ایک دوانی کا ذکر آتا ہے اور وہ نام ہے حکیم عین الملک شیرازی جو مشہور و معروف منطقی دوانی کی ذریت میں ہے ، اور بدایونی کا دوست بھی ہے لیکن حکیم شیرازی کا انتقال ۱۰۰۳ ہجری میں ہوگیا تھا ظاہر ہے کہ وہ شہزادہ خرم کا استاد نہیں ہو سکتا ۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حکیم دوانی سے مراد ہے حکیم علی گیلانی ۔ آخر الذکر حکیم عین الملک کا بھانجہ تھا اور ممکن ہے اپنے ماموں کے لقب پر مشہور ہوگیا ہو ۔ علاوہ اس کے وہ برابر شہزادہ خرم کا ساتھی رہا ۔ جہانگیر حکیم علی کی خصوصیات کی تعریف کرتا ہے ۔
عین الملک کے لیے دیکھو بدایونی جلد ۳ ص ۱۶۴ ، اور بلوچ میں ص ۴۸۱ ، حکیم علی کے لیے دیکھو طبقات ص ۲۹۱ ، ر ۔ ب جلد ۱ ص ۶۸ ۔ ۱۵۲ ، ۱۵۴ ۔ معاصر الامرا جلد ۱ صفحات ۵۶۸ - ۷۳ تک ۔

۹۔ قزوینی ف ۳۴ ۔

۱۰۔ طبقات ف ۲۹۹ ۔ صبح صادق ف ۱۰۰۰ محمد صوفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کا انتقال ۱۰۱۲ ہجری ، سفر لاہور میں ہوا ۔ یہاں وہ حسب المطلب جہانگیر کی خدمت میں جا رہا تھا ۔ (Blochmann ۔)

۱۱۔ ابتدا میں وہ خسرو کا اتالیق تھا ۔ ا ، ن ، جلد ۳ ص ۹۲۲ دیکھو بلوچ مین کا تعارف یہ سلسلہ آئین اکبری جلد ۳۴ ۔

۱۲ لاہوری جلد ا صفحات ۳۳ - ۱۳۲ ۔ قزوینی کا بیان ہے کہ شہزادہ خرم ترکی زبان کے چند حروف سے واقف تھا ۔ اس لیے کہ رقیہ بیگم کی صحبت میں رہتا تھا ف ۱۳۴ ۔

۱۳ ا ، ن ، جلد ۳ ص ۱۱۷۷ ، جہانگیر کے عہد میں وہ بکاول بیگی تھا ۔ ر ۔ ب جلد ا ص ۳۱۸ ۔

۱۴۔ ۱۵۹۸ء میں وہ لاہور کا بخشی تھا ۔ (ا ن جلد ۳ ص ۱۱۱۵ ، بلوچ مین صفحات ۴۹۸ - ۴۹۹ ۔ قزوینی ف ۳۴ ۔ ب ۔

۱۵۔ یہ سلامی مغل حکمرانوں کے یہاں از روئے ضابطہ تھی ۔ غالباً اس کا مفہوم مسلح سلامی پیش کرنے کا تھا ۔

۱۶۔ قزوینی ف ۳۵ ۔ سالیوہان (Salivahan) نے ابوالفضل کے لیے ایک خاص شاور ، دربار سے دکن جانے کا حاصل کیا ۔ ا ، ن جلد ۳ ص ۱۱۹۰ ۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ وہ دکن سے معہ دانیال کے ہاتھی کے آ رہا تھا ۔ ر ۔ ب ۔

جلد ۱ ص ۴۶۔

۱۷۔ قزوینی ف ۳۵ ب، ۳۶

۱۸۔ ایضاً ف ۳۶۔

۱۹۔ ا ا ن جلد ۳ ص ۲۴۴۔

۲۰۔ ایضاً ص ۱۲۴۴۔ معاصر جہانگیری ف ۵۷ خرم کے جانے کا مقصد نہیں بتایا۔

۲۱۔ ا ا ن، جلد ۳ ص ۱۲۴۵۔ قزوینی کا بیان ہے کہ شہزادہ خرم بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ اس لیے اس نے اپنی رپورٹ بڑی ہوشیاری سے پیش کی، ف ۳۶ ب۔ ۳۷۔

۲۲۔ معاصر جہانگیری ف ۵۹ ب۔ ۶۱۔

۲۳۔ ا ا ن۔ جلد ۳۔ صفحات ۱۲۵۸۔ ۶۲ تک

۲۴۔ معاصر جہانگیری صفحات ۷۱۔ ۷۲۔ ر، ب، جلد ۱، ص ۳۲۲۔

۲۵۔ قزوینی ف ۳۸۔ ۴۰ تک تسلیم کرتا ہے (ف ۴۰) کہ اس نے یہ تفصیلات جہانگیر نامہ سے لی ہیں۔

۲۶۔ اقبال نامہ ص ۹۔ معاصر جہانگیری ف ۱۰۰؛ قزوینی ف ۴۲۔ ر۔ ب جلد ۱ ص ۷۶

۲۷۔ ایضاً ص ۷۰۔

۲۸۔ ایضاً ص ۷۶۔ معاصر جہانگیری ف ۷۳؛ قزوینی ف ۴۳۔

۲۹۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۸۷؛ اقبال نامہ میں غلطی سے لکھا ہے ۵۰۰۰ ص ۲۲۲ معاصر میں ۸۰۰۰ ذات اور ۵۰۰۰ سوار لکھا ہے۔ ف ص ۷۶۔

۳۰۔ قزوینی ف ۴۳۔ ۴۴۔

۳۱۔ بموجب توزک دوسرے سال کے نوروز کے دن شہزادہ خرم کو صرف ۸۰۰۰ ذات اور ۵۰۰۰ سوار کا منصب، طبل، علم اور ایک جاگیر (ر۔ب ص ۸۷) حاصل ہوئے۔ حصار فیروزہ کی سرکار اس کو بعد میں عطا کی گئی (ر۔ب ص ۱۳۲) اقبال نامہ اور توزک ہم رائے ہیں (ص ۲۲) لیکن معاصر جہانگیری میں ہے کہ حصار فیروزہ بھی اسی موقع پر خرم کو دیا گیا۔ ف ۷۶ ب) اور اسے ولی عہد مقرر کیا گیا۔ قزوینی ف ۷۰ معاصر کی رائے سے متفق ہے اسکے اندراج میں یہ بھی ہے کہ مہر اوزک بھی اس موقع پر شہزادہ کو دی گئی۔ میں نے یہ دونوں واقعات حسب توزک علیحدہ پیش کیے ہیں۔

۳۲۔ ر۔ب۔ صفحہ ۱۱۵؛ قزوینی ف ۴۴۔

۳۳۔ ر۔ب جلد ۱ صفحات ۱۲۲۔ ۲۳۔ اقبال نامہ صفحات ۲۸۔ ۳۰ تک۔ معاصر جہانگیری میں اس کا تذکرہ صرف

ایک جلد میں کیا گیا ہے۔ ف ۶۹

۳۴۔ یہ ایک قسم کا شکار ہے جس میں جانور بیچ دائرہ میں ہنکا کر لائے جاتے ہیں اور شکاری بہت قریب سے اور تے ہیں یا نشانہ لیتے ہیں۔

۳۵۔ ر۔ب، جلد ۱ ص ۱۲۹۔

۳۶۔ قزوینی ف ۴۵۔

۳۷۔ ر۔ب۔ جلد ۱ ص ۱۵۶۔

۳۸۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۱۵۹؛ اقبال نامہ ص ۳۸۔ معاصر جہانگیری ف ۸۹ب، قزوینی نے تفصیل کے ساتھ مظفر حسین صفوی کے آباؤ اجداد کا حال بیان کیا ہے۔ ف ۴۵۔ ۴۶ب

۳۹۔ ر۔ب۔ جلد ۱ ص ۱۸۰، اقبال نامہ ص ۴۲، معاصر جہانگیری ف ۹۵

۴۰۔ ر۔ب جلد ۱ صفحات ۱۸۴۔ ۱۸۸ تک؛ اقبال نامہ صفحات ۴۷۔ ۴۸۔ معاصر جہانگیری ف ۹۶۔ ۹۷؛ قزوینی ف ۴۶ب۔ ۴۷ب

۴۱۔ اقبال نامہ، صفحات ۵۴۔ ۵۷۔ معاصر جہانگیری ف ۱۰۲ب

۴۲۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۲۱۷۔

۴۳۔ ر۔ب، جلد ۱ صفحات ۲۲۴۔ ۲۵؛ اقبال نامہ ص ۶۷۔ معاصر جہانگیری ف ۱۱۳؛ قزوینی ۴۸ب۔ ۴۹ب

۴۴۔ قزوینی کا خیال ہے کہ یہ رشتہ خان خاناں کی بدگمانی دور کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ ف ۶۷ب لاہوری کا کہنا ہے کہ یہ شادی بعض سیاسی امور کے لحاظ سے ہوئی۔ (جلد ۱ ص ۳۹۰) معتمد خان کا بیان ہے کہ خان خاناں کے اعزاز میں اضافہ ہوا۔ (اقبال نامہ ص ۱۰۰) اس کے بطن سے شہزادہ شاہجہان کے ایک لڑکا تھا جس کا نام جہان افروز تھا۔ لیکن بچپن ہی میں اس کا انتقال برہان پور میں ہو گیا تھا (لاہوری جلد ۱ ص ۳۹۰)

۴۵۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۱۱۸

۴۶۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۱۵۶

۴۷۔ میواڑ کی مہم کا بیان بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر صفحات ۲۲۷۔ ۴۰ تک۔

باب ۲

۱۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۲۸۸؛ قزوینی ف ۶۳؛ معاصر جہانگیری میں بیس ہزار دوسو ہزار ہے ف ۱۳۱۔ ص ۳۰۶:
قزوینی ف ۶۶۔ ۶۷۔

۲۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۳۰۶؛ قزوینی ف ۶۶۔ ۶۷۔

۳۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۲۸۰

۴۔ ر۔ب جلد ۱ صفحات ۳۱۲-۱۱۴؛ معاصر جہانگیری ف ۱۴۰۔ ۱۴۱؛ اقبال نامہ صفحات ۸۵۔ ۸۸۔ بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر ص ۲۷۰۔ رڈو جلد ۱ صفحہ ۱۹۲-۱۹۳

۵۔ ر۔ب جلد ۱: ص ۳۲۹؛ اقبال نامہ ۹۰؛ معاصر جہانگیری ۱۴۷ ب؛ قزوینی ف ۶۹

۶۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۳۳۶

۷۔ ر۔ب جلد ۱ صفحات ۳۳۱ اور ۳۳۵؛ معاصر جہانگیری ف ۱۴۴۔

۸۔ ر۔ب جلد ۱ ص ۳۳۸؛ قزوینی ف ۶۹؛ اقبال نامہ ص ۹۰؛ معاصر جہانگیری ف ۱۴۸۔

۹۔ محمد رضا بیگ ر۔ب، جلد ۱ ص ۳۳۶

۱۰۔ اپنے باپ سے بغاوت کے زمانہ میں خود جہانگیر نے شاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ تشریح کے لیے کہا کرتا تھا کہ اس کا باپ شہنشاہ تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ اپنے بیٹے کو شاہ کا لقب دے کر اپنے کو بھی اتنا ہی سربلند کرنا چاہتا تھا جتنا شہزادہ خرم کو۔

۱۱۔ ر۔ب، جلد ۱ ص ۳۳۹؛ قزوینی ف ۶۹؛ اقبال نامہ ص ۹۰۔ معاصر جہانگیری ف ۱۴۷ ب

۱۲۔ اقبال نامہ ص ۹۱۔

۱۳۔ قزوینی ف ۶۹ ب: اقبال نامہ ص ۹۲؛ معاصر جہانگیری ف ۱۴۸، ب؛ ر۔ب جلد ۱ ص ۳۴۴

۱۴۔ قزوینی ف ۷۰؛ ر۔ب جلد ۱ ص ۳۴۸؛ اقبال نامہ ۹۶؛ معاصر جہانگیری ف ص ۱۴۹۔

۱۵۔ ر۔ب، جلد ۱ صفحہ ۳۸۰؛ اقبال نامہ ۱۰۰؛ معاصر جہانگیری ف ۱۵۰؛ قزوینی ف ۷۱

۱۶۔ ر، ب، جلد ا ص ۳۹۳ ؛ اقبال نامہ ص ۱۰۲، معاصر جہانگیری ف ۱۵۲۔
۱۷۔ ر، ب، جلد ا ص ۳۸۰
۱۸۔ ر، ب، جلد ا ص ۳۹۳۔ ۹۷ تک۔
۱۹۔ ایضاً ص ۳۹۹۔ ۴۰۱ تک
۲۰۔ تاریخ جہانگیر، مصنفہ بینی پرشاد ص ۲۸۹۔ ۳۰۰ تک
۲۱۔ ر، ب، جلد ا ص ۴۴۴، ایک دوسری جگہ جہانگیر رقمطراز ہے کہ گجرات کی جاگیر شاہ جہاں کو اس لیے دی تھی کہ رانا کے مقابلہ میں اس کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ ر، ب جلد ا ص ۲۶۱، قزوینی ف ۷۵۔
۲۲۔ قزوینی ف ۷۷؛ اقبال نامہ ص ۱۱۰، ر، ب جلد ا ص ۴۴۴۔
۲۳۔ ر، ب جلد ص ۱۴؛ اقبال نامہ ص ۱۱۵
۲۴۔ ر، ب جلد ا ص ۸۴۔
۲۵۔ ر، ب جلد ۲ ص ۱۸۴۔ ۸۶ تک۔ اس کا بیان کشش فتح اور جلد دوسری کتابوں میں وہ اصل وہی ہے جو جہانگیر نے قلمبند کیا ہے۔
۲۶۔ قزوینی، ف ۸۸؛ ر، ب، جلد ۲ ص ۱۵۵۔ ۵۶، ص ۱۸۹۔ ۹۰ تک
۲۷۔ قزوینی (ف ۸۹) بعض نمایاں باتیں کہتا ہے۔ اقبال نامہ ص ۱۷۰۔ معاصر جہانگیری ف ۱۷۳۔
۲۸۔ قزوینی ف ۹۰، ۹۱۔
۲۹۔ اقبال نامہ ص ۱۸۱۔ ۱۸۲
۳۰۔ قزوینی ف ۹۲۔
۳۱۔ ایضاً ف ۹۳۔
۳۲۔ قزوینی ۹۳۔ ۹۴۔
۳۳۔ دکن کے معاملات کی بنیاد قزوینی کے بیانات پر ہے۔ اس نے اپنے تمام پیشروؤں سے زیادہ مفصل بیان کیا ہے۔ معتمد خان بہت مایوس کن ہے، وہ دربار کے حالات بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے بہ نسبت ان حالات کے جن کا وہ چشم دید گواہ تھا (دیکھو قزوینی ف ۹۲۔ ۱۰۲)

باب ۳

۱۔ قزوینی ت ۳۵ الف ب

۲۔ ر۔ب، جلد ۱ ص ۴۳۶

۳۔ رٹو جلد ۱ ص ۱۹۱۔ میتھولڈ شاہ جہاں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: بلیر اپنے ساتھیوں کی خوشامد کے بھی شاہ جہاں کافی مغرور و حوصلہ پسند تھا۔ اس کے عروج میں مضمر اس کی زبردست قوتِ ارادی شامل ہے۔ اس کا خود ساختہ قانون نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کی طرح دولت کا دلدادہ تھا۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۲۲ - ۲۳) ص ۴۲۔ کیمبرج نے جو شاہ جہاں کا جائزہ لیا ہے اس کے لیے دیکھیے (۱۶۲۴ - ۲۹) ص ۲۰۵ ۲۰۶ تک

۴۔ ر۔ب، جلد ۲ ص ۲۰۲

۵۔ ر۔ب، جلد ۲۔ ص ۱۸۷ اور ۱۹۹

۶۔ ر۔ب، جلد ۲۔ ص ۲۰۳

۷۔ ر۔ب جلد ۲۔ ص ۲۰۹

۸۔ ر۔ب جلد ۲ ص ۲۲۸

۹۔ ر۔ب، جلد ۲۔ ص ۲۲۱

۱۰۔ ر۔ب جلد ۲ ص ۱۹۴۔

۱۱۔ ر۔ب، جلد ۲ ص ۲۰۰

۱۲۔ ر۔ب، جلد ۲ ص 215

۱۳۔ E ، ر، ا، س (۱۹۱۱ء) ص ۵۹۹ تاریخ ہند مصنفہ الفنسٹن جلد ۲ ص ۳۶۸

۱۴۔ تاریخ جہانگیر مصنفہ بینی پرشاد ص ۳۳۶ - ۳۴۰ تک اور حواشی۔

1- Roe. (2) Methwold (3) The English Factories in India

۱۵۔ صالح ج ۱ ص ۱۲۷ اور صفحات ۱۹۳، ۹۵ تک

۱۶۔ ر۔ ب۔ ج ۲ ص ۲۲۸؛ خسرو کے قتل میں شاہ جہان کی شرکت کی بابت عصری شہادت ملاحظہ ہو۔ "ہندستان میں عصری کارخانے" (۱۶۲۲ - ۲۳) بالخصوص بیگم کے برہان پور سے سورت روانہ کیے ہوئے خطوط کے صفحات ۵۹، ۹۴ توجہ طلب ہیں، اور میتھولڈ کے بھی وہ خطوط دیکھیے جو اس نے مسلی پٹم سے سورت بھیجے ہیں ص ۱۵۹ اور ۱۶۰ میتھولڈ کی رائیں دلچسپ ہیں: سلطان خسرو کے برادرانہ غیر فطری قتل کی سزا فی الحال ملتوی ہو گئی ہے مگر قتل میں شریک ہونے والوں پر زبردست انتقام عائد ہو گا۔ یہ سانحہ اس بدبخت مغل بادشاہ سے چھپایا جا سکتا ہے کیونکہ فاصلہ بھی ہے اور اس کے دوستوں کی سازش بھی لیکن ایک سلطان السلاطین بھی ہے جو کبھی بغیر انتقام لیے ہوئے بے گناہ کا قتل نظر انداز نہیں کرتا۔ پیٹر منڈے ص ۲۲۴۔ پیٹرو ڈیلا ویل جلد ۱ ص ۵۸۔ فتوحات عادل شاہی میں شاہجہان کی بغاوت کا ذکر کچھ الجھا ہوا ہے لیکن اس کا بیان وضاحت کے ساتھ ہے کہ جہانگیر نے کتنی کشمکش کے ساتھ شاہ جہان کے سپرد، خسرو کو کیا تھا۔ کہتا ہے کہ اس کے کچھ ہی دن بعد سنا گیا کہ خسرو قتل کر دیا گیا ف (۲۸۱ - ۸۵)

۱۷۔ ر۔ ب جلد ۲ ص ۲۳۱؛ اقبال نامہ ص ۱۹۲؛ قزوینی ف ۱۰۲ اب؛ معاصر جہانگیری ف ۱۰۵۔

۱۸۔ قزوینی ف ۱۰۳، ب صالح، ج ۱ ص ۱۲۷ - ۱۲۸: جہانگیر کو شاہ جہان کے قندھار بھیجنے کی خواہش تین وجہوں سے تھی (۱) کیونکہ وہ قابل سپہ سالار اور تجربہ کار سیاست دان تھا۔ (۲) کیونکہ امام قلی خاں نے جہانگیر کے خط میں شاہجہان کا نام خاص طور پر لکھا تھا (لاہوری ج ۱ ص ۲۳۲ - ۳۳) اور (۳) کیونکہ جہانگیر نے سوچا کہ شاہ جہان، شاہ عباس سے خط و کتابت رکھتا ہے اس لیے وہ آخرالذکر کو متاثر کر سکے گا۔ یہ واضح کر جہانگیر شاہ جہان کے خلاف اس وقت کچھ نہیں سوچ رہا تھا اب تک۔ اس سلسلے میں نورجہاں کا اس نے کوئی اثر نہ لیا تھا۔

۱۹۔ ر۔ ب، ج ۲ ص ۲۳۴ - ۳۵۔ معتمد خان اب دکن سے واپس آتا ہے۔ دیکھیے اقبال نامہ ۱۹۳!

۲۰۔ ر۔ ب، ج ۲ ص ۲۳۶۔ جہانگیر اپنے لڑکے سے اتنا برافروختہ ہوا کہ اس نے بندوق سے شکار نہ کرنے کی قسم کھائی تھی وہ توڑ دی تھی یہ قسم اس نے شاہ جہان کے لڑکوں کی محبت و دلداری کے سلسلے میں کھائی تھی۔ دھول پور کے معاملات کا بیان سورت کے ایک خط میں ہے (ہندستان میں انگریزی کارخانے ص ۱۹۰ اور ۹۲)

۲۱۔ اقبال نامہ ص ۱۹۴، قزوینی ف ۱۰۴ صالح ج ۱ ص ۱۲۸ - ۹۹

۲۲۔ ر۔ ب۔ ج ۲ ص ۲۳۷، قزوینی ف ۱۰۴ اب

۲۳۔ ر۔ ب، ج ۲ ص ۲۳۸ - ۲۳۹؛ اقبال نامہ ص ۱۹۴

۲۴۔ ر اب ، ج ۲ ص ۲۸۷

۲۵۔ قزوینی اور معتمد خان دونوں شاہ جہان کے امن پسندارادوں پر اس کا ا نا محمول کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شاہ جہان کا شمال کی طرف کوچ کرنا شہنشاہ کی عیادت اور ایک مصالحت کرنے پر مبنی تھا لیکن یہ واقعہ کہ اسکے ساتھ ایک زبردست لشکر بھی تھا۔ اس کی نیک نیتی کی تکذیب کرتا ہے۔ اقبال نامہ ص ۲۰۰ قزوینی ۵۰ الب

۲۶۔ ر اب ، جلد ۲ ص ۲۴۷؛ اقبال نامہ ص ۲۰۰

۲۷۔ ر اب ، جلد ۲ ص ۲۴۹ - ۵۰ اور ڈیلاویل ص ۱۲۱؛

۲۸۔ ر اب ، جلد ۲۔ ص ۲۴۸۔

۲۹۔ ر اب ، ج ۲ ص ۲۴۹۔

۳۰۔ ر اب ، جلد ۲ ص ۲۵۰ اقبال نامہ ص ۲۰۰۔

۳۱۔ ر اب ، جلد ۲ ص ۲۵۱ اقبال نامہ ص ۲۰۱۔

۳۲۔ ر اب ، جلد ۲ ص ۲۴۹ اقبال نامہ ص ۱۹۹۔ معاصر جہانگیری نے معتمد خان کا نام بھی شامل کیا ہے ۔ (ق ۱۹۰)

۳۳۔ ڈیلاویل کہتا ہے کہ "آصف خان کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ بادشاہ نے اس کو حراست میں رکھ لیا ہے کیونکہ بغاوت کا شبہ تھا" (۱۲۱) رولی نے آگرہ سے سورت لکھ بھیجا کہ "بادشاہ ضرور آگرہ آئے گا اور آصف خان بحیثیت قیدی لالہ بیر سنگھ کے ہاتھ میں ہے (ہندستان میں انگریزی کارخانے ۱۶۲۲ - ۲۳ ص ۱۹۷)

۳۴۔ اقبال نامہ ص ۱۹۵ ۔

۳۵۔ واقعہ یہ ہے کہ آصف خان کا آگرہ بھیجا جانا محض مہابت خان کی خواہشات کے احترام میں تھا کیونکہ مہابت خان اس وقت تک دربار نہ آنا چاہتا تھا جب تک اس کا سخت دشمن آصف خان یہاں سے ہٹایا نہ جائے۔ معتمد خان کا قیاس ہے کہ نورجہان کا پہلا خیال یہ تھا کہ آصف خان کو بنگال بھیج دیا جائے ۔ ر اب ، ج ۲، ص ۲۴۵؛ اقبال نامہ ص ۱۹۵ ڈیلاویل لکھتا ہے کہ آصف خان سے متعلق آخری خبر کہ بادشاہ نے اس کو حکم دیا کہ خزانہ آگرہ سے ہٹا دیا جائے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو آصف خان اس پر اعتماد نہ تھا ؛ (ص ۵۹)

۳۶۔ غالباً اعتبار خان کو آگرہ سے خزانہ ہٹانے سے منع کیا۔ اگرچہ اقبال نامہ اور معاصر جہانگیری دونوں میں

---

1. Della Valle. 2. Willoughby.

احتیاطی اقدام کے لیے آصف خان کو حکم دیا جانا مذکور ہے۔ جہاں تک تزک جہانگیری کا سوال ہے اس وقت سے آگے تک اس کا لکھا جانا معتمد خان کے سپرد تھا، ملاحظہ ہو اقبال نامہ ص ۱۹۹ : معاصر جہانگیری ف ۱۸۹ اب ر، ب جلد ۲ ص ۲۴۸۔

۳۷۔ ر، ب، ج ۲ ص ۲۴۲۔

۳۸۔ اقبال نامہ ص ۱۹۸

۳۹۔ ر، ب، ج ۲ ؛ اقبال نامہ ص ۲۰۱، معاصر جہانگیری عبداللہ خان کے کردار کے صحیح ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شہنشاہ و ملکہ دونوں سے اُسے شکایت تھی ف ۱۹۰ ب) صالح کہتا ہے کہ جہانگیر نے اس لیے یہ عہدہ عبداللہ خان کو دیا تھا کہ اس کو یہ علم نہ تھا کہ شہزادہ کے ہمخیال وہ سازش میں شریک ہے وہ اطلاعات میں تصرف کرتا ہے غلط باتوں کو صحیح بتا دیتا ہے (ج ۱ ص ۱۷۱) عبداللہ خان کو ہربرٹ اس وقت کا "ہواپیا" کہتا ہے (ص ۹۵)

۴۰۔ ر، ب، ج ۲ ص ۲۵۴ ۔ ۵۵ ؛ اقبال نامہ میں قلیل معاملات ص ۲۰۲ ۔ ۲۰۳ اور معاصر جہانگیری ف ۱۹۱

۴۱۔ ر، ب، ج ۲ ص ۲۵۸ ۔ ۵۹ ۔ اقبال نامہ ص ۲۰۴

۴۲۔ ر، ب جلد ۲ ۔ ص ۲۵۹ ؛ اقبال نامہ ص ۲۰۳

۴۳۔ گوری شنکر ہیرا چند راوجھا " راجستھان کا اتہاس ص ۸۲۴ ۔ ۲۵۔

۴۴۔ اقبال نامہ ص ۲۰۹ ؛ ر، ب، ج ۲، ص ۲۷۱ ۔ ۷۲۔

۴۵۔ ر، ب، جلد ۲ ۔ ص ۲۷۴ ؛ اقبال نامہ ص ۲۱۰ ؛ معاصر جہانگیری ف ۱۹۲ ؛ معاصر الامرا ج ۱ ص ۷۰۶۔

۴۶۔ ر، ب، ج ۲ ص ۲۷۸

۴۷۔ ر، ب، ج ۲ ص ۲۷۸ ۔ ۷۹۔

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ صالح ج ۱ ص ۱۷۷

۵۰۔ ڈیلاویل لکھتا ہے کہ "قطب شاہ نے اس کی امداد نہ کی۔ اس کے باپ کا ڈر تھا۔ نہ اس کو اپنی مملکت سے باہر کیا اپنی عزت کا بھی خیال تھا۔ بلکہ اس کو ایک ایسے قلیل خطہ زمین پر قابض ہونے کی مسرت حاصل کرنے دی۔ جہاں وہ پہنچ چکا تھا۔ (۳۱۹) ؛ "ٹامس اور جان" ڈ نے جو مسولی پٹم سے سورت خطوط بھیجے ہیں ان میں انھوں نے وہ شرائط بیان کی ہیں جن کی بنا پر شاہ جہان کو گول کنڈہ میں آنے کی اجازت ملی تھی (ہندستان میں انگریزی کارخانے ص ۳۱۳ ۔ ۱۵) تک قزوینی ف ۱۰۶ ؛ اقبال نامہ ص ۲۱۵ ر، ب، ج ۲ ص ۲۹۱ :

مدافعت السلاطین ف ۲۲۹ : فتوحات عادل شاہی ف ۲۸۵ - ۸۷۰

۵۱۔ جہانگیر نے شاہجہاں کی اس نقل وحرکت کا مشاہدہ کیا - ر، ب، جلد ۲ ص ۲۸۰ - ۲۸۱ - صالح ج ۱ - ص ۱۷۷ - ۷۸ -

۵۲۔ اقبال نامہ اس شخص کا نام زمیندار گردھر بتاتا ہے (ص ۲۱۷)

۵۳۔ صالح میں لکھا ہے کہ احمد بیگ نے شاہ جہان کا راستہ بند کر دیا۔ ایک لڑائی لڑا، ہار گیا۔ تب پسپا ہو کر بنگال گیا (ج ۱۔ص ۱۷۹)

۵۴۔ ر، ب، ج ۲ ص ۲۹۹ : اقبال نامہ ص ۲۱۸ : صالح ج ۱ ص ۱۸۰۔

۵۵۔ قزوینی ف ۱۰۶ ب : اقبال نامہ ص ۲۱۹، ابراہیم خان اکبر نگر کے قلعہ میں پناہ گزیں نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنے لڑکے کے مقبرے میں پناہ لی ۔ یہ جگہ مختصر تھی یہاں آسانی سے مدافعت ہو سکتی تھی ۔

۵۶۔ اس جنگ کے مفصل بیانات کے لیے دیکھیے اقبال نامہ ص ۲۱۹ - ۲۲ - معاصر جہانگیری ف ۱۹۲ صالح ص ۱۸۱ - ۸۴ - تک۔ قزوینی ف ۱۰۶ - ۱۰۷ ب

۵۷۔ اقبال نامہ ص ۲۲۲ - معاصر جہانگیری ف ۱۹۸ ب

۵۸۔ اقبال نامہ ص ۲۲۲ روہتاس کی مفصل روداد کے لیے دیکھیے قزوینی ف ۱۰۷

۵۹۔ ر، ب - ج - ۲ - ص ۲۹۴ -

۶۰۔ اقبال نامہ ص ۲۳۲ - ۳۴ - جنگ کی مفصل روداد کے لیے دیکھیے معاصر جہانگیری ف ۲۰۲ ب - ۲۰۵ - قزوینی صرف یہ کہتا ہے کہ شاہ جہان اپنے مشیر کاروں کے مشورہ سے جون پور سے پسپا ہوا صالح کا خیال ہے کہ اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ جو فوج اس کے باپ کے خلاف بھیجی ہے اس کا مقابلہ کرے ج ۱ - ص ۱۸۷

۶۱۔ اقبال نامہ ص ۲۳۹

۶۲۔ اقبال نامہ ص ۲۴۴

۶۳۔ اقبال نامہ ص ۲۴۸ - ۴۹

۶۴۔ اقبال نامہ ص ۴ - ۲۷ - قزوینی دس لاکھ بتاتا ہے (ف ۱۰۹ ب)

۶۵۔ اقبال نامہ ص ۲۴۵ - معاصر جہانگیری کا کہنا ہے کہ وہ اس لیے برطرف کیا گیا کہ امراء دکن اس سے مطمئن نہ تھے (ف ۲۱۳)

۶۶۔ بینگھم[1] نے یہ لڑائی دیکھی تھی اس کا ایک مکمل بیان پیش کرتا ہے (ہندستان میں انگریزی کارخانے ۱۹۲۴ء

1- Bangham.

۲۹) ص ۱۵۱ - ۵۳ تک

۶۷ - فتوحاتِ عادل شاہی ف ۲۹۳ - ۹۵ - حدیقۃ السلاطین ف ۲۲۹

۶۸ - صالح ج ۱ ص ۱۹۳ -

۶۹ - عالم آرائے عباسی ف ۲۴۳ ب ۴۴ - جامع الانشا: ۲۱۱ - ۱۴ -
جامع المراسلات ف ۲۱۴ - ۱۶ - جامع المراسلات ف ۲۲۸

۷۰ - عالم آرائے عباسی ف ۲۷۵ ب - ۱۷۶ جامع الانشا ف ۲۱۴ - ۲۱۶ جامع المراسلات ف ۲۲۸

۷۱ - عالم آرائے عباسی ف ۲۷۵ - ۷۶ -

۷۲ - جامع الانشا ف ۲۱۶ - ۱۸: جامع المراسلات ف ۲۲۷ -

۷۳ - اقبال نامہ ص ۲۸۰

۷۴ - جامع المراسلات ف ۲۲۷

۷۵ - اقبال نامہ ص ۲۸۹: قزوینی ف ۱۱۱ ب - عصری بیان کے لیے ملاحظہ ہو خطوط صدر کیمبرج بنام
ایسٹ انڈیا کمپنی (ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۲۴ - ۲۹) ص ۲۰۴ - ۲۰۵

۷۶ - اقبال نامہ ص ۲۹۴ - قزوینی ف ۱۳۶ ب - شہریار سے نورجہاں کی بہی خواہی کے لیے ملاحظہ ہو
(ہندستان میں انگریزی کارخانے) ۱۶۲۴ - ۲۹) ص ۱۷۱ - ۷۲ -

۷۷ - اقبال نامہ ص ۲۹۴ - قزوینی ف ۱۱۴

۷۸ - اقبال نامہ ص ۲۹۹: قزوینی ف ۱۱۴؛ لاہوری کہتا ہے کہ چونکہ آصف خان نے بلاقی (داور بخش) کی
بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اس نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان شہزادوں کو اپنے پاس رکھے - اس لیے ان کو
صادق خان کے سپرد کر دیا (ج ۱ ص ۷۲)

۷۹ - اقبال نامہ ص ۲۹۶ - ۹۷: قزوینی ف ۱۱۵ - ۱۶

۸۰ - اقبال نامہ ص ۲۹۴

۸۱ - اقبال نامہ ص ۲۹۴

۸۲ - اقبال نامہ ص ۲۹۸: قزوینی ف ۱۱۷ ب مراۃ الاحمدی ف ۸۱ ب

۸۳ - اقبال نامہ ص ۲۹۹: قزوینی ف ۱۱۸

۸۴ - اقبال نامہ ص ۳۰۰ - قزوینی ف ۱۱۸ مرۃ الاحمدی ف ۸۲ -

۸۵ - قزوینی ف ۱۱۹؛ اقبال نامہ ص ۳۰۱ -

۸۶۔ قزوینی ف ۱۲۰: اقبال نامہ ص ۳۰۳

۸۷۔ قزوینی ف ۱۲۰۔ لاہوری کا بیان ہے کہ کرن سنگھ کو پنج ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار کا منصب دیا گیا تھا۔ ج ۱ ص ۔ ۸۰۔ گوری شنکر ہیرا چند راوجھا کی کتاب راجستھان کا اتہاس ص ۸۲۹۔

۸۸۔ قزوینی، لاہوری اور معتمد خان نے صاف صاف لکھا کہ جملہ پانچوں شہزادے شاہ جہاں کے حکم سے قتل کیے گئے لیکن ایران کی تاریخی تحریروں میں اور بعض مغربی سیاحوں کے مراسلات میں ہم کو ایک عجیب قصہ نظر آتا ہے کہا جاتا ہے کہ بلاقی یا داور بخش نے اپنی جگہ دوسرے شخص کو سپرد کر کے اپنی جان بچا لی ۔ (طاہر وحید، ف ۱۷۰ ب) جامع المراسلات میں شاہ کے دو خطوط سلطان بلاقی کے نام ہیں (ف ۲۹۳ خلد بریں ف ۲۵۹۔ ب ۱۲۱ اب؛ منڈلسلو[1] بھی قزوینی میں بلاقی کی موجودگی کی شہادت دیتا ہے ص ۱۱۹ ہربرٹ بھی یہی کہتا ہے ۔ منوچی[2] (ج ۱ ص ۱۸۱) اور ٹیورنیر (ج ص ۳۲۸) بھی یہی کہانی دُہراتا ہے اور آخر الذکر یہ بھی لکھتا ہے کہ برنیر نے بلاقی کو دیکھا اس سے باتیں کیں ص ۳۲۹) لیکن گووا کے وائسرائے نے جو خط بادشاہ فلپ کو لکھا ہے اس میں کہتا ہے کہ یہ شخص فریبی ہے (ہندستان میں انگریزی کارخانے) (۱۶۳۰-۳۳) ج ۱ لبزا

۸۹۔ تخت نشینی کے مفصل احوال کے لیے ملاحظہ ہو قزوینی ف ۱۲۱-۳۲؛ لاہوری ج ۱ ص ۸۲ - ۹۹ لاہوری لکھتا ہے کہ شاہ جہاں نے شہاب الدین کا لقب آصف خان کی تجویز سے اختیار کیا (ص ۹۶)

---

1. Mandelslo 2. Manucci

باب ۴

۱۔ خان جہان کے بزرگوں اور اس کی ابتدائی زندگی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "مخزن افاغنہ": راب ،ج ۱،
ص ۸۷ ۔ ۸۹،، معاصر الامرا ، ج ۱ ص ۱۲ ۔ ۲۲ تک

۲ راب ،ج ۲ ، ص ۲۹۰

۳۔ اقبال نامہ ص ۲۲۹ ۔ ۳۱: معاصر الامرا ، ج ۱ صفحات ۷۷۵ ۔ ۹۳

۴۔ اقبال نامہ ص ۲۳۱

۵ اقبال نامہ ص ۲۲۵

۶۔ اقبال نامہ ص ۲۷۹

۷۔ صرف معتمد خان رشوت کا ذکر کرتا ہے ۔ دوسرے لوگ مع قزوینی ، لاہوری ، نیز شاہ نواز خان بھی اس بات پر
خاموش ہیں ۔شاہ نواز خان کہتا ہے کہ خان جہان نے جب یہ افواہ سنی کہ مہابت خان مانڈو پر چڑھ آیا ہے تو اس
نے نظام الملک سے یارانہ کرلیا ۔ (اقبال نامہ ص ۲۸۴ ۔قزوینی ف ۱۱۸ ،لاہوری ج ۱ ص ۷۶ : معاصر الامرا ،
ج ۱ ، ص ۲۲)

۸۔ خان جہان نے اپنے لڑکے کو بروچ دیا تھا اور اس صوبہ کی تمام جاگیروں میں حتیٰ کہ نزیاد میں بھی بلاقی
کے نام پر خطبہ پڑھا گیا ۔ (ہندستان میں انگریزی کارخانے ص ۲۳۳)

۹۔ معاصر الامرا ، ج ۱ ص ۲۲)

۱۰ قزوینی ف ۱۱۸ ، ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۲۴ ۔ ۲۹) ص ۲۴۱ ؛

۱۱۔ قزوینی ف ۱۱۸ ؛ لاہوری ج ۱ ص ۷۶

۱۲ قزوینی ۱۷۹ ب : لاہوری ج ۱ ص ۷۶

۱۳۔ قزوینی ف ۱۸۰ ؛ معاصر الامرا نے لکھا ہے کہ خان جہان نے شاہجہان کو موتیوں کا ایک ہار بھیجا (ج ۱،
ص ۷۲۳)

۱۴۔ لاہوری ج ۱ ص ۲۷۳

۱۵۔ معاصرالامراء ج ۱ ص ۷۲۳

۱۶۔ معاصرالامراء ج ۱ ص ۷۲۴

۱۷۔ قزوینی ف ۱۸۰ اب ۔ ۱۸۱؛ لاہوری صفحات ۲۷۴ ۔ ۲۷۵

۱۸۔ قزوینی ف ۱۱۵ ب، لاہوری ج ۱ صفحات ۷۲ ، ۷۳

۱۹۔ جب خان جہاں ہتھیاپل کے دروازے پر پہنچا تو اس نے بآواز بلند کہا اے خدا میں اپنی عزت بچانے کے لیے گریز کر رہا ہوں میرا کوئی ارادہ بغاوت کا نہیں (معاصرالامراء ج ۱ ص ۷۲۵

۲۰۔ قزوینی صفحات ۱۸۰ ۔ ۸۳ ب؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۲۷۶ سے ۸۰ تک

۲۱۔ معاصرالامراء ج ۱ ص ۷۲۶

۲۲۔ قزوینی ف ۱۹۲؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۰۴ ۔ ۳۰۵؛ معاصرالامراء نے خان جہان کی نیم دلی کا ایک پرلطف قصہ بیان کیا ہے ۔ لکھا ہے کہ جنگ کے دن خان جہان آرام سے پالکی میں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا ۔ اس بات پر اس کے لڑکے عزیز نے اس سے کہا اگر آپ لڑنا چاہتے ہیں تو گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کیجیے اس سے کیا فائدہ کہ آپ ان لوگوں کی جان بلاوجہ لے رہے ہیں ؟ خان جہان نے جواب میں دریافت کیا کہ تم یہ سوچ سکتے ہو کہ ہم شاہی فوج سے جیت سکتے ہیں ؟ خدا اس کی طرف ہے ۔ میں ایک پرسکون فضا اپنے رویّے سے پیدا کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم ایک موقع عروج کرنے کا پا جاؤ اور میں چلا جاؤں (معاصرالامراء) (ج ۱ ۔ صفحات ۷۲۶ ۔ ۲۷)

۲۳۔ قزوینی ف ۲۰۰؛ لاہوری ج ۱ ص ۳۲۱

۲۴۔ قزوینی ف ۲۰۰ ب ۔ ۲۰۲ ب؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۲۲ ۔ ۲۶ ۔

۲۵۔ قزوینی ف ۲۰۲ ب؛ لاہوری ج ۱ ص ۳۲۶

۲۶۔ قزوینی ف ۲۰۷؛ لاہوری صفحات ۳۳۴ ۔ ۳۵

۲۷۔ لاہوری ج ۱ ص ۳۳۶؛ قزوینی ف ۲۰۷ ب

۲۸۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۳۸ ۔ ۳۹ قزوینی ف ۲۰۸ ۔ ۲۰۹ ب

۲۹۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۴۸ ۔ ۵۲ قزوینی ف ۲۱۶ ب ۔ ۲۱۷ ب

۳۰۔ معاصرالامراء ج ۲ صفحات ۱۹۷ ۔ ۹۹؛ اس کے آباؤ اجداد کے لیے شیخ جلال حصاری کی تاریخ ملاحظہ ہو ف ۱۳۷ ۔ ۳۹ ب اور چہرہ برکاشا ۔

۳۱۔ شیخ جلال حصاری ف ۱۳۹ ۔ ب

۳۲۔ قزوینی ف ۱۵۲؛ لاہوری ج ۱ ص ۱۹۶

۳۳۔ قزوینی ف ۱۲۸ ب: لاہوری نے کوئی وجہ اس کے اچانک فرار ہونے کی نہیں لکھی۔ (ج ۱ ص ۲۰۳) شیخ جلال متفق ہے قزوینی سے (ف ۱۴۰) معاصر الامراء ج ۲ ص ۲۱۵

۳۴۔ قزوینی و لاہوری جھجار کے تعاقب چھوڑنے کے لیے ہم زبان ہیں کہ شہنشاہ نے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دیا۔ قزوینی ف ۱۲۸ب؛ لاہوری صفحات ۲۰۳-۲۰۴

۳۵۔ معاصر الامراء ج ۲ صفحات ۲۱۳-۱۴؛ قزوینی ف ۱۲۹

۳۶۔ قزوینی ف ۱۲۹؛ لاہوری یہ نہیں کہتا کہ اسلام خان کا تقرر مہابت خان کے جوش کو معتدل کرنے کے لیے ہوا (ج ۱ ص ۲۴) شیخ الاسلام ف ۱۴۰

۳۷۔ معاصر الامراء ج ۲ صفحات ۲۵۶-۶۰

۳۸۔ قزوینی ف: ۱۱۷۲ صلح کی گفت و شنید لاہوری کے نزدیک اراج کی فتح کے بعد شروع ہوئی۔ (جلد ۱ ص ۲۴۶) اس ضمن میں شیخ جلال حصاری کا بیان تشنہ ہے۔

۳۹۔ چھتر پرکاش، تعارف صفحات ۱۰۹۔ شیام سندر داس نے بدقسمتی سے بندیل کھنڈ کے دونوں حملوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔

۴۰۔ قزوینی خاص طور پر مہابت خان کا نام نہیں لیتا ف (۱۷۲) لیکن لاہوری نے واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ (ج ۱۔ ص ۲۴۲) شیخ جلال لاہوری سے متفق ہے۔

۴۱۔ قزوینی ف: لاہوری ج ۱ ص ۲۵۴-۲۵۵

۴۲۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۲۹۶-۳۰۳

۴۳۔ لاہوری ج ۱ ص ۴۰۵

۴۴۔ قزوینی ف ۳۴۳؛ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۹۵؛ شیخ جلال ف ۱۴۰

۴۵۔ قزوینی ف ۲۱۳ ب لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۹۵۔ شیخ جلال ف ۱۴

۴۶۔ خان جہاں کے تعاقب کے سلسلے میں خدمات کے اعتراف میں وکرم جیت کو جگ راج کا خطاب عطا ہوا۔ قزوینی ف ۲۰۹ لاہوری ج ۱۔ ص ۳۹۹۔

۴۷۔ طباطبائی کہتا ہے کہ اللہ وردی خاں جو اس کی (جگ راج کی) راہ میں تھا اس نے بیشک اس کا پیچھا کیا۔ ف ۱۳۷ لیکن قزوینی، لاہوری اور شیخ جلال مذکورہ بالا رائے سے متفق ہیں

۴۸۔ وہ راجہ بھارت بندیلا کا لڑکا تھا اس کا انتقال ۱۶۳۳ء - ۳۴ میں ہوا۔ اس لیے سرداری کا حق دیبی سنگھ کو

تفویض ہوا (معاصر الامرا ج ۲ صفحات ۲۹۶ ۔ ۹۷

۴۹ ۔ جاریٹ ج ۲ ص ۱۸۸

۵۰ ۔ قزوینی ف ۳۴۴، طباطبائی ف ۱۳۷ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۹۲

۵۱ ۔ قزوینی ف ۳۴۸ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۹۸ ۔ ۹۹

۵۲ ۔ لاہوری ج ۱، حصہ ۲ ص ۹۹

۵۳ ۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۱۱۰ ۔ ۱۲؛ قزوینی ف ۳۵۳ ب اور ف ۳۵۷ ۔ ۵۹؛ شیخ جلال کا بیان صرف تیجزدھاموتی تک مفصل ہے کیونکہ اس کے بعد ہی اس کا سرپرست سید خان جہان جھجار سنگھ کے اس خزانہ کے برآمد کرنے پر تعینات کر دیا جو جنگل اور کنوئیں میں پوشیدہ تھا۔ لیکن چند الفاظ میں مصنف جھجار سنگھ کے زوال کا ذکر کرتا ہے

۵۴ ۔ اس بندیلا مہم کے حالات قلم بند کرنے کے صلہ میں قزوینی کو شاہی مراعات حاصل ہوئے (ف ۱۱۰ اور ف ۳۵۵ ۔ ۵۶ ۔ ب)

۵۵ ۔ چھتر پرکاش صفحات ۱۰ ۔ ۱۱ ۔ معاصر الامرا میں باقی خان کا حال ملاحظہ ہو، ج ۱ صفحات ۳۲۷ ۔ ۲۹ لاہوری ج ۲ ص ۱۳۶

۵۶ بندیلوں کی خلل اندازی کے سلسلے میں منظفر بارہہ خان جہان کے خطوط ملاحظہ ہوں۔ خان جہان گوالیار کا جیلر بھی تھا (رف ۱ ۔ ۲۵) لاہوری ج ۲ ص ۱۳۶؛ چھتر پرکاش ص ۲۵ ۔

۵۷ ۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۱۹۳ ۔ ۹۴

۵۸ ۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۲۲۱ اور ۲۴۷

۵۹ ۔ لاہوری ج ۱ ص ۲۴۷

۶۰ ۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۳۰۳ ۔ ۳۰۴ ۔ معاصر الامرا ج ۲ صفحات ۲۵۷ ۔ ۵۸؛ چھتر پرکاش صفحات ۳۰ ۔ ۳ پرگنہ کونچ چمپت کو عطا ہوا۔

۶۱ ۔ چھتر پرکاش، صفحات ۳۱ ۔ ۳۲ ۔

۶۲ ۔ ایضاً صفحات ۳۶ ۔ ۳۷

۶۳ ۔ معاصر الامرا ج ۲ صفحات ۱۵۷ ۔ ۶۰؛ راب ان ج ۱ ص ۴۹؛

Archeological survey of India Annual Report 1904-5 pp .50

۶۴- معاصر الامرا، ج ۲ صفحات ۱۷۶- ۱۷۹ اور صفحات ۲۳۸- ۱۴۱ (ب) ج ۲- صفحات ۵۷-۱۵۴ اور صفحات ۷۴- ۷۵

۶۵- شہریار اور شاہ جہاں کی لڑائی میں جگت سنگھ آخر الذکر کی طرف سے لڑا (قزوینی ف ۱۱۲- لاہوری کا کہنا ہے کہ وہ آصف خان کے ساتھ آگرہ آیا اور تین ہزار ذات اور پانچسو سوار کے منصب پر مستقل کر دیا گیا اور دسویں سال کے اختتام پر تین ہزار ذات اور دو ہزار سوار کی منصبداری پر قرار تھا (ج ۱ ص ۱۸۳)

۶۶- لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۹۱ قزوینی ف ۳۰۷

۶۷- لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۴۲، قزوینی ف ۳۴۴

۶۸- لاہوری ج ۲ ص ۱۳

۶۹- قندھار واپس لینے میں اس نے حصہ لیا اور سعید خان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا (لاہوری ج ۲ ص ۱۳۵)

۷۰- لاہوری ج ۲ ص ۱۴۴

۷۱- لاہوری ج ۲ ص ۱۹۰

۷۲- لاہوری ج ۲ صفحات ۲۳۷- ۳۸

۷۳- لاہوری ج ۲ ص ۲۳۹- شیخ جلال ف ۱۲۸ اب- ۱۳۰ ب

۷۴- لاہوری ج ۲ ص ۲۶۱- شیخ جلال ف ۱۳۰

۷۵- لاہوری ج ۲ صفحات ۲۶۱ تا ۷۸ تک

۷۶- شیخ جلال، ف ۱۳۵

۷۷- شیخ جلال، ف ۱۳۵

۷۸- عرض داشت ف ۲۰ ب- ۲۲۰

باب ۵

۱۔ امپیریل گزیٹر آف انڈیا۔ ج ۱۳ ص ۱۶۴ نیز مانریک بنگال میں پرتگالیوں کی تاریخ۔ بی۔ ش۔ ڈن ورس لکھتا ہے کہ تخمیناً اس زمانے میں بنگال میں پرتگالیوں کے اثرات بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ ہندستان میں پرتگالی ج ۱۔ ص ۴۲۲۔

۲۔ طباطبائی ف ۱۱ ب: قزوینی ف ۲۵۲: لاہوری ج ۱ ص ۴۳۴

۳۔ مانریک ج ۲ ص ۲۹۲ (کبرال کے خطوط)

۴۔ مانریک ج ۲ ص ۳۹۳

۵۔ برنیر صفحات ۱۷۴۔ ۱۷۶ قزوینی ۲۵۲ ب

۶۔ ڈن ورس ج ۲ ص ۲۴۶: قزوینی کی نظر ست گاؤں کے انحطاط پر ہے (ف ۲۵۲)

۷۔ مانریک ج ۲ ص ۳۱۴۔

۸۔ جے۔ کبرال کے خطوط

۹۔ ایضاً

۱۰۔ جے۔ کبرال پرتگالیوں کی تاریخ کے احکام کے سلسلے میں شاہ جہاں کے مذہبی معتقدات پر زور دیتا ہے۔ قزوینی (ف ۲۵۳ ب) اور لاہوری (ج ۱ صفحات ۴۳۴۔ ۳۵) مذہبی جذبات کا اثر دوسرے درجہ پر لاتے ہیں۔ لیکن ان کا اثر سیاسی اہمیت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مگر ڈن ورس غلط طریقہ پر سوچتا ہے کہ ہوگلی پر شاہ جہاں کا یہ حملہ دکنی شکست کی تلافی کے لیے تھا (ج ۲ ص ۲۴۷) کبرال کا بھی خیال ہے کہ مغلوں کی نظر بندی کی دولت پر تھی۔ منوچی کی رائے میں اس حملہ کی وجہ ممتاز محل کا سخت اصرار تھا۔

۱۱۔ قزوینی ف ۲۵۲ ب ۵۳۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۴۳۵۔ ۳۶۔ کبرال، قاسم خان کو بادشاہ کا قابل قدر دوست سمجھتا تھا۔ قزوینی اور لاہوری کی طرح وہ بھی کہتا ہے کہ قاسم خان ضرب لگانے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھا (مانریک ج ۲ ص ۲۹۶)

1- Manrique. 2- J. Cabral. 3- Danvers-

یہ تعداد مان ریکو کی بتائی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حفاظت کرنے والوں کی تعداد ۸۰ پرتگال اور ۴۰۰ غلاموں کی تھی۔ لیکن حملہ آوروں کی نظروں میں اتنی زیادہ تھی کہ حملہ کرنے کے پہلے انھوں نے محافظ کو حفاظت ترک کرنے پر اصرار کیا بہت سے وعدے و روپیہ کی لالچ دیتے رہے (ج ۲ ص ۳۲۳) ڈن ورس کی رائے میں پرتگالیوں کی تعداد دو سو تھی۔ (ج ۲ صفحات ۲۴۷ -۴۸)

۱۳۔ اس مصالحت کا بیان جے کبرال کے خطوط پر مبنی ہے

۱۴۔ قزوینی ف ۲۵۳

۱۵۔ برنیر صفحات ۷۶ / ۷۷ ، مان ریکو ج ۲ ص ۳۲۵ ؛ صفحات ۳۳۱ - ۳۳ : ص ۳۳۶ - اور صفحات ۳۳۹
۴۹ : منوچی ج ۱ ص ۱۸۳

۱۶۔ قزوینی ف ۳۱۳ ب

۱۷۔ قزوینی ف ۳۰۶

۱۸۔ قزوینی ف ۳۱۳ - ۱۷ ؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۲۸۱ - ۸۹ :

۱۹۔ بھٹاچاریہ کی تصنیف "شمالی و مشرقی سرحدوں کی مغلیہ پالیسی (The Moghul North East Frontier Policy) صفحات ۲۵۰ - ۹۷ : لاہوری ج ۲ صفحات ۶۴ - ۹۰

۲۰۔ قزوینی ف ۴۰۵ - ۸ ب ؛ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۲۷۱ - ۷۴

۲۱۔ قزوینی ف ۲۹۹ ب - ۳۴۰ : لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۷۳ - ۷۶

۲۲۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۳۵۶ - ۶۱ : ج ۱ ص ۱ب ۱۸۶ ؛ صفحات ۱۱۱ - ۴۴

۲۳۔ قزوینی ف ۲۵۹ ؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۴۴۹ -۵۰

۲۴۔ لاہوری ، ج ۲ ، صفحات ۲۷۰ - ۷۲

۲۵۔ ر ا ب' ج ۱ ص ۲۱۸

۲۶۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۹۰ - ۱۳

۲۷۔ وارث ف ۱۴۲ ا ب ۱۴۳ ا ب

۲۸۔ وارث ف ۱۵۷ اور ف ۱۵۹ اب

۲۹۔ معاصر الامرا ج ۲ صفحات ۲۴۴ - ۴۷

۳۰۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۱۹۰ - ۹۱ ؛ قزوینی ف ۱۵۵ اب ۵۶

۳۱۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۲۱۱ - ۱۳ ؛ ف ۱۹۵ اب ۱۹۷

۳۲۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۱۲-۱۴

۳۳۔ لاہوری ج ۲ ص ۲۲۲

۳۴۔ وارث ف ۶۷ ب

۳۵۔ قزوینی ف ۳۸۷؛ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۰۷۔ صدر راٹسن ٹیل نے جو خطوط سورت سے ایران روانہ کیے (مئی ۱۲ اسٹائل ۱۶۳۱ء) ان میں اس افواہ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ بامسنگر نے شاہجہان کی مغربی سرحدوں پر تاتاریوں کے حکمران سے مل کر حملہ کر دیا۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۳۰-۱۶۳۳) ص ۱۶۰۔ بامسنگر کے لیے ملاحظہ ہو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی اُردو داد ۱۸۶۶ء ص ۲۱۸۔

باب ۶

۱۔ برہان معاصر ص ۱۹؛ فرشتہ ج ۱۱ ص ۹۴

۲۔ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۵

۳۔ برہان اول نے راستی خان کو ہمایوں کی خدمت میں اس التماس کے لیے بھیجا کہ ہمایوں دکنی بادشاہوں کے جتھا کے خلاف اس کی امداد کرے (فرشتہ ج ۱۱ ص ۱۱۹)

۴۔ ا۔ ا ن ج ۱۱۱ ص ۱۰۸؛ بدایونی ج ۱۱ (لوجے) ص ۱۶۴

۵۔ برہان اوّل نے بہادر شاد کے نام کا خطبہ پڑھا۔ (فرشتہ جلد ۲، ص ۱۰۷)

۶۔ ابوالفضل رقم طراز ہے کہ بہ مطابق اصول شہنشاہ کہ زود طلب معاملات کو کمتر معاملات پر ترجیح دی جائے۔ تسخیر دکن میں تاخیر کی گئی اور اس کی ساری توجہ مشرقی صوبجات پر قبضہ کرنے اور وہاں کے باغیوں کی سرکوبی پر ہوئی۔ (آ) ان ج ۱۱۱ ص ۱۰۹)

۷۔ ی لی باول: ہندستان میں آریہ حکومت باب ۲۔

۸۔ برہان معاصر ص ۱۰۹

۹۔ فرشتہ ج ۲ فتوحات عادل شاہی (ف ۱۸۳) تذکرۃ الملوک (ف ۱۳۵ ب) دونوں کا کہنا ہے کہ برہان اول نے پہلے بیجاپور میں پناہ لی۔

۱۰۔ ا۔ ا ن ج ۱۱۱ صفحات ۹۰۹، ۹۸۳

۱۱۔ ا۔ ا ن ج ۱۱۱ صفحات ۱۰۴۵ ۔ ۴۸

۱۲۔ یہ سلیم کی بغاوت تھی۔

۱۳۔ ملک عنبر کے عروج کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الملوک ف ۲۳۴، ۸؛ فتوحات عادل شاہی ف ۲۲۲ب

۱۴۔ فتوحات عادل شاہی ف ۲۹۴ اور ۳۲۵۔

۱۵۔ فتوحات عادل شاہی ۳۲۵

۱۶۔ فتوحات عادل شاہی ف ۳۲۵؛ اقبال نامہ ص ۲۸۳

۱۷۔ اقبال نامہ ص ۲۸۴

۱۸۔ لاہوری ج ۱ ص ۱۹۹

۱۹۔ قزوینی ف ۱۷۵؛ لاہوری ج ۱ ص ۲۵۷

۲۰۔ قزوینی ف ۱۸۹؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۲۹۲ - ۲۹۴۔

۲۱۔ لاہوری ج ۱ ص ۲۹۳

۲۲۔ قزوینی ف ۱۹۴؛ لاہوری ج ۱ ص ۳۱۰

۲۳۔ قزوینی ف ۲۰۹ - ۲۱۱؛ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۳۹ - ۴۳۔

۲۴۔ رندولا خان نے شاہجہان کی نیک نیتی بجانب عادل شاہ کے ثبوت میں دھارور کا مطالبہ کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے قزوینی ف ۲۱۱ ب: لاہوری ج ۱ صفحات ۳۴۴ - ۴۶

۲۵۔ لاہوری ج ۱ ص ۳۵۶

۲۶۔ قزوینی ۲۱۳ ب: لاہوری یہ نہیں لکھتا کہ اعظم نے یہ اقدام آصف خان کی تجویز پر کیا۔ (صرف لاہوری ج ۱ ص ۳۵۶)

۲۷۔ قزوینی ف ۲۱۴

۲۸۔ قزوینی ف ۲۱۴ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۵۷ - ۵۸

۲۹۔ قزوینی ف ۲۱۴ ب ۱۵: لاہوری ج ۱ صفحات ۳۵۸ - ۶۰

۳۰۔ قزوینی ف ۲۱۶ اور ف ۲۲۷ - ۲۸ ب: لاہوری ج ۱ صفحات ۳۶۴ - ۶۶۔

۳۱۔ قزوینی ف ۲۲۳۔ لاہوری ج ۱ ص ۳۶۷

۳۲۔ فتوحات عادل شاہی ف ۳۲۵ ب

۳۳۔ قزوینی ف ۲۲۹ - ۲۹ ب: لاہوری ج ۱ صفحات ۳۷۸ - ۷۹

۳۴۔ قزوینی ف ۲۳۸ ب۔ لاہوری ج ۱ ص ۴۰۲: فتوحات عادل شاہی ف ۲۲۳ ب ۲۵۔ حدیقۃ السلاطین ف ۲۴۳ ب ۴۴: طباطبائی ف ۴ ب۔

۳۵۔ لاہوری ج ۱ ص ۴۰۲: قزوینی ف ۲۲۹

۳۶۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۴۰۹ - ۱۰: قزوینی ف ۲۳۱: ف ۲۴۴ ب ۴۵

۳۷۔ لاہوری ج ۱ ص ۴۲۴: قزوینی ۲۴۷: حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے کہ فتح خان سپرگی کے بعد پنج ہزاری بنا دیا گیا یعنی ۵۰۰۰ کا سپہ سالار (ف ۲۴۹ اور ف ۲۵۰ ب)

۳۸۔ قزوینی (ف ۲۴۸) فتوحات عادل شاہی میں لکھا ہے کہ جب شہنشاہ نے اللہ وردی خان کو بیجاپور بھیجا کہ آصف خان کو بلا لائے اور اس کی بھی اطلاع کر دے کہ دکن میں نائب سلطان کا عہدہ دیا جانے والا ہے تو آخر الذکر نے قاصد سے بطور راز یہ کہا کہ میں اپنی ملتان اور لاہور کی جاگیر بلکہ شہنشاہ مجھے اور جو کچھ عطا کرنے کے خیال میں ہوں سب سے باز دعویٰ دینے کو تیار ہوں لیکن میں دربار سے دور نہیں رہنا چاہتا" جب اللہ وردی خان نے شاہ جہاں کو اس بات کی اطلاع دی تو اس نے اپنے احکام منسوخ کر کے مہابت خان کو بحیثیت نائب سلطان مقرر کیا (فتوحات ف ۳۲۴) لاہوری کا کہنا ہے کہ مہابت خان کا تقرر اعظم خان کی نااہلی کی وجہ سے ہوا۔ (ج ۱ ص ۴۷۴)

۳۹۔ لاہوری ج ۱ ص ۴۲۲ : قزوینی ف ۲۴۷

۴۰۔ قزوینی ف ۲۵۵ - ۵۶ : لاہوری ج ۱ ص ۴۴۱ - ۴۴

۴۱۔ قزوینی ف ۲۷۸ ب : لاہوری ج ۱ ص ۴۹۷

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ قزوینی ف ۲۷۹ - ۹۹ : لاہوری ج ۱ صفحات ۴۹۷ - ۵۳۱

۴۴۔ لاہوری ج ۱ ص ۵۳۲ : قزوینی ف ۹۹ ب

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ قزوینی ف ۲۹۹ - ۳۰۲ : لاہوری ج ۱ صفحات ۵۳۳ - ۵۴۰

۴۷۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۳ : قزوینی ف ۳۱۹

۴۸۔ معاصر الامراء ج ۱۱۱ صفحات ۲۷۹ - ۸۵

۴۹۔ معاصر الامراء ج ۱ صفحات ۲۰۷ - ۱۵

۵۰۔ قزوینی ف ۳۳۶ - ۳۷ : لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۶۸ - ۷۰

۵۱۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۱۰۴ - ۱۰۵ : قزوینی ف ۳۴۹ ب - ۵۰

۵۲۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۱۳۰

۵۳۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۱۳۵

۵۴۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۱۳۵ - ۳۶ : قزوینی ف ۳۶۳ - ۳۶۴

۵۵۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۱۴۶ - ۴۸ - قزوینی ف ۳۶۸ - ۷۰

۵۶۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۲۱۰ - ۲۱ : قزوینی ف ۳۹۱ - ۹۲ ب

۵۷۔ لاہوری ج ا حصّہ ۲ صفحات ۲۰۲۔۲۰۵ قزوینی ف ۳۸۵۔ ۸۶ب

۵۸۔ لاہوری ج ا حصّہ ۲ صفحات ۲۱۷۔۲۱ قزوینی ف ۳۹۱۔ ۹۲ب

۵۹۔ لاہوری ج ا حصّہ ۲ صفحات ۲۲۵۔۳۰ قزوینی ف ۳۹۴۔ب ۹۷ب

۰ سرکار اورنگ زیب ج ا ص ۴۸۔ کنکیڈ و پارا سنس" مرہٹہ قوم کی تاریخ، ج ا صفحات ۱۱۷۔۲۱

۶۰۔ سرکار - تاریخ اورنگ زیب ج ا ص ۳۱

۶۱۔ " " " صفحات ۳۹۔ ۵۲

۶۲۔ " " " " ۱۹۱۔۹۲۔ معاصر الامراء ج ۲ صفحات ۴۹۳۔۵۰۰

1- J. N. Sarkar. History of Aurangzeb

باب ۷

۱۔ ا ا ن، ج ۳ ص ۸۸
۲۔ فرشتہ: ج ۲ ص ۴۷
۳۔ ا ا ن ج ۳ ص ۱۱۷۱
۴۔ ا ا ن، ج ۳ ص ۱۲۳۹: تذکرۃ الملک ف ۲۳۵ ب ۲۲۷: فتوحاتِ عادل شاہی ف ۲۵۰
۵۔ فتوحات میں ہے کہ احمد نگر کی تسخیر کے بعد ملک عنبر کافی عرصے تک بیجاپور میں رہا (ف ۲۶۱ ب)
۶۔ فتوحات ف ۲۸۷ - ۵۹۰ بینی پرشاد تاریخ جہانگیر ص ۳۸۷
۷۔ ایضاً ایضاً ص ۳۸۹ - ۹۰: فتوحات عادل شاہی ف ۲۸۶ب ۲۹۴
۸۔ ایضاً
۹۔ فتوحاتِ عادل شاہی ف ۲۹۴
۱۰۔ ایضاً ف ۲۹۷ ب اور ف ۳۱۵، بساطین السلاطین ف ۴۱
۱۱۔ ایضاً ف ۳۱۵ - ۱۹
۱۲۔ ایضاً ایضاً ۳۲۱ - ۲۱ب
۱۳۔ ایضاً ف ۳۲۱ ب قزوینی ف ۲۱۳ ب: لاہوری ج ۱ ص ۳۵۴
۱۴۔ بساطین السلاطین ف ۴۵ (ب)
۱۵۔ ملاحظہ ہو باب ۶ ن ۲۴
۱۶۔ قزوینی ۲۱۲ ب
۱۷۔ ایضاً ۲۱۳: لاہوری ج ۱ ص ۳۵۵
۱۸۔ قزوینی ف ۲۱۳ ب لاہوری ج ۱ ص ۳۵۸
۱۹۔ لاہوری ج ۱ ص ۳۷۹: قزوینی ف ۲۱۳ ب بساطین السلاطین میں لکھا ہے کہ معین الدین اس لیے روک لیا گیا تھا کہ مغلوں نے خلاف معاہدہ بیجاپور، دھارور پر حملہ کر دیا تھا (ف ۴۶): حدیقہ میں ہے کہ سفیر اس لیے روکا گیا تھا

کہ شاہ پرستوں نے سرحد بیجاپور پر غارت گری کی اور قطب شاہ نے معین الدین کے لیے روپیہ بھیجا (ف ۲۴۴ آ)

۲۰ - قزوینی ف ۲۲۹ب ؛ لاہوری ج ۱ ص ۳۷۹

۲۱ - ایضاً ف ۲۳۰ : ایضاً ج ۱ ص ۳۸۰ - ۸۱

۲۲ - لاہوری ص ۴۱۱ - ۱۲ ؛ قزوینی ف ۲۴۲ .

۲۳ - قزوینی ف ۲۴۲ب

۲۴ - ایضاً ایضاً : لاہوری ج ۱ ص ۴۱۳ حدیقۃ السلاطین ف ۲۴۹

۲۵ - ایضاً

۲۶ - قزوینی ف ۲۴۳ب - لاہوری ج ۱ ص ۴۱۴

۲۷ - فتوحات عادل شاہی ف ۳۲۳ب ، حدیقۃ السلاطین ف ۲۴۹

۲۸ - قزوینی ف ۲۴۳ب - ۴۴ : لاہوری ج ۱ صفحات ۴۱۴ - ۱۶ ؛ فتوحات عادل شاہی ف ۳۲۳ب

۲۹ - ایضاً

۳۰ - ایضاً

۳۱ - ایضاً

۳۲ - ایضاً

۳۳ - لاہوری ج ۱ ص ۴۱۶ ؛ قزوینی ف ص ۲۴۴

۳۴ - دیکھو ، ن ۲۸

۳۵ - فتوحات میں ہے کہ آصف خان کی ناکامیابی پر شاہ جہاں بہت برافروختہ ہوا لیکن آصف خان نے قیمتی تحائف نذر کرکے راضی کر لیا - (ف ۳۲۴)

۳۶ - بساطین میں لکھا ہے کہ مراری پنڈت نے مغل فوج کا پیچھا کیا (ف ۴۷)

۳۷ - ملاحظہ ہو باب ۷ ن ۷۴

۳۸ - لاہوری ج ۱ ص ۵۳۷ ؛ قزوینی ف ۳۰۰

۳۹ - قزوینی ف ۳۰۰ب - ۳۰۱ ؛ لاہوری ج ۱ ص ۵۳۷ - ۳۶

۴۰ - لاہوری ، ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۴ ؛ قزوینی ف ۳۱۹ ب

۴۱ - لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۵ ؛ ایضاً ایضاً ب ۲۰

۴۲ - ایضاً ایضاً

۴۳۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۶: قزوینی ف ۳۲۰

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ قزوینی ف ۳۲۰ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۳۶۔۳۹

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ قزوینی ف ۳۲۱۔۲۲: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۳۹، ۴۲

۴۸۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۴۵: قزوینی ف ۳۲۴

۴۹۔ قزوینی ف ۳۲۴۔۲۵: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۴۵

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ لاہوری ۱ حصہ ۲ ص ۴۷: قزوینی ف ۳۲۵ ف

۵۳۔ قزوینی (ف ۳۳۲ ب) اور لاہوری (صفحات ۵۹۔۶۰ ج ۱ حصہ ۲) نے مختصر سا تذکرہ مہابت کی موت کا کیا ہے آخرالذکر معتمد خان کے اس قطعہ تاریخ کا حوالہ دیتا ہے۔ "ان بجال ہوا" اس عظیم سپہ سالار کی سوانح عمری کے لیے بلاحظہ ہو مآثرالامراء ج ۳ ص ۳۸۵۔۴۰۷۔ حدیقۃ السلاطین ف ۲۶۵۔۶۶۔ فتوحات عادل شاہی ف ۳۲۲۔۲۳ ب

۵۴۔ فتوحات عادل شاہی ف ۳۲۲۔۲۳ ب

۵۵ ایضاً ف ۳۳۱ لیکن قزوینی (ف ۳۵۵) اور لاہوری (ج حصہ ۲ ص ۱۱۸) کا کہنا ہے کہ دربار میں اس کا استقبال گرمجوشی سے ہوا یہاں تک کہ شاہ جہان نے بھی احترام سے کھڑا ہوا۔

۵۶۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۱۲۶۔۳۰۔

۵۷۔ فتوحات عادل شاہی ف ۳۳۵۔۴۱ حدیقۃ السلاطین کے بموجب عبداللہ قطب شاہ نے بھی خواص خان کے زوال و موت میں حصہ لیا (ف ۲۶۷ ب۔۷۰)

۵۸۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۱۴۴: قزوینی ف ۳۶۸

۵۹۔ قزوینی ف ۳۶۷ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲، ص ۱۴۳۔

۶۰۔ ایضاً ۳۶۸: لاہوری ج ۱ حصہ ۲، ص ۱۴۴

۶۱۔ ان سپہ سالاروں کی نقل و حرکت کے لیے دیکھیے قزوینی ف ۳۷۱۔۷۷: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۱۵۱۔۶۵۔

۶۲۔ ان لوگوں کے نام یہ ہیں شاہ اور ریشیخ دبیر، قاضی ابو سعید اور میر ابوالحسن

۶۳۔ فتوحات عادل شاہی ۔ ف ۳۴۸ ب

۶۴۔ قزوینی ف ۳۸۱ ۔ ۸۳ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۲۶۷ ۔ ۷۰: فتوحات عادل شاہی
ف ۳۴۹ ۔ ۵۱

۶۵۔ فتوحات عادل شاہی ف ۳۹۹ ۔ ۴۰۰ ب لاہوری نے صرف میر جیب کی آمد اور مظفر حسین کے
ہمراہ اس کا جانا بیان کیا ہے ۔ (ج ۲ صفحات ۳۳۵ ۔ ۳۳۶)

۶۶۔ سرکار "تاریخ اورنگ زیب" ج ۱ ص ۲۵۵

۶۷۔ ایضاً ایضاً ایضاً

۶۸۔ ایضاً ص ۲۵۶

۶۹۔ ایضاً ص ۲۵۶ ۔ ۵۸

۷۰۔ ایضاً ص ۲۶۲

۷۱۔ تاریخ محمد قطب شاہی کا کہنا ہے کہ احمد بحری اور عادل خان کے ایما سے قطب الملک نے آزادی
اختیار کی (ف ۲۵)

۷۲۔ اکبر نامہ ج ۳ صفحات ۳۴۰ ۔ ۹۰۹ ۔ ۹۹۰، ۱۱۷۱ اور ۱۲۵۶

۷۳۔ بینی پرشاد، تاریخ جہانگیر ص ۳۳۵

۷۴۔ حدیقۃ السلاطین ف ۲۰۹

۷۵۔ حدیقت ف ۲۱۱

۷۶۔ " ف ۲۳۱

۷۷۔ قزوینی ف ۲۲۲ ب: حدیقت ۔ حدیقت ف ۲۳۷: لاہوری ج ۱ صفحات ۲۶۶ ۔ ۶۷

۷۸۔ حدیقت ف ۔ ۲۴۹ ب

۷۹۔ حدیقہ ف ۲۳۸ ب ۳۹: قزوینی ف ۲۰۶ ۔ ۷: لاہوری، ج ۱ صفحات ۳۳۲ ۔ ۳۴

۸۰۔ حدیقت ف ۲۴۹ ب

۸۱۔ ایضاً ف ۲۵۰ ۔ ۵۱

۸۲۔ ایضاً ف ۲۵۱ ۔ ۵۳

۸۳۔ ایضاً ف ۲۶۴ ب

۸۴۔ ایضاً ف ۲۶۸ - ۷۰
۸۵۔ ف ۲۷۲ ؛ لاہوری، ج ۱ حصہ ۲ ص ۱۳۹
۸۶۔ تاریخ محمد قطب شاہی (انڈیا آفس ۶۵۴۲) ف ۱۶۷ - ۸
۸۷۔ قزدینی ف ۳۶۱ ب - ۲ ب
۸۸۔ حدیقت ف ۲۷۲
۸۹۔ ایضاً، قزدینی ف ۳۶۷
۹۰۔ قزدینی ف ۳۶۸۔ حدیقت ف ۲۷۲ ف
۹۱۔ حدیقت ف ۲۷۳
۹۲۔ حدیقت میں لکھا ہے کہ مغل سفیر نے یہ فوجی تیاریاں دیکھ کر اپنے آقا کو مشورہ دیا کہ وہ عبداللہ کے پیش کردہ تحائف پر اکتفا کرے۔ (ف ۲۷۳ ب)
۹۳۔ حدیقت ف ۲۷۴
۹۴۔ " ف ۲۷۴ ب
۹۵۔ قزدینی ف ۳۶۸: ۳۸۲ ف ۸۳ ب، حدیقت ف ۲۷۲ - ۷۷۔
۹۶۔ قزدینی ف ۳۸۸ ب : لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۲۱۰
۹۷۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۲۱۰ - ۱۱
۹۸۔ حدیقت ف ۲۸۵
۹۹۔ ایضاً ف ۲۸۴ ب
۱۰۰۔ حدیقت ف ۲۸۵ - ۸۶۔
۱۰۱۔ مراسلات قطب شاہی ف ۱۔۳
۱۰۲۔ عصری مراسلات بالخصوص خطوط عبداللہ مشمولہ مراسلات قطب شاہی سے ہم ان جھگڑوں کے متعلق بڑی واضح رائے قائم کر سکتے ہیں۔
۱۰۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سرکار کی تصنیف تاریخ اورنگ زیب ج ۱ باب ۱۰۔

باب ۸

۱۔ رشبرک ولیمس" سولھویں صدی کا ایک معمار سلطنت" ص ۱۰۲

۲۔ ر/ب ۱ ج ص ۸۹

۳۔ لاہوری کہتا ہے کہ تشتر خان کے ملک پر روسیوں کے قبضہ کر لینے کے بعد یادمحمد ماوراالنہر آیا (ج ۱ ص ۲۱۷) ومبرے کی تصنیف تاریخ بخارا ص ۳۰۵

۴۔ ومبرے ص ۳۰۵ ؛ ہاورتھ کی تاریخ منگول ج ۲ حصہ ص ۴۴۴

۵۔ قزوینی ف ۱۶۲

۶۔ قزوینی ف ۱۵۰ اور ۱۵۱۔ لاہوری ج ۱ ص ۱۹۳

۷۔ ملاحظہ ہو باب ۲

۸۔ قزوینی ف ۱۵۵۔ ۵۸ : لاہوری ج ۱ صفحات ۲۰۶ ۔ ۱۵

۹۔ قزوینی ف ۱۶۵ ۔ ۶۷ب : لاہوری ج ۱ صفحات ۲۳۱ ۔ ۳۷

۱۰۔ قزوینی ف ۱۶۷ ب ایضاً ۲۶۰ ۔ ۶۱

۱۱۔ ایضاً ۲۵۱ ب ایضاً ص ۴۳۱؟

۱۲۔ " ۲۶۵ " صفحات ۴۶۵ ۔ ۷۲

۱۳۔ لاہوری ج ۱ ص ۱۳۹

۱۴۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۵۴

۱۵۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۲۵۷ ۔ ۵۲ : نذر محمد نے جو برتاؤ امام قلی کے ساتھ کیا اس کی مشابہت ملا عبد الحمید نے برادران یوسف (ف ۲۶) کے سلوک سے دی ہے ۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ اس نے شاہ سے یہ بھی درخواست

---

1. Rushbrook Williams: An Empire builder of The sixteenth century. 2. Vambery. 3 Howarth.

کی تھی کہ وہ امام قلی کی امداد سے گریز کرے لیکن درخواست نامنظور ہوئی (ف ۱۶) خلد بریں میں بھی یہی بیان امام قلی کے زوال کا ملتا ہے (ف ۱۲۵ - ۲۸) ولی قلی شاہ بھی امام قلی کے ایران پہنچنے اور اس کے خیر مقدم کیے جانے کا ذکر کرتا ہے (۴۹)

۱۶۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۵۳۶ - ۵۶

۱۷۔ ایضاً ص ۱۶ا۴

۱۸۔ ایضاً صفحات ۴۵۶ - ۵۸

۱۹۔ اس رائے کی تائید ایرانی مؤرخ کرتے ہیں۔ طاحظہ ہو خلد بریں ف ۱۸۳: طاہر وحید ف ۵۶ ب: قصص ف ۵۲ ب

۲۰۔ لاہوری ج ۲ ص ۴۷۹

۲۱۔ ایضاً صفحات ۵۳۰ - ۳۲

۲۲۔ ایضاً ص ۵۰۲

۲۳۔ ایضاً صفحات ۵۲۰ - ۲۵

۲۴۔ ایضاً " ۵۲۵ - ۵۵

۲۵۔ " " ۵۵۶ - ۶۵

۲۶۔ " ص ۴۹۲

۲۷۔ " صفحات ۵۷۲ سے ۷۷

۲۸۔ " " ۶۱۳ : ۴۴ : ۴۶۲ - ۴۵۸

۲۹۔ اورنگ زیب کی بلخ کی مہم کے لیے طاحظہ ہو "سرکار کی تاریخ اورنگ زیب" ج ۱ باب ۵۔

باب ۹

۱۔ برنیر ص ۱۲۸

۲۔ راشش برک ولیمس "سولھویں صدی کا ایک معمار سلطنت۔ صفحات ۱۱۷۔ ۱۱۹

۳۔ دلسنٹ اسمتھ "اکبر مغل اعظم" ص ۲۵۸

۴۔ راب ج ۲ صفحات ۲۴۰۔ ۴۲

۵۔ عالم آرائے عباسی ف ۴۴۷ دمعہ ۱۲ / ۶۸۴)

۶۔ جامع المراسلات ف ۲۲۹؛ قزوینی ف ۷۶اب ۷۷۔ لاہوری ج صفحات ۲۶۱۔ ۶۲

۷۔ ایضاً ف ۲۵۲ب ۔ ۵۳

۸۔ قزوینی ف ۱۸۳ اب ۸۷: لاہوری ج ا صفحات ۲۸۱ - ۸۷: جامع المراسلات ف ۲۵۲

۹۔ خلد برین ف ۳۹

۱۰۔ قزوینی ف ۲۱۹ب: لاہوری ج ا صفحات ۳۶۱ - ۶۲

۱۱۔ قزوینی ف ۲۴۹ - ۵۰ : ایضاً ص ۴۴۱

۱۲۔ ایضاً ۲۴۵ب ۲۴۰ب ایضاً صفحات ۴۱۰ - ۲۱۔ خلد برین ف ۴۰ - ۴۱ب

۱۳۔ ایضاً ۲۶۹ب اور ۱۰۷

۱۴۔ خلد برین ف ۹۰ اور ۱۰۷

۱۵۔ سائکس[1] تاریخ ایران ج ۲ صفحات ۲۱۰ - ۱۱

۱۶۔ ان جھگڑوں کے لیے ملاحظہ ہو قصص الخاقانی مصنفہ ولی قلی شاملو

۱۷۔ لاہوری ج ا حصہ ۲ صفحات ۵۷ - ۶۲ - خلد برین ف ۱۱۴

۱۸۔ بہار سخن ف ۴۵

۱۹۔ خلد برین میں علی مردان کی فہرست الزامات دی ہوئی ہے (ف ۱۱۴۔ ۱۱۶ب): ظاہر وحید کہتا ہے کہ علی مردان

1- Sykes

کے شبہات بے بنیاد تھے (ف ۲۳۶) ولی قلی شاملو، ظاہر وحید کی اس رائے سے متفق ہے۔ ف ۴۳ اور ۴۷: برنیر کہتا ہے کہ قندھار کی سپردگی علی مردان خان کی دغابازی کا نتیجہ تھی۔ دربار ایران میں اس کے بہت سے مخالف تھے وہاں جاکر اپنے انتظام کی کارگزاری بیان کرنے سے وہ خائف تھا (ص ۱۸۴)

۲۰۔ لاہوری ج ۲ ص ۳۲

۲۱۔ لاہوری ج ۲ ص ۳۲ ولی قلی شاملو نے اس کا نام مشہد علی بتایا ہے (ف ۴۴)

۲۲۔ قصص ف ۴۴

۲۳۔ لاہوری ج ۲ ص ۳۵۔ ظاہر وحید کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ شہنشاہ ہند نے قندھار کے انتظامات سنبھالنے کے لیے صفدر خان کو بھیجا (ف ۲۴)

۲۴۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۴۴ - ۵۴۔ خلد بریں میں اس جنگ کا تذکرہ صرف ایک جملہ میں ختم کر دیا گیا ہے۔

۲۵۔ جامع المراسلات ف ۲۵۳ب ۵۴۔ قصص ف ۴۳ : لاہوری ج ۲ ص ۹۳

۲۶۔ لاہوری ج ۲ ص ۴۹: ظاہر وحید کا کہنا ہے کہ شاہ ایران نے رستم خان کے نام احکام جاری کیے، کہ خراسان میں فوج اکٹھا کی جائے لیکن اس کا انتقال ہو گیا (۲۴) ف

۲۷۔ جامع المراسلات ف ۲۵۴ب

۲۸۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۲۵

۲۹۔ ظاہر وحید کہتا ہے کہ یہ مہم اس لیے ترک کر دی گئی کہ دارا واپس آگیا تھا (ف ۴۴) لاہوری ج ۲ ص ۱۲۹

۳۰۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۴۹۲ - ۵۰۰: ظاہر وحید ف ۶۱ - ۶۴: قصص ف ۵۴

۳۱۔ جامع الانشاء ف ۱۲۲ب - ۱۲۶ب

۳۲۔ ظاہر وحید ف ۴۸ - ۴۹

۳۳۔ لاہوری جلد ۲ صفحات ۵۹۵ - ۶۰۲

۳۴۔ قصص میں لکھا ہے کہ یہ سفیر سلطان ابراہیم کی نیک خواہشات، مجوزہ قندھار مہم کے لیے کر آیا (ف ۵۵)

۳۵۔ منشآت ظاہر وحید ف ۲۵ - ۲۶۔

۳۶۔ وارث ف ۱۱۴ - ۱۳

۳۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے قصص الخاقانی مصنفہ ولی قلی شاملو

۳۸۔ دیکھیے سرکار کی تاریخ اورنگ زیب ج ۱ باب ۷، ۸

۳۹۔ وارث ف ۴۴۳ - ۶۵ (سنہ ۱۰۶۵) دارا کی مہم کی تفصیلات کے لیے قصص الخاقانی اور لطائف الاخبار

ملاحظہ ہو۔

۴۱۔ منشات طاہر وحید ف ۱۰ ورالف ۔ ۱۲ ب

۴۲۔ ایضاً ف ۳ ۔ ب ۴ ۔ ب

باب ۱۰

۱۔ ہندستان کی دولت کے بیان کے لیے دیکھیے منڈلسلو ص ۱۱۸: منوچی ج ۱ ص ۲۰۶: برنیر ص ۲۰۲ مانریکو کہتا ہے کہ ہر شہر میں خزانے تھے اس نے ایک ایسا ہی خزانہ راج محل میں دیکھا تھا ج ۲ ص ۲۷۴: ٹرنیور ج ۱ باب ۸ اور ۱۰: لاہوری ج ۲ صفحات ۱۳-۱۴۷ محمد صادق ف ۸-۱۰: سرکار ہندستان کے مغلیہ کا مطالعہ، (صفحات ۱۲-۲۰) وہ ایک مستند بیان پیش کرتا ہے۔

۲۔ سرکار۔ تاریخ مغلیہ ہندستان ص ۱۵

۳۔ روزانہ کاروبار کا بیان قزوینی۔ لاہوری اور چندر بھان دوسرا چمن ملاحظہ ہو۔ منوچی بشورے کے لیے غسل خانہ کا حوالہ دیتا ہے۔ ج ۲ صفحات ۴۶۲-۶۳۔ مغربی سیاح عام انداز میں مغل شہنشاہوں روزانہ کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہیں۔

۴۔ یہ ایک قسم کی ہوادار کمرہ کی تھی۔

۵۔ اکبر وجہانگیر کے عہد حکومت میں اس کا نام غسل خانہ تھا۔ لیکن شاہ جہان نے اس کا نام دولت خانہ خاص کردیا، لاہوری ج ۲ ص ۳۲۰

۶۔ تھوینو ج ۱ صفحات ۱۰۵-۱۰۹

۷۔ وارث ف ۱۷-۲۳۔

۸۔ قزوینی شاہ برج میں خود اپنے معاملات پیش کرنے کا ذکر کرتا ہے ف ۱۴۱

۹۔ اس کا بھائی طالب اس سے بعد مانوس تھا وہ ایران سے آگرہ آئی۔ براون۔ تاریخ ادب ایران، (۱۵۰۰-۱۹۲۴) ص ۲۵۵

۱۰۔ منوچی کا کہنا ہے کہ یہ خاموشی تعجب خیز تھی اور حکم الجاؤ سے بری تھا۔

۱۱۔ لاہوری ج ۱ ص ۱۱۰-۱۱۲۔ ایسے دوسرے احکام میں یہ بھی شامل تھا کہ الٰہی سنہ کی جگہ ہجری لکھا جائے (لاہوری ج۔ صفحات ۱۰۶-۰۹) اور پگڑی میں شہنشاہ کی تصویر نہ رکھی جائے (محمد صادق ف ۷)

۱۲ - چارتسلیم ایک طریقہ سلام کرنے کا تھا جس میں آدمی جھک کر اپنی پیشانی آنکھ اور بازو چھوتا تھا ۔

۱۳ - منڈسلو ص ۸۸

۱۴ - برنیر صفحات ۲۰۰ - ۲۶۹ ؛ منوچی ج ۲ صفحات ۳۴۸ - ۴۹ ؛ مان ریکو ج ۲ صفحات ۲۰۰ - ۲ ؛ ٹیورنیر ج ۱ صفحات ۳۷۹ - ۸۱ ۔

۱۵ - لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۷۸ - ۸۱ ؛ برنیر کہتا ہے کہ طاؤس کی تعمیر ایک فرانسیسی دانشور نے کی تھی ص ۲۶۹ ؛ ہفت تخت کا بیان ، مصنفہ ٹیورنیر ج ۱ صفحات ۳۸۴ - ۸۷ ؛ مان ریکو ج ۲ صفحات ۱۹۸ - ۹۹ ۔

۱۶ - محمد صادق نے طبقات شاہ جہانی میں لکھا ہے کہ میر شمس الدین خلجانی کو آگرہ کے ایک اسکول میں شاہجہاں نے بہ حیثیت مدرس مقرر کیا (ف ۳۲۰) پھر حافظ محمد خیالی کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ دلی کے عظیم ترین علماء میں سے تھا ۔ (ف ۳۲۴) ف ۳۹۵ ف ۲۹۴ بھی ملاحظہ ہوں ۔

۱۷ - محمد صادق کی تصنیف طبقات کے اس پہلو کی تائید ڈیلاویل کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ایک دیہاتی اسکول کے سلسلے میں لکھا ہے صفحات ۲۲۷ - ۲۸ ؛ بینی پرشاد کا تبصرہ اُن کے اس مضمون میں ملاحظہ ہو جس کا عنوان ہے "تعلیم و ادب مغلوں میں" یہ مضمون اس روداد میں ہے جو (Indian Historical Record Commission) کی روداد مورخہ ۱۹۲۳ء ص ۸۴ میں شامل ہے

۱۸ - منوچی کا بیان ہے کہ لاہور میں کثیر التعداد دانشوروں کا اجتماع تھا ج ۲ ص ۲۲۴

۱۹ - لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۵۵

۲۰ - ملاحظہ ہو آئین ، صفحات ۲۰۱ - ۲۰۲

۲۱ - چندر بھان نے اپنی تصنیف چمن میں علمی و ادبی تحریکات کا ذکر کیا ہے ۔

۲۲ - موازنہ کیجیے ڈیلاویل کے اس بیان سے کہ "تعجب کی بات نہیں کہ ہندوستان کے مغلیہ ممالک میں فارسی زبان کا زیادہ رواج تھا بہ نسبت دیسی زبانوں کے ص ۹۲ "

۲۳ - صالح ف ۷۰۲ ب : معاصر الامراء ج ۱ صفحات ۲۰۵ - ۲۰۸

۲۴ - طبقات ف ۳۲۲ ؛ صالح ف ۶۹۸ ؛ ایک تبصرہ ۷۸۶ ؛ براؤن (۱۵۰۰ - ۱۹۲۴) صفحات ۲۵۸ - ۵۹ ؛ شبلی حصہ ۳ صفحات ۱۸۵ - ۲۰۸

۲۵ - طبقات ف ۳۲۴ ب : صالح ف ۶۹۶ - ۹۷ ؛ ریو (Rieu) ص ۴۸۴

۲۶ - ریو (Rieu) ۱۸۵۲ ص ۱۰۰۱

۲۷ - ایضاً ایضاً ۲۹۲ ؛ براؤن (۱۵۰۰ - ۱۹۲۴) صفحات ۲۶۵ - ۶۷ ۔

۲۸۔ صالح ف ۲۰۳، ریو ص ۲۸۔

۲۹۔ ایضاً ف ۲۹۵ ، ۹۰۵۰۰، نمبر ۱۵۷۲

۳۰۔ ایضاً ف ۲۰۴

۳۱۔ طبقات ف ۳۲۴ ب ۳۲۵

۳۲۔ صالح ف ۲۱۰

۳۳۔ طبقات ف ۳۲۲؛ صالح ۲۹۸۔ ۹۹

۳۴۔ چندر بھان نے اپنی سوانحعمری کا ذکر چوتھے چمن میں کیا ہے، ب ام معہ ۱۶۸۶۳: صالح ف ۲۰۷

۳۵۔ طبقات ف ۳۲۱: صالح ف ۲۱۰

۳۶۔ ایضاً ف ۳۲۳ ب

۳۷۔ ایضاً ف ۳۲۷ ب

۳۸۔ صالح ۲۰۵ ب

۳۹۔ اس کا مصنف جلال الدین طباطبائی تھا۔ ملاحظہ ہو بینی پرشاد من ۱۸ ص ۳۱۷

۴۰۔ جے سنگھ کے بہت سے خطوط جامع الانشاء میں بھی نقل کیے گئے ہیں ب۔ م۔ ۱۶۰۲۵۳

۴۱۔ طبقات ف ۳۱۷: صالح ف ۲۹۱ ب۔ ۲۹۲ اور ص ۲۰۸

۴۲۔ صالح ف ۲۹۲ اور ف ۲۰۸

۴۳۔ ایضاً ب ایضاً

۴۴۔ ایضاً ف ۲۸۹ ب ۔ ۲۹۰ اور ف ۲۰۹

۴۵۔ ایضاً ف ۲۱۰

۴۶۔ م۔ م۔ ج ۱ ص ۵۸۷۔ ۹۰

۴۷۔ ریو معہ ۱۲۸۵

۴۸۔ ایضاً صفحات ۱۷۸۔ ۷۹

۴۹۔ ایضاً ایضاً

۵۰۔ ایضاً معہ ۵۵۵۵، معہ ۵۵۵۵۲، معہ ۵۵۵۴، ۱۰۔۱، ۱، ل نمبر ۲۲۲۶

۵۱۔ فارکوہر: ہندستان کے مذہبی ادب کا خاکہ[1] ص ۲۸۰؛ ریو معہ ۱۸۴۰: ۱۱، آؤل نمبر ۱۹۴۹ اور ۱۹۷۲

1- Farquhar: out line of The Religious Literature of - India.

۵۲۔ ۱-۱ ا۔ل۔ نمبر ۳۵

۵۳۔ ایضاً ۱۹۹۰

۵۴۔ ایضاً ص ۲۲۴

۵۵۔ ریو۔ ص ۱۲۲۷۰

۵۶۔ سٹوری ج ۲ صفحات ۳۵۵ - ۵۶ - ۱۳ نے اطباء کے نام کی فہرست دی ہے۔

۵۷۔ صالح ف ۲۹۵ ب ۴۰۔۴۱ ج ۳ صفحات ۹۲۳- ۳۲

۵۸۔ ایضاً ف ۲۹۵ ب ۲۹۶

۵۹۔ ایضاً ف ۲۹۵

۶۰۔ ۱۱۲۱ صفحات ۷۷ - ۷۹

۶۱۔ لاہوری ج ۱ ص ۳۱۶

۶۲۔ طبقات ف ۳۲۰ ب؛ ۃ ۵۳ ۲۷۲: ۵۰۷-۹ نمبر ۲۲۵۴

۶۳۔ ریو ص ۴۴ ۱۲۷

۶۴۔ ایضاً ص ۱۲۸۷۹

۶۵۔ صالح ف ۲۹۴

۶۶۔ ایضاً ف ۲۹۴ ب

۶۷۔ طبقات ف ۳۲۰

۶۸۔ ایضاً ف ۳۱۹

۶۹۔ ایضاً ف ۳۲۰

۷۰۔ صالح ۲۹۳ ب

۷۱۔ طبقات ف ۳۱۸ ب

۷۲۔ صالح ف ۲۶۸

۷۳۔ طبقات ف ۳۱۴

۷۴۔ صالح ف ۲۸۱ ب - ۸۲

۷۵۔ طبقات ف ۳۱۳ ب؛ صالح ف ۲۸۳-۸۴

۷۶۔ ایضاً ۳۰۸ - ۱۱؛ صالح ف ۲۹۱ ب

۷۷۔ مسرا بندو۔ دنود، ج ۲ صفحات ۴۵۴ – ۵۵ ہندی سبد ساگر ج ۴، اختتام ص ۱۹

۷۸۔ ایضاً ایضاً " ۴۵۷۔ ۵۹ ؛ ایضاً ج ۲ " ص ۱۳۳

۷۹۔ ایضاً ایضاً " ۴۵۳ – ۵۴

۸۰۔ ملاحظہ ہو رام بابو سکسینہ کا تبصرہ ان کی تصنیف "تاریخ ادب اُردو ص ۱۲

۸۱۔ فارگیوسن۔ ہندستانی اور ایشیائی تعمیر کی تاریخ ص ۲۸۶؛ اسمتھ "تاریخ فنون لطیفہ، صفحات ۱۷۲، اور ۱۸۰

۸۲۔ ہاول: ہندستانی تعمیرات باب ۲

۸۳۔ اس محکمہ کا ایک داروغہ تعمیرات ہوتا تھا جو سرکاری عمارتوں کا ذمہ دار تھا۔ ایک زمانہ میں مکرانت خان اس عہدے پر مامور تھا۔

۸۴۔ ملاحظہ ہو سید محمد لطیف کی تصنیف "آگرہ تاریخی و معماکاتی" صفحات ۷۴ – ۷۵

۸۵۔ ایضاً ص ۸۲

۸۶۔ " " ۸۶

۸۷۔ " صفحات ۹۰ – ۹۴؛ فارگوسن صفحات ۳۱۷ – ۱۸

۸۸۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۲۵۳؛ فارگوسن صفحات ۳۱۸ – ۲۰؛ لطیف صفحات ۱۸۴، ۸۸ – قزوینی ف ۲۰۶

۸۹۔ ہاول: ہندستانی تعمیرات ص ۲۹

۹۰۔ ملاحظہ ہو ہاول کی مذکورہ بالا تصنیف باب ۲ ؛ لطیف صفحات ۱۰۰ – ۲۳ ؛ فارگوسن صفحات ۳۱۳ – ۱۷۔

۹۱۔ سلی مان[3] Rambles. recollections ج ۱ ص ۳۸۵

۹۲۔ اسمتھ تاریخ فنون لطیفہ، صفحات ۱۸۳ – ۸۵

۹۳۔ ہاول ہندستان تعمیرات صفحات ۳۳ – ۳۹۔ سرجان مارشل Archaeological Survey of India Report (1905-1904) صفحات ۱ – ۳۔

۹۴۔ دلی کا محل: داشت ف ۱۱۷ اور ف ۱۷۲۳ فارگوسن صفحات ۳۰۹ – ۱۲ Archaeological Survey of India Report (1911-12) صفحات ۱ – ۲۷۔

1- Fergusson. History of Indian and Eastern Architecture 2.- E.B Havell. 3- Sleeman.

۹۵۔ وارث، ف ۲۳

۹۶۔ فارگوسن صفحات ۲۱۸ - ۲۰

۹۷۔ پرسی براؤن[1] Indian Painting under Moghuls ص ۹۲

۹۸۔ اس کا تبصرہ خوش خطی پر۔ تاریخ فنون لطیفہ۔ صفحات ۲۰۸ - ۲۰۹۔ چندر بھان کہتا ہے کہ شاہجہان خوش خطی کا ماہر تھا چار چمن ف ۲۳ ب

۹۹۔ صالح ف ۳۳ ۔ ۳۴ (معہ ۷۵۵۶)؛ چندر بھان حسب ذیل اور کچھ خوش خط لکھنے والوں کی فہرست پیش کرتا ہے (۱) یاقوت صرفی (۲) ملا میر (۳) علی سلطان (۴) علی میر عماد (۵) ملا درویش (۶) محمد خان (۷) محمد حسین۔

۱۰۰۔ لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۵۷؛ قزوینی ف ۳۲۹ ب۔ ۳۳۱

۱۰۱۔ وارث ف ۷۰، دیکھئے ڈیلاویل کی تصنیف "ہن کا بیان" صفحات ۱۱۷ - ۱۸

---

1. Percy Brown.

باب ۱۱

۱. آئین ص ۲۔ لاہوری ج ۱ ص ۷ : منوچی خان خاناں (ہونا چاہیے خان عالم) کی سرگزشت ایران بیان کرتے ہوئے وہ جملہ لکھتا ہے جو اس نے شاہ ایران سے کہا تھا کہ ہمارا شہنشاہ ارضی خدا ہے" ج ۲ ص ۴۶۱

۲۔ چار چمن ف ۲۷ ب: لاہوری نے شہنشاہ کو ستون شرع سے تعبیر کیا ہے ج ۱ ص ۷ : قزوینی ف ۱۸۹

۳۔ آئین ص ۲

۴۔ مغربی سیاح اکثر و بیشتر مغل بادشاہوں کی انصاف پسندی کی تعریف کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ انکی گورنمنٹ کی مذمت بھی کرتے ہیں: ایسی متضاد باتوں کی مثالیں برنیر کے بیانات میں مان ریکو اور منوچی کے یہاں ملتی ہیں : ملاحظہ ہو منوچی ج ۱ صفحات ۱۹۷۔۲۰۴ اور ج ۲ ص ۲۸۲ برنیر ص ۲۷ ۱۲ اور ص ۲۳۶: مان ریکو ج ۱ ص ۴۴ ۲ اور ص ۳۵۴

۵۔ سرکار (مغل انتظامیہ ۱۹۲۴) ص ۱۱

۶۔ برنیر ص ۲۳۶ : مان ریکو ج ۱ ص ۳۵۴ اور ج ۲ ص ۲۶۸ : منوچی ج ۱ صفحات ۱۹۷۔۲۰۴

۷۔ سرکار (مغل انتظامیہ ۱۹۲۴) ص ۵

۸۔ مورلینڈ "ہندستان اکبر کے انتقال پر" ص ۳۱

۹۔ بینی پرشاد جہانگیر ص ۹۴

۱۰۔ ٹیورنیر ج ۱ ص ۳۲۵

۱۱۔ مثلاً مورلینڈ نے لکھا ہے کہ سترھویں صدی کا ہندستان معمولی آدمیوں کے لیے دوزخ رہا ہوگا۔ اکبر سے اورنگ زیب تک ص ۳۰۲

۱۲۔ آئین ص ۳

۱۳۔ لاہوری ج ۱ ص ۱۸۰ : قزوینی ف ۱۴۷ ب

۱۴۔ آئین ص ۴

۱۵۔ بینی پرشاد ص ۹۶

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ یہ حکم دسمبر ۱۶۴۳ء میں جاری ہوا تھا۔ لاہوری ج ۲ ص ۳۵۰

۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ بینی پرشاد ص ۹۶: آئین ص ۴ اور صفحات ۲۰۲۔۲۰۳

۲۲۔ آئین ص ۴

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ صالح ف ۱۰۷ ب۔ وارث ف ۱۲۴

۲۵۔ آئین ص ۴

۲۶۔ ایضاً۔ سرکار (مغل انتظامیہ ۱۹۲۴) صفحات ۳۲۔۴: منوچی ج ۲ ص ۴۱۹: منڈیسلو ص ۱۱۷۔

۲۸۔ منوچی ج ۲ ص ۴۱۹: سرکار (مغل انتظامیہ ۱۹۲۴) صفحات ۲۶۔۸: مورلینڈ لفظ تان کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے مراد تنخواہ دار افسر ہے۔ زرعی نظام ص ۹۴

۲۹۔ سرکار (مغل انتظامیہ) صفحات ۴۱، ۴۴: لاہوری کا کہنا ہے کہ دیوان کل کے دو نائب ہوتے تھے۔ ایک دیوان تان، دوسرا دیوان خالصہ ج ۱ ص ۴۴۴

۳۰۔ لاہوری ملا عبدالرؤف اور ملا عبداللطیف کے نام بہ حیثیت مصطفوی رقم کرتا ہے۔ ج ۲ ص ۶۱۰

۳۱۔ آئین (بلوچ مین) فوج کا محتسب ص ۶ ن ۱۴

۳۲۔ ایضاً ص ۶ ن ۱۵

۳۳۔ ایضاً ن ۱۶ اور سرکار (مغل انتظامیہ) صفحات ۴۸۔۵۲: منوچی اس کو تیسرے درجہ کا عہدہ سمجھتا ہے۔ ج ۲ ص ۴۱۹

۳۴۔ افضل خان ایک سال تک میر سامان تھا۔ سعد اللہ خان ۲ سال تک اور فاضل کئی سال تک اسی عہدے پر رہا۔

۳۵۔ آئین ص ۱۴

۳۶۔ آئین صفحات ۱۹۲۔۳

۳۷۔ ایضاً ص ۱۹۸: سرکار (مغل انتظامیہ) صفحات ۴۸۔۹: لاہوری ص ۳۱۶

۳۸۔ لاہوری ج ۲ ص ۳۱۶

۳۹ ۔ ایضاً صفحات ۱۵-۳۱۶

۴۰ ۔ سرکار مغل انتظامیہ ص ۲۴ : برنیر اس کو حکومت کا دوسرا یا تیسرا مرتبہ خیال کرتا ہے ۔ ص ۱۷۱؛ منوچی ج ۲ ص ۴۱۹

۴۱ ۔ سرکار (مغل انتظامیہ) کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے اواخر میں ۔ ماتحت بخشی تعداد میں تین تھے ۔ ص ۲۴

۴۲ ۔ مثلاً جب مہابت خان ججھار سنگھ سے لڑنے گیا تھا تو اسلام خان اس کی فوج کا بخشی مقرر ہوا تھا ۔ لاہوری ج ۱ ص ۲۴۱ اس کے علاوہ اسحاق بیگ یزدی کا تقرر بہ حیثیت بخشی اور واقعہ نویس دکن کی ایک فوج میں ہوا تھا لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۱۳۶ ۔

۴۳ ۔ صالح کہتا ہے یہ عہدہ صرف قابل اعتماد لوگوں کو تفویض کیا جاتا تھا ۔ ف ۶۲۰ : منوچی کا کہنا ہے کہ اس کا لقب داروغہ خاص چوکی ہوتا تھا ج ۲ ص ۴۲۲ ۔

۴۴ ۔ سرکار مغل انتظامیہ ۔ ص ۲۷ ۔ منوچی ج ۲ ص ۴۱۹ کہتا ہے کہ اس کی نیابت کے لیے دو مفتی ہوتے تھے اور پھانسی کا مقدمہ بغیر تین بار شہنشاہ کے سامنے پیش کیے ہوئے انجام تک نہیں پہنچ سکتا تھا ۔

۴۵ ۔ لاہوری اس نام کا تذکرہ دارا کی شادی کے سلسلے میں کرتا ہے ۔ ج ۱ ص ۴۵۸

۴۶ ۔ صالح ف ۵۷۶

۴۷ ۔ عبدالرحمان ۔ رشید ائے خوش نویس ، میر صالح ، میر سید علی ، اعتماد خان ۔ عنایت خان ابن ظفر خان کے نام اس عہدہ کے سلسلے میں لیے جاتے ہیں ۔

۴۸ ۔ منڈلسلو ص ۱۱۸

۴۹ ۔ آئین ص ۱۳

۵۰ ۔ ر ۔ ب ج ۲ ص ۱۹۵ : لاہوری ج ۱ ص ۹۵

۵۱ ۔ صالح ف ۵۷ ، ۵ الف و ب

۵۲ ۔ مولانا محمد فاضل بدخشی ، سید عبدالقادر مانک پوری ۔ میر بارکا بخاری ، اور حاجی احمد سعید مسلسل اس عہدے پر مامور رہے ۔

۵۳ ۔ تین نام اس عہدہ داروں کے سلسلے میں لیے جاتے ہیں ۔ دیانت خان ، عنایت خان اور میر جعفر ۔

۵۴ ۔ آئین ۔ ص ۲۸۴ : مانریکو ج ۱ ص ۴۱۸ اور ج ۲ ص ۱۳۷ جہاں وہ لکھتا ہے کہ کوتوال محصول کے لیے افسر اعلیٰ تھا ۔ بعد ازاں غالباً ڈی لایٹ کی سند پر وہ کہتا ہے کہ ایک کوتوال ہر خاص شہر میں تعینات

کیا جاتا۔ ج ۲ ص ۲۷۰ ۔ ن ۷ اور ۲۷۱؛ مورلینڈ ۔ ہندستان اکبر کی موت کے وقت، ص ۳۷ ۔ ۳۹ ۔

۵۵۔ منتخب اللباب ص ۱۱۸

۵۶۔ منوچی ج ۲ ص ۴۲۱

۵۷۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۱۰ ۔ ۱۱

۵۸۔ نومبر ۱۶۲۹ میں جب شاہ جہان دکن گیا تو اسلام خان آگرہ کا ناظم مقرر ہوا۔ اور جب شاہجہان ۱۶۳۸ میں کشمیر گیا تو سیف خان آگرہ کا ناظم مقرر ہوا۔ یہی طریق کار اس وقت بھی اختیار کیا گیا۔ جب دارالسلطنت دہلی کو منتقل ہوا۔

۵۹۔ اورنگ زیب جملہ چاروں صوبہ جات کا ناظم مقرر کیا گیا جس میں احمدنگر، برار، خاندیش اور تلنگانہ شامل تھے۔

۶۰۔ اودھ کا ذکر اس عہد تک زیادہ نہیں کیا گیا۔

۶۱۔ آئین صفحات ۲۸۰ ۔ ۸۱ ۔ سرکار؛ مغل انتظامیہ صفحات ۸۰ ۔ ۸۶

۶۲۔ لاہوری ج ۲ ص ۲۹۰؛ صالح ج ۳ ص ۶۴ ۔ مراۃ سکندری میں لکھا ہے کہ اعظم خان کے مظالم کی شکایت سید جلال نے کی ف ۸۷ ۔

۶۳۔ لاہوری ج ۲ ص ۲۸۲

۶۴۔ ایضاً ص ۲۸۳ ۔ دس لاکھ روپیہ بقایا جو ظفر خان پر واجب الادا تھا شاہ جہان نے معاف کر دیا اس لیے کہ اہلِ کشمیر اس کے انتظام سے مطمئن تھے: لاہوری ج ۲ ص ۲۲۰

۶۵۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۵۸

۶۶۔ مورلینڈ اس عہد کی نوعیت دو طرح کی بتاتا ہے ایک کچا اور دوسرا پکا؛ "ہندستان اکبر کے انتقال کے وقت" ص ۳۱ ۔ برنیر کا کہنا ہے کہ ہندستان میں ناظم کی مدت ملازمت بہ نسبت ترکی کے زیادہ تھی ص ۲۳۱ ۔ بینی پرشاد ص ۲۰۴ ۔ مان ریکچی کہتا ہے کہ مدت کم تھی ۔ ج ۱ ص ۵۲ ۔

۶۷۔ سرکار: مغل انتظامیہ صفحات ۵۶ ۔ ۹۱ صفحات ۸۰ ۔ ۸۳ ۔

۶۸۔ سرکار: ایضاً صفحات ۶۲ ۔ ۳

۶۹۔ وارث ف ۶ ۔

۷۰۔ آئین صفحات ۲۸۵ ۔ ۸۸

۷۱۔ ایضاً ص ۲۸۸

۷۲۔ ایضاً ص ۲۸۸

۷۳۔ ایضاً ص ۲۸۹

۷۴۔ سرکار: مغل انتظامیہ صفحات ۷۱ - ۵ ؛ منوچی کہتا ہے کہ ان افسروں کی عرضداشت شہنشاہ کے حضور میں رات کو پڑھی جاتی ہے ج ۲ صفحات ۳۳۱ - ۳۲

۷۵۔ ی ۔ ج ۱۶۴۵ء میں قاضی ظاہر آصف خان ایسے متعدد عہدے پر مقرر کیا گیا: لاہوری ج ۲ ص ۳۷۵

۷۶۔ مورلینڈ: زراعتی نظام ص ۲۷۷ ۔ منوچی کہتا ہے کہ سرکار کے معنی ایک حصہ ہے ۔ ج ۲ ص ۴۱۳

۷۷۔ آئین ص ۲۸۳ ۔ منوچی ج ۲ صفحات ۴۵۰ - ۵۱ ۔ پیٹر منڈی ج ۲ صفحات ۴۳ - ۴

۷۸۔ قزوینی ف ۱۳۲

۷۹۔ آئین ص ۲۸۳

۸۰۔ مانریکو (ج ۲ ص ۲۴۹) بیان کرتا ہے کہ کوتوال کے جاسوس نے کیسے اس کا پتہ لگالیا حالانکہ اس نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی بہت کوشش کی۔ منوچی ج ۲ صفحات ۴۲۰ - ۲۱ ۔

۸۱۔ دیکھیے تھیوونیر ج ۱ باب ۴ سے ۸ تک

۸۲۔ مانریکو ہندوستان کی کاروان سراؤں کی تعریف کرتا ہے ۔ ج ۲ صفحات ۹۷ - ۹۹ ۔ منوچی ۲ ص ۷۸ اور ص ۱۱۶ ؛ برنیر برائی کرتا ہے ص ۲۳۳ ۔

۸۳۔ تھیونیر ج ۱ ص ۲۹۲ اور ص ۲۲۵ : منڈلسلو کہتا ہے کہ احمد آباد کے ناظم کے فرائض میں تھا کہ سڑکوں کی محافظت کرے ص ۱۱۴۔ مانریکو بھی عام انداز میں سڑکوں کی محافظت کا ذکر کرتا ہے منوچی صفحات ۴۵۰ - ۵۱

۸۴۔ آئین ص ۲۸۴ ۔ پیٹر منڈی ج ۲ ص ۲۷ ۔ منوچی ج ۲ ۔ ص ۲۴

۸۵۔ مانریکو کہتا ہے کہ سزا کا تعین لحاظ جرم ہوتا تھا ۔ ج ۲ ص ۲۶۹ ؛ منوچی ج ۱ ص ۱۹۷ - ۲۰۲:

۸۶۔ پیٹر منڈی کا بیان ہے کہ چور زندہ جلادیے جاتے تھے ۔ ج ۲ ص ۴۷ ص ۲۳۲ ص ۲۳۳ ص ۲۳۴ اور ص ۲۴۵

۸۷۔ مانریکو ج ۱ ص ۴۲۳

۸۷۔ بیورا کسن ڈاکیہ ہوتے تھے۔ آئین ص ۱۸۸؛ خافی خاں ا ص ۲۴۳، منوچی کہتا ہے کہ کبوتر بھی نامہ بر کا کام کرتے تھے ج ۲ ص ۴۶۷؛ ٹیورنیر ج ا ص ۲۹۲: پل سارٹ ص ۵۸۔

۸۸۔ برنیر ص ۲۰۹

۸۹۔ مورلینڈ لکھتا ہے کہ اس دور میں ملازمت، کہنا درست ہوگا۔ ملازمتوں سے تعبیر کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ اس زمانے میں فرائض کی علیحدگی یا امتیازی خصوصیت کا فرق نہ تھا۔ ایک بار جو ملازم ہو جاتا تھا اس کی مدت ملازمت کا انحصار شہنشاہ کی مرضی پر ہوتا اس کو فوجی خدمات سے بھی وابستہ کیا جاتا یا انتظامیہ سے بھی متعلق کیا جاتا تھا زراعتی نظام ص ۹۳۔

۹۰۔ سی۔ ج۔ سید جلال چھ ہزار ذات اور دو ہزار سوار کا سپہ سالار تھا: لاہوری ج ۲ ص ۷۱۸

۹۱۔ اردن: مغلوں کی فوج ص ۴۔ دیکھیے ہٹر منٹے کی تحریر جس میں وہ منصب دار کی تعریف بتاتا ہے ج ۲ ص ۱۳۴

۹۲۔ آئین صفحات ۱۴۴ - ۴۵۔

۹۳۔ اردن ص ۴

۹۴۔ دیکھیے بلوچ مین صفحات ۲۳۸ - ۴۷

۹۵۔ اردن ص ۹

۹۶۔ انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ میں کمیشن، ج ۵۔ ۱۹۲۳ صفحات ۰۰۔ ۲

۹۷۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۵-۵۰۸

۹۸۔ ایضاً۔ منوچی لکھتا ہے کہ درجہ اوّل کے ایک ہزاری کو ۲۵۰ گھوڑے رکھنا پڑتے تھے ج ۲ ص ۳۷۵

۹۹۔ ملاحظہ ہو وارث کی فہرست منصب داروں کے سلسلے میں۔

۱۰۰۔ دستور العمل ب۔ م ۲۶۵۲ ۱۹ : اردن ص ۶

۱۰۱۔ دستور العمل ایضاً

۱۰۲۔ دیکھیے وہ فہرست جو منصب داروں کی وارث میں دی ہوئی ہے ب۔ م۔ ۳۰۳ ۱۹۳۷

۱۰۳ دستور العمل ب م ۰۲ .۱۶۹۰ ف ۱۰۲ ب برنیر کہتا ہے فوج کی تنخواہ ہر دو سرے مہینے دی جاتی تھی۔

۱۰۴۔ وارث ق ۲۲ ب

۱۰۵۔ ایضاً اور لاہوری ج ۱ ص ۱۱۵

۱۰۶۔ دستورالعمل ب، م ۵۳ ۱۹۳۷

۱۰۷۔ ایضاً، اور باب ۳ اروِن، مغلوں کی فوج

۱۰۸۔ ایضاً

۱۰۹۔ ایضاً۔ م ۵۳ ۱۹۳۷ اور اروِن ص ۵۴: منوچی کہتا ہے کہ بخشی سال میں دو بار جائزہ لیتا تھا۔
ج ۲ ص ۲۷۷

۱۱۰۔ اروِن ص ۹ ص ۲۱۱

۱۱۱۔ ایضاً

۱۱۲۔ ایضاً ص ۴۳ اور آئین ص ۱۸۷

۱۱۳۔ وی اسمتھ کی تصنیف اکبر ص ۳۶۰: برنیر صفحات ۹-۲۰۹-۱۰۔

۱۱۴۔ ڈاکٹر ہارن کا حوالہ دیتے ہوئے اروِن کہتا ہے کہ مغلیہ فوج رسالہ، پیدل، توپ خانہ پر مشتمل تھی
لیکن دوسری اور تیسری شاخیں اوّل کے مقابلے میں بڑی کمتر درجہ رکھتی تھیں ص ۵۷ ۔ برنیر کا
تبصرہ "بیہر" ص ۴۳

۱۱۵۔ آئین صفحات ۱۸-۹۰: منڈسلو کہتا ہے پیدل سپاہ بندوق کے استعمال میں غنیمت ہے ص ۱۱۸؛
برنیر کہتا ہے بندوقچی اچھے نہ تھے۔ ص ۲۱۷

۱۱۶۔ مان ریکو لکھتا ہے کہ گھوڑے زیادہ تر عربی، ایرانی اور ترکی تھے، ج ۱۱ ص ۲۷۷: منوچی کہتا ہے کہ
بادشاہ کی ملازمت میں ہر سوار کو ترکی گھوڑا رکھنا ضروری تھا ج ۲ ص ۳۷۶۔

۱۱۷۔ برنیر صفحات ۴۸-۹

۱۱۸۔ ایضاً ص ۲۱۷: منڈسلو لکھتا ہے کہ مغلوں کے پاس بہ لحاظ تعداد زبردست توپ خانہ ہے۔ توپیں
زیادہ تر کمتر درجہ کی ہیں۔ ص ۱۱۸: منوچی ج ۱ ص ۹۵

۱۱۹۔ برنیر ص ۲۱۸

۱۲۰۔ مان ریکو بُرا اثر بحریہ کی کمی کی وجہ مغلوں کی بزدلی پر محمول کرتا ہے۔ ج ۲ ص ۲۷۸: ج ۲ ص ۱۹۶

۱۲۱۔ ملاحظہ ہو ہوگلی کی تسخیر کا بیان

۱۲۲۔ آسام کی مہم کا بیان ملاحظہ ہو۔

۱۲۳۔ ملاحظہ ہو شاہ جہان نے جو حکم کشمیر سفر کرنے میں کاشتکاروں کو معاوضہ دینے کا حکم دیا تھا۔ لاہوری ج ۱۔۱۔ ص ۲۔ صفحات ۴۔۵

۱۲۴۔ قزوینی ف ۲۶۷ ب

۱۲۵۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۶۸

۱۲۶۔ ضبطی کے نظام کا بیان کے سلسلے میں ملاحظہ ہو مورلینڈ کا مضمون ج۔ ر ا۔ س سوسائٹی ۱۹۱۸

۱۲۷۔ ایضاً

۱۲۸۔ ایضاً

۱۲۹۔ مورلینڈ زراعتی نظام ص ۲۳۴۔ ۳۷

۱۳۰۔ ایضا ص ۱۳۵

۱۳۱۔ ایضاً ص ۱۲۴

۱۳۳۔ ایضاً ص ۱۲۶۔

۱۳۴۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۳۶۲۔ ۶۴: مراۃ سکندری ف ۸۳ ب: منڈلسلو ص ۱۲۰

۱۳۵۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۲۸۲۔ ۸۳

۱۳۶۔ ایضاً ص ۲۸۹ اور ص ۲۳۲: محمد صادق ص ۱۱۶

۱۳۷۔ اجمیر میں برا ہم مندر کی بے حرمتی۔ ر۔ب، ج ۱ ص ۲۵۴ اور کانگڑہ کے مندر کی توڑ پھوڑ کے بابت ج ۲ ص ۲۲۳۔ ملاحظہ ہو قزوینی کا تبصرہ ف ۲۰: شش فتح کانگڑہ ف ۲۵۔

۱۳۸۔ یہ حکم جنوری ۱۶۳۳ء میں جاری ہوا تھا۔ لاہوری ج ص ۴۵۲: ۷۶ مندر بنارس میں مسمار کیے گئے۔

۱۳۹۔ قزوینی ف ۳۰۲، برنیئر کشمیر میں مندروں کے مسمار کیے جانے کا ذکر کرتا ہے ص ۴۰۰۔

۱۴۰۔ قزوینی ف ۳۰۲

۱۴۱۔ ایضاً ف ۲۳۱۔ ۱۲ ف ۲۱۱: جوکھو بجھار کا زمیندار تھا اس کے قبیلہ کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ چار سو ہندو پنجاب میں مسلمان کیے گئے۔

۱۴۲۔ تبدیلی مذہب کی اہم مثالیں حسب ذیل ہیں: (۱) ججھار سنگھ کے دو لڑکے دوگ بھان اور درجن سال کے نام اسلام قلی اور علی قلی رکھے گئے۔ قزوینی ف ۳۶۲ ب (۲) پرتگالی قیدی قزوینی ف ص ۲۹۹ ب (۳) دلپت سرہندی سے بھی کہا گیا کہ اگر وہ دو مسلمان لڑکیاں رکھنا چاہتا ہے تو اسے مسلمان ہو جانا چاہیے لیکن اس نے انکار کر دیا اس کو تکلیف کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کی لاش ٹکڑے

ٹکڑے کردی گئی۔ قزوینی ف ۱۱۴ ٹیورنیر، ص ۳۹۱، ج ۱

۱۴۲۔ طبقات شاہجہانی ف ۳۱۷

۱۴۴۔ قزوینی ف ۳۰۲

۱۴۵۔ ایضاً ف ۳۰۳ ب

۱۴۶۔ ایضاً ف ۲۳۸

۱۴۷۔ طباطبائی ف ۱۹ لیکن لاہوری کا کہنا ہے کہ مایہ داس کافی عمر کا ہو گیا تھا ج ۱ ص ۲۲۴

۱۴۸۔ پی ڈیلاویل ج ۱ ص ۷۱

۱۴۹۔ دیکھو مان ریکو کا بیان ج ۲ صفحات ۱۰۵ - ۱۵

۱۵۰۔ مان ریکو ج ۲ صفحات ایضاً

۱۵۱۔ ایضاً ص ۱۴۷

۱۵۲۔ برنیر ص ۲۱۲ ایک دوسری جگہ کہتا ہے ہم عموماً مشرقی حکمرانوں کو وحشی بھی سمجھتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ایسے التفات سے روگردانی نہیں کرتے تھے جو رعایا کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ص ۲۶۳: منوچی ج ۲ ص ۱۴۷

۱۵۳۔ منوچی ج ۱، صفحات ۱۹۸ - ۲۰۲: ٹیورنیر ج ۱ ص ۳۲۵

۱۵۴۔ منڈلسلو ص ۱۱۸: برنیر ص ۵۵: اردن ص ۱۸۵

۱۵۵۔ ایضاً ڈیلاویل کہتا ہے کہ ہر ہندستانی سپاہی ایک مخصوص اسلحہ میں مہارت حاصل کرتا ہے اور جنگ میں دوسرے ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔ ص ۲۲۵۔

۱۵۶۔ منوچی کہتا ہے کہ شاہجہاں تین ہزار ہاتھی رکھتا تھا ج ۲ ص ۱۰: برنیر ص ۲۷۷: پیٹر منڈے کا بیان ج ۲ ص ۵۲ - ۳ - اردن صفحات ۱۷۵ - ۸۱۔

۱۵۷۔ زاہد خان کا دس سال کا لڑکا فیض اللہ ایک ہزار ذات اور چار سو سوار کا منصب دار مقرر ہوا۔ لاہوری ج ۲ ص ۴۳۴: محمد مراد بن صلابت خان ۵ سو ذات اور سو سوار کا منصب دار مقرر ہوا۔ ایضاً ص ۳۸۴: منڈلسلو ص ۱۱۸۔

۱۵۸۔ اردن ص ۲۱۳: منڈلسلو فوج کی ترتیب و تنظیم کی تعریف کرتا ہے لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ فوج ایک دن میں "۵۰ لیگ" سے زیادہ مارچ نہیں کر سکتی تھی ص ۱۱۸۔

۱۵۹۔ برنیر ص ۲۰۵ اور ص ۲۲۷: ٹیورنیر ج ۱ ص ۳۹۱

۱۶۰۔ برنیر ص ۲۷۱: منوچی ج ۲ ص ۳۷۸: منڈلسلو ص ۲۰-۲۱: مان ریکو ج ۲ ص ۲۷۱ پیٹر منڈے ج ۲ ص ۱۴۷

اور ص ۲۳۳۔

۱۶۱۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۸۲؛ ولیم فاسٹر کی رائے ہے کہ طریف (جس کو وہ شریف کہتا ہے) کا مقصد ترک و مغل کا اتحاد برخلاف ایران عمل میں لانا تھا؛ انگریزی کارخانہ کے اندراجات (۱۶۳۰ - ۴۱) تعارف

۱۶۲۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۸۶

۱۶۳۔ ایضاً صفحات ۲۱۷ - ۱۸

۱۶۴۔ وارث ف ۷۳ ب اور ف ۸۰

۱۶۵۔ وارث ف ۸۱ ب

۱۶۶۔ جامع الانشا ف ۱۳۹۔ ۵۷

۱۶۷۔ وارث (سعد ۶۵ - ۵۶) ف ۹۴ اور ف ۸۸

۱۶۸۔ ایضاً ف ۸۱ (سعد ۶۵، ۵۶)

۱۶۹۔ جامع الانشا ف ۱۳۹ - ۵۷

۱۷۰۔ وارث ف ۸۵ - ۸۷ (سعد ۶۵ - ۵۶)

۱۷۱۔ لاہوری ج ۱ ص ۳۰۴؛ ج ۱ حصہ ۲ ص ۱۱۰۲؛ ج ۲ ص ۱۴، ۳۴۲، ۳۹۰، ۴۰۶ وارث ف ۱۴ ف

۲۹ ف ۶۸ ف ۸۰ ب ۸۲ ف ۷۶ (۶۵، ۵۶) ف ۸۶ ب

۱۷۲۔ وارث ف ۸۱ ب

۱۷۳۔ مان ریکو ج ۲ ص ۱۷۸

۱۷۴۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے ۱۶۳۰ - ۳۳ صفحات ۲۷ - ۸؛ تعارف ۸، ۱۰۔

۱۷۵۔ ڈیسوزس ج ۲ ص ۲۵۲

۱۷۶۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے ۳۳ - ۱۶۳۰ صفحات ۱۲۳ - ۵؛ منوچی ج ۱ ص ۱۸۵۔

۱۷۷۔ ایضاً ایضاً تعارف ۱۸

۱۷۸۔ ایضاً (۱۶۱۸ - ۲۱) تعارف ۳۷

۱۷۹۔ ایضاً (۱۶۲۴ - ۲۹) ایضاً ۲۵، ۳۰

۱۸۰۔ ایضاً (۱۶۳۴ - ۳۶) ایضاً ۷ - ۹، ۱۲، ۱۳، ۱۶ اور ڈیسوزس ج ۲ ص ۲۴۰

۱۸۱۔ ایضاً (۱۶۴۲ - ۴۵) ایضاً ۱۰

۱۸۲۔ ایضاً (۱۶۴۶ - ۵۰) ایضاً ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۱

۱۸۳۔ ٹھٹہ میں چار اہل ڈچ کا آنا: ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۵۱ - ۵۴) ص ۱۱۲ اور تعارف ۱۱، ۳۰

۱۸۴۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۵۵ - ۶۰) ص ۶۸؛

۱۸۵۔ ایضاً (۱۶۲۴ - ۲۹) تعارف ۲۵، ۲۹، ۳۲۔

۱۸۶۔ ایضاً (۱۶۳۰ - ۳۳) تعارف ۱۸، ۲۵، ۳۴،

۱۸۷۔ ایضاً (۱۶۳۴ - ۳۶) تعارف ۱۵،

۱۸۸۔ ایضا (ایضاً) ایضاً

۱۸۹۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے (۱۶۳۴ - ۳۶) تعارف ۲۲-۷

۱۹۰۔ ایضاً (۱۶۳۷ - ۴۱) ایضاً

۱۹۱۔ ایضا (۱۶۴۲ - ۴۵) ایضاً ۱۰

۱۹۲۔ ایضاً (۱۶۴۶ - ۵۰) ایضاً ۲۲ - ۳۔

باب ۱۲

۱۔ لاہوری ج ۱ ص ۲۴۳؛ قزوینی ف ۱۶۷ ب

۲۔ ایضاً ص ۲۵۴۔ " ۱۷۲ ب

۳۔ ایضاً ص ۲۹۴ " ۱۹۰

۴۔ لاہوری کوئی نام نہیں لیتا ج ۱ ص ۳۰۰؛ قزوینی اس کا نام حسن آرا بیگم بتاتا ہے ف ۱۹۱

۵۔ لاہوری ج ۱ صفحات ۳۸۱ - ۸۹؛ قزوینی ف ۲۳۲ - ۳۵ ب دیکھیے برٹش میوزیم کیٹلاگ بھی مع ۱۰۹۸ تاج محل اور شاہ جہان کی تعلیں۔

۶۔ قزوینی لکھتا ہے کہ شہنشاہ عینک بھی استعمال کرنے لگا ف ۲۳۲ ب

۷۔ قزوینی ف ۲۳۵؛ لاہوری ج ۱ ص ۴۰۳

۸۔ ایضاً ۲۴۷ ب اور ف ۲۵۰؛ لاہوری ج ۱ ص ۴۲۲ اور ص ۴۲۸

۹۔ ایضاً ۲۵۱؛ لاہوری ج ۱ ص ۴۳۰

۱۰۔ ایضاً ف ۲۵۶ ب ۷ ۵ ب اور ۲۷۱ - ۷۵؛ قزوینی کا کہنا ہے کہ تیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا لاہوری ج ۱ صفحات ۴۵۲

۱۱۔ ایضاً ۲۷۵ - ۲۶۶ ب؛ لاہوری صفحات ۴۷۰ - ۶۵

۱۲۔ قزوینی ف ۲۷۴ - ۷۷ ب۔ سیدائے گیلانی نے اس واقعہ کو منظوم کیا اس کو چاندی میں وزن کرایا گیا۔ طالب کلیم نے بھی اس پر نظم کہی۔ قزوینی نے واقعہ کو نثر میں قلم بند کر کے حضور شاہ پیش کیا۔ اس نے دادِ سخن دی اس کا وظیفہ بڑھا دیا شاہ جہان کا وہ منظور نظر ہو گیا۔ اس سے اکثر فرمائش کی جاتی کہ مرصع انداز بیان میں نثر لکھا کرے (ف ۲۷۷ ب) لاہوری ج ۱ صفحات ۴۸۹ - ۹۲ وہ قزوینی یا کلیم کا اس سلسلے میں ذکر نہیں کرتا وہ صرف سیدائے گیلانی کا ذکر کرتا ہے صفحہ ۴۹۳

۱۳۔ قزوینی ف ۳۰۰؛ لاہوری ج ۱ ص ۵۳۶

۱۴۔ ایضاً ۳۰۴؛ ایضاً حصہ ۲ ص ۴

۱۵۔ قزوینی لکھتا ہے کہ دارا کی بیماری کا راز اس کی لڑکی کی موت تھی ف ۳۰۷: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ صفحات ۹، ۱۰

۱۶۔ قزوینی ف ۳۱۳ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۳۰

۱۷۔ کشمیر کے بیان کا موازنہ قزوینی اور جلال الدین طباطبائی کے الگ الگ بادشاہ ناموں سے کیجیے: اور قدسی اور کلیم کے منظوم بیانات کا بھی مقابلہ کیجیے: قزوینی اس وقت شاہی جلوس میں شریک تھا۔ ف، ۳۲۹۔

۱۸۔ قزوینی ۳۲۶ ب: لاہوری ج ۱ حصہ ۲ ص ۴۹

۱۹۔ قزوینی ۳۳۴: لاہوری 〃 〃 ۶۲

۲۰۔ ایضاً ۳۳۷: ایضاً ص ۷۰

۲۱۔ ایضاً ایضاً ص ۷۰

۲۲۔ ایضاً ۳۴۰ ایضاً ص ۷۴

۲۳۔ ایضاً ۳۵۰ ایضاً ص ۱۰۵

۲۴۔ ایضاً ف ۳۵۴ ب ۳۵۷ ایضاً صفحات ۱۲۰-۱۲۳

۲۵۔ ایضاً ۳۶۰ ایضاً ص ۱۲۳

۲۶۔ ایضاً ۳۶۳ ایضاً ص ۱۳۵

۲۷۔ ایضاً ۳۸۶ ایضاً ص ۲۵

۲۸۔ ایضاً ۳۹۳ ب ایضاً ص ۲۲۴

۲۹۔ ایضاً ۴۰۰ ص ۲۲۵

۳۰۔ ایضاً ۴۰۲ ایضا صفحات ۲۴۴-۴۵

۳۱۔ ایضاً ف ۴۰۳-۴۰۷ اور ف ۴۰۸ ب ۴۱۰ ایضاً صفحات ۲۶۶-۷۱

۳۲۔ لاہوری ج ۲ ص ۱۱۰

۳۳۔ ایضاً ص ۱۶۳

۳۴۔ ایضاً ص ۱۹۲

۳۵۔ ایضاً ص ۲۵۷

۳۶۔ ایضاً ص ۳۰۴-۵

۳۷۔ ایضاً ص ۳۳۰

۳۸۔ ایضاً ص ۳۴۴ - ۴۹

۳۹۔ ایضاً ص ۳۴۳ - ۴۹، ۳۵۵، ۳۹۳ - ۴۰۰ ولیم فاسٹر نے کس انگریز کے ہاتھ سے جہاں آرا کے شفا پانے کی کہانی کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے دیکھیے دیباچہ "ہندستان میں انگریزی کارخانے - ۱۶۴۲ - ۴۵ - ۳۵/۳۶

۴۰۔ لاہوری ج ۲ صفحات ۳۸۰ - ۸۴ - محمد صادق نے اس واقعہ کو خود دیکھا اس کا کہنا ہے کہ صلابت خان مکرمت خان سے باتیں کر رہا تھا اور شہنشاہ، عبداللہ خان فیروز جنگ کے لیے ایک فرمان لکھا رہا تھا۔ امر سنگھ بدگمان ہوا اس نے سمجھا کہ صلابت جنگ اس کی شکایت کر رہا ہے

۴۱۔ لاہوری ج ۲ ص ۴۰۷

۴۲۔ ایضاً ص ۴۱۳

۴۳۔ وارث ف ۵ ب

۴۴۔ ایضاً ۱۳ب

۴۵۔ ایضاً ۱۴

۴۶۔ ایضاً ۱۵ب: صالح ف ۱۱۷

۴۷۔ ایضاً ۲۸ب

۴۸۔ ایضاً ۵۰ب

۴۹۔ ایضاً ف ۳۳ - ۹۳ Archaeological survey) of India Report 911-12

۵۰۔ ایضاً ف ۷۵

۵۱۔ ایضاً ۹۱

۵۲۔ ایضاً ف ۹۹ب

۵۳۔ ایضاً (معہ ۲۵۵۶) ف ۲۶۲ب

۵۴۔ ایضاً ف ۲۷۵ب - ۷۷ اور ف ۲۸۷

۵۵۔ ایضاً ف ۴۸

۵۶۔ ایضاً ۲۸۱ب

۵۶۔ ایضاً ۱۸۳ ب
۵۷۔ ایضاً (۵۳ ۱۶۷۵) ف ۱۲۳ب۔ ۱۲۶
۵۸۔ ایضاً (معہ ۶۵۵۶) ف ۳۸۹
۵۹۔ وارث۔ ف ۴۹۰
۶۰۔ ایضاً ف ۴۹۱
۶۱۔ ایضاً ف ۴۱۹
۶۲۔ ایضاً ف ۵۲۱
۶۳۔ سرکار: تاریخ اورنگ زیب ج ۱ صفحات ۳-۳۰۲
۶۴۔ لطیف الاخبار کا مصنف دارا کے کردار کی ایک مختصر ترین تصویر الفاظ میں پیش کرتا ہے۔
۶۵۔ سرکار: تاریخ اورنگ زیب ج ۲ صفحات ۲۸-۱۲۷
۶۶۔ ظفر نامہ عالمگیری ف ۹
۶۷۔ عنایت نامہ اورنگ زیب سے شجاع تک ف ۳۸ ب: جامع الانشا، مراد سے اورنگ زیب تک ف ۳۵۹۔
۶۸۔ ایضاً ف ۳۷ جامع الانشا ف ۳۷۵
۶۹۔ ایضاً ف ۳۸ ب
۷۰۔ ایضاً ف ۳۷
۷۱۔ جامع الانشا، مراد سے اورنگ زیب تک ف ۳۵۷
۷۲۔ عنایت نامہ: اورنگ زیب سے مراد تک ف ۴۱
۷۳۔ ایضاً ف ۴۰: ظفر نامہ ف ۱۷ ب
۷۴۔ سرکار: تاریخ اورنگ زیب ج ۱ ص ۳۰۸
۷۵۔ جامع الانشا، مراد سے اورنگ زیب تک ف ۳۵۵
۷۶۔ سرکار کی تاریخ اورنگ زیب ج ۱ ص ۳۰۹
۷۷۔ ایضاً
۷۸۔ جامع الانشا: مراد سے اورنگ زیب تک ف ۳۶۶
۷۹۔ ایضاً ف ۳۶۵: مراد نے اورنگ زیب کو لکھا کہ میں خوش ہوں کہ آپ نے یہ مرحلہ کو جیت کر قید کر دیا۔

۸۰۔ خلاصۃ التواریخ ف ۳۸۴

۸۱۔ سرکار کی تاریخ اورنگ زیب ج ۲ ص ۱۔ ۳۰

۸۲۔ ایضاً ایضاً

۸۳۔ جامع الانشاف ۱۵۷ ۔ ۵۸: صالح کا کہنا ہے کہ جہان آرا نے یہ خط اپنے بخشی محمد فاروق کے ہاتھ بھیجا۔

۸۴۔ ایضاً ۱۵۸ - ۶۰

۸۵ ۔ فتوحات عالمگیری میں لکھا ہے کہ یہ ہاتھی راج ، گو ہاد کا زمیندار تھا۔ ف ۲۳ ب دل کشا میں ہے کہ یہ چمپت تھا۔ ف ۱۵۶ ا دیکھیے جہتر پرکاش ص: خلاصۃ التواریخ خاموش ہے

۸۶۔ جامع الانشاء مراد سے شاہ جہان تک ف ۳۷۹ - ~

۸۷۔ ایضاً مراد سے شجاع تک ف ۲۷۶

۸۸ ۔ظفر نامہ ف ۳۶: فتوحات عالمگیری ف ۲۷

۸۹ ظفر نامہ ف ۳۲ ب: محمد صادق لکھتا ہے کہ وہ گفت و شنید میں ایک فریق تھا۔ اورنگ زیب نے خلیل اللہ خان کو روک رکھا اور فاضل خان کو اور راقم کو رخصت کر دیا۔ ف ۲۰۱ -۲۔ صالح بھی مستند ذرائع سے یہی خبر دیتا ہے ف ۲۳۷۔

۹۰۔ ظفر نامہ ف ۳۸

۹۱ ۔ سرکار: تاریخ اورنگ زیب ج ۳ ص ۱۲۵

۹۲ ۔ قزوینی ف ۳۰۲ : لاہوری ج ص ۱۳۹

۹۳۔ منوچی ج ۱ ص ۱۹۵

۹۴ ۔ ایضاً ص ۱۹۴

۹۵۔ برنیر ص ۲۷۳

۹۶۔ مان ریکو ج ۲ صفحات ۱۴۰ - ۴۴

۹۷۔ پیٹر منڈے ج ۲ ص ۲۰۳

۹۸۔ ٹیورنیر ج ۱ ص ۳۴۴

۹۹۔ وارث ف ۷۰

۱۰۰۔ وارث ف ۷۱، ۸۰، ۱۰۰ ب

۱۰۱۔ منوچی ج ۲ ص ۳۳۶ : پلاسرٹ ص ۸۳

۱۰۲۔ برنیر ص ۲۷۴ : منوچی ج ۲ ص ۳۳۶

۱۰۳۔ منوچی ج ۲ ص ۱۰۵

۱۰۴۔ ہندستان میں انگریزی کارخانے " (۱۶۳۷ - ۴۱) ص ۲۸۹

۱۰۵۔ برنیر ص ۱۲

۱۰۶۔ ہندستانی آثارِ قدیمہ، ۱۹۱۴ صفحات ۲۴۰-۴۴

۱۰۷۔ ڈی لائٹ : مغل اعظم کی سلطنت ۔ تعارف

۱۰۸۔ منوچی ج ۱ ص ۲۱۷۔ اس کے وہ بیانات بھی ملاحظہ ہوں جن میں اس نے اپنے اطلاعات کے مآخذ کی نشان دہی کی ہے ۔ج ۱ ص ۲۲۰

۱۰۹۔ منوچی ج ۲ صفحات ۷۵ - ۷۶

۱۱۰۔ منوچی کہتا ہے کہ حرم کے عملہ کی خدمات بجالانے کے اعتراف میں بیگم صاحبہ نے اپنی شراب خاص کی بوتلیں اس کو بھیجیں۔

۱۱۱۔ برنیر ص ۱۲ ۔ ملاحظہ ہو وہ اشعار جو جہاں آرا نے باپ کے انتقال پر کہے ہیں۔

۱۱۲۔ (The Indian Antiquary.) 1915 - P - 24

۱۱۳۔ بی آیل: (Dictionary of oriental Biography) P. 190

۱۱۴۔ وارث ف ۶۸

۱۱۵۔ صالح کا کہنا ہے کہ شاہ جہاں میر سید محمد قنوجی کے ساتھ قرآن پڑھتا تھا: ف ۶۷۵ ب

۱۱۶ یہ تیل رزق اللہ ۔ مقرب خان نے تیار کیا تھا: صالح ف ۶۷۶

1- Peter Mundy. 2- De-Laet. 3- The Indian Antiquary.

تاریخ، تہذیب، سیاسیات اور عمرانیات پر

قابلِ مُطالعہ کتابیں

- حیاتِ جاوید
- حیاتِ شبلی
- وقارِ حیات
- تذکرۂ محسن
- حیاتِ سُلیمان
- حیدر علی
- حیات النذیر
- مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال
- تاریخ سلطنتِ خُداداد
- ہندوستان شاہجہاں اور نگ زیب کے عہد میں
- تاریخ شاہ جہاں
- ظہیر الدین محمّد بابر
- اسلامی فکر و ثقافت
- علم، سائنس اور اسلام

- شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی
- علامہ سید محمد سلیمان ندوی مرحوم
- وقار الملک نواب مشتاق احمد خاں کے سوانح
- محسن الملک سید مہدی علی خاں کے سوانح
- مولانا سید معین الدین احمد ندوی
- پروفیسر اقتدار حسین صدیقی ایم اے
- ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے سوانح و افکار
- ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی
- محمود خاں محمود بنگلوری
- سفرنامہ ڈاکٹر برنیئر
- ترجمہ: سید اعجاز حسین
- ترجمہ: ڈاکٹر رفعت بلگرامی
- عطش دُرانی ایم اے

نیشنل بُک ہاؤس ○ ایبک روڈ ○ لاہور